

حُطَبَاكُ
حَكِيمُ الْأُمَمِ

إِدَارَةُ تَالِيفَاتِ اشْرَافِيَه

پنجک فوارہ ملت ان پکسٹان فون 4540513-4519240



فصل في معرفة الصلاة

بِسلسلہ خطبات حکیم الامت جلد - ۱۰

فضائل صوم و صلوٰۃ

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت
حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ

ترجمہ مولانا

منشی عبدالرحمن خاں

تصحیح و تزئین
صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ
تخریج احادیث
مولانا زاہد محمود قاسمی

ادارۃ تالیفات اشرفیہ

چوک، فوارہ ملت، پاکستان

[061-4540513-4519240]

فضائل صوم و صلوٰۃ

تاریخ اشاعت..... محرم الحرام ۱۴۳۱ھ
ناشر..... ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت..... سلامت اقبال پریس ملتان

انتباہ

اس کتاب کی کاپی رائٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں
کسی بھی طریقہ سے اس کی اشاعت غیر قانونی ہے

قانونی مشیر

قیصر احمد خان

(ایڈووکیٹ ہائی کورٹ ملتان)

قارئین سے گزارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔
الحمد للہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔
پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں
تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ادارہ تالیفات اشرفیہ..... چوک نوارہ..... ملتان

ادارہ اسلامیات..... انارکلی..... لاہور ادارہ اشاعت..... اردو بازار..... کراچی
مکتبہ سید احمد شہید..... اردو بازار..... لاہور ادارہ الانور..... نیوٹاؤن..... کراچی
مکتبہ رحمانیہ..... اردو بازار..... لاہور مکتبہ دارالاعلاص..... قصہ خوانی بازار..... پشاور

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K 119-121- HALLIWELL ROAD
(ISLAMIC BOOKS CENTRE) BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

ملتان
پشاور

عرض ناشر

خطبات حکیم الامت جلد نمبر ۱۰ ”فضائل صوم و صلوٰۃ“
 جدید اشاعت سے مزین اپ کے ہاتھوں میں ہے۔
 اللہ کے فضل و کرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل کافی
 عرصہ سے خطبات کی اشاعت کا ادارہ کو شرف حاصل ہو رہا ہے۔
 بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ ان کی احادیث مبارکہ کی تخریج ہو
 جائے۔ بتوفیقہ تعالیٰ خطبات کی تمام جلدوں میں احادیث کی تخریج
 حاشیہ میں اور ساتھ ہی اشعار اور عربی عبارات کا ترجمہ دیدیا گیا ہے۔
 ادارہ نے زر کثیر خرچ کر کے تخریج کا کام محترم جناب مولانا زاہد محمود صاحب
 (فاضل جامعہ قاسم العلوم ملتان) سے کرایا۔
 فارسی اشعار اور عربی عبارات کا ترجمہ اور اس کے ساتھ ساتھ تصحیح کا کام
 حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ العالی نے سرانجام دیا۔
 اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین

احقر: محمد اسحاق عفی عنہ

ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ بمطابق جون ۲۰۰۷ء

اجمالی فہرست

۱	الصلوة	صفحہ ۱۵
---	--------	---------

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى. (الاعلى: ۱۵۱۳)

۲	نداء رمضان	صفحہ ۷۴
---	------------	---------

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ينادى الملك يا باغي الخير اقبل ويا باغي الشر اقصر ولله عتقاء من النار (سنن ترمذی)

۳	الصوم	صفحہ ۸۸
---	-------	---------

قال النبي صلى الله عليه وسلم قال الله تعالى كل حسنة تضاعف بعشر الى سبع مائة ضعف الا الصوم فانه لي وانا اجزي به (مسند احمد)

۴	الصيام	صفحہ ۱۰۹
---	--------	----------

فقد قال النبي صلى الله عليه وسلم من صام رمضان ايمانا واحتسابا غفر له تقدم ماذنبه ومن قام رمضان ايمانا واحتسابا غفر له ماتقدم من ذنبه. (الصحيح للبخارى)

۵	الفطر	صفحہ ۱۴۶
---	-------	----------

انما يوفى الصبر ون اجرهم بغير حساب. (الزمر: ۱۰)

٦	النسوان في رمضان	صفحة ١٦٣
---	------------------	----------

عسى ربه ان يطلعن ان يبدله ازواجاً خيراً منكن مسلمات مؤمنات
قانتات تائبات عبادات سائحات ثيبات وابكاراً. (التحریم: ٥)

٧	رمضان في رمضان	صفحة ١٩٦
---	----------------	----------

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ . (البقرة: ١٨٥)

٨	احكام العشرة الاخيرة	صفحة ٢٦٩
---	----------------------	----------

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ . (البقرة: ١٨٥)

٩	تطهير رمضان	صفحة ٣١٣
---	-------------	----------

يا ايها الذين امنوا كتب عليكم الصيام الخ (البقرة: ١٨٣)

١٠	عصم الصنوف	صفحة ٣٣٢
----	------------	----------

كلوا واشربوا هنيئاً بما اسلفتم في الايام الخالية (الحاقة: ٢٣)

١١	التهذيب نمبر ١	صفحة ٣٩١
----	----------------	----------

قد افلح من زكها وقد خاب من دسها (الشمس: ١٠٩)

١٢	التهذيب نمبر ٢	صفحة ٣١٩
----	----------------	----------

يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر ولتكملوا العدة الخ (البقرة: ١٨٥)

فہرست عنوانات

صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات
۳۶	طلب صادق کا اثر	۱۵	۱۔ الصلوٰۃ
۳۷	وسوسہ اور اس کا علاج	۱۶	تمہید
۳۹	ذکر و فکر	۱۷	اسرار کلام الہی
۳۹	فضیلت نماز	۱۸	اقسام کلام الہی
۴۰	نماز میں روزہ	۱۸	قوت استنباطیہ
۴۱	نماز فاسد	۱۹	قلبی توجہ کی ضرورت
۴۲	نماز میں ہنسا و رونا	۲۰	آج کل کے مجتہد
۴۳	حقیقت کمال	۲۱	قرآن نہ پڑھنے کا بہانہ
۴۴	رونے کی اہمیت	۲۲	ترجمہ پڑھنے کا اصول
۴۵	نماز میں چلنا	۲۴	تلاوت کے فوائد
۴۷	نماز کا توڑنا	۲۴	اہل علم میں ایک کمی
۴۸	جذبات طبعیہ کی رعایت	۲۵	دنیا و آخرت کی مثال
۴۹	عقل اور شریعت	۲۶	توکل کی صورت
۵۰	شریعت اور راحت	۲۷	توکل اور کارِ عقبی
۵۰	نماز میں ادھر ادھر دیکھنا	۲۸	قلب و اعمال کا تعلق
۵۲	آجکل کی آزادی	۳۰	ریاضت نفس
۵۲	خشوع کی حقیقت	۳۱	اصلاح ظاہر و باطن
۵۳	دفع وساوس کے طریق	۳۲	درستی جوارح و قلب
۵۵	سجدہ کی حقیقت	۳۳	برائیوں سے بچنے کا طریقہ
۵۶	خلوت بالمحسوب	۳۴	اہل علم کی نازک حالت
۵۸	نماز میں حج	۳۵	نفس کی شرارت

۸۵	تلاوت قرآن	۵۸	نماز کی جامعیت
۸۶	ہماری حالت	۶۰	نماز کا وقفہ
۸۸	۳۔ الصوم	۶۲	نماز کی صورت
۸۹	تمہید	۶۳	نماز کی روح
۹۰	وسعت ثواب	۶۴	قرب خداوندی
۹۱	نیکی کا قانون	۶۵	اللہ کی محبت
۹۳	ثواب کا مدار	۶۵	عتاب میں عنایت
۹۳	روزہ کا خصوصی ثواب	۶۶	حق تعالیٰ کی رحمت
۹۴	بلا ضرر لغزش	۶۸	ذکر کی خاصیت
۹۵	فہم حکمت	۷۰	صبر کا طریقہ
۹۶	احکام الہی کی عظمت	۷۱	موت کی پریشانی
۹۹	روزہ کی خصوصیت	۷۲	نماز کی برکت
۱۰۰	صلوٰۃ اللہ کی حقیقت	۷۴	۲۔ نداء رمضان
۱۰۱	ایک لطیفہ نبوی	۷۵	متاع مسلمان
۱۰۲	روزہ اور فدیہ	۷۶	تلاوت کا ثواب
۱۰۴	روزہ کے حقوق	۷۷	فضیلت رمضان
۱۰۵	حظ نفس	۷۸	ترک معاصی کی ترکیب
۱۰۷	تقویٰ کی صورت	۷۹	حکایت شیخ ابوسعیدؒ
۱۰۹	۴۔ الصیام	۸۰	قرب خداوندی کی صورت
۱۱۰	فاعل بالا اختیار	۸۱	افعال کی قسمیں
۱۱۱	سائنس اور شریعت	۸۱	خشوع کی ضرورت
۱۱۴	حکماء حقیقی	۸۲	روزہ کی عدمیت
۱۱۵	عبث میں مشغولیت	۸۳	ندائے فرشتہ
۱۱۶	اتباع کی ضرورت	۸۴	اتباع سنت
۱۱۷	مسئلہ تقدیر	۸۵	حقیقی شہرت

۱۵۳	بغیر حساب کے معنی	۱۱۸	تصرف حق تعالیٰ
۱۵۴	نعمت فقر	۱۱۹	مجاہدہ کی ضرورت
۱۵۶	نیک صحبت کا اثر	۱۲۰	توجہ کی اہمیت
۱۵۸	روزہ داروں کی فرحتیں	۱۲۲	غفلت انسانی
۱۶۰	صدقہ فطر	۱۲۳	شریعت اور حقیقت
۱۶۱	زیر دستوں کے حقوق	۱۲۵	فلسفہ و منطق
۱۶۲	خلاصہ بیان	۱۲۶	تجلیات کی تاثیر
۱۶۳	۶۔ النسوان فی رمضان	۱۲۸	تجلی کے معنی
۱۶۴	اہل بیت	۱۲۹	طلب کے کرشمے
۱۶۷	ازواج مطہرات	۱۳۱	ذکر و شغل کے اثرات
۱۷۰	عشق و محبت	۱۳۲	روزہ کی شان خاص
۱۷۱	مسلمات کی خصوصیات	۱۳۳	تقویٰ کی مشق
۱۷۵	سیاحت الدین	۱۳۵	معصیت اور طاعت
۱۸۰	سراپا انعامات	۱۳۶	حلال و حرام
۱۸۱	سہولت صوم	۱۳۷	حلال کی صورت
۱۸۴	نماز روزہ کی یا بندی کا فرق	۱۳۸	طالب علمی کا رنگ
۱۸۵	خلوت گاہ حق	۱۴۰	تصوف اور فقہ
۱۸۶	نماز روزہ کا فرق	۱۴۱	شرعی مجاہدے
۱۸۸	فرحت افطار	۱۴۲	روزہ اور تقلیل
۱۸۹	تکمیل صوم	۱۴۶	۵۔ الفطر
۱۹۱	تکمیل کے درجے	۱۴۷	تمہید
۱۹۳	شب قدر کی عبادت	۱۴۸	صبر کے مواقع
۱۹۶	۷۔ رمضان فی رمضان	۱۴۹	قانون اجر
۱۹۷	روزہ کے حقوق	۱۵۱	دعا کی اہمیت و افادیت
۱۹۹	تمہید	۱۵۱	شیطان کا مکر

۲۳۸	کثرت تلاوت	۲۰۰	ماہ رمضان کا اہتمام
۲۳۹	ترک معصیت	۲۰۲	معصیت کے آثار
۲۴۰	جامع جمیع عبادات	۲۰۳	معرفت کا مدار
۲۴۱	روزہ کے متعلق معاصی	۲۰۵	نور طاعت
۲۴۲	اتلاف حق	۲۰۶	صحبت کا اثر
۲۴۴	نماز تراویح	۲۰۸	ظلمت معصیت
۲۴۷	عبادت تلاوت قرآن	۲۱۱	نور کی حقیقت
۲۵۰	صحیح مخارج کی اہمیت	۲۱۳	ایک حکایت
۲۵۱	غرض پرستی	۲۱۴	مردود ابدی
۲۵۳	اتباع کی ضرورت	۲۱۵	طلب صادق کا اثر
۲۵۶	اعتکاف کی حقیقت	۲۱۷	مقام صدیق
۲۵۷	ضرورت فقہ	۲۱۸	قبر میں زیارت رسول ﷺ
۲۵۹	وعظ و فتویٰ کے اہل	۲۱۹	عبدیت کا خاصہ
۲۶۰	کتاب اور صحبت اثر کا فرق	۲۲۱	عشاق کی شان
۲۶۳	خود بینی کے مضرات	۲۲۴	مساوات اسلامی کا سبق
۲۶۶	آداب ماہ رمضان	۲۲۶	حق پرستی
۲۶۹	۸۔ احکام العشر الاخیرہ	۲۲۷	اسلام دوستی
۲۷۰	فضیلت ماہ رمضان	۲۲۸	تکبر کی صورت
۲۷۱	نزول قرآن کریم	۲۲۹	قدرت کا کرشمہ
۲۷۲	سابقہ کتب کا نزول	۲۳۱	خدا کا مقابلہ
۲۷۳	عالم غیب کی وسعت	۲۳۲	نور کے آثار
۲۷۴	کشف اور بزرگی	۲۳۳	ذات الانوار
۲۷۵	لیلة القدر	۲۳۴	انسانوں کی فرشتوں پر فضیلت
۲۷۶	جمعہ کی فضیلت	۲۳۶	انسان کی حیثیت
۲۷۹	تلاوت کی اہمیت	۲۳۷	ماہ رمضان کی عبادات

۳۱۴	حسناات وسیناات	۲۸۰	حال وقال کافرق
۳۱۶	زبان کے گناہ	۲۸۱	نسبت انعکاسی
۳۱۷	افطار علی الحرام	۲۸۳	فیض رسائی کی صورتیں
۳۱۸	شیطان کے جال	۲۹۴	منصب ہدایت
۳۱۸	رزق میں برکت کے معنی	۲۸۶	اہلیت ارشاد
۳۱۹	ہم اور ہماری نمازیں	۲۸۷	تصور شیخ
۳۲۲	تراویح کے منکرات	۲۸۸	ثواب قرأت قرآن
۳۲۲	شبہ کی بدعات و منکرات	۲۹۰	اجرت تعلیم
۳۲۴	اجرت قرآن خوانی	۲۹۱	اجرت امامت
۳۲۷	چراغاں کی بدعت	۲۹۱	دیدار خداوندی
۳۲۷	لباس کی اغراض	۲۹۳	حفظ تلاوت قرآن
۳۲۹	ختم کی مٹھائی کے منکرات	۲۹۴	ترغیب ذکر اللہ
۳۳۰	یوم عید کی بدعت	۲۹۷	طلب الہی کی ترغیب
۳۳۲	سیویوں کی تخصیص	۲۹۸	ترتیب سلوک
۳۳۳	وعظ کا خلاصہ	۳۰۱	تفریط معلمین
۳۳۴	۱۰۔ عصم الصنوف	۳۰۱	افراط معلمین
۳۳۵	نامہ اعمال	۳۰۲	فضیلت عشرہ اخیرہ
۳۳۶	کھانے پینے کی رعایت	۳۰۴	شب قدر کی فضیلت
۳۳۷	حق تعالیٰ کی توجہ	۳۰۵	فضیلت اعتکاف
۳۳۸	جنت کا کام	۳۰۷	فضیلت خدمت والدین
۳۴۰	ایام خالیہ	۳۰۸	ماہ رمضان کی فضیلت
۳۴۱	آسان عبادت	۳۰۹	بے علم واعظوں کی غلطی
۳۴۲	سلب قدرت گناہ	۳۱۱	تذہب کی ترغیب
۳۴۳	نیت صوم	۳۱۱	ختم قرآن اور شیرینی
۳۴۴	اعمال وجودیہ	۳۱۳	۹۔ تطہیر رمضان

۳۸۱	سہولت اور طبیعت	۳۴۶	روزہ اور نماز میں آسانی
۳۸۲	دروود شریف کی اہمیت	۳۴۷	روح صوم
۳۸۳	دانت گھسائی	۳۴۸	روزہ اور مشغولیت
۳۸۵	رعایت جذبات	۳۴۹	والدین کی محبت
۳۸۷	محبت اور رحمت کا نباہ	۳۵۰	عدم التفات اور خوف و حزن
۳۸۸	دروود کی فضیلت	۳۵۲	قرب حق
۳۸۸	مغفرت کا سامان	۳۵۳	انا للہ کی تعلیم
۳۹۰	خلاصہ بیان	۳۵۵	موت مثل شادی
۳۹۱	۱۱۔ التہذیب	۳۵۷	خوشی، غم اور عارف
۳۹۲	تزکیہ کے معنی	۳۵۹	تذکرہ کا اثر
۳۹۳	تزکیہ باطنی	۳۵۹	فضائل و ہیہ
۳۹۴	تزکیہ نفس	۳۶۱	احوال و کیفیات
۳۹۵	اعمال شرعیہ کی خاصیت	۳۳	روزہ اور گرانی
۳۹۵	کید نفس	۳۶۳	ماہ رمضان اور زیادتی رزق
۳۹۶	توفیق نعمت	۳۶۷	مصائب کی حکمتیں
۳۹۷	دعویٰ کی ممانعت	۳۷۰	سہل احکام
۳۹۹	مسافت معرفت	۳۷۱	حضرت موسیٰ کے افسوس کی حکمت
۳۹۹	مدار نجات	۳۷۳	روزوں میں تخفیف
۴۰۰	تحقیقات جدیدہ اور طاعون	۳۷۴	حضور ﷺ کی بدوعا
۴۰۲	وہم کا اثر	۳۷۶	اہل اللہ کے کلمات
۴۰۳	وحدة الوجود	۳۷۸	مرزا مظہر جانجنا کی لطیف المزاجی
۴۰۵	ام المعاصی	۳۷۹	مقام مرزا مظہر جانجنا
۴۰۶	کلابی تقویٰ	۳۷۹	حضور کی غایت رحمت
۴۰۷	تفریق و تنفید	۳۸۰	ذلت اور عذاب جہنم
۴۰۷	امام کا فرض	۳۸۰	سکین گناہ

۴۲۹	توجہ کی اہمیت	۴۰۸	تراویح اور حفاظ
۴۳۰	محبت اور ادب	۴۱۰	حفاظ اور ائمہ کا فرض
۴۳۱	اوقات نزع کے کلمات	۴۱	خراہیوں کی جز
۴۳۳	ایمان کی رخصتی	۴۱۲	مجاہدہ اور مواد خبیثہ
۴۳۴	نشان قدرت	۴۱۳	تہذیب نفس
۴۳۵	ذکر اللہ کی دولت	۴۱۴	شریعت کا مقصود
۴۳۷	خسوف اور نکاح	۴۱۵	نفس کی مثال
۴۳۸	اختتام و اکمال مجاہدہ	۴۱۶	تذلل للخالق
۴۳۹	مجاہدہ کی آسانیاں	۴۱۷	ترک لذات کا طریقہ
۴۴۱	مصلحت الہی	۴۱۹	۱۲۔ التہذیب
۴۴۳	مشاہدہ جمال حق	۴۲۰	مجاہدہ کی اہمیت
۴۴۳	ہمارے اعمال	۴۲۲	ماہ رمضان اور ایام شماری
۴۴۵	مذاق طبعی کی رعایت	۴۲۳	روزہ دار کی خوشیاں
۴۴۷	اختتام رمضان	۴۲۷	شیطان اور مومن
۴۴۸	فرائض اور قرب	۴۲۸	سلب ایمان



الصلوة

نماز کے متعلق یہ وعظ ۱۱ رجب ۱۳۳۷ھ کو مسجد شاہ پیر محمد صاحب
متصل گوشتی ندی واقع لکھنوتخت پر کھڑے ہو کر فرمایا، جو پونے
چار گھنٹہ میں ختم ہوا۔ تعداد سامعین تخمیناً دو ہزار تھی۔ محمد یوسف
بجنوری ولد مردان علی نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِیْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِہِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یُّہْدِہِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضِلِلْہُ فَلَا هَادِیَ لَہٗ وَنَشْہَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْہَدُ اَنْ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ . بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ .

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّیْ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلَّی . (الاعلیٰ: ۱۵۱۳)

تمہید

یہ دو آیتیں ہیں جو اس کے قبل پرسوں کے بیان میں پڑھی گئی تھی۔ چونکہ وہ مضمون نا تمام رہ گیا تھا اس لئے اس کا تمہ اس وقت بیان ہوتا ہے اور اتفاق وقت سے وہ اس انجمن کے مناسب بھی ہے میں نے اس وقت دو آیتیں تلاوت کیں قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّیْ دوسری وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلَّی۔ پہلی آیت کے متعلق پرسوں بیان ہوا تھا۔ دوسری آیت کا بیان رہ گیا تھا۔ وہ اس وقت عرض کیا جائے گا۔

اس دوسری آیت میں حق تعالیٰ نے آیت کے ختم پر فصلی فرمایا جس کے معنی ہیں نماز پڑھی۔ اس کے ترجمہ ہی سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس میں نماز کی فضیلت مذکور ہے اور اس انجمن کی بھی یہی غرض ہے۔ چنانچہ مولانا کے بیان (لکھنؤ میں ایک انجمن ہے جس کے بہت سے مقاصد ہیں ان میں سے اعلیٰ مقصد یہ ہے کہ بذریعہ واعظین کے لوگوں کو نماز کی تحریک کی جائے اور انجمن کی جانب سے ناواقفوں کو نماز سکھانے کا اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ حضرت والا کے وعظ شروع

کرنے سے پیشتر انجمن کے اراکین میں سے ایک مولوی صاحب کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے انجمن کی بعض کاروائیاں لوگوں کو سنائی تھیں اور انجمن کا اعلیٰ مقصد نماز کی تعلیم اور اس کا اہتمام ہونا ظاہر کیا تھا۔ حضرت والا نے بھی حسب موقع نماز ہی کے متعلق بیان فرمایا۔ حضرت کی تقریر میں مولانا کے لفظ سے وہی صاحب مراد ہیں جنہوں نے انجمن کی کارروائی سنائی تھی۔ غالباً یہ وعظ بھی انجمن ہی کی تحریک سے ہوا تھا۔ گو کہ اہل انجمن نے حضرت والا سے خاص اسی بیان کے لئے نہ کہا تھا لیکن حضرت والا نے خود ہی حسب موقع اس بیان کو اختیار فرمایا تھا۔ ۱۲ جامع) سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ پس یہ مضمون موقع کے مناسب ہوگا۔

اسرار کلام الہی

ظاہر یہ دونوں آیتیں مختصر ہیں مگر کلام اللہ ہونے کی وجہ سے ہر شخص جانتا ہے کہ یہ آیتیں جامعیت میں تام ہوں گی۔ ان کے اندر کسی قسم کی کمی نہیں ہو سکتی۔ اس وجہ سے الفاظ کے اختصار پر نظر نہ کی جائے بلکہ اس کی حقیقت میں غور کیا جائے اور یہ حق تعالیٰ کے کلام کی خصوصیت ہے کہ نہایت مختصر الفاظ میں بڑے بڑے مہمات پر تنبیہ کر دیا ہے۔ پھر کمال یہ کہ وہ اختصار مطلب سمجھنے میں مغل نہیں ہوتا۔ گو حق تعالیٰ کے کلام میں بعض کلمات ایسے بھی ہیں جن کی مراد ہم کو معلوم نہیں۔ مگر ایسے کلمات صرف وہی ہیں جن کے متعلق عام افادہ نہیں ہے اور نہ ان کے اندر احکام کا بیان ہے بلکہ ان میں خاص خاص اسرار ہیں جو حضور کو منکشف کر دیئے گئے ہیں اور بعض کے نزدیک وہ کنور مخفیہ میں سے ہیں کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی جمہور کے نزدیک ان کا انکشاف نہیں ہوا لیکن چونکہ عام افادہ ان کے متعلق نہیں ہے اس لئے ان کے مخفی رہنے میں کوئی قباحت بھی نہیں۔ غرض کہ کلام اللہ میں اس قسم کے کلمات بھی موجود ہیں اور اس کے اندر بعض مضامین ایسے بھی ہیں کہ وہ بالکل تو مخفی نہیں ہیں مگر ہیں غامض کہ ہر شخص کا فہم ان تک نہیں پہنچ سکتا۔ ان کی توضیح حضرات مجتہدین نے کر دی۔ ہاں جو باتیں محض عقائد یا ترغیب و ترہیب کے متعلق ہیں وہ بہت ہی سہل ہیں۔ ان میں کوئی غموض نہیں۔ کسی کو ان کے سمجھنے میں وقت واقع نہیں ہوتی۔ کلام اللہ ان تمام اقسام پر مشتمل ہے۔

اس پر یہ شبہ نہ ہو کہ حق تعالیٰ تو قرآن کی نسبت یہ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کو آسان کر دیا ہے پھر اس کے اندر امور مخفیہ و غامضہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ آسان کرنے سے یہ مراد ہے کہ ہر حصہ سہل ہو۔ جو جزو سہل ہے اس کو خود بیان فرما دیا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَلَقَدْ يَسْرُنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ، کہ ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان کر دیا ہے۔
 للذکر کو جو بڑھایا تو اسی وجہ سے کہ یہ صرف نصیحت حاصل کرنے کے اعتبار سے سہل
 ہے۔ اگر مطلقاً سہل ہوتا تو صرف ولقد یسرنا القرآن فرماتے للذکر کی قید نہ بڑھاتے۔

اقسام کلام الہی

خوب سمجھ لیجئے کہ کلام اللہ میں دو قسم کے مضمون ہیں۔ ایک تو مضمون ہے تذکیر کا۔ قرآن کے
 جتنے حصہ میں یہ مضمون ہے وہ تو نہایت آسان ہے کسی کو بھی اس کے سمجھنے میں دقت نہیں۔ ہر شخص سمجھ
 سکتا ہے۔ چنانچہ ولقد یسرنا القرآن للذکر (اور ہم نے قرآن کو نصیحت کیلئے آسان کر دیا
 ہے) اس بات کو صاف طور پر بتلایا جا رہا ہے کہ وہ حصہ قرآن کا اتنا سہل کیا گیا ہے کہ ہر شخص اس سے
 واقفیت حاصل کر سکتا ہے اور واقعی وہ حصہ ہے بھی ایسا ہی کہ کسی کو بھی اس کے سمجھنے میں کسی قسم کی دقت
 نہیں ہوتی مثلاً قیامت کا ہونا، عذاب، ثواب کا پایا جانا، جنت و دوزخ کا موجود ہونا۔ اسی طرح
 اور عقائد ہیں کہ ان کو ایسی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے بتلایئے تو کہ ان
 امور کے سمجھنے میں کسی کو کیا دقت ہے اور انہی کا سمجھنا منکر کو دلائل عقلیہ سے ضروری بھی ہے۔

رہے باقی احکام ان کا ایسے دلائل سے سمجھنا ضروری نہیں ہے۔ اسی وجہ سے دین کے دو جز و قرار
 دیئے جاتے ہیں۔ ایک اصول ایک فروع۔ اصول تو وہی ہیں جن کا سمجھنا ضروری ہے۔ پس وہ ایسے
 سہل کئے جائیں کہ کسی کو بھی ان کے سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ فروع جن کا دلائل سے سمجھنا ضروری نہیں۔
 ایک تو قرآن میں یہ مضمون ہے اور دوسرا مضمون ہے احکام غامضہ کا جس میں اجتہاد کی ضرورت ہے۔

قوت استنباطیہ

ہر شخص کا فہم اس کے لئے کافی نہیں۔ اس کیلئے خاص فہم کی حاجت ہے۔ قرآن کے جتنے
 حصوں میں یہ مضمون ہے وہ مشکل ہے اور احکام غامضہ کا سمجھنا اور ان میں استنباط کرنا تو کیسے مشکل
 نہ ہوتا جبکہ معمولی خبروں تک کا سمجھنا دشوار ہے۔

چنانچہ کلام اللہ میں حق تعالیٰ نے منافقین کی شکایت فرمائی ہے اس بناء پر کہ وہ لوگ امن
 و خوف کی خبریں سن کر مشہور کر دیتے تھے اور رسول اور اولی الامر کے حوالے ان کو نہیں کرتے تھے
 چنانچہ ارشاد ہے:

وذا جاءهم امر من الامن او الخوف اذا عوابه ولو ردوه الى الرسول
والى اولى الامر منهم لعلمه الذين يستنبطونه منهم.

کہ جب ان کے پاس کوئی خبر امن کی یا ڈر کی پہنچتی ہے تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں اور اگر اس
کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے اہل حکومت کے حوالے کرتے تو اہل تحقیق ان میں سے اس کی
تحقیق کر لیتے (کہ یہ خبر قابل اشاعت ہے یا نہیں)

سو منافقین کی یہ کیفیت تھی کہ جیسی خبر ان کو پہنچتی مشہور کر دیتے۔ یہ نہ خیال کرتے کہ کون سی
خبر عوام میں شائع کرنے کے قابل ہے اور کون سی نہیں۔ سب خبروں کو یکساں شائع کر دیتے حق تعالیٰ
اس بات پر ان کی اس آیت میں شکایت فرماتے ہیں۔ اذا جاءهم امر من الامن او الخوف
اذا عوبہ۔ (جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر پہنچتی ہے اس کو مشہور کر دیتے ہیں) آگے ان
کو مشورہ دیتے ہیں ولو ردوه الى الرسول والى اولى الامر منهم لعلمه الذين
يستنبطونه منهم، کہ ان کو یوں چاہیے تھا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل الامر (یعنی جن کے
ہاتھ میں حکومت کی باگ ہے اور وہ صاحب اختیار اور تجربہ کار ہیں ان) کے حوالے کر دیتے۔
پس جن میں قوت استنباطیہ ہے وہ ان خبروں میں استنباط کرتے کہ آیا یہ قابل اشاعت ہیں یا نہیں
اور پھر یہ منافقین ان کی رائے کے موافق عمل کرتے۔

پس جب معمولی خبروں میں قوت استنباطیہ کی ضرورت ہے اور ہر شخص اس کا اہل نہیں بلکہ
اہل استنباط کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے تو جو احکام غامض اور دقیق ہیں۔ ان میں کیسے
ہو سکتا ہے کہ ہر شخص ان کو سمجھ لے اور اہل استنباط کی طرف رجوع کرنے کی اس کو ضرورت نہ ہو۔
یہی وجہ ہے کہ احکام کے سمجھنے اور اس کے اندر استنباط کرنے کو عام طور سے جائز نہیں قرار دیا گیا کہ
ہر شخص اس کو کرے۔ پس یہ حصہ قرآن شریف کا غامض ہے اور دوسرا جو تذکیر کا حصہ ہے جس میں
ترغیب ترہیب اور عقائد کا بیان ہے اس میں کچھ خفاء نہیں ہر شخص اس کو سمجھ سکتا ہے۔

قلبی توجہ کی ضرورت

اسی طرح احکام بھی درجہ اجمال میں آسان ہیں۔ لیکن درجہ تفصیل میں دشوار ہیں۔ دیکھئے
ایک تو کلام اللہ میں یہ ہے کہ نماز پڑھو۔ اس کے سمجھنے میں تو کچھ خفاء نہیں۔ یہ تو اجمالی درجہ ہے

اور ایک نماز کی تفصیل ہے کہ لاحق کے کیا احکام ہیں مسبوق کا کیا حکم ہے علیٰ ہذا۔ تو اس میں اجتہاد کی ضرورت ہے۔ اس کا سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں۔ اس کے سمجھنے کے لئے خاص فہم کی حاجت ہے۔ یہ تو معلوم ہو گیا کہ قرآن شریف میں ذکر کا حصہ نہایت آسان ہے مگر اس کے نافع ہونے کے لئے ایک چیز کی اور ضرورت ہے۔ وہ کیا ہے، توجہ۔ جب تک توجہ نہ ہو اس وقت تک اس کا کوئی نفع نہیں ہو سکتا گو وہ کتنا ہی آسان ہو اگر کوئی شخص بغیر توجہ کے ان آیات کا ترجمہ دیکھے تو وہ کچھ بھی نہ سمجھے گا بلکہ توجہ کے بغیر تو اپنی بول چال بھی نہیں سمجھتے۔

مثلاً بازار جائے وہاں صد ہا حکایات کان میں پڑتی ہیں جب لوٹ کر آتے ہیں تو خبر بھی نہیں رہتی کہ کیا سنا تھا۔ حتیٰ کہ وہ حکایات سوچنے سے بھی یاد نہیں آتیں۔ وجہ یہی ہے کہ ادھر توجہ نہیں۔ اس لئے اگر کوئی ترجمہ جانتا ہو مگر التفات نہ ہو تو قرآن شریف کے حصہ ذکر سے بھی پورا نفع حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے حق تعالیٰ کسی جگہ توارشاد فرماتے ہیں۔ لیذبوا ایاتہ کہ اس کی آیات میں تدبیر کریں۔ اور کسی جگہ فرماتے ہیں لیتذکر اولوا الالباب کہ عقل والے نصیحت حاصل کریں۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ باوجود آسان ہونے کے تدبیر کی حاجت ہے۔ اس کا نفع بدون اس کے پورا حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ میں نے اس کو مثال سے واضح کر دیا۔ قرآن شریف کے اندر ایک موقع پر اسی کو تصریح فرمایا ہے۔ وہ یہ ہے:

ان فی ذلک لذکر لمن کان لہ قلب او القی السمع وهو شہید
کہ اس میں نصیحت ہے اس شخص کے لئے جو (فہیم) دل رکھتا ہے یا (اگر زیادہ فہیم نہ ہو) تو متوجہ ہو کر کان (ہی) لگا دیتا ہو۔

یہ آیت بتلا رہی ہے کہ یہ نفع کا موقوف علیہ ہے کہ قلب فہیم سے کام لے یا متوجہ ہو کر سننے کے بدون اس کے نفع نہیں ہوتا۔ پس معلوم ہو گیا کہ قرآن کا وہ حصہ مشکل ہے جس میں ان احکام کا بیان ہے جن کے اندر اجتہاد کی ضرورت ہے۔

آج کل کے مجتہد

بعض مدعی اجتہاد اس زمانہ میں ایسے ہیں کہ صرف ترجمہ دیکھ کر اجتہاد کرتے ہیں اجتہاد کیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تحریف کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے سنا ہے کہ ایک شخص نے یہ رائے دی تھی کہ اب وضو کی ضرورت نہیں۔ اس وجہ سے کہ وضو سے مقصود تطہیر اعضا ہے اور ہم لوگ اس زمانہ

میں ویسے ہی صاف ستھرے رہتے ہیں۔ اس لئے اب کیا ضرورت ہے وضو کی۔ پہلے زمانہ میں گرد و غبار پڑتا رہتا تھا۔ میلے کپلے رہتے تھے اس لئے وضو کی ضرورت تھی۔ اب ہم آئینوں کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ گرد و غبار پاس کو بھی نہیں آتا۔ تو اب وضو کی کیا ضرورت ہے۔ یہ ان صاحب نے اجتہاد کیا۔ یا تو اس قدر اجتہاد کا زعم اور یا اس طرف التفات بھی نہیں۔

چنانچہ مولوی محمد حسین صاحب ایک بیرسٹر کا قصہ سناتے تھے کہ اس نے ان سے یہ کہا کہ علماء کو چاہیے کہ جمع ہو کر سود کی حلت کا فتویٰ دے دیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ علماء کے گھر کی بات تھوڑا ہی ہے کہ جیسے چاہیں پھیر لیں۔ سود کی حرمت تو کلام اللہ میں منصوص ہے۔ کلام اللہ کے خلاف کون جرأت کر سکتا ہے اس پر آپ حیرت سے پوچھتے ہیں کہ کیا سود کی حرمت قرآن شریف میں ہے ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ مولویوں کی گھڑی ہوئی باتیں ہیں۔

دیکھئے یہ حال ہے ان لوگوں کی اجنبیت کا قرآن سے کہ اعلیٰ درجہ کی لیاقت کے بیرسٹر تھے اور مولوی بھی کہلاتے تھے مگر اتنی خبر نہ تھی کہ یہ قرآن کا مسئلہ ہے لیکن چونکہ مسلمان تھے اس وجہ سے معلوم ہونے کے بعد اپنے منہ پر طمانچہ مارے اور بہت نادم ہوئے۔ سو آج کل کے عقلاء دعویٰ تو اجتہاد کا کرتے ہیں مگر ان کی اجنبیت کا قرآن سے یہ حال ہے۔

ایک اور قصہ ہے کسی معقولی کا کہ ان سے ایک دفعہ لوگوں نے کہا کہ کچھ بیان کیجئے۔ آپ نے نماز کا بیان شروع کیا۔ کچھ یاد تھا نہیں۔ بہت سوچ کر آپ نے فرمایا کہ آج کل لوگوں کا کیا حال ہو گیا ہے کہ نماز نہیں پڑھتے حالانکہ قرآن شریف میں ہے من ترک الصلوۃ متعمدا فقد کفر۔ اس پر کسی نے ان حضرت کو ملامت کی کہ آپ نے اسے (یعنی حدیث شریف کو) قرآن شریف میں کیسے بتلا دیا۔ تو آپ تعجب سے فرماتے ہیں کہ کیا یہ قرآن کی آیت نہیں ہے۔

یہ حالت رہ گئی ہے اس زمانہ میں۔ یہ بھی خبر نہیں کہ یہ قرآن کی آیت ہے یا حدیث ہے۔ اس حالت پر اندیشہ ہے کہ قیامت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں نہ فرمانے لگیں:

یا رب ان قومی اتخذوا هذا القرآن مہجوراً۔

کہ اے میرے رب میری قوم نے اس قرآن کو ترک کر دیا تھا۔

قرآن نہ پڑھنے کا بہانہ

معنی سے تو غفلت تھی سہی وہ جو بہل چیز ہے (یعنی الفاظ قرآن) اس سے بھی غفلت ہوتی چلی

جاتی ہے۔ چنانچہ آج کل کے بہت سے عقلا کی رائے ہے کہ قرآن شریف کا پڑھنا ہی فضول ہے۔
 رام پور کا قصہ ہے ایک صاحب کا بچہ قرآن پڑھتا تھا۔ ان کے ایک دوست نے جو انگریزی
 کے بہت حامی تھے کہا کہ آپ اس لڑکے کو انگریزی پڑھائیے۔ ان کے دوست نے اس پر انکار نہیں کیا
 بلکہ یوں کہا کہ یہ قرآن پڑھ رہا ہے۔ آدھا تو ہو چکا ہے آدھا اور رہا ہے۔ وہ ختم ہو جاوے تو انگریزی
 شروع کراؤں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ آدھا کتنے دنوں میں پڑھا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ دو برس میں
 ۔ تو آپ کہتے ہیں کہ دو برس تو ضائع کر ہی چکے۔ اب اور دو برس کیوں ضائع کرتے ہو۔

ان عقلاء نے کلام اللہ نہ پڑھانے کا ایک بہانہ نکالا ہے کہ کہتے ہیں، اجی صاحب بدون
 مطلب سمجھے ہوئے پڑھنے سے کیا فائدہ۔ اگر پڑھا جاوے تو معنی مطلب کے ساتھ پڑھا
 جاوے۔ صرف الفاظ رٹنے سے کیا نتیجہ۔ اپنے نزدیک بڑی خیر خواہی کی ہے مگر غور سے دیکھا
 جائے تو یہ صرف نہ پڑھانے کا بہانہ ہے۔ مقصود تو ہے نہ پڑھانا اور اس کا بہانہ یہ تلاش کیا۔
 اگر بہانہ نہیں تو ترجمے تو شائع ہو گئے ہیں پھر ترجمہ سمیت کیوں نہیں پڑھاتے۔ ہاں اس وقت
 بہانہ نہ سمجھا جاتا جب کہ یہ لوگ ویسے تو نہ پڑھاتے مگر ترجمہ کے ساتھ پڑھاتے لیکن دیکھا جاتا
 ہے کہ یہ حضرات نہ ویسے پڑھاتے ہیں نہ ترجمہ سے پڑھاتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے
 کہ بس نہ پڑھانا ہی مقصود ہے۔ اور یہ صرف بہانہ ہے نہ پڑھانے کا۔

ترجمہ پڑھنے کا اصول

ہاں ترجمہ کی نسبت میں یہ ضرور کہوں گا کہ اگر ترجمہ پڑھایا جاوے تو خود مطالعہ کرنے کی
 اجازت نہ دی جاوے بلکہ کسی واقف کار سے سبقاً سبقاً پڑھا جاوے اور جو مضامین دقیق ہوں ان
 کے اجمال پر اکتفا کیا جاوے۔ معلم بھی ان کی تفصیل نہ بیان کریں بلکہ اجمال کے ساتھ ان
 کا مطلب بیان کر دیں۔ تفصیل کی کاوش نہ کریں۔ جتنی بات سمجھ میں آسکتی ہے اس کے بتلانے
 پر اکتفا کریں اور خود مطالعہ کر کے امتحان دے دیا کرو۔ استاد سے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔
 اگر کہا جاوے کہ اقلیدس پیچیدہ ہے۔ اس لئے استاد سے پڑھنے کی ضرورت ہے اور قرآن شریف
 ایسا نہیں۔ تو میں کہتا ہوں کہ قانون بھی تو ایسا پیچیدہ نہیں ہے۔ قانون ہی کی کتاب لیجئے اور خود اس
 کا مطالعہ کیجئے ضرور آپ اس کے سمجھنے میں غلطی کریں گے اور جو استاد سے پڑھے ہوں وہ غلطی نہ

کریں گے۔ قانون دان ہی جانتا ہے قانون کی باتوں کو۔

قانون کتاب کی ایک خاصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ایک امر کے متعلق ایک جگہ اجمالی ہوتا ہے دوسری جگہ اس کی تفصیل ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن شریف میں بھی ایسا واقع ہوا ہے کہ ایک حکم کو دو مقام سے تعلق ہے۔ ایک موقع میں تو اس کو اجمالاً بیان کیا ہے اور دوسری جگہ اس کی تفصیل کر دی ہے جب تک تفصیل کے موقع کو سمجھ ہوئے نہ ہوگا تو یہاں کیا سمجھے گا اور کہیں ایسا ہے کہ کچھ تفصیل اس موقع پر ہے اور کچھ دوسرے موقع پر۔ پس اس کے سمجھنے کی کیا ضرورت ہے کہ دونوں موقعوں کا علم ہو اور یہ بات واقف کار ہی جان سکتا ہے کہ اس کا ذکر کتنی جگہ ہوا ہے۔ خود مطالعہ کرنے والا کیا جانے گا۔ بس یہ ہوگا کہ ایک موقع میں مجمل دیکھ کر اس کو الجھن پیدا ہوگی اور شکوک واقع ہوں گے اور یہ کچھ کلام اللہ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہر فن میں یہی ہے۔

مثلاً فقہ ہی ہے۔ اس میں ایک مسئلہ ہے جس کا تعلق دو باب سے ہے۔ ایک باب میں مجمل ہے اور ایک باب میں مفصل ہے۔ تو جب تک دونوں موقعوں سے واقفیت نہ ہوگی تو کیا خود سمجھ سکے گا اور کیا دوسروں کو سمجھا سکے گا۔

ایک شافعی المذہب نے مجھ سے فقہ شافعی پڑھنا چاہا تو میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں نے فقہ شافعی پڑھا ہی نہیں۔ شاید کوئی موقع ایسا ہو کہ ایک مسئلہ کا تعلق دو جگہ سے ہو اور ایک موقع پر اجمال ہو اور دوسری جگہ اس کی تفصیل ہو اور میں اس تفصیل سے واقف ہوں نہیں۔ پس میں غلطی کر بیٹھوں۔ اس لئے میں نے صاف کہہ دیا کہ آپ شافعی المذہب سے پڑھئے۔ پس یہ وجوہات ہیں جن کی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ قرآن شریف کا ترجمہ خود دیکھ لینا کافی نہیں ہے۔ کسی محقق عالم سے پڑھ لینا چاہیے۔ لیکن اس کے لئے اگر فرصت نہ ہو تو یہ تو نہ ہو کہ الفاظ کو بھی بے فائدہ سمجھ کر چھوڑ دیا جائے کیونکہ فائدہ قرآن شریف کا معانی کے ساتھ تو خاص نہیں۔ فائدہ کے اوراق سام بھی ہیں۔ ایک قسم کے انتفاء سے مقسم کا انتفاء تو نہیں ہوتا (مطلب یہ ہے کہ معنی سمجھنے کا فائدہ ہے۔ نہ رے الفاظ میں اس کے جاتے رہنے سے الفاظ قرآن کا دوسرا فائدہ تو مثلاً ثواب کہیں نہیں جاتا رہا)۔

ہم کو معلوم ہے کہ بعض انگریزی خواں اقلیدس کی عبارت یاد کر کے امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ مطلب کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ بتلائیے کہ اس صورت میں اقلیدس کے محض الفاظ یاد کرنے مفید ہوئے یا عبث ہوئے۔ ہر شخص اس کو مفید ہی کہے گا۔

فائدہ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ پاس ہو جائے خواہ مطلب کچھ بھی نہ سمجھے اور یہ نفع صرف الفاظ یاد کرنے سے بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ قرآن شریف کے ساتھ ہمارا یہ برتاؤ نہیں۔ اس کے الفاظ کا یاد کرنا محض بیکار سمجھتے ہیں۔

تلاوت کے فوائد

اب قرآن شریف کے الفاظ پر جو ثمرہ مرتب ہوتا ہے اس کو بتلاتا ہوں۔ حدیث شریف میں ہے کہ قرآن شریف جب کوئی پڑھتا ہے تو ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں تو جس نے کھلی عصا ایک مرتبہ کہا تو اس کے نامہ اعمال میں پچاس نیکیاں لکھی گئیں۔ تو کیا یہ فائدہ نہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ لوگ نفع کو منحصر سمجھتے ہیں نفع عاجلہ میں۔ جب اسے نہیں دیکھتے تو کہہ دیتے ہیں کہ اس میں کچھ نفع نہیں۔ حالانکہ نفع اس میں منحصر نہیں۔ ایک اور نفع بھی ہے جس کو نفع آجلہ کہتے ہیں یعنی آخرت کا نفع جس کو ثواب کہتے ہیں۔ مگر چونکہ نفع عاجلہ عاجلہ مشاہد ہے کہ وہ آنکھوں سے نظر آتا ہے اس لئے اس کو تو نفع سمجھتے ہیں اور ثواب ملنا مشاہد نہیں اس لئے اس کو تو نفع نہیں خیال کرتے۔

چنانچہ بعض خواص تک کی زبان پر یہ آ جاتا ہے جب کہ وہ کسی کو ذکر و شغل کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ میاں کام کرتے ہوئے تمہیں اتنے دن ہو گئے کچھ نفع بھی ہوا کچھ معلوم بھی ہونے لگا۔ یعنی کچھ نظر بھی آتا ہے۔ اگر وہ کہتا ہے کہ معلوم تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تو کہتے ہیں کہ بس میاں ثواب اکٹھا کئے جاؤ۔ گویا ان کے نزدیک ثواب ایسی بے قدر چیز ہوئی۔ یہ کس قدر افسوسناک بات ہے۔ سو یہ ثواب نرے الفاظ میں بھی ہے۔ سو کیا ثواب نفع نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو الفاظ قرآن کو پڑھنا فضول سمجھتے ہیں۔

اہل علم میں ایک کمی

اب ایک وہ ہیں جو الفاظ قرآن کو تو پڑھتے ہی ہیں اس کے ساتھ معانی کو بھی پڑھتے ہیں۔ ترجمہ بھی جانتے ہیں اور اہل علم بھی ہیں مگر ان میں ایک اور بات کی کمی ہے۔ وہ یہ کہ تدبیر نہیں کرتے۔ لفظی تحقیق تو بڑی لمبی چوڑی کریں گے۔ مثلاً قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَوَكَّلَ (بامراد ہوا جو شخص) (خبائث عقاید و اخلاق سے) پاک ہو گیا) میں قد حرف تحقیق ہے اور افلح ماضی کا صیغہ ہے اور من اسم موصول اپنے صلہ سے مل کر فاعل ہے۔ یہ ساری لمبی چوڑی تحقیق کر لیں گے مگر حق تعالیٰ

کا مقصود اس سے کیا ہے اس کی طرف التفات بھی نہیں۔ قرآن شریف کو اس نظر سے دیکھتے ہی نہیں کہ یہ ہماری اصلاح کا کفیل ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی نے حکیم محمود خاں سے نسخہ لکھوایا اور اس کو اس نظر سے دیکھنے لگا کہ اس نسخہ کا خط کیسا ہے، دائرے کیسے ہیں۔ اس نظر سے نہیں دیکھا کہ اجزاء کیسے ہیں۔ مزاج کی کیسی رعایت کی ہے۔ صرف یہ دیکھا کہ خوشخط ہے، دائرے خوب بنائے ہیں۔ اور اس پر کہنے لگا کہ محمود خان بڑے طبیب ہیں، ان کے دائرے کیسے عمدہ ہیں اس سے معلوم ہوگا کہ یہ شخص نسخہ کی حقیقت ہی نہیں سمجھا۔ نسخہ کی حقیقت تو یہ ہے کہ مرض کے موافق ہو۔ اس سے اصلاح ہوتی ہو۔ نسخہ کو اس نظر سے دیکھنا چاہیے۔

اسی طرح اہل علم قرآن کے الفاظ کی تو خوب تحقیق کرتے ہیں مگر اس کا خیال نہیں کرتے کہ حق تعالیٰ کا اس سے مقصود کیا ہے یہ نہیں دیکھتے کہ اس کے اندر ہمارے امراض باطن کے کیسے علاج کئے گئے ہیں اور ہم کو اس سے نفع حاصل کرنا چاہیے۔

دنیا و آخرت کی مثال

اس وجہ سے میں اس طرف متوجہ کرتا ہوں کہ اس آیت کے اختصار الفاظ کی طرف نظر نہ کرنی چاہیے۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ نے اس کے اندر کیا بات بتلائی ہے جس کا مختصر بیان یہ ہے کہ اس موقع پر حق تعالیٰ نے اصلی مطلوب کو بتلایا ہے کہ تمام مطالب اسی کے اندر منحصر ہیں۔ وہ مطلوب کیا ہے فلاح اور فلاح کا طریقہ بھی ارشاد فرمایا ہے۔ افلح میں تو مطلوب کو بتادیا کہ ہر ایک شخص کو فلاح مطلوب ہونی چاہیے اور من تزکی میں طریقہ ارشاد فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ فلاح تو مطلوب ہے اور اس کا طریقہ ہے تزکیہ۔ پس جس کو فلاح کامل میسر ہوگئی تو اس سے بڑھکر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

اب بیان اس کا ہونا چاہیے کہ فلاح کامل کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اور اس کے بیان کی اس لئے ضرورت ہے کہ بعض آدمی ایسی باتیں کیا کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک فلاح کامل کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ بعض لوگ نصیحت کرنے پر کہا کرتے ہیں کہ بس جی جنت میں پہلے تم ہی چلے جانا ہم دوزخ کی سزا بھگتنے کے بعد ہی چلے جائیں گے۔ سو ان کا مطلب کیا ہے کہ فلاح کامل کی ضرورت نہیں۔ اب میں اس کا فیصلہ کہ فلاح کامل کی ضرورت ہے یا نہیں دنیا کے

واقعات سے بتلائے دیتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جسے دنیوی امور میں فلاح کامل مقصود نہیں ہے حالانکہ دنیا کوئی چیز نہیں ہے آخرت کے مقابلے میں۔

دنیا اور آخرت کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی سمندر میں انگلی ڈبوئے۔ سو جیسی اس کو سمندر سے نسبت ہے ایسی ہی دنیا کو آخرت کے ساتھ ہے بلکہ حقیقت میں اتنی نسبت بھی نہیں۔ محض تقریب الی الفہم کی غرض سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مثال دی ہے دنیا کو آخرت سے اس سے بھی زیادہ بعید نسبت ہے۔ کیونکہ دنیا محدود ہے اور آخرت غیر محدود اور محدود کو غیر محدود سے نسبت ہی کیا ہو سکتی ہے اور اس مثال میں نسبت محدود کی محدود کے ساتھ ہے (انگلی کی تری بھی محدود اور سمندر بھی محدود ہے)۔ سود محدود شے کے اندر وہ تفاوت نہیں ہو سکتا جو کہ محدود اور غیر محدود کے اندر ہوتا ہے۔ پس یہ حقیقی مثال نہ ہوئی۔ مگر چونکہ اور کوئی مثال لوگوں کے فہم سے قریب نہ تھی اس لئے اس پر اکتفا فرمایا۔ سود دنیا آخرت کے مقابلہ میں یہ نسبت رکھتی ہے۔

توکل کی صورت

مگر پھر بھی ہم دنیا کے مقاصد میں لوگوں کی حالت دیکھتے ہیں کہ کبھی ان کو ایک حالت پر قناعت نہیں ہوتی جب تک درجہ کمال حاصل نہ کر لیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر چاہتے ہیں۔ چنانچہ رات دن لوگوں کا اس پر عمل ہو رہا ہے۔ پس جب دنیا کے مقاصد میں ہمارا یہ برتاؤ ہے باوجود اس کی حقارت کے تو آخرت کے مقاصد میں ہمارا کیا برتاؤ ہونا چاہیے۔ جو آخرت کے ساتھ ہمیں معاملہ کرنا چاہیے تھا وہ معاملہ دنیا کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ دنیا میں تو جو درجہ بھی کمال کا حاصل ہو اس سے اور آگے قدم بڑھانا چاہیں گے اور آخرت کے بارہ میں یہ معاملہ نہیں۔ بس اصل مذاق تو ہر شخص کا یہی ہے کہ جو شے اس کو محبوب ہوتی ہے اس کا اعلیٰ درجہ اس کو مقصود ہوتا ہے اور جو شے مقصود ہوتی ہے اس کی تحصیل میں پوری کوشش کرتا ہے۔ پس جب آخرت کے ساتھ یہ معاملہ ہے تو پھر کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آخرت کی فلاح کامل درجہ پر مقصود ہے۔ کوئی شخص ایک شے کو حاصل کرنا چاہتا ہو مگر اس کے طرق سے گھبرائے تو اس کو اس شے کا طالب تھوڑا ہی کہیں گے۔

جیسے کوئی شخص کھیتی کرنا چاہے مگر نہ تو بیج ڈالے نہ پانی دے نہ اور شرائط کو پوری کرے بس اللہ کے فضل پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائے تو اس کو کھیتی کا طالب نہیں کہہ سکتے۔ رجاوہ ہے کہ اسباب جمع

کر کے امیدوار رہے۔

اس سے بھی ایک اور موٹی مثال ہے۔ ایک شخص اولاد کا طالب ہے اور چاہتا ہے کہ صاحب اولاد ہو۔ سو ظاہر ہے کہ طریقہ اس کا یہی ہے کہ نکاح کرے اگر بیمار ہو تو علاج بھی کرے اور پھر اولاد کا امیدوار بنے۔ یہ تو ہے رجا اور ایک شخص ہے کہ یہ تو چاہتا ہے کہ اولاد ہو مگر نکاح نہیں کرتا۔ بزرگوں کے پاس جاتا ہے کہ اولاد ہونے کی دعا کر دیجئے۔ وہ جواب یہ دیتے ہیں کہ اول نکاح کرو۔ خدا کرے گا اولاد بھی ہوگی۔ تو وہ کہتا ہے کہ اولاد تو چاہتا ہوں مگر نکاح کا بکھیڑا مجھ سے نہیں کیا جاتا تو اس کو یوں جواب دیا جائے گا کہ عادتہ اللہ اسی طرح جاری ہے کہ اسباب کے جمع کرنے پر ثمرہ مرتب ہوتا ہے۔ اب وہ نظیر دیتا ہے کہ حوا علیہا السلام ویسے ہی پیدا ہوئی تھیں میں بھی چاہتا ہوں کہ اسی طرح اولاد ہو جائے یا کوئی عورت تمنا کرے کہ میرے اولاد پیدا ہو اور نکاح نہیں کرتی اور چاہتی ہے کہ بلا نکاح ہی ہو جائے اور کہتی ہے کہ عیسیٰؑ بلا باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ پس ضرورت کیا ہے نکاح کی تو ایسے شخصوں کو طالب نہیں کہہ سکتے۔

بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ عادتہ مستمرہ کے موافق کام کرتے ہیں اور احیاناً اس کے خلاف بھی قدرت ظاہر کرنے کے لئے دکھا دیتے ہیں۔ اگر وہ کہے کہ حق تعالیٰ قادر تو ہیں کہ بلا نکاح کے اولاد دے دیں۔ تو اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ بیشک وہ قادر ہیں کہ بلا اسباب کے پیدا کر دیں مگر آپ کو انہوں نے اجازت نہیں دی ایسے اسباب کے ترک کرنے کی۔

خلاصہ یہ کہ جو شخص نکاح تو نہ کرے اور اولاد کا خواہشمند ہو وہ اولاد کا طالب نہیں۔ اسی طرح جو شخص فلاح کامل کے اسباب اختیار نہ کرے وہ فلاح کامل کا طالب نہیں اور اس کو توکل کا دعویٰ کر کے اس سے اسباب کو ترک کرنا جائز نہیں۔

توکل اور کارِ عقبیٰ

جو لوگ توکل توکل کا سبق ورد زبان رکھتے ہیں ان صاحبوں نے آخرت ہی کے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے۔ دنیوی اسباب جمع کرنے میں توکل نہیں کرتے۔ اس میں تو بڑے چست و چالاک ہیں۔ ان کے جمع کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ باوجودیکہ حق تعالیٰ نے روزی کی ذمہ داری بھی کر لی ہے چنانچہ ارشاد فرمایا:

وما من دابة فی الارض الا علی اللہ رزقھا۔ (کہ زمین پر کوئی چلنے والا نہیں مگر اللہ پر

اس کا رزق ہے) اور اس میں کوئی قید طلب وغیرہ کی نہیں لگائی اور جہاں آخرت کا ذکر کیا ہے وہاں مقید کیا ہے سعی کے ساتھ۔ چنانچہ ارشاد فرمایا ہے:

ومن اراد الآخرة وسعى لها سعيها

کہ جس نے آخرت کا ارادہ کیا اور اس کے لئے سعی کی۔ یعنی ہم ذمہ داری نہیں کرتے۔ سن لو جو نیک عمل کرے گا جنت میں جائے گا۔

تعب ہے کہ جس میں ذمہ داری کی ہے اس میں توکل کو عیب سمجھتے ہیں اور جس کی ذمہ داری نہیں کی اس میں توکل اختیار کرتے ہیں۔

بس جی جو بات جس طرح اپنی سمجھ میں آئی اس طرح کر لی۔ انبیاء علیہم السلام بھی صرف امور دنیوی میں سے اسباب ظنیہ کو ترک کر دیتے ہیں۔ اسباب قطعہ کو وہ بھی ترک نہیں کرتے۔ کھانے کو ترک نہیں کرتے کیونکہ وہ تو اسباب قطعہ سے ہے ہاں انہوں نے تدابیر معاش کو چھوڑ دیا کیونکہ وہ اسباب ظنیہ سے ہے مولانا فرماتے ہیں۔

انبیاء در کار دنیا جبری اند کافراں در کار عقبی جبری اند

انبیاء را کار عقبی اختیار کافراں را کار دنیا اختیار

انبیاء تو جبری اس معنی کو ہیں کہ امور دنیویہ کے بارے میں حس و حرکت نہیں کرتے ان کو چھوڑ دیتے ہیں اور کافر کا عقبی میں جبری ہیں کہ اس کے اندر حس و حرکت نہیں کرتے ان کو ترک کئے ہوئے ہیں۔ انبیاء کا عقبی کو اختیار کئے ہوئے ہیں ان کو نہیں چھوڑتے اور کافر کا دنیا کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ سو انبیاء کے جبری ہونے کے یہ معنی ہیں۔ جب انبیاء کی یہ حالت ہے کہ وہ اسباب قطعہ کو ترک نہیں کرتے گو دنیوی ہی ہوں اور اخروی گو بدرجہ اولیٰ، تو اور لوگوں سے بڑی حیرت ہے کہ انہوں نے آخرت کے بارے میں توکل کیسے اختیار کر رکھا ہے کہ اُس کی تحصیل میں حرکت ہی نہیں کرتے۔ مانا کہ اہل توکل تو یہ بھی ہیں مگر ایسی چیز میں توکل اختیار کیا ہے کہ اس میں توکل درست نہیں۔

قلب و اعمال کا تعلق

بہر حال اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر اسباب فلاح آخرت کو بیان کیا ہے بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ مطلق فلاح کے اسباب بیان کئے ہیں۔ (صرف آخرت ہی کے نہیں) کیونکہ فلاح

کے اندر کوئی قید نہیں لگائی پس وہ عام ہوگی فلاح دنیوی کو بھی۔ اور فلاح کو ذکر کر کے پھر اس کے طریقے بتلا دیئے ہیں جنکے اختیار کرنے سے اخروی دنیا کی فلاح بھی میسر ہوتی ہے۔ (چنانچہ ختم وعظ کے قریب یہ مضمون مفصلاً مذکور ہے)۔

پس ارشاد ہے قد افلح من تزکی و ذکر اسم ربہ فصلی۔ یہاں تین اعمال بیان کئے ہیں۔ ایک تزکی ایک ذکر اسم ربہ ایک فصلی۔ یہاں پر تزکیہ سے عام بھی مراد لے سکتے ہیں۔ ذمائم باطنی سے بھی تزکیہ ہو اور معاصی جوارح سے بھی مگر دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ذمائم باطنی سے پاکی مراد ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

ونفس وما سواها فالههها فجورها وتقواها قد افلح من زکھا

(اور قسم ہے انسان (جان) کی اور اس ذات کی جس نے اس کو درست بنایا پھر اس کی بدکاری اور پرہیزگاری (دونوں باتوں کا) اس کو القاء کیا یقیناً وہ مراد کو پہنچا جن نے اس (جان) کو پاک کر لیا) زکھا میں مفعول کی ضمیر نفس کی طرف ہے کہ نفس کا تزکیہ کر لیا۔ اس آیت میں تصریح ہے اس بات کی کہ مدار فلاح کا تزکیہ نفس پر ہے اور ظاہر ہے کہ نفس کا تزکیہ اور اس کی پاکی ذمائم باطنی کے ازالہ سے ہوتی ہے۔ کیونکہ نفس بلا واسطہ انہیں کے ساتھ متصف ہے نہ کہ اعمال جوارح کے ساتھ۔ پس اس کا تزکیہ بھی انہی ذمائم سے ہوگا۔ لہذا اولیٰ یہ ہے کہ یہاں بھی ذمائم باطنی ہی سے تزکیہ مراد ہو۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ظاہری اعمال کی ضرورت نہیں جیسا کہ بعض لوگ آج کل کہتے ہیں۔ سو تزکیہ باطن کا حکم دینے سے حق تعالیٰ کا یہ مقصود نہیں کہ تزکیہ ظاہر ضروری ہیں۔ اگر یہ مقصود ہوتا تو آگے و ذکر اسم ربہ فصلی کیوں فرماتے بلکہ مقصود یہ ہے کہ نفس کا پاک کرنا اصل ہے اور ظاہر اس کی فرع ہے۔

اسی طرح ایک موقع پر یز کیہم فرمایا ہے تو اس سے بھی اسی قرینہ سے تزکیہ نفس مراد ہے کیونکہ اصل چیز تو تزکیہ باطن ہی ہے۔ اگر تزکیہ باطن اصل چیز نہ ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حدیث میں یہ کیوں فرماتے۔

التقویٰ ههنا و اشار الی صدرہ۔ کہ تقویٰ یہاں پر ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینہ کی طرف اشارہ فرمایا اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لہ الصحيح لمسلم کتاب البر والصلہ: ۳۲، سنن الترمذی: ۱۹۲۷، مسند احمد: ۲/۲۷۷

الغنی غنی النفس . کہ غنی نفس کا غنا ہے

اس کا یہ مطلب نہیں کہ غنا ظاہری کوئی چیز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اصل غنا تو نفس ہی کا ہے اور جب نفس میں غنا ہوتا ہے تو پھر ویسے ہی افعال صادر ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ مطلب نہیں کہ تقویٰ ظاہری کوئی چیز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تقویٰ کی جڑ تو قلب میں ہے اور جب تقویٰ قلب میں ہوتا ہے تو افعال بھی اچھے ہی صادر ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے کہ اگر تقویٰ قلب میں نہ ہوگا تو اچھے افعال کے صادر ہونے کا تقاضا نہ ہوگا۔

غرض خوب سمجھ لیجئے کہ جب قلب کی اصلاح ہو جاتی ہے تو اعمال بھی درست ہو جاتے ہیں۔ سو اصل قلب ہی کی اصلاح ہوگی مگر اصلاح قلب سے درستی اعمال ہو جانے کا یہ مطلب نہیں کہ بعد اصلاح ہو جانے کے اعمال کے قصد کی بھی ضرورت نہ ہوگی بلکہ معنی یہ ہیں کہ قلب کی اصلاح ہونے پر اعمال کا کرنا سہل ہو جائے گا یعنی قبل اصلاح کے جو اعمال مشکل تھے وہ بعد اصلاح کے آسان ہو جائیں گے۔ مگر قصد کی پھر بھی ضرورت رہے گی۔ اصلاح کا تو بس اتنا ہی اثر ہوتا ہے کہ اصلاح کے قبل بری باتوں کا چھوڑنا باوجود قصد کے بھی نہایت دشوار تھا۔ اصلاح کے بعد آسان ہو گیا۔ جو لوگ اصلاح شدہ ہوتے ہیں ان میں اور جو اصلاح شدہ نہیں ہوتے ان میں بس یہی فرق ہے کہ قصد تو سب کو کرنا پڑتا ہے۔

ریاضت نفس

مگر جن لوگوں کی اصلاح ہو چکی ہے ان کا کام تو معمولی قصد اور اشارہ ہی سے چلتا ہے اور جنہوں نے اپنی اصلاح نہیں کی ہوتی ان کو برے کاموں کے چھوڑنے میں سخت مجاہدہ کرنا پڑتا ہے اور بڑی دشواری پیش آتی ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ مثلاً ایک عورت سامنے کونکلی۔ نفس کا تقاضا ہوا کہ اس کو دیکھ لو اگر قلب کی اصلاح ہو گئی ہے تب بھی نفس کو روکنے کے لیے ارادہ کی تو ضرورت ہوگی مگر تھوڑے قصد سے نفس کو روک سکتے ہیں۔ ذرا سا اشارہ کافی ہے اور اگر اصلاح نہیں ہوئی ہے تو باوجود قصد کرنے کے بھی نفس کے روکنے میں سخت دشواری پیش آئے گی اور جو لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اصلاح ہو جانے کے بعد نفس میں گناہ کا تقاضا ہی نہیں رہتا سو یہ بالکل غلط ہے۔ ہاں وہ تقاضا ضعیف ضرور ہو جاتا ہے کہ اگر دبایا جائے تو نہایت آسانی سے دب جاتا ہے اور جس نے اصلاح

نہیں کی ہوتی اس کو تقاضا نہایت شدید ہوتا ہے اس کے روکنے میں نہایت دشواری پیش آتی ہے۔
اب یہ شبہ جاتا رہا کہ جب تقاضا اصلاح شدہ اور غیر اصلاح شدہ دونوں کو ہوتا ہے پھر دونوں میں
فرق کیا ہوا اور جب دونوں برابر ہیں تو پھر ریاضت کی حاجت کیا ہے سو میں نے دونوں میں فرق بتلادیا۔
ریاضت کردہ کی مثال ایسی ہے جیسے شائستہ گھوڑا اور جس نے مجاہدہ نہیں کیا اس کی مثال ایسی
ہے جیسے شریر گھوڑا۔ سوار اگر ماہر ہو تو شائستہ گھوڑے کو اگر وہ شوخی کرے ذرا سا اشارہ کافی ہو جاتا ہے
بخلاف شریر گھوڑے کے کہ اس کے درست کرنے میں ماہر کو بھی بڑی کلفت پیش آتی ہے شہسوار اپنے
زور سے قابو میں لے آئے وہ اور بات ہے مگر دقت ضرور ہوگی بخلاف شائستہ گھوڑے کے کہ وہ
آسانی سے قابو میں آ جاتا ہے یہ فرق ہے نفس کی ریاضت اور عدم ریاضت میں۔

رہا میلان معاصی کی طرف سو وہ دونوں کو ہوتا ہے۔ ایسا کوئی شخص بھی نہیں کہ اس کو میلان نہ
ہو ہاں قبل ریاضت داعیہ قوی ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا روکنا مشکل ہے اگر طاقت سے باہر نہیں
صرف دشواری ہے اور نفس اس دشواری کو گوارا نہیں کرتا مثلاً نگاہ کا نیچا کرنا کہ یہ طبیعت کو بہت گراں
ہوتا ہے۔ نفس اس گرانی کا تحمل نہیں کرتا پس وہ اس کی طرف نگاہ کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ پھر توبہ
کر لیں گے۔ بخلاف ریاضت کے کہ داعیہ تو ہوتا ہے مگر ہوتا ہے ضعیف۔ اور پھر ریاضت سے
مدافعت کی قوت پیدا ہو جاتی ہے بہت زیادہ۔ اس لئے وہ بہت آسانی سے اس کی مدافعت کر سکتا
ہے کہ داعیہ ضعیف ہے اور قوت دافعہ زبردست ہے۔ بس اس واسطے ریاضت مجاہدہ کرتے ہیں۔
سو تزکیہ نفس کا جو حکم کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اثر ہے کہ اس کی اعانت سے
ظاہر اعمال بھی درست ہو جاتے ہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ نے نفس کے متعلق فرمایا۔ قد افلح من
تزکی۔ (بامراد ہوا جو شخص (خباثت عقائد و اخلاق سے) پاک ہو گیا)

اصلاح ظاہر و باطن

باقی اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ صرف یہی کافی ہے ظاہری اعمال کی ضرورت نہیں جیسا کہ بعض
لوگوں کا عقیدہ ہے کہ فقط قلب کا درست کر لینا کافی ہے۔ یہ لوگ شریعت کو منہدم بلکہ منعدم کرنا چاہتے
ہیں کیونکہ تمام شریعت بھری ہوئی ہے اصلاح ظاہر و باطن سے اور تصوف کی حقیقت بھی یہی ہے کہ
تعمیر الظاہر والباطن (ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح ہو)
اور دونوں ہی کی ضرورت بھی ہے۔ بعض وجوہ سے اصلاح باطن کی اور بعض وجوہ سے

اصلاح ظاہر کی۔ بہر حال صرف اصلاح باطن کافی نہیں کہ ظاہر ترک کر دیا جائے۔ اور باطن ہی پر اکتفا کیا جائے اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ محض باطن مقصود ہے مگر یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ:

الشنی اذا ثبت ثبت بلوازمہ۔ جب کوئی چیز پائی جائے گی تو اپنے لوازم کیساتھ پائی جائیگی یہ قاعدہ مسلمہ ہے۔ مثلاً آفتاب کے لئے دھوپ لازم ہے جب آفتاب نکلے گا تو دھوپ ضرور ہوگی یا تین کے عدد کو فرد ہونا لازم ہے۔ جہاں تین کا عدد صادق آئے گا وہاں فرد بھی صادق آئے گا۔ جب یہ معلوم ہو گیا تو سمجھ لیجئے کہ جس وقت باطن میں کوئی کیفیت ہوتی ہے تو ظاہر میں اس کا ظہور ضروری ہے مثلاً کسی کے دل میں غصہ کی کیفیت ہو تو چہرہ پر اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے کہ چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور رگیں گردن کی پھول جاتی ہیں۔ یا کسی کے دل میں کسی کی محبت ہوتی ہے تو ظاہر میں اضطراب کے آثار پائے جاتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ دل میں تو محبت ہو اور محبوب کی طرف نہ ہاتھ بڑھے نہ اس کی طرف پاؤں چلے۔ ایسا نہ سنا اور نہ دیکھا جب دنیا کی محبت میں یہ حالت ہے جو کہ نہایت ضعیف ہے تو پھر خدا تعالیٰ کی محبت میں جو کہ اقویٰ ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قلب میں تو حق تعالیٰ کی محبت ہو اور زبان پر کلمات مدح کے آتے نہ ہوں اور عجز و نیاز ظاہر نہ ہوتا ہو۔ اگر ایسا ہے کہ ظاہر میں آثار نہیں پائے جاتے تو سمجھا جائے گا کہ اس کو خدا تعالیٰ کی محبت ہی نہیں ہے۔ ورنہ ممکن نہیں کہ قلب میں خدا کی محبت ہو اور اس کے سامنے جھکا نہ جائے اس سے ثابت ہو گیا کہ ظاہر لازم ہے باطن کے لئے۔ پس جب تزکیہ باطن ضروری ہو تو تزکیہ ظاہر بھی بوجہ لازم ہونے کے ضروری ہو۔ لہذا تزکیہ باطن و تزکیہ ظاہر دونوں ضروری ہوئے۔ اور گو ضروری دونوں تھے مگر چونکہ اصل تزکیہ نفس ہی تھا۔ اس لئے قد افلح من تزکی (بامراد ہوا جو شخص) (خباثت عقائد و اخلاق سے) پاک ہو گیا) میں اس کو بیان کیا۔

درستی جوارح و قلب

آگے ہے و ذکر اسم ربہ فصلی۔ (اور اپنے رب کا نام لیتا رہا اور نماز پڑھتا رہا) پہلی آیت میں تو تزکیہ باطن کا ذکر تھا اور اس کے اندر ایک ظاہر۔ اور جو من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن ان دونوں کے تزکیہ کا ذکر ہے۔ وہ اس طرح کہ عمل تین حال سے خالی نہیں۔ یا تو اس کا تعلق باطن سے ہے یا افعال جوارح سے اور یا زبان سے۔ اعمال جوارح تو ظاہر ہیں اور زبان برزخ ہے کہ من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن ہے حساب بھی۔ چنانچہ اگر منہ بند رکھو تب تو زبان باطن میں داخل ہے اور جو منہ

کھول دو تو ظاہر۔ ایک تو یہ وجہ ہے زبان کے من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن ہونے کی۔ اور احکام میں بھی چنانچہ دیکھ لیجئے آب و وہن (تھوک) اگر حلق کے اندر چلا جاوے تو روزہ نہیں ٹوٹتا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باطن ہے اور اگر کوئی چیز چکھ کر تھوک دی جائے تو اس سے بھی روزہ نہیں جاتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ظاہر ہے اور چونکہ زبان برزخ ہے اس لئے جدا گانہ قسم قرار دی گئی۔

پس و ذکر اسم ربہ فصلی (اور اپنے رب کا نام لیتا رہا اور نماز پڑھتا رہا) میں تزکیہ ظاہر اور تزکیہ ماہو بین الظاہر والباطن (یعنی برزخ) دونوں کا ذکر ہو گیا ہے۔ صلی تو ظاہر کے متعلق ہے اور ذکر اسم ربہ۔ زبان کے متعلق جو کہ من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن ہے۔ غرض دونوں قسم کے تزکیہ کا ذکر اس آیت میں آ گیا۔

پس خلاصہ دونوں آیتوں کا یہ ہوا کہ باطن کی بھی اصلاح کرو اور ظاہر کی بھی اصلاح کرو اور ایسی چیز کی بھی اصلاح کرو جو من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن ہے حاصل یہ کہ تین فعل ہیں۔

۱۔ زبان کی درستی ۲۔ جوارح کی درستی ۳۔ قلب کی درستی

پس مطلب یہ ہوا کہ ہر قسم کی درستی کرو اور چونکہ وہ امور جن کی درستی ہونا چاہیے اتنے ہیں کہ ہر وقت زبان سے انکی تفصیل یاد رکھنا مشکل تھا اور بدون استحضار درستی کا اہتمام مشکل۔ اس لئے اس کی سہولت کے لئے بجائے اس ساری فہرست کے ذکر اسم ربہ فصلی (اور اپنے رب کا نام لیتا رہا اور نماز پڑھتا رہا) فرما دیا۔

راز اس کا یہ ہے کہ اس میں ایک ضابطہ بتلاتے ہیں کہ اگر اس کو اختیار کر لو گے تو بآسانی تمام امور کی درستی پر قادر ہو جاؤ گے۔ ان سب کی فہرست یاد رکھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

برائیوں سے بچنے کا طریق

اس کا طریقہ یہ ہے کہ اگر اپنا اصل کام ذکر کو سمجھو گے تو خود بخود سب چیزوں سے رک جاؤ گے۔ غلطی ہماری یہ ہے کہ ہم اصل کام ذکر کو نہیں سمجھتے۔ اسی واسطے برائیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں ورنہ برائیوں میں کبھی مبتلا نہ ہوں۔ مشائخ برائیوں کے چھوڑنے کی تعلیم تفصیلاً بھی کرتے ہیں مگر سب سے اہل یہ طریقہ ہے کہ اپنے لئے ایک اصل کام تجویز کر لے پھر اس میں مشغول ہونے سے خود ہی سب برائیاں چھوٹ جائیں گی۔ وہ اصل کام ذکر ہے۔ تو جو چیزیں اس میں مغل ہوں گی خود بخود ان سے انقباض ہوگا تو بقدر ضرورت ہوگا اور ضرورت اسے کہتے ہیں کہ بدون اس کے ضرر ہونے لگے۔

مثلاً نوکر کو کوئی ایسا کام بتلانا ہے کہ اگر نہ بتلائے گا تو ضرر ہوگا۔ یہ ضرورت ہے پس اس کو تو وہ اختیار کرے گا اور ایک ہے مشغلہ کے طور پر باتیں ہانکنا۔ سو یہ غیر ضروری ہیں جو شخص ذکر کو اصلی کام سمجھے گا وہ کبھی اس میں مشغول نہ ہوگا۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ حصہ لوگوں کے وقت کا ایسے ہی قصوں میں صرف ہوتا ہے۔ چنانچہ مجلسوں میں دوست آشنا بیٹھتے ہیں تو زیادہ وقت کا ہے میں صرف ہوتا ہے۔ صرف اسی میں کہ کہیں کی خبریں بیان کرتے ہیں۔ قصہ قضا یا کا ذکر کرتے ہیں۔ کسی پر اعتراض کرتے ہیں۔ کسی کی برائی کرتے ہیں۔ ان چیزوں کو لوگوں نے اپنا مشغلہ بنا رکھا ہے۔

خاص کر اہل علم جو مبتلا ہوتے ہیں تو وہ اس میں عوام سے بڑھے ہوئے ہیں کیونکہ عوام الناس کو تو خیر بھی نہیں ہوتی کہ یہ معصیت ہے اور انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ معصیت ہے اور پھر کرتے ہیں۔ غرض برا شغل اہل علم کا غیبت ہے اور غیبت بھی کس کی ابرار کی کہ اکثر ان کے یہاں علماء اور صلحاء کی برائیاں ہوتی ہیں۔ ہم لوگوں کی حالت افسوس کے قابل ہے۔ ساری خرابی یہ ہے کہ اس طرف توجہ نہیں کرتے کہ ہمارا اصلی کام کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کیا اچھی تدبیر بتلائی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا ذکر اسم ربہ فصلی کہ ذکر کو اصلی کام سمجھ لو تمام برائیاں چھوٹ جائیں گی۔

اہل علم کی نازک حالت

یہاں ظاہر ایہ مناسب معلوم ہوتا تھا کہ یوں فرماتے ذکر ربہ فصلی لفظ اسم کیوں بڑھایا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر ذکر ربہ فرماتے تو اس میں بعض سالکین کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ خدا کو کیسے یاد کریں کیونکہ یاد کرنا موقوف ہے تصور پر اور تصور بڑا مشکل ہے کیونکہ ان تک ہمارے ذہن کی رسائی کہاں ہو سکتی ہے ان کی تو یہ شان ہے۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم وز ہر چہ گفتہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت وہ پایاں رسید عمر مانچناں در اول وصف تو ماندہ ایم
(اے اللہ آپ ہمارے قیاس و خیال و گمان و وہم سے برتر ہیں۔ اور اس لئے بھی کہ جو کچھ ہم نے پڑھا اور سنا ہے۔ دفتر تمام ہو گیا اور عمر انتہا کو پہنچ گئی ہم ایسے پہلے ہی وصف رہے ہیں)

اور یہ شان ہے۔

در تصور ذات اورا گنج کو ماور آید در تصور مثل او

(اس کے ذات کے تصور میں کہاں گنجائش ہے کہ اس کے مثل کا تصور آ سکے)

اس پر ایک حکایت یاد آئی کہ جب حضرت حاجی صاحب ہجرت کر کے حرم شریف میں پہنچے تو وہاں ایک شیخ مشنوی کا درس دے رہے تھے۔ حضرت بھی شریک درس ہو کر سننے لگے۔ وہ شیخ اس شعر کا مطلب بیان کر رہے تھے مگر ان کے نسخہ میں کج کو تھا۔ جیسا کہ اور نسخہ مطبوعہ ہے۔ اسی کے موافق وہ مطلب بیان کر رہے تھے مگر معنی نہیں بنتے تھے۔ وہ تکلف اس کو بنا رہے تھے۔ حضرت نے اس تقریر پر اعتراض کیا تو وہ خفا ہو گئے اور فرمانے لگے کہ اگر یہ معنی غلط ہیں تو صحیح معنی آپ فرما دیجئے۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھ کو معلوم نہ تھا کہ یہاں یہ قاعدہ ہے کہ پوچھنے والے سے ناخوش ہو جائیں۔ ہمارے یہاں تو یہ قاعدہ ہے کہ اگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ میری سمجھ میں نہیں آیا اور پوچھنے پر برا نہیں مانتے۔ تب انہوں نے کہا کہ اصل بات تو یہی ہے کہ اس کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ حضرت نے فرمایا کہ ہمیں تو اساتذہ سے اسی طرح پہنچا ہے کہ یہ گنج کو ہے۔ بس یہ سن کر وہ پھڑک گئے کہ بیشک اسی طرح ہونا چاہیئے۔

نفس کی شرارت

غرض یہ کہ ذکرِ ربہ فرمانے سے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ ذاتِ حق کا جب تصور نہیں ہو سکتا تو اس کی یاد کیسے ہو سکتی ہے۔ بعض سالکین کو اس قسم کے خطرات پیش آتے ہیں اور یہ سب شیطان کے حیلے بہانے ہیں کہ وہ خدا کی یاد سے روکنا چاہتا ہے۔

مجھے اس پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک شخص میرے پاس کسی بات کے لئے تعویذ لینے آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ دعا کرو میں بھی دعا کروں گا کہنے لگے کہ ہماری زبان اس قابل کہاں ہے۔ میں نے کہا کہ کلمہ بھی پڑھتے ہو یا نہیں۔ آپ کی زبان کلمہ کے قابل تو ہے اور کلماتِ دعائیہ کے قابل نہیں۔ اور میں نے کہا کہ ایمان افضل ہے یا دعا۔ جب ناپاک زبان سے ایمان کا کلمہ پڑھ لیتے ہو تو پھر دعا میں کیوں عذر کرتے ہو۔ کلمہ میں کیوں عذر کیا کہ ہماری زبان اس قابل کہاں ہے۔

بس کچھ بھی نہیں شیطان نے راہ مارا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس آرام چاہتا ہے اور دعا میں ہے کلفت۔ اس لئے صرف تعویذ تو طلب کرتے ہیں کہ ایک بار لے کر بے فکر ہو جاتے ہیں اور جو کچھ پڑھتے کو بتلاؤں تو اس کو نہیں کرتے ظاہر میں تو یہ بات واضح کی ہے کہ ہم اس قابل کہاں ہیں مگر واقع میں نفس کی شرارت ہے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا کہ نفس آرام طلب ہے اور تعویذ میں کچھ

کرنا پڑتا نہیں لے کر بازو پر باندھ لیا بس چھٹی ہوئی۔ اور پڑھنے میں ہے مصیبت۔ وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے پڑھنے سے اور دعا سے گھبراتے ہیں۔

اسی طرح بہت سے لوگ ذکر سالک جب ان پر خطرات ہجوم کرتے ہیں تو ان کے دل میں خیال جم جاتا ہے کہ ذکر سے فائدہ کیا ہوا کہ خطرات بھی قطع نہیں ہوتے شیطان ان کے اس قدر پیچھے پڑا رہتا ہے کہ اس کے وساوس کی وجہ سے ذکر چھوڑ دیتے ہیں کہ جب بغیر وساوس کے ذکر ہوتا ہے نہیں تو پھر ذکر کرنا ہی بیکار ہے جیسے لوگوں نے قرآن شریف کے ساتھ عمل کیا ہے اور خیال جمالیا ہے کہ جب معنی نہیں سمجھتے تو قرآن ہی کو چھوڑ دو۔ اس کی تو ایسی مثال ہے کہ اگر کسی کی اولاد بد صورت ہو تو اس کا گلا گھونٹ دو۔ یہ کتنی بڑی غلطی ہے یہودہ حرکت ہے۔

غرض کہ ذکر اللہ کو بعض لوگ اس لئے بیکار سمجھتے ہیں کہ خدا تک ہماری رسائی کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر یاد کہاں۔ اہل سلوک تک اس میں مبتلا ہیں۔ اس واسطے حق تعالیٰ نے اس جگہ اسم کا لفظ آیت میں بڑھا دیا کہ اگر رسمی کا ذکر نہیں ہے تو اسم کا تو ممکن ہے اور بعض جگہ قرآن شریف میں ذات کے ذکر کرنے کو بھی فرمایا ہے۔ جیسے فاذا کرونی اور کہیں صفت کے ذکر کو لائے ہیں جیسے واذکر ربک فی نفسک مطلب یہ ہے کہ ذات کا تصور نہ ہو سکے تو صفات کا بھی۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو اسم اور لفظ ہی کا بھی۔ اسی لفظی ذکر سے پھر حقیقی ذکر بھی نصیب ہو جاتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس لفظی ذکر سے حقیقی ذکر کا قصد ہو۔ یہ قصد ہی ایسی چیز ہے کہ اس سے باطن میں ضرور اثر ہوتا ہے۔

طلب صادق کا اثر

بعض کو شبہ ہوتا ہے کہ نماز پڑھی مگر اثر نہیں ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ نماز سے قصد ہی نہیں کیا اثر ہونے کا اور جب قصد ہی نہ ہو تو اس کے بارہ میں یوں فرماتے ہیں۔

انلزمکموها وانتم لها کارہون۔ کہ جب تم اعراض کرتے ہو تو ہم پیچھے نہیں لپٹتے پھرتے۔

حضرت طلب ہونی چاہیے۔ جب طلب ہوتی ہے تو ان کی یہ عنایت ہوتی ہے۔

من تقرب الی شبرا تقرب الیہ ذرا عا ومن تقرب الی ذرا عا تقرب

الیہ باعا الحدیث

یعنی جب کوئی ایک بالشت میری طرف آتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کی طرف جاتا ہوں اور جو

ایک ہاتھ آتا ہے تو میں ایک باغ دو ہاتھ جاتا ہوں۔ اور جو پیادہ آتا ہے تو میں دوڑ کر آتا ہوں۔
یعنی انسان کے مسافت قطع کرنے سے کیا ہو سکتا مگر جب یہ قصد کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اس سے
تزدیک ہو کر اس کو مقرب بنا لیتے ہیں۔ بس انسان کو چاہئے کہ جو کچھ اس سے ہو سکے وہ کرتا رہے۔
بعض لوگ ریا کے خوف سے ذکر نہیں کرتے کہ جب ذکر کرتے ہیں تو ریا کا خیال ہوتا ہے۔
یہ بھی شیطان کا دھوکہ ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ اول ریا ہوتی ہے پھر عادت ہو جاتی ہے پھر عبادت چنانچہ
مشاہدہ کر لیجئے کہ اول اول جب کسی کو نماز میں امام بناتے ہیں تو وہ خوب بیٹا بنا کر پڑھتا ہے کہ مقتدیوں
کو اچھا معلوم ہو۔ مگر دو چار دن کے بعد اس طرف التفات بھی نہیں رہتا۔ ریا ہمیشہ ریا نہیں رہتی۔
دوسرے یہ کہ جو ریا بلا قصد کے ہو تو یہ اس کے دور کرنے کا مکلف ہی نہیں پس ریا کے
دور رہے ہیں۔ ایک صورت ریا دوسری حقیقت ریا۔ یہ صورت ریا کو حقیقت ریا سمجھ لیا جاتا ہے۔
میں کہتا ہوں کہ جب وہ تمہارے اختیار سے پیدا نہیں ہوئی ہے تو اس میں حرج کیا ہے۔
مجھ سے ایک شخص نے شکایت کی ریا کی۔ تو میں نے کہا کہ بلا قصد ہے یا بالقصد، اختیاری
ہے یا غیر اختیاری۔ انہوں نے کہا کہ غیر اختیاری ہے اس پر میں نے کہا کہ بس یہ دوسو سہ ریا ہے ریا
نہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

وسوسہ اور اس کا علاج

حتیٰ کہ اگر کفر کا بھی وسوسہ آئے اس میں بھی حرج نہیں۔ چنانچہ دیکھئے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم
نے ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت کی تھی کہ ہمارے قلب میں ایسی باتیں
آتی ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا گوارا ہے مگر ان کا زبان پر لانا گوارا نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ
کفر کے وسوسے ہوں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر فرمایا: الحمد للہ الذی رد امرہ
الی الوسوسة (کہ خدا کا شکر ہے کہ اس کی کوشش وسوسہ ہی کے اندر محدود کر دی)
پس جب کہ وسوسہ کفر بھی مضر نہیں تو وسوسہ ریا تو کسی درجہ میں بھی مضر نہیں ہو سکتا پس اس کا علاج یہ
ہے کہ کام کئے جائے کچھ پرواہ نہ کرے شیطان کے وسوسہ ڈالنے کی طرف کچھ خیال نہ کرے۔
کار خود کن کار بے گانہ کن (اپنا کام کر دو دوسرے کا کام مت کرو)
ذکر میں لگنا اپنا کام ہے۔ وسوسہ آنا نہ آنا اپنا کام نہیں۔ اپنے کام میں لگنا چاہیے۔ اور جو اپنا

فعل نہیں ہے۔ اس میں کیوں مشغول ہوئے کہ وہ نخل مقصود ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص بادشاہ کا طلبیدہ جا رہا تھا۔ کسی حاسد کو خبر ہوئی وہ راستہ میں جا کھڑا ہوا۔ جب یہ وہاں سے گزرا تو اس نے پوچھا کہ کہاں جاتے ہو۔ اس نے کہا کہ بادشاہ کے دربار میں جا رہا ہوں۔ اس نے بادشاہ کی شان میں گستاخی شروع کر دی اگر یہ بادشاہ کا عاشق ہے اور بادشاہ کی ملاقات کا طالب ہے تو گستاخی سننے اور اس کے جواب دینے میں مشغول نہ ہوگا بلکہ سیدھا چلا جائے گا۔ حتیٰ کہ اگر وہ کان میں منہ لگا کر گالیاں دے گا تب بھی ادھر ملتفت نہ ہوگا۔ کیونکہ حاسد کی غرض اس سے یہی ہے کہ اس مشغلہ میں اس کو لگا لوں تاکہ دربار کی حاضری کا وقت جاتا رہے اور یہ بادشاہ کی عطایا سے محروم رہے۔ سو اگر یہ شخص ہوش سے کام لے گا تو سمجھ لے گا کہ یہ اس لئے شرارت کر رہا ہے کہ مجھ کو محروم کر دے۔ بس اس کو چاہیے کہ اس کی طرف التفات نہ کرے اور سیدھا چلا جائے۔ اس طریقہ سے یہ بادشاہ تک پہنچ جائے گا اور گستاخی کرنے والا اندر نہیں پہنچ سکتا پس اس کو مقصود بھی حاصل ہو جائے گا اور ان تکلیف دہ کلمات سے بھی نجات ہو جائے گی اور اگر یہ شخص اس کی باتوں کے جواب دینے میں لگ گیا اور تمام وقت اسی میں صرف ہو گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ بادشاہ کے قرب سے محروم رہے گا۔

اسی طرح شیطان وساوس ڈال کر قرب الہی سے محروم رکھتا ہے۔ سو جو شخص وسوسہ کی فکر میں مشغول ہو جاتا ہے وہ ترقی سے رک جاتا ہے اور جو اس میں مشغول نہیں ہوتا ترقی کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ مقام قرب حاصل ہو جاتا ہے اور جب مقام قرب حاصل ہوتا ہے تو وساوس بھی منقطع ہو جاتے ہیں کیونکہ دربار میں شیطان کا دخل کہاں اور اسی لئے بزرگوں نے وساوس کا علاج تجویز کیا ہے عدم التفات یعنی وساوس کی طرف التفات ہی نہ کرے۔ اس کے سوا اس کی تدبیر نہیں۔

غرض کہ جیسے ریا کا وسوسہ ریا نہیں اسی طرح کفر کا وسوسہ کفر نہیں اور نہ مذہب کا وسوسہ مذہب ہی ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ وہ قلب کے اندر نہیں گویا معلوم ایسا ہی ہوتا ہے کہ جیسے قلب کے اندر ہی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے آئینہ پر مکھی بیٹھی ہو اور اس کا عکس آئینہ میں پڑتا ہو۔ اس لئے اندر مکھی نظر آتی ہے حالانکہ اندر نہیں ہوتی۔ اسی طرح ایسے غیر اختیاری وساوس قلب کے اندر نہیں ہوتے۔ قلب میں تو ذکر و محبت خدا کی ہوتی ہے اور وسوسہ قلب کے باہر ہے۔ اہل اللہ کے قلب میں اللہ کے سوا کوئی چیز نہیں ہوتی اس لئے سالک کو قلب قوی رکھنا چاہیے اور کام میں لگے

رہنا چاہیے۔ اگر زیادہ خلجان ہو تو یوں دل کو سمجھائے کہ اور کچھ نہ ہو ذکر لفظی تو ہے نہ یہ کہ اس فکر میں پڑ جائے کہ یکسوئی کیوں نہیں ہوتی۔

ذکر و فکر

فکر دو ہیں۔ ایک تو اصلاح کی فکر سو یہ تو ہونا چاہیے اور ایک ہے یکسوئی اور کیفیات جس سے اصل کام ہی جاتا رہا مثلاً اس کا اہتمام کیا کہ قلب میں کوئی چیز نہ ہو اور اس میں کامیابی نہ ہونے سے یہ خیال کیا کہ میرا ذکر بیکار جا رہا ہے۔ بس ذکر ہی کو چھوڑ بیٹھے۔ اور غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ منشا اس کا کبر ہے۔ یعنی اپنے کو اتنا بڑا سمجھتا ہے کہ میں اپنے عمل و ذکر میں موجودہ حالت سے زیادہ کا مستحق تھا مگر مجھ کو ملا نہیں۔ اتنے دنوں ذکر کیا مگر ہنوز روز اول ہے۔ پس یہ کبر ہے ورنہ اگر سچا عاشق ہو تو اس کو بھی غنیمت سمجھتا کہ اس کا نام لینا تو میسر ہو گیا اسی واسطے تو کہتے ہیں۔

ادائے حق محبت عنایت ست زودست و گرنہ عاشق مسکین پہنچ خورسند است

(حق محبت کی ادائیگی سراسر دوست کی عنایت کے سبب ہے ورنہ عاشق بیچارہ یونہی خوش و خرم ہے) اگر تمام عمر ذکر لفظی ہی کی پابندی ہو جائے تو یہ بھی غنیمت ہے ہم تو اس کے بھی مستحق نہ تھے۔ غلو کرنا تو وضع میں بعض اوقات کبر تک پہنچا دیتا ہے۔ دیکھو اس نے تو وضع کی تھی کہ اپنی حالت کو حقیر سمجھا تھا مگر پھر رفتہ رفتہ یہ خیال جمایا کہ میں کام تو اتنا کرتا ہوں مگر میری حالت ایسی بری ہے۔ بس کبر تک پہنچ گیا

صاحبو! ہماری نماز کیا ہمارا روزہ کیا۔ اس پر جو انعام بھی ہو جائے احسان سمجھنا چاہیے اب یہ خیال کرنا کہ مجھے زیادہ ملنا چاہیے تھا یہ ناقدری ہے۔ بہر حال لفظ اسم بڑھانے میں یہ نکتہ تھا۔

حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ زبان سے اللہ اللہ کرنے کو غنیمت سمجھے حقیر نہ سمجھے۔ جب غنیمت سمجھے گا تو شکر کرے گا اور شکر پر یہ وعدہ ہے: لئن شکرتم لازیدنکم اس سے ترقی ہوگی۔ پس جس کی طلب ہے اس تک پہنچ جائے گا خلاصہ یہ کہ ذکر اسم ربہ میں تمام برائیوں سے بچنے کی تدبیر بتلائی ہے کہ ذکر کرنے میں مشغول ہو جاؤ۔ سب برائیوں سے بچ جاؤ گے۔

فضیلت نماز

اس آیت میں ایک نکتہ اور ہے۔ وہ یہ کہ فصلی میں تو فالائے اور ذکر اسم ربہ میں واؤ۔ حالانکہ ہے دونوں جگہ عطف۔ مگر اول میں واؤ کے ساتھ عطف کیا ہے اور دوسری جگہ فاء کے

ساتھ۔ سو اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ نماز بعض وجوہ سے مقصود اعظم ہے کیونکہ ذکر پر نماز کی اس طور پر تفریع کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر مقدمہ ہے نماز کا اور اصل مقصود نماز ہے۔ پس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اول ذکر سے نماز کی قابلیت پیدا کی اور پھر نماز پڑھی۔

اس سے نماز کی مقصودیت عظمیٰ معلوم ہوئی۔ دوسرے قد افلح من تزکی (بامراد ہوا جو شخص) (خباثت عقائد و اخلاق سے) پاک ہو گیا) کے ساتھ و ذکر اسم ربہ فصلی (اور اپنے رب کا نام لیتا رہا اور نماز پڑھتا رہا) کی قید لگانے سے اشارہ اس طرف ہے کہ گو ترکیہ بہت بڑا عمل ہے مگر بغیر نماز کے فلاح کے لئے کافی نہیں۔ ہاں جب کہ ترکیہ کے ساتھ نماز بھی پڑھی تو اس وقت سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری فلاح ہو گئی۔ نماز سبب عظمیٰ ہے فلاح کا۔

آپ کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اذان میں حی علی الفلاح کیوں فرمایا ہے بات یہ ہے کہ فلاح لقب رکھ دیا ہے نماز کا۔ نماز ہی کو فلاح کے نام سے تعبیر کیا ہے تاکہ لوگ سمجھ لیں کہ نماز فلاح کا ایسا سبب ہے کہ گویا عین فلاح ہے اور مسبب کے قائم مقام ہے۔ پس جس نے نماز پڑھی تو یوں کہیں گے کہ اس کو فلاح حاصل ہو گئی۔ اس سے نماز کا کیا رتبہ ثابت ہوتا ہے۔

نماز میں روزہ

تفصیل اس کی یہ ہے کہ نماز ایسی چیز ہے کہ اس کو تمام اعمال سے امتیاز حاصل ہے یعنی اعمال فرعیہ سے کیونکہ ایک عمل تو ایسا ہے جو سب کی اصل ہے ایمان وہ تو نماز سے بھی افضل ہے۔ کیونکہ اگر ایمان نہ ہو تو نماز ہی نہیں ہوتی۔ اور ایمان بلا نماز کے بھی مفید ہو جاتا ہے (مثلاً انسان خلود فی النار سے بچ جائے) اور نماز کا امتیاز دوسری عبادات سے یہ ہے کہ نماز میں تمام عبادات موجود ہیں۔ اس کی مثال اس مرکب نسخہ کی سی ہے جس میں تمام اجزائے مقیدہ کو جمع کر دیا گیا ہو۔ ایسا خمیرہ یا معجون ظاہر بات کہ مفرد و اسے زیادہ مفید ہوتا ہے سو اعمال جو کہ بمنزلہ غذا یا دوا کے ہیں نماز ان سب کا مجموعہ ہے کیونکہ دوا تو وہ ہے جس سے مواد خبیثہ کا ازالہ ہو اور غذا وہ جس سے مواد صالحہ پیدا ہوں۔ چونکہ اعمال شرعیہ میں یہ دونوں شامل ہیں۔ اس لئے وہ بمنزلہ دوا اور غذا کے ہوئے۔ پس جتنے اعمال مفرد تھے نماز میں ان سب کو جمع کر کے ایک مرکب بنا دیا ہے۔

دیکھئے ایک عمل روزہ ہے، ایک تلاوت کلام اللہ ہے ایک اعتکاف ہے۔ روزہ کے فضائل

اور تلاوت اور اعتکاف کے معلوم ہیں کہ کتنے کچھ ہیں سو جس عمل کے اندر یہ سب جمع ہوں گے ظاہر ہے کہ اس کی کیا کچھ فضیلت ہوگی اور وہ نماز ہے کہ اس میں ان میں سے تھوڑی تھوڑی سب چیزیں موجود ہیں۔ روزہ تو اس لئے کہ اس میں تین چیزیں ہیں کھانے اور پینے اور مقاربت کا ترک کرنا سو نماز میں یہ سب چیزیں پائی جاتی ہیں۔ لہذا نماز میں روزہ کی شان ہوئی بلکہ نماز کے اندر روزہ کی شان روزہ کے اعتبار سے علی وجہ الکمال پائی جاتی ہے وہ یہ کہ نماز کے اندر بہت سے ایسے مباحات سے بھی روک دیا گیا ہے جن سے روزہ میں اس قدر روک نہیں کی گئی۔ اس میں تو صرف تین چیز سے روکا گیا ہے اور یہاں چلنے پھرنے، ہنسنے بولنے، کھانے پینے سب سے ممانعت ہے۔ بولنا بھی منع ہے حتیٰ کہ دعا بھی وہ درست ہے جو مشابہ کلام ناس کے نہ ہو۔

نماز فاسد

اگر اللہ سے باتیں کرو تو ایسی نہ ہوں جس کا سوال لوگوں سے کر سکتے ہو۔ اگر ایسی دعا کرو گے تو نماز فاسد ہو جائیگی۔ گو عربی میں ہو اور جو مشابہ کلام ناس کے نہ ہو وہ مفسد نہیں۔ گو اردو ہی میں ہو۔ تو ایسی دعا اردو میں ہونے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اردو میں دعا کیا کرو بلکہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ اردو میں دعا کرنے سے نماز نہیں ٹوٹی جب کہ وہ کلام ناس کے مشابہ نہ ہو لیکن بجز عربی کے دوسری زبان میں ہونا ہے حرام اور جن صورتوں میں نماز فاسد ہو جاتی ہے سو اس کا فساد بوجہ اس کے نہیں کہ اردو میں ہے بلکہ بوجہ مشابہت کلام ناس کے ہے۔

اس پر ایک حکایت یاد آئی۔ ہمارے ایک دوست کہتے تھے کہ ہم نے منیہ میں پڑھا تھا کہ کلام ناس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ آپ اس کا مطلب یہ سمجھے کہ عربی کے سوا اردو وغیرہ بولنے سے نماز جاتی رہتی ہے اور عربی میں بولنے سے نہیں جاتی۔ اتفاق سے امام کو سہو ہوا کہ قعدہ اولیٰ کو قعدہ اخیر سمجھ گیا اس وجہ سے بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ سلام پھیرنے کے قریب ہوا تو آپ کہتے ہیں قُم۔ امام کو سن کر خود یاد آ گیا کہ یہ قعدہ اولیٰ ہے اس وجہ سے کھڑا ہو گا یہ دل میں کہنے لگے کہ عربی سے بڑا فائدہ ہے۔ نماز فاسد بھی نہ ہوئی اور کام بھی بن گیا۔ امام صاحب نے بعد نماز کہا کہ قم والا کون تھا یہ بولے میں تھا۔ امام صاحب نے کہا کہ بھائی اس طرح نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ تو آپ کہتے ہیں کہ میں نے کلام ناس کے ساتھ تکلم تھوڑا ہی کیا ہے۔ آپ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ جو بات عربی میں ہو وہ کلام ناس نہیں ہوتی۔ کلام ناس وہ بات ہوتی ہے جو کہ غیر عربی اردو وغیرہ میں ہو۔

عربی پر دوسری حکایت یاد آئی کہ ایک رئیس لغت بہت بولتے تھے ان کی اسامیوں میں سے کچھ گنواران کے پاس آئے۔ رئیس صاحب نے پوچھا امسال تمہارے زار گندم پر تقاطر امطار ہوایا نہیں۔ گنوار لوگ اس کو سن کر متحیر تھے کہ جانے میاں کیا کہہ رہے ہیں۔ انہوں نے یہ لغات کہاں سے تھے ایک گنواران میں ہوشیار تھے اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ اس وقت میاں قرآن پڑھ رہے ہیں پھر آئیو جب آدمیوں کی بولی بولیں گے۔

خلاصہ یہ کہ کلام ناس سے خواہ عربی میں ہو یا غیر عربی میں نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ سو نماز وہ چیز ہے کہ کھانا پینا تو درکنار کلام کرنے تک سے بھی وہ فاسد ہو جاتی ہے۔ جب کہ وہ کلام ناس سے ہو۔ اور کسی مخلوق سے کلام کرنا تو کہاں خود حق تعالیٰ سے ایسا کلام کرنا جو آدمیوں سے ہو سکتا ہے اس سے بھی تو نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ ہاں جو چیز بندوں سے نہیں مانگی جاتی جیسے مغفرت اس سے نماز نہیں جاتی خیال کیجئے کہ نماز میں کتنا بڑا روزہ ہے۔

نماز میں ہنسنا اور رونا

چنانچہ نماز میں ہنسی کی بھی ممانعت ہے ہنسی کے تین درجے ہیں۔ قہقہہ، خفک، تبسم۔ قہقہہ میں نماز تو سب کے نزدیک فاسد ہو جاتی ہے۔ لیکن حنفیہ کے نزدیک وضو بھی جاتا رہتا ہے۔ اور خفک سے نماز جاتی ہے وضو نہیں جاتا۔ اور تبسم بے ادبی تو ہے مگر اس سے نماز نہیں جاتی۔ کیونکہ شرعاً تبسم کو ہنسی قرار نہیں دیا گیا۔ گویا وہ ملحکات کلام ہی سے نہیں غرض ہیں یہ سب نماز کے خلاف گو تبسم سے نماز نہ فاسد ہو پس نماز میں ہنسنے کا بھی روزہ ہوا۔

اب رونے کا حکم سنئے کہ نماز میں اس کی بھی ممانعت ہے۔ ہنسنے کا تو اس لئے روزہ ہوا تھا کہ وہ شان نماز کے مناسب ہی نہ تھا۔ مگر اس میں رونے کا بھی روزہ ہے۔ ہاں جنت اور دوزخ کے ذکر سے ہو تو اور بات ہے۔ حالانکہ رونا فی نفسہ وہ چیز ہے کہ اس میں پوری نیاز مندی کی شان ہے۔ اور نیاز مندی کی شان ہر حال میں محمود ہی ہے۔ اگر رونا آخرت کے لئے ہو وہ تو محمود ہی ہے لیکن اگر دنیا کے لئے بھی ہو اس کو بھی دخل ہے قرب میں۔ کیونکہ رونا حزن و غم کی وجہ سے ہوتا ہے اور حزن و غم کی نسبت صوفیا کرام کہتے ہیں کہ بہت بڑی ریاضت ہے۔

ایک بزرگ رورہے تھے۔ کسی نے کہا کہ کیوں رورہے ہو۔ جواب دیا کہ بھوک لگی ہے واقعی ان حضرات کو اپنی ہستی پر بالکل نظر نہیں ہوتی۔ اگر اپنی کچھ شان سمجھتے تو روٹی کے لئے ہرگز نہ روتے

کیونکہ یہ خیال ہوتا کہ روٹی کے لئے رونا ہماری شان کے خلاف ہے۔ اگر کسی کو معلوم ہوگا تو کیا کہے گا۔ غرض کہ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ بھوک کی وجہ سے رو رہا ہوں۔ کہنے والے نے کہا کہ شرم نہیں آتی بچوں کی طرح رو رہے ہو۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ خدا نے تو بھوک اس لئے لگائی ہے کہ میرا رونا دیکھیں جب وہ ہی ہمارا رونا دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہم کیوں نہ روئیں۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

(جب دین کا بادشاہ مجھ سے طمع کا اظہار کرے تو پھر ایسی قناعت پر خاک)

حقیقت کمال

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیمار تھے کسی نے پوچھا کہ کیسا مزاج ہے آپ نے فرمایا طبیعت اچھی نہیں ہے۔ بظاہر یہ کلمہ شان استقلال کے خلاف معلوم ہوتا تھا۔ مگر درنیا یہ حال پختہ بیج خام عوام عارفین کی حالت کیا سمجھ سکتے ہیں۔ عوام تو عارفین کی اس حالت کو یوں سمجھتے ہیں کہ یہ شان استقلال کے خلاف ہے کیونکہ وہ بزرگی اسے سمجھتے ہیں کہ آدمی پتھر ہو جائے کچھ حس ہی نہ رہے بلکہ فطرت کے خلاف اس کے افعال صادر ہوں۔ بعض کی حالت یہ ہوئی ہے کہ ان کا بچہ مر گیا اور وہ ہنس پڑے۔ عوام ایسی حکایت کو بہت وقعت سے دیکھتے ہیں اور کمال سمجھتے ہیں حالانکہ کامل حالت وہ ہے جو مشابہ ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت کے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے کا انتقال ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم روئے۔ پس معلوم ہو گیا کہ مصیبت میں غم نہ ہونا کمال کی بات نہیں۔

پھر آج کل لوگ جو اس کو کمال اور بزرگی سمجھتے ہیں تو کیا بزرگی کے یہ معنی ہیں کہ کسی بات کا اثر ہی نہ ہو۔ حالانکہ بزرگوں پر تو ہر شے کا سب سے زیادہ اثر ہوتا ہے۔ ہاں حدود سے باہر اس کے مقتضا پر عمل نہیں ہوتا۔ چنانچہ نامناسب بات سے بزرگوں کو غصہ آتا ہے اور تغیر ہوتا ہے مگر پھر بھی مقتضا پر عمل کرنے میں اعتدال ہوتا ہے۔ حسد سے تجاوز نہیں کرتے اور ان حضرات پر اثر کیسے نہ ہو۔ بادشاہوں کے حواس اتنے سلیم نہیں ہوتے جتنے ان حضرات کے ہوتے ہیں۔ ان کا ادراک بہت صحیح ہوتا ہے۔ اسی واسطے ان کو اولاد کی محبت بھی سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ خطبہ پڑھ رہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے حضرت امام حسینؑ اور حضرت امام حسنؑ کھیلنے ہوئے آ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرط محبت سے خطبہ پڑھ کر منبر سے اتر آئے اور پیار کیا اور پھر منبر پر تشریف لے گئے۔

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیار کرتے دیکھ کر ایک صحابی نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے دس بیٹے ہیں۔ میں نے ان کو کبھی پیار نہیں کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا کہ اگر خدا تعالیٰ ہی تمہارے دل سے محبت نکال لیں تو میں کیا کر لوں گا۔

خلاصہ یہ کہ حضرت عمرؓ بیماری میں کراہ رہے تھے جو بزرگ عیادت کو گئے تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ آپؓ کا مزاج کیسا ہے۔ آپؓ نے فرمایا اچھا نہیں۔ وہ بولے آپؓ بے استغلائی کی بات فرماتے ہیں حضرت عمرؓ نے فرمایا کیا میں خدا کے روبرو پہلوان بنوں۔ وہ ضعیف بتائیں اور میں قوی بنوں۔ جب خدا نے عجز کے لئے بیمار کیا ہے تو میں کس لئے قوی بنوں۔ یہ ہیں عارفین۔ یہ حضرات گویا مزاج شناس ہوتے ہیں جس میں حق تعالیٰ کی رضا دیکھتے ہیں اس کے موافق عمل کرتے ہیں کہ اس وقت یہ مناسب ہے اور اس وقت یہ مناسب ہے یہ حکایت اس مناسبت سے بیان ہوئی تھی کہ حزن و غم بڑی ریاضت ہے۔

رونے کی اہمیت

اس پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک بزرگ ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔ عادت یہ تھی کہ ضرورت میں قرض لے لیا۔ جب فتوحات ہوئی ادا کر دیا۔ ساری عمر قرضہ میں گزری۔ حتیٰ کہ خاتمہ کے وقت بھی مقروض تھے اور یہ کوئی بزرگی کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ جو قرضہ اللہ کے واسطے ہو وہ گناہ نہیں۔ سو یہ بھی اللہ ہی کے واسطے قرضہ لیا کرتے تھے۔ کیوں کہ بزرگوں کے یہاں مہمان آتے ہیں۔ جب ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا ہے تو قرض لے کر ان کی مہمانی کرتے ہیں۔ پس لوگوں نے اس حالت میں آکر تقاضا کرنا شروع کیا کہ ہم نے آپ کو بزرگ سمجھ کر قرضہ دے دیا تھا اب ادا کیوں نہیں کرتے ہو۔ وہ بزرگ روکھے روکھے جواب دیتے تھے۔ جب قرض خواہوں نے بہت تنگ کیا تو منہ ڈھانک کر پڑ رہے۔

اتنے میں ایک لڑکا حلوہ بیچتا ہوا نکلا اور اس نے آواز دی۔ انہوں نے اس کو بلوایا اور پوچھا کہ تیرے پاس کتنا حلوہ ہے۔ غرض وہ دو روپیہ کا اترا۔ آپ نے سب خرید لیا اور جتنے لوگ تقاضے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے ان سب کو کھلا دیا حلوہ فروش نے دام طلب کئے تو یہ جواب دیا کہ دام ہوتے تو میرے پاس یہ برأت کیوں نظر آتی۔ تو بھی ان ہی میں بیٹھ جا۔ لوگوں نے اور بھی لتاڑا کہ اس بچے پر بھی آپ نے ظلم کیا۔ اگر ہمیں پہلے سے یہ معلوم ہوتا تو ہم کبھی ہرگز اس کا حلوہ نہ کھاتے۔ ان کا یہ فعل لوگوں کو برا معلوم ہوا مگر

ورنیا ید حال پختہ بیچ خام

اس لڑکے نے یہ حال دیکھ کر رونا شروع کیا کہ میرا استاد مجھے مار ڈالے گا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک شخص سہمی میں کچھ روپے اور حلوہ والے کے دام علیحدہ ایک کاغذ میں لپیٹے ہوئے لے کر حاضر ہوا۔ وہ روپے سب قرض خواہوں کو تقسیم کئے تو اسی قدر تھے۔ جس میں قرضہ ادا ہو جائے۔ غرض سب کو بیباق کر دیا۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت کیا بات تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ جب لوگ قرض طلب کرنے آئے اور مجھ کو تنگ کیا تو میں نے حق تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا کہ اے اللہ ان کا قرضہ ادا کر دیجئے میں نے آپ ہی کے واسطے قرض لیا تھا۔ وہاں سے جواب ملا کہ ہمارے خزانہ میں تو کچھ کمی نہیں۔ مگر تمہارے یہاں کوئی روٹنے والا نہیں۔ بس میں نے سوچا کہ کسی کو رلاؤ۔ بس میں نے اس حلوہ والے کو منتخب کیا۔ اسی کے متعلق مولانا فرماتے ہیں۔

تانہ گرید کودک حلوا فروش بحر بخشایش نے آید بجوش

تانہ گرید طفل کے جوشد لبن تانہ گرید ابر کے خند وچمن

(جب تک حلوا بیچنے والا بچہ رونا نہیں، بخشش کے سمندر کو اس وقت تک جوش نہیں آتا۔ بچہ جب تک

روئے نہیں ماں کو بھی دودھ پلانے کا خیال نہیں آتا۔ جب تک بارش نہ برے چمن میں بہا نہیں آتی)

غرض رونا خواہ دنیا کی وجہ سے ہو اس پر بھی رحمت متوجہ ہوتی ہے۔ پس باوجودیکہ دنیا کی وجہ سے بھی رونا اقرب الی الخشوع اور مفتاح رحمت حق ہے مگر نماز میں اس کی بھی تو بندش ہے۔ ہاں اگر دین کے خوف سے آنکھ سے روئے مگر چلائے نہیں تو جائز ہے۔ دیکھا آپ نے کتنی بڑی شان ہے نماز کی۔

نماز میں چلنا

نیز نماز میں چلنے کا بھی روزہ ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر متصل چلا تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر ایک قدم چلا اور ٹھہر گیا پھر ایک قدم چلا اور ٹھہر گیا تو نماز فاسد نہ ہوگی۔

ایک صحابی کا قصہ ہے کہ وہ سفر میں تھے۔ نماز پڑھنے گھوڑے پر سے اترے گھوڑے کو چرنے چھوڑ دیا اور باگ کی رسی ہاتھ میں پکڑے ہوئے نماز پڑھنے لگے گھوڑا چرتا ہوا آگے سرکتا تو یہ بھی ایک ایک قدم سرک جاتے۔ ایک خارجی نے دیکھا تو کہا سبحان اللہ! یہ صحابی ہیں۔ کیا خوب صورت نماز ہو رہی ہے۔ سلام کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ یہ کون سی اعتراض کی بات ہے۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آسانی کا مشاہدہ کیا ہے۔ آپ سہولت پسند تھے۔ قدم بڑھانے کو دیکھا کہ گھوڑے

کے ساتھ میں قدم بڑھاتا ہوں۔ اس پر اعتراض کیا مگر یہ نہ دیکھا کہ اگر میں ایسا نہ کرتا (یعنی باگ نہ پکڑے رہتا) تو گھوڑا بھاگ جاتا۔ میں پیادہ چلنے پر قادر نہیں۔ مجھ کو کتنی تکلیف ہوتی۔

اگر کوئی کہے کہ اگر تکلیف ہوتی بھی تو اس سے دین کا کیا ضرر تھا۔ سو جواب یہ ہے کہ یہ کیا ضرور ہے کہ اللہ والے پریشان نہیں ہوتے۔ اللہ والوں کو پریشان اور مضطرب کسی بات میں نہ دیکھو گے۔ ہاں کمر میں درد ہو گیا۔ بیماری ہو گئی یہ تو دیکھو گے مگر پریشانی حقیقت میں جس کا نام ہے وہ ان کو نہیں ہوتی کیونکہ ایک حقیقت ہے پریشانی کی ایک اور صورت ہے اس کا۔ پس اہل اللہ میں پریشانی کی صورت تو ہوتی ہے کہ تکالیف وغیرہ میں مبتلا ہوتے ہیں مگر حقیقت پریشانی کی نہیں ہوتی۔ اگر کوئی کہے کہ ایک شخص مر رہا ہے اور پھر بھی کہو کہ مر نہیں رہا۔ یہ تو زبردستی کی بات ہے ہم بزرگوں کو بڑی بڑی پریشانیوں میں مبتلا دیکھتے ہیں۔ کوئی بیماری کی مصیبت میں مبتلا ہے۔ کوئی فقر و فاقہ میں۔ پھر پریشانی کیسے نہ ہوتی ہوگی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ واقعات کو دیکھ لیجئے۔ اس سے اندازہ ہو جائے گا ان کے پاس رہ کر دیکھ لیجئے کہ ان میں پریشانی کے آثار ہیں یا نہیں۔ پریشانی میں آدمی بدحواس ہوتا ہے۔ واللہ وہ حضرات ہر حالت میں نہایت مطمئن ہوتے ہیں ان کی یہ حالت ہوتی ہے جیسے کسی کا محبوب ہو جس کے فراق میں یہ شخص مر رہا ہو کھانا تک چھوٹ گیا ہو۔ ناک پکڑنے سے دم نکلتا ہو اور وہ اتفاق سے مل جائے اور عنایت و مہربانی سے اس کی حالت پر ترس کھا کر بغل میں لے لے اور ایسا دبائے کہ آنکھیں نکلنے لگیں اور وہ یہ دیکھ کر کہ میرے دبائے سے اس کو تکلیف ہے امتحان یوں کہے کہ اگر تم کو تکلیف ہو تو میں چھوڑ دوں اور ایک تمہارا رقیب ہے بجائے تمہارے اس کو بغل میں لے لوں۔ اتنا ذوق تو سب کو ہے بتلائیے وہ کیا کہے گا وہ تو یہی کہے گا۔

نشد نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستان سلامت کہ تو خنجر آزمائی
(دشمن کا یہ نصیب نہ ہو کہ آپ کی تلوار سے ہلاک ہو آپ کی خنجر آزمائی کے لئے دوستوں

کا سر سلامت رہے)

کوئی شخص اس عاشق کو پریشان کہہ سکتا ہے؟ کیا اس کو دبائے سے تکلیف ہوگی ہرگز نہیں بلکہ عین راحت ہوگی۔ ہاں تکلیف جسم کو ہوگی مگر روح کو نہ ہوگی اور جمعیت و اطمینان روح کے متعلق ہے۔ کیا آپ نے کبھی آپریشن پچاس روپے دے کر نہیں کرایا۔ اس میں آہ بھی نکلتی ہے آنسو بھی نکلتے

ہیں۔ اس پر کوئی کہے کہ آپریشن کیوں کرایا اور پھر یہ کہ پچاس روپے بھی دیئے تو یہی کہو گے کہ میری رگ رگ میں راحت ساگئی۔ معلوم ہوا کہ جسمانی تکلیف پر مدار نہیں پریشانی کا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جسمانی تکلیف ہوتی ہے اور روح کو پریشانی نہیں ہوتی سوا اہل اللہ صورۃ پریشان ہیں حقیقتہً نہیں۔ اہل دنیا حقیقتہً پریشان ہیں ہاں صورت تنعم کی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اہل اللہ کو پریشانی نہیں ہوتی۔

غرض یہ کہ اگر وہ نماز میں گھوڑے کی باگ نہ پکڑتے تو وہ بھاگ جاتا اور مضرت آخرت کا بھی احتمال تھا کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جب عبادت کی بدولت اس میں پریشانی ہوتی ہے تو نفس کہتا ہے کہ میں یہ عبادت نہ کرتا تو اچھا ہوتا عبادت ہی کی بدولت مبتلا ہوا۔ اسی واسطے شریعت نے یہ آسانی کر دی کہ اگر چلنا متصل نہ ہو تو نماز نہ جائے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں کس قدر راحت کے احکام ہیں۔

نماز کا توڑنا

اگر کوئی کہے کہ ایسی صورت میں اگر گھوڑا دوڑنے لگے تو پھر کیا کریں گے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے ایسے وقت میں نماز توڑنے کی اجازت دے دی ہے۔ یہاں تک کہ ایک درم یعنی چار آنے نقصان پر بھی نماز کے توڑ دینے کی اجازت ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص جوتا چراتا ہو تو نیت توڑ کر اس کو پکڑ لینے کی اجازت ہے یا چار آنے کی ہانڈی جاتی ہو یا خراب ہوتی ہو تو اس وقت بھی نماز توڑ دینے کی اجازت ہے کون کہتا ہے کہ شریعت میں تشدد ہے۔ شریعت میں تورائی برابر بھی تشدد نہیں بلکہ اور تشدد کی ممانعت ہے۔ دیکھئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

لَا يَنْبَغِي لِلْمُؤْمِنِ أَنْ يَذِلَّ نَفْسَهُ. (یعنی مومن کو مناسب نہیں کہ اپنے آپ کو ذلیل کرے)
صحابہؓ نے عرض کیا:

قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ كَيْفَ يَذِلُّ نَفْسَهُ (یعنی اپنے نفس کو ذلیل کرنا سے کس طرح مراد ہے)
تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يَتَحَمَّلُ مِنَ الْبَلَاءِ لِمَا لَا يُطِيقُهُ. یعنی ایسی بلا میں اپنے آپ کو پھنسائے جس کی برداشت نہ کر سکے۔

دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشدد سے کس طرح منع فرماتے ہیں اور کیسی آسانی سکھاتے ہیں

اور شریعت کی ہر تعلیم ایسی ہی ہے۔ نماز ہی میں دیکھ لیجئے کتنی سہولت کے احکام میں کھڑے نہ ہو سکو تو بیٹھ کر اور بیٹھ نہ سکو تو لیٹ کر ادا کر لو۔ سفر میں ہو قصر کرو۔ دنیا کے واقعات میں غور کیجئے کہ ہر واقعہ میں سہولت کی کیسی تدابیر تعلیم فرمائی۔

جذبات طبعہ کی رعایت

مرنے سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہیں۔ اس سے زیادہ کوئی امر پریشان کن نہ تھا۔ پھر اس کے بارہ میں کیسی عمدہ تعلیم فرمائی ہے قرآن شریف میں ہے۔

اذا اصابتهم مصيبة قالوا انا لله وانا اليه راجعون

کہ جب ان پر مصیبت پڑتی ہے تو یوں کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں اس کے اندر ہم تسلی کا طریقہ بتلایا ہے کہ مصیبت کے وقت انا لله وانا اليه راجعون کہنے سے تسلی ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ ہم نے تو مصیبت میں اس کو پڑھا تھا مگر کچھ بھی نہ ہوا تو جواب یہ ہے کہ وظیفہ کی طرح پڑھنے کو کس نے کہا تھا بلکہ ساتھ میں اس کی حقیقت پر بھی غور کرنا چاہیے وہ یہ کہ مصیبت آنے پر دو باتوں کا لحاظ رہے۔

ایک تو یہ کہ ہم خدا کی ملک ہیں۔ ہم اپنے نہیں۔ جب خدا کے ہیں تو ان کو اختیار ہے کہ جیسے چاہیں ہم میں تصرف کریں۔ یہاں رکھیں یا اٹھالیں۔ اس میں تو عقل کی تسلی ہو گئی۔

دوسرے یہ کہ جہاں ہمارے عزیز چلے گئے ہیں ہم بھی وہیں چلے جائیں گے اس میں طبع کی رعایت ہے۔ ایک عقل اور ایک طبیعت۔ عقل تو انا لله سے راضی ہو گئی تھی۔ کیونکہ عقل تسلیم کرتی ہے کہ جب ہم اللہ کے ہیں تو پھر ہم کو ان کے کسی تصرف پر رنج کرنے کا کیا حق ہے۔ ان کو اختیار ہے جیسا چاہیں کریں مگر طبع ابھی راضی نہ ہوئی تھی کہ باپ مر گیا اس کے مرنے کا کیسے رنج نہ ہو۔ تعلق ہی ایسا ہے کہ خواہ مخواہ رنج ہوتا ہے۔ اس کو ہم کیا کریں۔ اس لئے دوسرا جملہ طبع کے سنبھالنے کو بتلایا کہ جس عشرت کدہ میں وہ گئے ہیں ہم بھی وہیں چلے جائیں گے۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ جلدی ہی ملاقات ہو جائے گی۔

اسکی مثال ایسی ہے جیسے کسی کو حیدرآباد کی وزارت کا عہدہ مل گیا اور وہ وہاں چلا گیا اس کے بیٹے کو اس کے چلے جانے سے سخت صدمہ ہوا اور اس سے کہا گیا کہ تم کیوں گھبراتے ہو وہ تو بڑے عیش میں ہے وزارت کے عہدہ پر ہے اور تم بھی عنقریب وہیں بلا لئے جاؤ گے کیا کوئی کہہ سکتا ہے

کہ اس کا صدمہ اس کو سن کر باقی رہے گا یہ دوسرا جملہ طبع کی تسلی کے لئے بڑھایا ہے۔
 غرض انا للہ وانا الیہ راجعون (ہم سب اللہ کیلئے ہیں اور اللہ کی طرف لوٹنے والے ہیں) میں عقل و طبع دونوں کی تسلی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے جذبات طبع کی کتنی بڑی رعایت کی ہے ساری دنیا کے عقلاء و حکماء جمع ہو جائیں تو بھی تسلی کا ایسا ذریعہ نہیں لاسکتے۔
 دیکھئے جب انا للہ کی حقیقت ملحوظ ہوگی کہ ہم سب خدا کی ملک ہیں۔ تو کسی عزیز کے مرنے سے خدا تعالیٰ کی شکایت عقلاً تو اس کے لحاظ کرنے ہی سے پیدا نہ ہوگی کیونکہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کی ملک میں دو گھوڑے ہوں۔ ایک کو یہاں باندھ دے اور ایک کو دوسری جگہ باندھ دے انکو کیا منصب ہے اعتراض کا کہ ایسا کیوں کیا یا الماری میں کسی کی دو بوتلیں رکھی ہوں۔ ایک کو نیچے کے تختہ پر رہنے دے اور ایک کو اوپر کے تختہ پر رکھ دے کسی کو کوئی اعتراض کا حق نہیں کہ ایک کو نیچے کیوں رکھا اور دوسری کو اوپر کس واسطے رکھ دیا۔ اس کی ملک ہے جو چاہے کرے۔

اسی طرح ہم سب اللہ کی چیزیں ہیں جس کو چاہیں یہاں رکھیں اور جس کو چاہیں وہاں اٹھالیں۔ کسی کو قیل وقال کی گنجائش نہیں۔ باقی جذبات طبعیت اپنا اثر ضرور کرتے ہیں تو دوسرے جملہ میں اس کی کتنی رعایت کی ہے۔ یہ نہیں کہ اس امر طبعی پر مواخذہ فرماتے بلکہ اسی اثر کو جائز رکھ کر اس کا تدارک کیا۔

عقل اور شریعت

اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ اگر قانون بنانے والا خدا کے سوا اور کوئی ہوتا تو اس کے بعد کسی کے مرنے پر رونے کی بھی گنجائش نہ ہوتی کیونکہ اور جو شخص قانون مقرر کرتا وہ حکم عقل کا اتباع کرتا اور عقل یہاں کہتی ہے کہ جب ہم اللہ کے ہیں تو وہ جو چاہے سو کرے ہم کو کیا حق ہے ان کے کسی تصرف پر حزن کرنے کا چہ جائیکہ رونا۔ مگر قربان جائیے شریعت کے کہ رونے کی بھی اجازت دے دی بلکہ ایک قسم کی اس میں فضیلت بھی رکھ دی کہ ہر حمت یعنی آنسو بہانا خدا تعالیٰ کی رحمت ہے حالانکہ عقل اس کو جائز بھی نہیں کہتی۔ دیکھ لیجئے کہ وہ روتا جس کو عقل حرام کہتی ہے۔ خدا کے قانون میں فضیلت قرار دیا جا رہا ہے۔ افسوس ہے کہ آج کل کے عقلا دین کے اندر اپنی عقل کو متبوع بناتے ہیں۔ بعض مسائل میں علماء سے مزاحمت کرتے ہیں کہ یہ عقل کے خلاف ہیں۔ اس مقام پر وہ لوگ اپنی عقل سے استفتاء کریں اور بتلائیں کہ عقل زیادہ خیر خواہ ہے یا شریعت۔ عقل تو رونے کو جرم بتلاتی ہے اور شریعت اس کو اچھا شمار کرتی ہے۔ کس کے حکم میں آسانی ہے شریعت کے

یا عقل کے ظاہر بات ہے کہ شریعت کا فتویٰ زیادہ رحم پر مبنی ہے۔ اب جو خیر خواہ ہے اس کے عوض عقل کو امام بنانا چاہتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازین دیوانہ سازم خویش را
(میں نے عقل دور اندیش کو آزمایا جب اس سے کام نہ چلا تو پھر اپنے آپ کو دیوانہ بنالیا)

شریعت اور راحت

اب سمجھ لیجئے کہ جب شریعت نے موت میں جو کہ اتنی بڑی پریشانی کا واقعہ ہے اس درجہ سہولت کی رعایت کی ہے اور اس قدر راحت پہنچائی ہے تو اور واقعات میں کیوں راحت کا سامان نہ کیا ہوگا۔ اسی طرح شریعت نے ہم کو ہر امر میں ایسا طریقہ بتلایا ہے کہ اس کے اختیار کرنے میں راحت ہی راحت ہے۔ اسی واسطے احکام شریعت کے بارہ میں دعویٰ کیا گیا ہے۔

الابد کر اللہ تطمئن القلوب کہ اللہ کے ذکر ہی سے قلوب کو اطمینان ہوتا ہے۔
اور ہر عمل صالح ذکر اللہ ہے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ جن اعمال کی تعلیم شریعت نے کی صرف انہی سے قلوب کو راحت اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ بذکر اللہ کو جو تطمئن سے مقدم لائے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے حصر کی طرف کہ شریعت کے احکام پر عمل کرنے کے سوا اطمینان اور راحت کا کوئی طریقہ نہیں۔ یہ ہے شریعت کی راحت رساں تعلیم جس کو ہم نے چھوڑ رکھا ہے۔
بہر حال ذکر اس پر تھا کہ شریعت نے روزہ میں بعض مباحات کی اجازت دی ہے مگر نماز میں نہیں دی۔ تو نماز میں روزہ کی شان روزہ سے بھی بڑھ کر ہوئی۔

نماز میں ادھر ادھر دیکھنا

روزہ میں ادھر ادھر دیکھنا جائز ہے نماز میں وہ بھی نہیں گواہی سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ مگر ادب صلوٰۃ کے خلاف ہے۔ ہاں ادب نہ ہو نرا ضابطہ ہی ہو تو اور بات ہے۔ میرٹھ میں ایک مولوی صاحب تھے۔ نماز کے اندر ادھر ادھر دیکھنے کا مرض تھا۔ اتفاق سے ایک شخص جماعت میں ان کے پاس کھڑے ہو گئے۔ وہ مولوی کھڑے ہوئے اور حسب عادت حالت ان کی یہ تھی کہ نماز میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ نماز کے بعد اس شخص نے کہا کہ آپ نماز میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے آپ کی نماز ہی کیا ہوئی۔ بجائے اس کے کہ وہ مولوی ان کے ممنون ہوتے کہتے ہیں کہ میرے ادھر ادھر

دیکھنے کی تمہیں جب ہی تو خبر ہوئی جب کہ تم نے مجھے دیکھا پس تمہاری نماز بھی نہیں ہوئی۔ بس وہ یہ کہہ کر سرخرو ہو گئے مگر کس کے سامنے مخلوق کے سامنے۔ اللہ کے سامنے تو سرخرو نہ ہوئے۔ مخلوق کے سامنے سرخرو ہونے سے کیا ہوتا ہے۔

کارہا باخلق آری جملہ راست باخدا تزوید وحیلہ کے رواست
کار باادرست باید داشتن رایت اخلاص وصدق افراشتن

(مخلوق کے ساتھ تیرے سب کام درست ہیں۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ مکر و حیلہ کب جائز ہے۔ حق تعالیٰ کے ساتھ سب کام درست رکھنا چاہئیں، اخلاص اور صدق کا علم بلند کرنا چاہیے) اے صاحبو! حکام کے سامنے جتنا ادب ملحوظ رکھتے ہو کم از کم حق تعالیٰ کے سامنے اتنا تو رکھو۔ جب حکام کی ہیبت دنیا میں مانع ہے نگاہ اٹھانے سے تو حق تعالیٰ میں تو علاوہ ہیبت کے اور بہت سے امور بھی اس کے مقتضی موجود ہیں۔ مثلاً منجملہ ان کے ایک محبت بھی ہے۔ کیا ادھر ادھر دیکھنے کیلئے محبوب سے نگاہ ہٹاؤ گے۔ عشاق سے پوچھئے کہ محبوب کے سامنے موجود ہوتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنا کیسا ہے۔ عشاق کو تو محبوب سے ایک دم بھی غفلت گوارا نہیں ہوتی۔

یک چشم زون غافل ازاں شاہ نباشی شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی
(محبوب حقیقی سے تھوڑی دیر بھی غفلت میں نہ گزار، شاید وہ کسی وقت کرم کر دے اور تجھے اس کی خبر نہ ہو)

نماز میں تو غفلت کیسی غیر نماز میں بھی غفلت نہ چاہیے۔ حاکم کے سامنے تو ادھر ادھر دیکھتے ہی نہیں۔ اس خیال سے کہ شاید ہمیں نگاہ ہٹاتے ہوئے دیکھ لے۔ پس اللہ تعالیٰ تو ہر وقت ہمیں دیکھتے ہیں اور کسی وقت ہم سے توجہ نہیں ہٹاتے۔ پھر ان کے سامنے ادھر ادھر دیکھنا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ قلب بھی دوسری طرف متوجہ نہ ہوتا۔ خیر اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس پر قدرت نہیں تو نگاہ پر تو قدرت ہے۔ نگاہ پر قدرت ہونے کا تو انکار نہیں کر سکتے۔ پس اس کو دوسری طرف کیوں متوجہ کرتے ہو۔ دوسرے اس میں کچھ فائدہ بھی تو نہیں ہے کیونکہ جن چیزوں کو دیکھتے ہو ان کو نماز کے اندر لے تو سکتے نہیں پس فعل عبث ہونے کی وجہ سے اس سے بچاؤ ہونا چاہیے۔ دیکھنے سے جب کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی تو پھر کیوں دیکھتے ہو۔

غرض یہ کہ نماز میں نگاہ کا بھی روزہ ہے اور چونکہ نماز میں قیود بہت ہیں کہ ہنسنے بولنے چلنے

پھرنے، دیکھنے بھالنے اور اس کے علاوہ اور بہت سی باتوں سے ممانعت ہے اسی وجہ سے اس کی شان میں کہا گیا ہے۔

انہا لکبیرۃ - کہ نماز بہت گراں ہے۔

کیوں جن باتوں سے منع کیا گیا ہے ہمارے اندران کے تقاضے موجود ہیں۔

آج کل کی آزادی

ہمارا جی چاہتا ہے کہ بولیں بھی کھائیں پیئیں بھی چلیں پھریں بس ہر طرح سے آزاد رہنے کو طبیعت چاہتی ہے اسی لئے یہ نفس پر بہت شاق ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے اس کی تمام خواہشات سے رک جانا پڑتا ہے۔ مثلاً خوشی سے بیٹھے ہوئے ہیں، باتیں کر رہے ہیں، چلتے پھرتے ہیں مزے اڑا رہے ہیں۔ بس نماز کا وقت آیا اور خدا کی جانب سے حکم ہوا کہ ایک گھنٹہ کے لئے ہمارے دربار میں آؤ اور اپنی خواہشات کو چھوڑو۔ بس مصیبت آگئی۔

بات یہ ہے کہ انسان مقید ہونا نہیں چاہتا اور شریعت نے مقید کیا ہے۔ دونوں کی مرضی اللہ کی مرضی اور بندہ کی مرضی۔ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس لئے نماز لوگوں پر بھاری ہے۔ اسی لئے اس کے حق میں فرمایا کہ **إِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ** کہ اس سے آزادی کا خون ہوتا ہے۔ جس کا آج کل ہر وقت سبق گایا جاتا ہے۔ مگر یہ آج کل کی آزادی ہے عجیب کہ لوگ صرف شریعات میں آزاد رہنا چاہتے ہیں کہ کوئی قید شرعی ہمارے اوپر نہ رہے ہم تو جب جانیں کہ تکوینیات میں بھی آزادی اختیار کر لو کہ خدا مارنا چاہے اور نہ مریں۔ طاعون میں مبتلا کرنا چاہے اور مبتلا نہ ہوں۔ بس جیسے تکوینیات میں آزاد نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح شریعات کو سمجھ لو کہ اس میں بھی آزاد نہیں ہونا چاہیے حق تعالیٰ نے جو امر بھی فرمایا ہے اس میں اپنے آپ کو مجبور خیال کرو۔

خشوع کی حقیقت

اب جہاں حق تعالیٰ نے ہمارے مرض کا بیان کیا ہے (کہ نماز بھاری ہے) وہاں اس کا علاج بھی بتلا دیا چنانچہ فرماتے ہیں۔

انہا لکبیرۃ الاعلیٰ الخاشعین الذین یظنون انہم ملقوا ربہم و انہم الیہ راجعون۔

یعنی نماز سب پر بھاری ہے مگر خشوع کرنے والوں پر بھاری نہیں جن کو یقین ہے اس بات کا کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور وہ اسی کی طرف جانے والے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ نماز بھاری ضرور ہے بوجہ قیود کے مگر جو لوگ اپنے اندر خشوع پیدا کر لیتے ہیں اور حق تعالیٰ سے ملنے اور ان کے پاس جانے کا خیال جما لیتے ہیں۔ ان پر بھاری نہیں رہتی۔ سوا اس کے اندر ہمارے مرض کا پورا علاج بتلا دیا کہ طریقہ خشوع سے نماز پر دھو تو کچھ گرائی نہیں رہے گی۔

اب خشوع کو لوگ جانے کیا سمجھتے ہیں حتیٰ کہ اس کو اختیاری بھی نہیں سمجھتے سو خشوع کی حقیقت لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سوائے حق کے کسی قسم کا خطرہ نہ آئے یہ غلط ہے۔ خشوع کی حقیقت یہ ہے کہ خطرہ خود نہ لادے گواز خود آجائے اور یہ نہ آنا تو غیر اختیاری ہے لیکن نہ لانا اختیار میں ہے۔ آرد و خطرات منافی خشوع ہے۔ آمد و خطرات منافی نہیں۔ آمد و آرد میں فرق ظاہر ہے۔ ہاں البتہ یہ بھی کرنا چاہیے کہ جب وسوسہ بلا قصد آئے تو اس میں بقصد مشغول نہ ہو جائے۔ بعض ایسا کرتے ہیں کہ وسوسہ خود لاتے تو نہیں لیکن جب آتا ہے تو اس میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی غلطی ہے نہ قصد سے لانا ہو نہ قصد سے ابقاء ہو۔ کیونکہ بقصد باقی رکھنا بھی منافی خشوع ہے بس جب وسوسہ آئے تو اس کو رکھے نہیں دفع کر دے۔

دفع وساوس کے طریق

ایک بات دقیق ہے قابل یاد رکھنے کے وہ یہ کہ عارفین کے نزدیک دفع کا مطلوب ہونا تو سب کو معلوم ہے۔ اب اس میں گفتگو ہے کہ کس طریقہ سے دفع کرنا چاہیے۔ سوا اس کے دو طریقے ہیں ایک تو یہ صورت ہے کہ براہ راست وساوس کو ہٹا دے کہ جب کوئی وسوسہ آئے کوشش کر کے اس کو اپنے خیال سے دور کر دے۔ اس میں تو بہت دقت ہے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا کہ دفع کرتے ہیں مگر دفع نہیں ہوتا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بواسطہ ہٹائے یہ عمدہ تدبیر ہے اس کے سمجھنے کے لئے پہلے ایک مقدمہ سن لو۔ وہ یہ کہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ النفس لا تتوجه الى شئین فی ان واحد۔ کہ نفس کی توجہ ایک وقت میں دو چیز کی طرف نہیں ہوتی

اب سنئے بواسطہ دفع یہ ہے کہ قلب میں کسی دوسری چیز کو لے آؤ۔ دوسری چیز کے لانے سے اس کی طرف توجہ ہو جائے گی۔ اور وسوسہ کی طرف توجہ نہ رہے گی۔ اب بعض مشائخ دفع بلا واسطہ

بتلاتے ہیں۔ اس میں نہایت دقت واقع ہوتی ہے کیونکہ بلا واسطہ ہٹانے میں یہ تو ہوتا نہیں کہ دوسری طرف توجہ ہو اور اس توجہ کی وجہ سے دوسرے کی طرف توجہ ہو جاتی ہے۔ اس میں خود دوسرے کی طرف توجہ ہو جاتی ہے گو بقصد دفع سہی مگر استحضار تو ہوا۔ اس لئے اس کا دفع ہونا مشکل ہو جاتا ہے اس دوسرے کی مثال تاری بجلي کی سی ہے کہ وہ تمہیں لگے جب لپٹے۔ اور جو تم اس کو لگو ہٹانے ہی کے لئے سہی جب لپٹے۔ بس دوسرے ہٹانے کی تدبیر یہ ہے کہ بواسطہ ہٹاؤ۔ وہ یہ کہ دوسری چیز کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

اب رہی یہ بات کہ وہ کون سی چیز ہے جس کی طرف متوجہ ہو آیا پتھر کی طرف یا اور کسی چیز کی طرف ہو اس کی تعیین میں ضرورت ہے دلیل شرعی کی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔
مقبلا علیہما بقلبہ۔ کہ قلب کو متوجہ کرے دونوں رکعت یعنی نماز کی طرف۔

اب نماز کی طرف متوجہ ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ پوری نماز کی طرف ایک دم سے متوجہ ہو کیونکہ نماز مرکب ہے مختلف اجزا سے۔ پس اس کی طرف توجہ اس طرح ہوگی کہ اس کے تمام اجزا کی طرف توجہ ہو مگر اس میں یہ خرابی ہے کہ بہت سے اجزا کی طرف توجہ کرنے سے قلب میں تشویش ہوگی۔ اس لئے یہ صورت تو ٹھیک نہیں۔

ایک صورت یہ ہے کہ جس جزو میں مشغول ہو اسی کی طرف توجہ رکھے۔ اس کا طریقہ ایک بزرگ نے بتلایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مثلاً سبحانک اللہم یاد سے مت پڑھو کہ رٹا ہوا ہونے کی وجہ سے زبان سے خود نکلتا چلا جائے۔ بلکہ ہر ہر جزو سوچ کر پڑھو کہ اب سبحانک اللہم کہہ رہا ہوں اب تبارک اسمک پڑھتا ہوں۔ اب لا الہ غیرک نکالتا ہوں۔ اب بسم اللہ اب الحمد للہ علی ہذا۔ ہر ہر لفظ کو ارادہ سے ادا کرو۔ جب قلب افکار کی طرف متوجہ رہے گا تو دوسروں کی طرف توجہ نہ رہے گی۔ کیونکہ قاعدہ مسلمہ ہے۔ النفس لا تتوجہ الی شئین فی ان واحد۔ اس طریقہ سے اول ہی دن خشوع ہو جائے گا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ اول اول نماز میں تنگی ہوگی۔ کیونکہ خیالات پریشان ہوں گے ان سے توجہ ہٹا کر ذکر کی طرف توجہ کرنی پڑے گی اس وجہ سے حقیقت کو گرانی ہوگی۔ اور بعض کو بآسانی بھی خشوع میسر ہو جائے گا۔

جب یہ تدبیر دوسروں سے نجات کی ملی تو اب ایک اور آفت میں مبتلا ہوگا وہ یہ کہ یوں خیال کرے گا کہ طریقہ تو مل ہی گیا۔ بس جب چاہیں گے کر لیں گے اس لئے اول تو کرتے نہیں اور اگر کرتے ہیں تو ہمیشہ نہیں کرتے۔ مشائخ تک اس میں مبتلا ہیں اور یہ حالت ہے۔

واعظاں کیس جلوہ بر محراب و منبر می کنند چوں بخلوت می رسند آں کار دیگری کنند
 مشکلی وارم زندانش مند مجلس باز پرس توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند
 (واعظین محراب و منبر پر جلوہ کرتے ہیں اور جب خلوت میں پہنچتے ہیں تو وہ دوسرے کام
 کرتے ہیں۔ مجھے یہ مشکل درپیش ہے کہ مجلس کے دانشمندان یہ سوال کرتے ہیں کہ
 دوسروں کو توبہ کی تلقین کرنے والے خود توبہ کیوں نہیں کرتے)

اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی طبیب ناز کرے کہ مجھ کو خارش کا نسخہ بڑا مجرب معلوم ہے
 مگر ساری عمر خارش میں مبتلا رہ کر مر جائے اور اس کا استعمال نہ کرے۔ سو اس کو نسخہ سنے کیا فائدہ
 ہو۔ کوئی انجان کسی بات سے محروم رہے تو ایسی مصیبت نہیں جیسے کوئی جان بوجھ کر محروم رہے اسی
 کے بارے میں کہتے ہیں۔

فان كنت لاتدري فتلک مصیبة وان كنت تدري فالمصیبة اعظم
 (اگر تجھے اس کا علم نہیں تو یہ مصیبت ہے اور اگر تجھے اس کا علم ہے تو یہ بڑی مصیبت ہے)
 اس تدبیر کے ملنے کے بعد شیطان دو طریقہ سے دھوکا دے گا۔ ایک تو یہ کہ ہر ہر لفظ پر توجہ
 کرنے سے شروع میں دل تنگ ہوگا۔ پس شیطان بہکائے گا کہ یہ تدبیر تو بہت مشکل ہے۔ تیرے
 بس کی نہیں ہے۔ اور ایک اس طرح کہ یہ سمجھائے گا کہ طریقہ تو معلوم ہو ہی گیا ہے جب جی
 چاہے گا اس سے علاج کر لیں گے۔ مگر خوب سمجھ لو کہ کچھ بھی دشوار نہیں ہے۔ دو چار دن اس
 طریقہ سے نماز پڑھنے میں طبیعت زچ فچ رہے گی مگر پھر یہی قرۃ عینی فی الصلوٰۃ کی
 لذت و راحت میسر ہوگی۔ اس کا ترک برا معلوم ہوگا۔

حاصل یہ کہ خشوع کے حاصل کرنے کی یہ صورت ہے۔ پس جب خشوع حاصل ہو جائے
 گا تو پھر نماز میں کچھ گرانی نہ رہے گی۔ چنانچہ فرماتے ہیں اَلَا عَلٰی الْخَاشِعِیْنَ کہ نماز بھاری
 ہے مگر خاشعین پر بھاری نہیں۔ پھر اس کی نماز ایسی ہوگی جس کے بارہ میں ارشاد ہے وَاسْجُدْ
 وَاقْتَرِبْ نیچے کو گرو (یعنی سجدہ کرو) اور قریب ہو جاؤ (آیت سجدہ)۔

سجدہ کی حقیقت

بلندی والوں سے تو قرب ہوتا ہے ترفع سے اور یہاں قرب ہوتا ہے پستی سے۔
 قرب تر پستی بہ بالا اخقن است قرب حق از قید ہستی رستن است

(قرب اس کا نام نہیں کہ نیچے سے اوپر چلے جاؤ بلکہ قرب یہ ہے کہ ہستی سے چھوٹ جاؤ) بس ان کے قرب کا یہی طریقہ ہے کہ ہستی فنا حاصل کر لو اور سجدہ کی حقیقت یہی فنا اور نیاز مندی ہے۔ اس لئے وہ سبب ہے قرب کا۔ خلاصہ یہ کہ اول اول تو قیدیں بری معلوم ہوں گی۔ مگر پھر یہ قیدیں ایسی ہوں گی جیسا کہ شیخ شیرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

اسیرش نخواہد رہائی ز بند شکارش نخواہد خلاص از کمند

(تیرا قیدی قید سے رہائی حاصل کرنا نہیں چاہتا اور تیرا شکار کمند سے خلاصی نہیں چاہتا)

چند روز ایسا کر کے اس کا مشاہدہ کر لو۔ اویس قرنی ہیں یا اور کوئی بزرگ ہیں ان کی یہ حالت تھی کہ ساری رات دو رکعت میں ختم کر دیتے یہاں تک کہ صبح ہو جاتی ہر رات کو ایک ایک رکن کے لئے مقرر کر لیتے۔ ایک دن فرماتے ہیں لیلۃ القیام دوسرے دن فرماتے ہیں لیلۃ المکوع اور اس رات کے اکثر حصہ میں اسی رکن کے اندر مشغول رہتے اور جب تھوڑی رات رہ جاتی تو بقیہ ارکان پورا کر لیتے اور کہتے افسوس کہ مجھے دل بھر کر نماز پڑھنے کا موقع نہیں ملتا۔ کاش کہ ایک رات ایسی ہوتی کہ اس کا ایک سر ازل سے ملا ہوا ہوتا اور دوسرا ابد سے اور اس میں ارمان پورا کرتا آپ کو اس پر تعجب ہوگا مگر عشاق کی شان ہی جدا ہے۔ ان کا تو کبھی دل ہی نہیں بھرتا ان کی تو یہ حالت ہوتی ہے۔

نگویم کہ برآب قادریند کہ بر ساحل نیل مستقی اند

(میں یہ نہیں کہتا کہ پانی پر قادر نہیں، لب دریا ہوتے ہوئے جلد نہر کے بیمار کی طرح پیاسے ہیں)

اور یہ حالت ہوتی ہے

دلآرام دربر دلآرام جو لب از تشنگی خشک و برطرف جو

(محبوب سے ہم کنار اور محبوب کی تلاش، پیاس سے ہونٹ خشک اور لب دریا سیرابی کے طلب گار)

اس وقت یہ قیود زلف یار کی قیود ہو جائیں گے جس کی یہ حالت ہے۔

گرد و صد زنجیر آری یکسلم غیر زلف آں نگار مقہم

(اگر دو سوزنجیریں ہوں تو توڑ دوں، سوائے اپنے محبوب کی زلف کے بندش کے یعنی

سوائے اپنے محبوب کے کسی اور کا گرفتار ہونا برداشت نہیں)

اب تو قیدیں نظر آتی ہیں مگر پھر یہ قیود زلف یار کی قیدیں ہوں گی کہ کبھی ان سے نکلنا نہ چاہے گا۔

خلوت با محبوب

سچ کہتا ہوں کہ جو محبت ہوگا وہ تو یہ چاہے گا کہ خلوت ہو اور محبوب کے ساتھ بے تکلف باتیں

کرنا شروع کر دے گو ساری رات کیوں نہ گزر جائے۔ سو وہ خلوت یہی نماز ہے۔ واقعی اگر نماز نہ ہوتی تو جن کے واقعات بڑھے ہوئے ہیں ان کے لئے کوئی خلوت کی صورت نہ تھی۔ کیونکہ اور تمام عبادات میں بولنا تو ضروری جائز ہے اس لئے ان میں لوگ اس سے بولنے چالنے سے بند نہ ہوتے اور نماز میں ہے اس کی ممانعت۔ اس لئے جہاں نماز شروع کی اور تمام لوگ اس سے بات چیت کرنے سے بند۔ لیجئے نماز میں حق تعالیٰ کے ساتھ خلوت میسر ہوگئی اور یہ خلوت وہ چیز ہے جس کی نسبت مولانا فرماتے ہیں۔

ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست جز خلوت گاہ حق آرام نیست

(کوئی گوشہ بے دود و دھوپ اور بغیر دام کے نہیں ہے سوائے خلوت گاہ حق (کہیں) آرام نہیں ہے) نماز ہی کیا پاکیزہ چیز ہے کہ اس کی وجہ سے خلوت میسر ہوگئی اور جو قیود گراں تھیں انہی کی بدولت آسان ہوگئی اور خلوت بھی ایسی کہ اس کے اندر کوئی بھی حارج ہی نہیں ہو سکتا۔ جب نماز شروع کر دی پھر بادشاہ بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر سورہ بقرہ بھی پڑھو تب بھی کوئی تقاضا نہیں کر سکتا۔ جب نیت باندھ لی اور سب کو ہرادیا۔ ہاں کوئی ظالم ظلم ہی کرنے لگے تو جدا بات ہے۔ ایسی آسان صورت ہے خلوت کی کہ جب کسی سے جی گھبرائے بس اللہ اکبر کہہ کر نیت باندھ لو۔ نمازی کا کوئی کیا کرے گا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ دوست مذاق میں گدگدی اٹھاتے ہیں مگر جب نماز شروع کر دی تو سب الگ بیٹھ جاتے ہیں یہ کاہے کی بدولت ہوا۔ قیود کی بدولت۔ اگر قیود نہ ہوتیں تو لوگ کہتے کہ میاں نماز بھی پڑھو اور باتیں بھی کرو۔ آپ نے دیکھا کہ یہ قیود کیسی قدر کی چیز ہیں اس لئے اہل محبت اس قید کو زلف یار کی قید سمجھتے ہیں کیونکہ یہ خلوت بالمحبوب قیود ہی سے تو میسر ہوئی ہے۔

کیرانہ میں میرے عزیزوں میں ایک درویش تھے۔ وہ خلوت کے لئے دروازہ پر پہرہ چوکی رکھتے نہ تھے کہ یہ لوگوں کا ناگوار ہوتا ہے بلکہ تخیل کی یہ صورت اختیار کی تھی کہ بیٹھک میں عام منظر پر بیٹھتے مگر ہر وقت نفل پڑھتے تھے۔ اگر کوئی ملنے آیا تو سلام پھیر کر اس کا مزاج پوچھا اور پھر نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے۔ پھر سلام پھیر کر دو چار باتیں کیں اور پھر اللہ اکبر کہہ کر نیت باندھ لی خلوت اور انجمن اسی کو کہتے ہیں۔ غرض کہ خلوت کی خلوت تھی اور کوئی برا بھی نہیں مانتا تھا۔

سو یہ نماز ایسی چیز ہے کہ جس وقت خلوت چاہو نماز شروع کر دو بس خلوت ہو جائے گی۔ تو گویا نماز خلوت گاہ حق ہے۔ سو یہ کس وجہ سے خلوت گاہ حق بنی، قیود ہی کی بدولت تو بنی۔ ان قیود

سے معلوم ہو گیا کہ نماز میں بہت بڑا روزہ ہے غرض نماز میں روزہ بھی پایا گیا۔

نماز میں حج

اسی طرح نماز میں حج بھی موجود ہے۔ کیونکہ حج کی حقیقت ہے تعلق بالیت۔ سو نماز میں وہ موجود ہے۔ چنانچہ حکم ہے: **فول وجھک شطرا المسجد الحرام** کہ نماز کے وقت، بیت الحرام کی جانب قصد کر کے رخ کر لیا کرو۔

سو تعلق بالیت نماز کے اندر قلب میں بھی ہے اور ظاہر میں بھی ظاہر میں تو یہ کہ نماز کی حالت میں اسی کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوتے ہیں اور اس کو فرض کر دیا گیا ہے۔ اور قلب میں یہ کہ استقبال کعبہ کی نیت کی جاتی ہے۔ پس جو نماز پڑھے گا اسے برکات حج بھی میسر ہوں گے۔

اسی طرح نماز میں اعتکاف بھی ہے کیونکہ اعتکاف کی روح و حقیقت ہے گناہوں سے رکنا **المعتکف یعتکف الذنوب کلھا**۔ حدیث ہے اور یہ (خصوصیت) نماز کے اندر موجود ہے۔ چنانچہ نماز کے اندر تمام گناہوں سے رکنا ہے۔ نماز میں کون گناہ کر سکتا ہے **ان الصلوۃ تنہی** کی بعض نے یہی تفسیر کی ہے کہ نمازی جب تک نماز میں رہتا ہے اس وقت تک وہ اس کو گناہوں سے روکتی ہے۔ گو اس کی اور تفسیریں بھی ہیں مگر یہ بھی ایک لطیف تفسیر ہے۔ تلاوت قرآن بھی نماز میں موجود ہے جس کے حدیث میں بہت فضائل آئے۔ چنانچہ قرأت نماز میں فرض ہے بدون قرأت نماز ہی نہیں ہوتی۔

نماز کی جامعیت

پس جو شخص نماز پڑھے گا اس کو تلاوت قرآن کے فضائل بھی حاصل ہوں گے۔ خیال تو کیجئے کہ ذرا سی مختصر چیز میں کیا کیا فضائل مل گئے۔ حج بھی مل گیا، روزہ بھی مل گیا۔ تلاوت قرآن بھی اور اعتکاف بھی۔

بعض اذکار کی فضیلت احادیث میں آئی ہے جیسے سبحان اللہ کہ اس کے بارہ میں آیا ہے کہ سبحان اللہ نصف میزان ہے نماز میں وہ بھی موجود ہے چنانچہ رکوع میں پڑھتے ہیں۔ سبحان ربی العظیم اور سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ احادیث میں دعا کے بہت فضائل وارد ہیں اور قرآن میں کہیں کہیں اور خصوصاً فاتحہ میں تو ہر رکعت میں دعا بھی موجود ہے اور وہ نماز میں پڑھا

ہی جاتا ہے۔ نیز درود شریف کے بعد بھی دعا کی جاتی ہے۔ پس نماز میں دعا کے فضائل بھی آگئے۔
 درود شریف کے کتنے فضائل ہیں وہ بھی نماز میں پڑھا جاتا ہے۔

غرض یہ کہ نمازی کسی برکت سے خالی نہیں۔ دعا ہے وہ اس میں موجود ثنا ہے وہ اس میں
 موجود، ذکر مبارک ہے وہ اس میں موجود۔ بعض لوگ اولیاء اللہ کا دم بھرتے ہیں اور ان کے
 تذکرے کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ سوان کا تذکرہ بھی نماز میں موجود ہے۔ چنانچہ ہر رکعت
 میں پڑھتے ہیں۔ اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ اس میں اولیاء اللہ بھی تو آگئے۔

اب زکوٰۃ رہ گئی۔ شاید کوئی کہے کہ نماز میں زکوٰۃ کہاں ہے۔ سو سمجھ لیجئے کہ زکوٰۃ کی روح
 ہے انفاق فی سبیل اللہ۔ ظاہر ہے کہ نماز ننگے تو پڑھو گے نہیں۔ کپڑا تو پہنویں گے اور اس میں خرچ
 بھی ہو ہی گا (خصوصاً اس زمانہ میں کہ کپڑے کی بہت زیادہ قیمت ہو گئی ہے) لہذا انفاق بھی
 ہو گیا۔ اب کون سی عبادت رہ گئی جو نماز میں نہیں۔

شاید کوئی کہنے لگے کہ نماز میں قربانی نہیں تو سمجھ لیجئے کہ قربانی کی حقیقت باطنی ہے۔ اپنے
 کو فنا کر دینا اور اپنی خواہشات کو مٹا دینا۔ سو وہ نماز میں ایسی ہے کہ اپنے نفس سے پوچھو کہ قیود کے
 اندر مقید ہو کر اپنی خواہشات کو چھوڑنا پڑتا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

معنی تکبیر اس است اے ایم	کاے خدا پیش تو ما قبریاں شدیم
وقت ذبح اللہ اکبر سے کئی	ہم چنین در ذبح نفس کشتنی
گوئی اللہ اکبر وایں شوم را	سر بر تا وار ہدا جاں از غنا
تن چوں اسمعیل جاں ہجو خلیل	کرد جاں تکبیر بر جسم بنیل

(تکبیر کی حقیقت یہ ہے کہ اے اللہ ہم تمہارے سامنے قربان ہوتے ہیں.... ذبح کے
 وقت تو تکبیر کہتا ہے ایسے ذبح نفس کے وقت جو مارنے کے لائق ہے اللہ اکبر ہو.... اور
 اس منحوس کا سر کاٹ مارو اور جان کو تکلیف سے رہائی دو.... مثل تن حضرت اسماعیل علیہ
 السلام کے اور جان مانند خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تکبیر بزرگ جسم مانند
 حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اپنا سر اس محبوب حقیقی کے سامنے رکھ اور ہنسی خوشی اس کی
 تلوار کے سامنے جان دے اور اللہ کی بڑائی بیان کر)

غرض کون سی عبادت ہے جو نماز میں نہیں۔

نماز کا وقفہ

پھر یہ کہ چار منٹ میں سب باتیں ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ تخمیناً چار منٹ میں نماز ہو جاتی ہے۔ اول تو نماز ویسے ہی تھوڑی دیر میں ہو جاتی ہے اور اس پر لوگ اور زیادتی کرتے ہیں کہ جلدی جلدی پڑھتے ہیں۔ اس پر ایک حکایت یاد آئی۔ کچھری میں دو ملازم تھے ایک انگریز کی ماتحتی میں۔ ایک تو سررشتہ دار تھے اور دوسرا نائب سررشتہ دار۔ دونوں مسجد میں نماز پڑھنے جاتے۔ نائب سررشتہ دار کو نماز میں بہت دیر لگتی وظیفہ وظائف سے فارغ ہو کر آتے اور سررشتہ دار صاحب الٹی سیدھی ٹکریں مار کر اور کبھی بے پڑھے ہی فوراً چلے آتے۔ ایک روز انگریز نے کہا کہ سررشتہ دار صاحب تم بہت ہی جلد واپس آ جاتے ہو۔ نائب دیر میں آتا ہے۔ یہ کیا بات ہے اس نے جواب دیا، حضور بات یہ ہے کہ نائب سررشتہ دار صاحب نے تو نماز خود اپنی ذات سے سیکھی ہے۔ اس لئے ان کو اچھی طرح یاد نہیں۔ سوچ سوچ کر پڑھتے ہیں اور میرے بڑوں سے نماز چلی آئی ہے۔ مجھ کو خوب مشق ہے اور خوب یاد ہے اس لئے میں جلد پڑھ کر آ جاتا ہوں اور وہ اٹک اٹک کر پڑھتے ہیں اس لئے دیر لگتی ہے۔

غرض بعض کو نماز کی مشق ہوتی ہے کہ انہیں نماز کے شروع کرنے کی تو ضرورت ہوتی ہے پھر انہیں کسی بات کے قصد کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ زبان خود بخود چلتی رہتی ہے جیسے کہ گھڑی کہ اسے کوک (چابی) دینے کی تو ضرورت ہوتی ہے۔ پھر وہ خود بخود چلتی رہتی ہے۔ اسی طرح اللہ اکبر پر تو کوک شروع ہوئی اور سلام پر ختم۔ اگر نماز اس طرح پڑھی جائے تو چار منٹ سے بھی کم لگتے ہیں۔ ایک آقا اور نوکر تھے۔ وہ نماز پڑھنے آتے تو آپس میں بحث ہوتی کہ پہلے کون فارغ ہو۔ نماز شروع کرتے اور ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی کہ پہلے میں فارغ ہوں۔ بس ادھر اللہ اکبر کہتے اور ادھر نماز ختم ہو جاتی۔ ایک شخص نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اذکار تو گھر کر آتے ہو اور اٹھک بیٹھک کر ناباقی رہ جاتا ہے وہ یہاں آ کر بولتے ہو۔

اس پہلے فارغ ہونے پر ایک قصہ ایک ہوشیاروں کے قصبہ کا یاد آیا۔ عید کی امامت میں دو شخصوں میں تنازعہ ہوا۔ اس نے کہا کہ نماز میں پڑھاؤں گا اس نے کہا میں پڑھاؤں گا۔ آخر عین وقت پر دونوں نے ایک دم سے امامت شروع کر دی۔ کچھ ان کے مقتدی ہو گئے کچھ انکے۔ ایک پہلے الحمد پڑھ چکے اور ابھی دوسرے نے ختم نہیں کی تھی۔ جس نے پہلے ختم کی تھی وہ ٹھہر گئے۔ اس خیال سے کہ جو کسی سورۃ یہ پڑھے گا میں اس سے چھوٹی سورۃ پڑھ کر پہلے ختم کر دوں گا اور میری

ہوں گا۔ لہذا اس نے جو سورۃ پڑھی اس نے اس سے چھوٹی سورۃ پڑھ کر اللہ اکبر کہہ کر رکوع کر دیا مقتدی دوسرے امام کے بھی رکوع میں گئے۔ بس اس جماعت کے ایک مقتدی نے اپنے پاس والے کے کہنی ماری اور کہا اونہہ۔ مطلب یہ تھا کہ یہ ہمارا امام نہیں تو رکوع میں کیوں جاتا ہے۔ اس قسم کی حکایات پر ہمیں ہنسی آتی ہے مگر ہم خود اس کے عامل ہیں۔ یہی چاہتے ہیں کہ نماز جلدی ختم ہو۔ سوائے اِنَّا اَعْطَيْنَا اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ کے ہمیں اور کوئی سورۃ ہی یاد نہیں۔ ہاں اگر سلطنت مل جائے یعنی امامت تو پھر دیکھو کیسی کیسی لمبی سورتیں پڑھتے ہیں کہ مقتدی بھی کھڑے کھڑے وبال میں آجائیں۔

کانپور کا واقعہ ہے ایک صاحب امام ہوئے۔ خوب گرمی کا زمانہ تھا۔ جمعہ کا روز۔ انہوں نے سورۃ ق پڑھی۔ کھڑے کھڑے ایک نمازی کو تو ق پڑھ گئی۔ ایک بیچارہ نے اسی روز نماز شروع کی تھی۔ لوگ اسے کہہ سن کر نماز کے لئے لائے تھے جب انہوں نے لمبی لمبی سورتیں پڑھنی شروع کیں تو وہ نیت توڑ کر یہ کہتے ہوئے چلتا بنا اور کہا کہ ہم اسی واسطے تو نماز نہیں پڑھتے۔ اس قسم کے لوگ مناع خیر ہیں۔ حدیث میں مقتدیوں کی بڑی رعایت آئی ہے۔ غرض کہ جب امام ہوتے ہیں تو اس وقت تو ایسی نماز پڑھتے ہیں اور جب تنہا پڑھتے ہیں تو ایسی کہ قُلْ مَرْوٰی نے پڑھی تھی۔ قصہ اس کا یہ ہے کہ اس نے بادشاہ کو حنفیہ سے بدگمان کرنے کے لئے کہا کہ میں آپ کو حنفیوں کی نماز پڑھ کر دکھاؤں گا۔ پس اس نے چھوٹی سی تہہ باندھی کہ ناف تو کھلی رہی اور گھٹنے ڈھک گئے اور اللہ بزرگ است کہہ کر نماز شروع کی اور برگ سمز کہہ کر رکوع کر دیا اور رکوع میں جاتے ہی بلا تسبیح کہے سیدھے سجدہ میں چلے گئے۔ اسی طرح تمام نماز پڑھی اور قعدہ اخیرہ تشہد پڑھ چکے تو بجائے سلام کے زور سے ایک گوزر سید کیا۔

اس نے تو تمسخر سے نقل کی تھی باقی ہماری اصل نماز بھی ایسی ہی ہے نہ تعدیل ارکان کرتے ہیں نہ اس کا اور کوئی حق ادا کرتے ہیں۔ بس جلدی اتنی ہوتی ہے کہ کچھ ٹھیک نہیں۔ ادھر اللہ اکبر کہا ادھر ختم۔ میں کہتا ہوں کہ اگر سنبھال کر پڑھیں تو بھی چار منٹ صرف ہوتے ہیں۔ پھر اور جلدی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ چار منٹ کی تو بات ہے۔ اتنی دیر میں ثواب کے ڈھیر کے ڈھیر لے کر چلے آؤ گے۔

خود کہ یا بی ایس چنیں بازار را کہ بیک گل مے خری گلزار را

نیم جاں بستاندہ و صد جاں دہد آنچہ دردہمت نیاید آن دہد

(ایسا بازار کہاں مل سکتا ہے کہ ایک پھول کے بدلے میں چمن ہی خرید لے۔ حقیر وفانی جان لیتے ہیں اور باقی جان عطا فرماتے ہیں۔ تمہارے وہم و گمان میں نہیں آ سکتا جو کچھ عطا فرماتے ہیں) چارمنٹ میں اتنی دولت! افسوس ہے کہ اس پر بھی ہمارے بھائی نماز پڑھنے میں پس و پیش کرتے ہیں اور حالت یہ ہے کہ چوپالوں میں باتیں گھڑتے رہتے ہیں میں کہتا ہوں کہ مسجد میں باتوں ہی کے واسطے چلے آیا کرو۔ پھر اس کی اصلاح بھی ہو جائے گی۔ آؤ تو سہی۔

بہر حال نماز کی ہیئت بتلا رہی ہے کہ نماز تمام عبادات میں ممتاز ہے۔ اپنے باطن سے بھی کہ اس کے اندر تمام عبادات موجود ہیں اور اپنے ظاہر سے بھی کہ جیسے نماز کی ہیئت خشوع و خضوع کی ہے اور کسی عبادت کی نہیں۔ اسی طرح ذکر میں۔

نماز کی صورت

ذکر میں جتنے منافع ہیں وہ بھی نماز میں ہیں۔ کیونکہ ہر عمل کی ایک ہیئت ہوتی ہے اور ایک روح اور ضروری دونوں ہی ہوتی ہیں۔ سو نماز کی روح ذکر ہے چنانچہ ارشاد فرمایا:

اقم الصلوٰۃ لذکری۔ کہ میری یاد کرنے کے لئے نماز پڑھا کیجئے۔

پس جو منافع ذکر کے ہوں گے۔ نماز میں وہ بھی ہوں گے۔ بس نماز تمام فضائل کی جامع ہوئی اپنے ان اسرار کے بیان کرنے پر اس وقت کے مناسب ایک کام کی بات یاد آئی۔ وہ یہ کہ اس زمانہ میں بعض لوگوں نے ہر چیز کے اسرار ایسے طور پر بیان کرنے شروع کئے ہیں کہ گویا اس عمل سے مقصود ہی اسرار راز ہے۔ سمجھ لیجئے کہ اگر یہی طرز رہا تو شاید چند روز میں الحاد تک نہ بہت آجائے۔ کیونکہ جب ہر عمل کے اسرار اور ارواح بطور مقصود کے بیان کئے جائیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صرف ارواح کو ضروری سمجھیں گے اور صورت کی طرف سے بے اعتنائی ہو جائے گی اور اس سے اندیشہ ہے کہ عبادت کی صورت نہ چھوٹ جائے۔ کیونکہ جب کہ ان کے نزدیک عبادت کی روح تو ضروری ہوگی اور اس کی صورت ضروری نہ ہوگی تو اس صورت کی قید کو حذف کر دیں گے اور مطلق ذکر پر اکتفا کریں گے مثلاً نماز کہ اس کی ہیئت کو چھوڑ دیں گے اور مطلق ذکر پر اکتفا کریں گے۔

چنانچہ آج کل ایک راز اور برکت نماز کی یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ جماعت کی نماز سے اتفاق ہوتا ہے اور اس کی یہ ترتیب بتلائی جاتی ہے کہ پانچوں نمازوں میں تو محلہ کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ پھر جمعہ میں شہر کے لوگ۔ پھر اس کی ضرورت ہے کہ دیہات کے لوگ جمع ہوں اس

کیلئے عید ہے۔ پھر ضرورت ہے کہ مختلف ولایتوں کے لوگ جمع ہوں اس کیلئے حج تجویز کیا۔ پس یہ عبادات ایسی چیز ہیں کہ ان میں اتفاق کی رعایت رکھی گئی ہے۔

یہ عنوان تو بہت اچھا ہے اور بہت خوب صورت ہے مگر اس کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ عبادات بنفسہا مقصود نہیں بلکہ بمصالحہا مقصود ہیں۔ اس کا مال کسی وقت میں یہ ہوگا کہ اگر اغراض بدون ذرائع کے حاصل ہو جائیں گی تو نفس کہے گا کہ مقصود تو حاصل ہو ہی گیا۔ اب ان اعمال کی کیا ضرورت ہے۔ اس سے الحاد کا باب کھلتا ہے۔ یہ باتیں عوام الناس کے سامنے ہرگز نہ بیان کی جائیں اور اگر بیان کریں بھی تو کہہ دیں کہ عبادات تو بنفسہا ہی مقصود ہیں۔ ہاں ان سے یہ مصالح بھی حاصل ہوتے ہیں جیسے کوئی حج کی ترغیب دے اور کہے کہ حج کرنے سے ایسے ایسے منافع حاصل ہوتے ہیں کہ مکہ کی سیر ہوتی ہے۔ دریا پہاڑ، شہر دیکھنے میں آتے ہیں مگر یہ چیزیں مقصود نہیں ہیں۔ مقصود اصلی رضا حق ہے۔ ہاں اس سے یہ منافع بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اعمال پر جو مصالح مرتب ہوتے ہیں وہ مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بنفسہا یہی اعمال ہیں خواہ یہ مصالح نہ بھی مرتب ہوں۔

نماز کی روح

بیان یہ ہو رہا تھا کہ ذکر نماز کی روح ہے۔ درمیان میں ایک کام کی بات بھی بیان کر دی اور چونکہ ذکر نماز کی روح ہے اسی واسطے نماز کی فضیلت کے موکد کے لئے فرماتے ہیں۔

وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ . کہ اللہ کا ذکر بڑی چیز ہے

اس لئے نماز میں اگر یہ خاصیت ہو کہ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ (برائیوں سے روکتی ہے) تو تعجب کی بات نہیں ہے بعض لوگ یہ کہنے لگے کہ ذکر بڑھ کر ہے یعنی نماز سے بھی۔ پس ذکر ہی کر لیا کریں نماز نہ پڑھیں۔

اس کا ایک لطیف جواب میرے عرض سابق سے نکل آیا یعنی وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ (اور اللہ کی یاد بڑی چیز ہے) کا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ذکر اللہ نماز سے بڑھ کر ہے بلکہ یہ علت ہے ماقبل کی۔ پہلے نماز کی ایک خوبی بیان کی ہے اب آگے اس کی علت بتلاتے ہیں مطلب یہ ہے کہ نماز کی یہ خاصیت ہے کہ وہ برائیوں سے روکتی ہے۔ مگر یہ خاصیت اس کی کیوں ہوئی اس لئے ہوئی کہ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ (اس کی روح ہے ذکر اللہ اور) اللہ کا ذکر بڑی چیز ہے اور ہر پہلو سے مفید ہے طبع سے، عقل سے، عشق سے۔ عشاق کی نظر تو بس اس خاصیت پر ہے۔

ان ذکر نی فی نفسہ ذکر تہ فی نفسی وان ذکر نی فی ملأ ذکر تہ
فی ملا خیر منہم

یعنی جودل میں یاد کرتا ہے تو خدا اس کو دل میں یاد کرتے ہیں (خدا دل سے پاک ہے
مگر صرف شاکلۃ ایسا فرما دیا) جو مجمع میں یاد کرے تو حق تعالیٰ اس کو مجمع میں یاد کرتے ہیں۔
گویا ذکر کرنے سے حق تعالیٰ کے مذکور بنے۔ عاشق کے لئے کون سی دولت اس سے زیادہ
ہوگی کہ اس کا محبوب اس کو یاد کرے۔ اول تو عاشق کو محبوب کا نام لینا ہی نہایت پیارا معلوم ہوتا ہے
اور پھر اس کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں کہ محبوب اس کا نام لے۔

یہاں سے ایک بڑی بشارت معلوم ہوئی کہ جیسے ہم خدا تعالیٰ کو چاہتے ہیں ایسے ہی وہ بھی ہم
کو چاہتے ہیں۔ مگر ان کے چاہنے کا بظاہر اعلان نہیں ہوتا۔ اخبار و آثار سے معلوم ہوتا ہے۔ مولانا
فرماتے ہیں ۔

عشق معشوقاں نہاں است و ستیز عشق عاشق باد و صد طبل و نفیر

لیک عشق عاشقاں تن زہ کند عشق معشوقاں خوش و فر بہ کند

(معشوقوں کا عشق پوشیدہ اور چھپا ہوا ہے، عاشق کا عشق دو سو طبل اور شہنائیوں کے ساتھ
ظاہر و باہر ہے لیکن عاشقوں کا عشق دبا کر دیتا ہے اور معشوق کا عشق مونا اور فر بہ کر دیتا ہے۔)

سو جیسے عاشق معشوق کا طالب ہوتا ہے اسی طرح معشوق عاشق کا طالب ہوتا ہے ۔

تشنگاں گر آب جو ننداز جہاں آب ہم جوید بعالم تشنگاں

(پیا سے اگر پانی کے متلاشی ہیں تو پانی بھی ان کا طالب ہے)

قرب خداوندی

بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ کو بندہ سے جتنی محبت ہے اتنی بندہ کو حق تعالیٰ سے نہیں ہے
اور اس کی دلیل یہ ہے کہ محبت موقوف ہے معرفت پر اور ظاہر ہے کہ جیسی معرفت بندہ کی خدا کو
ہے بندہ کو خدا کی نہیں۔ اور یہی معنی ہیں آیت ونحن اقرب الیہ من جبل الوریڈ (ہم
اس کے شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں) کے کہ علماء و معرّفہا بندے ہم سے قریب ہیں و نعلم
ما تو سوس بہ نفسہ (تمہارے جی میں جو وسوسہ آتا ہے ہم اس کو (بھی) جانتے ہیں)۔ اسی
وجہ سے نحن اقرب فرمایا کہ ہم قریب ہیں انتم اقرب الینا نہیں فرمایا کہ تم بھی ہم سے قریب

ہو۔ سو اس سے قرب حقیقی مراد ہوتا تو دونوں طرف سے قرب ہوتا کیونکہ یہ قرب نسب متکررہ سے ہے۔ اگر ایک طرف سے قرب ہوگا تو دوسری طرف سے بھی ضرور ہوگا۔

رہا قرب علمی سو اس میں یہ ضرور نہیں کہ اگر ایک طرف سے قرب ہو تو دوسری طرف سے بھی ہو۔ تو قرب علمی خدا کی طرف سے تو ہے۔ اس لئے کہ ان کا علم کامل ہے اور بندہ کی طرف سے نہیں کیونکہ بندہ ہے غافل۔ پس بندہ تو خدا سے دور ہوا اور اللہ تعالیٰ بندہ سے قریب۔ غرض حق تعالیٰ کو پوری معرفت ہے اور معرفت ہی پر مدار ہے محبت کا۔ اس لئے ان کو پوری محبت ہوگی ہم سے۔ اگر کوئی کہے کہ حق تعالیٰ کو بندہ کی معرفت تو ہے مگر عیوب کے ساتھ کیونکہ بندہ میں ہزاروں عیب ہیں۔ پس جب اس کی معرفت ہوئی تو اس کے ساتھ اس کے تمام عیوب کی بھی معرفت ہوئی۔ سو جس معرفت کے ساتھ عیوب کی بھی معرفت ہو تو وہ محبت کا سبب نہیں ہو سکتی۔ تو میں کہوں گا کہ یہ اس سے کہو جو صورت پر مرتا ہو۔ جو صورت کا عاشق ہوتا ہے عیوب پر مطلع ہونے سے اس کو محبت نہیں رہتی۔

اللہ کی محبت

حق تعالیٰ کو جو ہم سے محبت ہے تو وہ اس لئے نہیں کہ ہمارے اندر کوئی خوبی ہے بلکہ اس لئے ہے کہ ہم ان کے بنائے ہوئے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ آپ نے اپنی قوم پر بددعا کی۔ قوم ہلاک ہو گئی۔ سب کچھ ہو جانے کے بعد حق تعالیٰ کا حکم ہوا کہ فلاں جگہ جا کر چالیس برس تک مٹی کے برتن بناؤ۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد حکم ہوا کہ سب کو ایک طرف سے توڑ ڈالو۔ چنانچہ انہوں نے توڑنا شروع کیا مگر دل پر بہت صدمہ تھا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ توڑنے سے کچھ دل بھی دکھا۔ عرض کیا کہ دل تو بہت دکھا۔ ارشاد ہوا کہ بس ایسے ہی اپنی مخلوق کو ہلاک کرنا ہم کو ناگوار ہوگا جیسے برتن تمہارے بنائے ہوئے تھے اسی طرح بندے ہمارے بنائے ہوئے تھے۔

قارون کے قصہ میں دیکھئے کہ وہ تو کہہ رہا تھا کہ اے موسیٰ مجھ کو بچاؤ اور آپ فرماتے تھے خذ یا ارض کہ اے زمین اسکو پکڑ۔ یہاں تک کہ بالکل زمین میں دھنس گیا۔ حق تعالیٰ کی طرف سے خطاب ہوا کہ اگر ہمیں ایک دفعہ بھی پکارتا تو ہم فوراً بچا لیتے۔

عتاب میں عنایت

سیر میں ہے کہ جب بندے گناہ کرتے ہیں تو زمین آسمان کہتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں حکم دے کہ ہم ان پر ٹوٹ پڑیں۔ اس پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندوں کو تم نے تھوڑا ہی بنایا

ہے۔ سو حق تعالیٰ کی بندوں سے اس قدر محبت ہے۔ حتیٰ کہ حق تعالیٰ کے عتاب تک میں بھی عنایت ہوتی ہے چنانچہ ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَوْ يَؤُا خِذَاللّٰہِ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَکْ عَلٰی ظَہْرِہَا مِنْ دَآبَۃٍ .

اگر اللہ میاں لوگوں کے اعمال پر مواخذہ کرتے تو کسی جاندار کو زمین پر نہ چھوڑتے۔
بظاہر یہ کلام بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔ مقدم اور تالی میں بظاہر علاقہ نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ ظاہر تو ہے کہ یوں فرماتے:

وَلَوْ يَؤُا خِذَاللّٰہِ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَکْ عَلَیْہِمَا مِنْ بَشَرٍ .

کہ اگر آدمیوں سے مواخذہ فرماتے تو زمین پر کسی آدمی کو نہ چھوڑتے۔
نہ یہ کہ مواخذہ تو صرف آدمیوں سے فرماتے اور ہلاک جانوروں کو بھی کر دیتے۔ بظاہر یہ بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ سو بات یہ ہے کہ عین عتاب میں بھی ان کا شرف بتلایا ہے کہ مقصود بالخلق انسان ہی ہے اور دوسری چیزیں اسی کے واسطے بنائی گئی ہیں تو اگر ان سے مواخذہ کرتے تو ان میں سے کسی کو نہ چھوڑتے اور جب ان کو نہ رکھتے تو جانور نرے کیا کرتے۔

کیا رحمت ہے کہ عتاب میں بھی ہمارا شرف بیان کیا جا رہا ہے کہ انسان ہی اشرف المخلوقات ہے حق تعالیٰ کا انعام دیکھئے کہ جو تیاں لگائیں مگر قدر و منزلت نہیں گھٹائی بھلا ایسا آقا مل سکتا ہے۔
ایسے آقا کا یہی ادب اور یہی معاملہ ہے جیسا ہم کر رہے ہیں۔

حق تعالیٰ کی رحمت

حق تعالیٰ کو محبت ہم سے اس حیثیت سے ہے کہ ہم اس کے بنائے ہوئے ہیں گو مطیع نہ ہوں اور جو اطاعت کرے اس کو پوچھنا ہی نہیں ان پر تو لمحہ بر لمحہ فخر کرتے ہیں۔

اگر کوئی ذکر کا جلسہ ہوتا ہے مثل وعظ وغیرہ کے تو جب فرشتے یہاں سے لوٹ کر جاتے ہیں تو ان سے پوچھتے ہیں کہ میرے بندے کیا کر رہے ہیں وہ عرض کرتے ہیں کہ آپ کی تسبیح اور تحمید کر رہے ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں فرشتے عرض کرتے ہیں جنت کو طلب کرتے ہیں اور دوزخ سے پناہ مانگتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ گواہ رہو میں نے سب کو بخش دیا۔
فرشتے عرض کرتے ہیں کہ ان میں ایک شخص آپ کے ذکر کیلئے نہیں آیا تھا بلکہ کسی کام کے لئے

آیا تھا۔ اس کا مقصود اس جلسہ میں شرکت نہ تھی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کو بخش دیا۔ اس لئے کہ ہم قوم لا یشقى جلسہم (یہ ایسے لوگ ہیں جنکے ساتھ بیٹھنے والے محروم نہیں) اب رہی یہ بات کہ بندوں کی حالت فرشتوں سے کیوں پوچھتے ہیں۔ انہیں تو ویسے ہی بدوں فرشتوں کے تمام باتوں کا علم ہے۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتوں نے ایک دفعہ ہمارے متعلق ایک بات کہہ دی تھی جس سے اب تک ان کا پیچھا نہیں چھوٹا۔ سوان سے پوچھ کر یہ بتلاتے ہیں کہ دیکھو یہ وہی تو ہیں جن کے بارہ میں تم نے ایسا کہا تھا۔ فرشتوں کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ فرشتوں نے کہا تھا:

اتجعل فیہا من یفسد فیہا۔ کہ آپ زمین میں ایسے کو خلیفہ بناتے ہیں جو اس میں فساد کرے۔

من سے مراد عام تھا کہ وہ سب ایسے ہی ہوں گے۔ سو وہ موجبہ کلیہ کے مدعی تھے پس سالبہ جزئیہ ان کے مقابلہ میں کافی ہو گیا (یعنی ایک ایسے شخص کا پیش کر دینا جو مطیع کامل ہو ان کی موجبہ کلیہ توڑنے کے لئے کافی ہے۔ یہ نہیں کہ سارے مطیع ہوں تب ہی ان کا جواب ہو سکے، سو فرشتے ایک دفعہ ہم پر اعتراض کرنے سے پکڑے گئے۔ آج تک ان کا پیچھا نہیں چھوٹا۔ جب کوئی موقع ہوتا ہے تو حق تعالیٰ جتلا دیتے ہیں۔

اسی طرح فرشتوں کی بدلی ہوتی ہے عصر اور صبح میں۔ جو فرشتے عصر کے وقت آئے تھے وہ صبح کے وقت رخصت ہوتے ہیں اور ان کی بجائے دوسرے فرشتے آتے ہیں۔ پھر وہ عصر کے وقت چلے جاتے ہیں۔ اور دوسرے آ جاتے ہیں۔ جب واپس ہو کر جاتے ہیں تو ان سے پوچھا جاتا ہے کہ ہمارے بندے کیا کر رہے تھے وہ عرض کرتے ہیں کہ یا الہی جب ہم گئے تھے جب بھی نماز پڑھ رہے تھے اور واپسی کے وقت بھی نماز پڑھتے چھوڑا اللہ میاں دونوں وقت فرشتوں کو جتلا دیتے ہیں اور بدلی بھی خاص اس وقت میں کرتے ہیں۔ جو ہنر کا وقت ہے۔ اور اسی وقت کی حالت پوچھتے ہیں کہ میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑ کر آئے۔ حالانکہ فرشتے دیکھتے سب ہیں جو کچھ بھی بندے کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی شان ہے یعلمون ماتفعلون (جو تم کرتے ہو وہ اسے جانتے ہیں) مگر ان سے صرف اسی وقت کی حالت پوچھتے ہیں۔ بلا پوچھے وہ خود کہہ نہیں سکتے۔ سو مطلب یہ ہوا کہ دیکھو سب کچھ مگر خوبی کے سوا اور کچھ مت کہو۔ صرف خوبی کی بات کہو برائی کی بات مت کہو

صاحبو۔ حق تعالیٰ کو اتنی محبت ہے بندوں سے اور بندے بیچارے کیا محبت کریں گے۔ اگر تم کو حق تعالیٰ سے محبت ہے تو یوں سمجھو کہ ادھر اس سے زیادہ محبت ہے۔ غرض کہ عشاق کے نزدیک

تو ذکر کا یہی نفع ہی سب کچھ ہے کہ خدا تعالیٰ ہم کو یاد کریں۔ اور اگر سچ پوچھو ہم تو یاد کرنے کے قابل نہیں کیونکہ ان کا ذکر جتنے ادب سے ہونا چاہیے یہاں اس کا عشرِ عشر بھی نہیں۔ بھلا حاکم دنیا کا نرانا نام تولو۔ کیا کچھ عتاب ہو کہ ہمارا نام لیتا ہے اور وہاں سے حکم ہے نام لینے کا۔ یہ کتنی بڑی رحمت ہے۔ ہماری تو زبان بھی نام لینے کے قابل نہیں۔ ہماری زبان کیسی ہے۔

ہزار یارِ یثویم دہن بمشک و گلاب ہنوز نام تو گفتن کمال ہے ادبی است
ہم تو مشک و گلاب سے منہ کو صاف کریں تب بھی نام لینے کے قابل نہ ہوں مگر رحمت دیکھئے
کہ پھر بھی ہمارے یاد کرنے پر وہ ہم کو یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے فاذا کرونی اذکرکم
(پس تم مجھے یاد کرو۔ میں (اپنی عنایت سے) تمہیں یاد کروں گا)۔ اے صاحبو! محبوب کا محبت کو یاد کرنا تھوڑی بات ہے ہمیں اس کی قدر نہیں۔

صحابہ کی حالت دیکھئے۔ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی ابن کعبؓ سے فرمایا کہ مجھ کو اللہ نے حکم کیا ہے تمہارے سامنے قرآن پڑھنے کا۔ اس پر ابی کعبؓ نے کہا۔ اللہ سمانی۔ کیا اللہ نے میرا نام لیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نعم! ہاں! انہوں نے تمہارا نام لیا ہے۔ اس پر ابی ابن کعبؓ رونے لگے۔ محبوب کے نام لینے کی قدر ان حضرات کو تھی۔

کوئی کہے کہ یہ تو خوشی کا موقع تھا اس وقت رونا کیسا تو سمجھ لو کہ رونا ہمیشہ غم ہی کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ایک رونا خوشی کا ہے اور ایک غم کا اور ایک رونا ہے گرم بازارِ عشق کا تو یہ رونا عشق تھا۔ بہر حال نماز کی روح ہے ذکر اور ذکر کی خاصیت یہ ہے تو نماز کی بھی یہ خاصیت ہوئی۔

ذکر کی خاصیت

اس کے علاوہ ذکر کی ایک خاصیت یہ ہے کہ ذکر کو کوئی خطرہ اور پریشانی نہیں رہتی اور یہ بات عقل اور طبع دونوں اعتبار سے ہے۔ عقلاً تو اس لئے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔
فاذا کرونی اذکرکم کہ تم اللہ کو یاد کرو وہ تمہیں یاد کریں گے۔

پس جب کوئی شخص خدا کی یاد کرے گا اس کے ساتھ یہ بھی سمجھے گا کہ خدا تعالیٰ مجھ کو یاد کرتے ہیں اور قاعدہ ہے کہ جب کسی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاکم ہمارا خیال رکھتا ہے تو پھر اس کو کچھ خطرہ نہیں رہتا۔ پس حق تعالیٰ کو یاد کرنے سے اس کو کسی قسم کا خطرہ نہ رہے گا۔

اور طبعا اس لئے کہ یہ امر طبعی ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو یاد کرتا ہے تو اس کو اور ہر طرف سے یکسوئی ہو جاتی ہے۔ یعنی جس کو یاد کرتا ہے اسکے ساتھ کوئی چیز قلب میں جمع نہیں ہوتی۔ پس جب خدا تعالیٰ کو یاد کریں گے تو ان کے ساتھ یکسوئی ہوگی۔ یکسوئی ہو جانے سے پھر کسی (اور) طرف التفات نہیں ہوتا۔ اور پریشانی مختلف پہلوؤں پر التفات کرنے سے ہوتی ہے اس لئے ذکر سے کسی قسم کی پریشانی نہیں رہ سکتی اور میں اس پر قسم کھاتا ہوں اور گو یہ بات اپنے بزرگوں کی تقلید سے کہہ رہا ہوں کہ خدا کے یاد کرنے والے کے پاس دنیا کی نہ پریشانی ہے، نہ بزرخ کی نہ آخرت کی، نہ پل صراط کی۔ مگر میں اس کو سائنس کی رو سے سمجھائے دیتا ہوں۔

وہ یہ کہ قاعدہ کلیہ ہے کہ جب کوئی چیز (ذہن میں) پائی جاتی ہے تو اس کا مقابل نہیں رہتا اور پریشانی مقابل ہے یکسوئی کی۔ پس جب یکسوئی آئی تو اس کا مقابل کہاں۔ پس جو شخص حق تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہو گا وہ ہرگز پریشان نہیں ہو سکتا۔

مولانا فرماتے ہیں ۔

ہج کنجے بے دود بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست
(کوئی گوشہ بے دود و دھوپ اور بغیر دام کے نہیں ہے، سوائے خلوت گاہ حق کے) (کہیں) آرام نہیں ہے)

باقی اللہ کے سوائے جہاں بھی پناہ لو گے آفت سے چھٹکارہ نہ ہوگا۔

گر گریزی بر امید راحت ہم ازا آنجا پشت آید آفتے
(اگر کسی راحت یا آرام کی جگہ پر بھاگتا ہے تو اس جگہ بھی تجھ کو کوئی آفت پیش آئے گی)

پس جب سارے ٹھکانے ایسے اور ایک ٹھکانا ایسا تو اسی کو اختیار کرنا چاہیے۔ اور ذکر کی اس خاصیت کا رات دن مشاہدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اہل اللہ کی حالت دیکھ لیجئے وہ فقر و فاقہ میں اور طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہوتے ہیں واللہ تکلیف ان کے جسم تک محدود رہتی ہے۔ پریشانی جس کا نام ہے وہ کبھی نہیں ہوتی، اور وہ ہر زبان حال یہ کہتے ہیں۔

کوئے نومیدی مرد کارمید ہاست سوئے تاریکی مرد خورشید ہاست

(ناامیدی کی راہ نہ جاؤ، بہت سی امیدیں ہیں تاریکی کی طرف نہ چلو بہت سے آفتاب ہیں)

ایک راز اس کا کہ اہل اللہ کو پریشانی نہیں ہوتی یہ بھی ہے کہ یہ ہر واقعہ اللہ کی طرف سے سمجھتے

ہیں اور اللہ سے ہے ان کی محبت۔ اس لئے جو بات بھی ان کو پیش آئے گی وہ اس کو محبوب کی طرف سے سمجھیں گے۔ جب یہ ہے تو پھر پریشانی کہاں۔ محبوب کی تو مار بھی ناگوار نہیں ہوتی۔

دیکھئے اگر کوئی عاشق چلا جا رہا ہو اور محبوب پیچھے سے آ کر اس کے زور سے دھول لگائے اور یہ پیچھے پھر کر دیکھے کہ میرا محبوب ہے تو خوشی میں آ کر کہے گا وہ تو آپ ہیں!

اب تمنا ہوگی کہ ایک اور مارے۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس تکلیف کو راحت سے کس چیز نے مبدل کر دیا۔ بس انتساب الی المحبوب نے کہ وہ دھول چونکہ محبوب کا مارا ہوا ہے۔ اس لئے وہ راحت ہو گئی۔ اسی طرح مصائب میں اہل اللہ کی حالت ہوتی ہے چونکہ وہ محبوب کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں اور مصائب کو محبوب کی طرف سے سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کو اس سے عین راحت ہوتی ہے وہ تو بر زبان حال یہ کہتے ہیں۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من دل فدائے یار دل رنجان من

صبر کا طریقہ

یہی راز ہے اس کا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہود کے اس قول سے بہت صدمہ ہوا کہ خدا آسمان پیدا کر کے تھک گیا تو اس نے یوم السبت میں آرام کیا۔ تو اس پر حق تعالیٰ نے پہلے ان کے قول کی تردید میں یہ آیت نازل کی:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا مَسْنَانٌ لِّغُوبٍ.

(اور ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہیں ان سب کو چھ دن میں پیدا کیا اور ہم کو تھکان نے چھو تک نہیں)

اس کے بعد ارشاد ہوا فاصبر علی ما یقولون (پس ان کی باتوں پر صبر کیجئے)۔ مگر صبر کیسے کریں اتنے بڑے صدمہ پر تو آگے اس کی ترکیب بتلائی و سبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل الغروب (اور اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہیے) (اس میں نماز بھی داخل ہے) سورج نکلنے سے پہلے (نماز فجر) اور چھپنے سے پہلے (ظہر و عصر)۔ طریقہ صبر کا کیا ہے۔ وہ یہ کہ آؤ ہم سے باتیں کرنے کھڑے ہو جاؤ بس سب رنج و صدمہ جاتا رہے گا۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے رنج پہنچایا اور محبوب کہے کس جھگڑے میں پڑے ہو آؤ ہم سے باتیں کر لو۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس شخص کو صدمہ رہے گا۔

ایک اور جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے واصبر لکم ربک فانک باعینا۔ کہ آپ صبر کیجئے۔ آپ تو ہماری نگاہ کے سامنے ہیں۔ یہ عاشقانہ لم اور تدبیر ہے رنج کے دور کرنے کی۔ میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں اس سے اس کی تفسیر سمجھ میں آجائے گی وہ یہ کہ کسی پر ایک شخص عاشق تھا۔ اس کے سودرے مارے گئے، ننانوے درہ تک آہ بھی منہ سے نہ نکلی، اخیر میں ایک درہ لگا تو منہ سے آہ نکلی کسی نے پوچھا کہ ننانوے تک تو تیرے منہ سے کچھ بھی نہ نکلا اور ایک درہ میں یہ حال ہوا۔ عاشق نے کہا کہ ننانوے درہ تک تو میرا محبوب کھڑا ہوا مجھ کو دیکھ رہا تھا۔ اس وجہ سے کچھ تکلیف نہیں معلوم ہوئی اور اخیر درہ میں وہ چلا گیا تھا۔ دیکھتا تھا اس لئے آہ نکلی اسی واسطے ایک عاشق کہتا ہے۔

ہینم بس کہ داند ماہر دیم کہ من نیز از خریدارام اویم

(یہی کافی ہے کہ میرا محبوب جان لے کہ میں اس کے خریداروں میں سے ہوں)

اس کا بڑا حظ ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے۔ بس بڑی تسلی اہل اللہ کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر تسلی کا اور کوئی درجہ ہی نہیں۔ اور دنیا میں بھی اس قسم کے سینکڑوں واقعات موجود ہیں کہ محبوب مجازی کے دیکھنے سے تمام تکالیف راحت ہو گئی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اہل اللہ چونکہ حق تعالیٰ میں مشغول ہوتے ہیں اور ہر مصیبت انہی کی طرف سے سمجھتے ہیں اس وجہ سے انہیں کسی بات سے پریشانی نہیں ہوتی اور چونکہ یہ رنگ ان کا مرنے کے وقت بھی موجود رہتا ہے، زائل نہیں ہوتا، اس لئے جیسے زندگی کے واقعات میں انہیں پریشانی نہیں ہوتی اسی طرح مرنے کے وقت بھی پریشانی نہیں آتی۔

موت کی پریشانی

پھر اوپر سے اہل اللہ کو موت کے وقت یہ بشارت بھی دی جاتی ہے وابشروا بالجنة التي كنتم توعدون نحن اولياءكم في الحياة الدنيا وفي الآخرة موت کے وقت کہا جاتا ہے کہ گھبرانا مت۔ بعض لوگوں نے بیان کیا کہ بعض لوگوں کو طاعون کے زمانے میں مرتے دیکھا کہ وہ اپنے باپ اور استاد کا نام لے رہے تھے کہ وہ کھڑے ہیں اور ہم کو بلارہے ہیں۔ وہ مانوس شکل میں فرشتے تھے تا کہ یہ گھبرائیں نہیں۔ سو اہل اللہ مرنے کے وقت بھی خوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ کے مرنے کا وقت قریب تھا اور وہ خوشی میں آکر کہہ رہے تھے۔

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(اب وہ وقت آ گیا کہ میں عریاں ہو جاؤں جسم کو چھوڑ کر سراسر جان ہو جاؤں)

کیا یہ لوگ بیہودہ تھے جو ایسا کرتے تھے۔ واقع یہ ہے کہ ان کو اس وقت نہایت خوشی کا عالم ہوتا ہے پھر قبر میں دیکھئے ان کے لئے کیا خطاب ہوتا ہے۔ جس وقت منکر نکیر آتے ہیں اور سوال کرنے ہیں اور یہ جواب دیتے ہیں تو حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے :

ان صدق عبدی . کہ میرے بندہ نے سچ کہا

اس کے لئے جنت کی طرف دروازہ کھول دو۔ غرض سب راحت کا سامان کر دیا جاتا ہے۔

پھر قیامت میں دیکھئے جو کہ بڑی گھبراہٹ کا وقت ہے کہ انہیں اس وقت بھی کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ چنانچہ ارشاد ہے :

لا یحزنہم الفزع الاکبر . کہ ان کو فزع اکبر بھی گھبراہٹ میں نہ ڈالے گی۔

مولانا فضل الرحمن صاحب کو میں نے یہ اشعار پڑھتے ہوئے سنا۔ گویا وہ اس کا ترجمہ ہے۔ فرماتے تھے۔

عاشقاں را روز محشر یا قیامت کا رنہست عاشقاں را جز تماشائے جمال یار نیست

رہا دوزخ، سو اس میں اول تو جائیں گے کیوں! وہ تو ان سے الگ رہنا چاہے گا چنانچہ

حدیث میں ہے کہ دوزخ کہے گا۔ جزیا مومن فان نودک قد اطفاناری کہ اے مومن جلدی سے گزر جا تیرا نور تو میری آگ کو بجھائے دیتا ہے۔

جب دوزخ خود ان سے پریشان ہوگی تو وہ انہیں کیا جلانے گی۔ یہی اسے ٹھنڈی کر دیں

گے پھر ایسے لوگوں کو کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔

میں اہل اللہ کی راحت کا ایک فوری درجہ ادراک بتلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ اللہ والوں کے پاس دس منٹ

کے لئے بیٹھ جائیے۔ ان کے پاس بیٹھنے سے آپ کے قلب میں بھی اطمینان ہو جائے گا۔ پس جب پاس

بیٹھنے والے کو اطمینان ہو جاتا ہے تو ان کے اطمینان کو کیا پوچھتے ہو۔ بس اللہ کے ساتھ تعلق پیدا کرنا چاہیے

جس سے ہر موقع پر اطمینان ہو کہیں بھی پریشانی نہ ہو۔ نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ دیکھی ذکر کی برکت۔

نماز کی برکت

سو یہ تمام برکت نماز کی بھی ہے کیونکہ وہ بھی ذکر ہے اسی واسطے فرماتے ہیں قد افلح من

۱۰ لم أجد الحديث فی "موسوعة أطراف الحديث"

تذکرہ اسم ربہ فصلی (بامراد ہوا جو شخص (خباثت عقائد و اخلاق سے) پاک ہو گیا اور اپنے رب کا نام لیتا رہا اور نماز پڑھتا رہا) مگر یہ بات اسی وقت حاصل ہوگی جب کہ نماز کی تکمیل کرے، وقت پر پڑھے، جماعت کے ساتھ ادا کرے، قرآن کی تصحیح کرے، قلب کے متوجہ کرنے کی کوشش کرے اگر متوجہ نہ ہو تو کسی شیخ سے پوچھے۔ اور خود تو کرے ہی دوسروں کو اس کی ترغیب دلائے۔ جو اچھی چیز ہوتی ہے۔ اس کو دوسروں کو بھی بتلاتے ہیں۔ اسی واسطے حق تعالیٰ فرماتے ہیں و تواصوا بالحق (اور ایک دوسرے کو (اعتقاد) حق پر قائم رہنے کی فہمائش کرتے رہے)۔ جہاں توقع ہو راہ پر آنے کی وہاں ضرور کہو مگر نرمی سے کہو دوسرے کو ذلیل مت سمجھو۔ ممکن ہے کہ کوئی چیز اس میں ایسی ہو کہ وہ اس کی وجہ سے ہم سے بڑھ جائے۔ اگر کسی کو سیاست کرنی پڑے تب بھی حقیر مت سمجھو اگر کوئی کہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سیاست کی جائے اور اس کو حقیر نہ سمجھا جائے۔

امام غزالی نے اس کی مثال لکھی ہے۔ وہ یہ کہ کوئی بھنگی بادشاہ کے حکم سے شہزادے کے بید لگائے تو وہ سیاست تو کر رہا ہے مگر شہزادہ کو حقیر نہیں سمجھتا۔ اس کو ویسے ہی معزز مکرم سمجھ رہا ہے مگر بادشاہ کے حکم سے مجبور ہے۔ لہذا سیاست اور حقیر نہ سمجھتا دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔ امر بالمعروف اس طرح نہ ہونا چاہیے کہ کسی کو ذرہ برابر حقیر جانو۔ اگر خفگی کی ضرورت ہے تو اس طرح سے خفگی ظاہر کرو جیسے بچہ دوا پینے میں مچلتا ہے اور آپ اس پر غصے ہوتے ہیں۔ غصہ تو ہے مگر جوش محبت کے ساتھ۔ کیا غصہ قطع تعلق کرنے کے ارادہ سے کرتے ہو۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ چاہتے ہو کہ کسی طرح دوا پی لے۔ جو نماز نہ پڑھے، تو یہ نہیں کہ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دو بلکہ یہ دیکھو کہ کس طرح سے ہمارا بھائی مسلمان نمازی ہو جائے گا۔ بس ویسے ہی کرو۔ نرمی سے سختی سے، کچھ دینے سے غرض جیسے بھی راہ پر آنے کی امید ہو اس طرح کرو۔ البتہ مداہنت نہ ہو سو امر بالمعروف اس طرح ہونا چاہیے اور اس طرح اپنے ساتھ دوسروں کو بھی فلاح میں لاؤ۔ اب میں بیان ختم کرتا ہوں۔

دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ توفیق عمل کی مرحمت فرمائیں۔ آمین

فقط بفضل اللہ و برحمۃ۔ اشرف علی

ندا رمضان

ماہ رمضان کے متعلق یہ وعظ ۹ رمضان المبارک ۱۳۳۰ھ کو
جامع مسجد تھانہ بھون میں فرمایا،
جسے حکیم محمد یوسف نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ
وَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا
مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ
لَا شَرِيكَ لَهُ وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ صَلَّى
اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ. آمَنَّا بَعْدُ

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ينادى الملك ياباغى الخير اقبل
وياباغى الشر اقصر ولله عتقاء من النار

(ارشاد فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ فرشتہ منادی کرتا ہے کہ اے خیر
کے طلب گار آگے بڑھ اور اے برائی چاہنے والے رک جا اور اللہ کے لئے بہت
سے لوگ آزاد کئے جاتے ہیں)

متاع مسلمان

صاحبو! کلام اللہ اس لئے سنایا گیا تا کہ لوگوں کو اس طرف رغبت پیدا ہو۔ کیونکہ لوگ فی زمانہ
(ہمارے زمانہ میں) اس طرف سے بے رغبت ہو رہے ہیں۔ اور اس کو بیکار سمجھتے ہیں۔ بعض کہہ
دیتے ہیں کہ اس میں عمر ضائع جاتی ہے اس کی بجائے دوسری طرف بچہ کو مشغول کیا جائے تو کیسا
ہو۔ بعض جگہ اس کی تعلیم موقوف کرنے پر کمیٹیاں ہوتی ہیں اور اس میں مشغول ہونے کو تضييع اوقات
خیال کرتے ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر اس کو مع مطالب پڑھایا جائے تو وقت بہت ضائع ہوتا ہے
اور طوطے کی طرح پڑھانے سے (جس میں وقت کم صرف ہوتا ہے) کیا فائدہ وقت بھی ضائع ہوا

اور کوئی فائدہ مرتب نہ ہو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو اس کو بھی مفید بتاتے ہیں کہ اس پر وعدہ ثواب فرماتے ہیں (اگرچہ مع مطالب پڑھنے کے برابر مفید نہ ہو) اور تم بے فائدہ کہتے ہو بتاؤ کس کو صحیح مانیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ جس سے روٹیاں ملیں یہ واقعی ٹھیک ہے ہماری بھی غرض اس قرآن سے یہی ہے کہ آخرت کی روٹیاں ملیں جہاں سخت محتاجی ہوگی کہ انسان ایک ایک نیکی کے لئے ٹکریں مارتا پھرے گا اور اس کا نصیب ہونا بھی دشوار ہوگا۔

صاحبو! مسلمانوں میں اس وقت صرف کلام اللہ باقی رہ گیا ہے اور کچھ نہیں رہا اس کو بھی ترک کر دو گے تو کیا رہے گا۔ اس کے الفاظ بھی غنیمت سمجھو۔ گوان میں مطالب سے واقف ہونے کے برابر فائدہ نہ ہو۔

تلاوت کا ثواب

چنانچہ اس فائدہ کی نسبت ارشاد ہوا کہ ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ میں الف لام میم کو ایک حرف نہیں کہتا بلکہ الف ایک حرف ہے۔ لام ایک حرف ہے۔ میم ایک حرف ہے۔ سو صرف الہم کہنے سے تیس نیکیاں ملتی ہیں۔ اور بقول بعض کے نوے نیکیاں ملتی ہیں۔ اس طرح کہ الہم میں جو الف ہے اس کو تعبیر کرنے میں جو تین حرف ہوتے ہیں (ا۔ل۔ف) ہر ایک کے عوض میں دس نیکیاں ملتی ہیں۔ دس الف پر اور دس لام پر اور دس فاء پر سب تیس ہوئیں اسی طرح لام کی تعبیر میں تین حرف (ل۔ا۔م) ہوئے جس کی تیس نیکیاں ہوئیں اسی طرح سے میم کی تعبیر میں تین حروف (یعنی م۔ی۔م) پر تیس نیکیاں ملیں۔ سب کا مجموعہ ۹۰ ہو گیا۔

خود کہ یابد ایس چنیں بازار را کہ بیک گل سے خرد گلزار را
ایسا بازار کس کو ملے گا کہ ایک پھول کے بدلہ ہی میں سارے چمن کا ملک ہو جائے۔
(تعجب یہ کہ وہ پھول بھی اسی چمن کا ہو)

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد آنچہ دردہمت نیاید آل دہد
نیم جاں یعنی حقیر و فانی لیتے ہیں اور صد جاں یعنی باقی جان اور حیات ابدی عنایت کرتے ہیں۔ وہ کچھ عطا فرماتے ہیں جو وہ ہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔

خیر اس تفسیر غیر مشہور کو مت لو۔ پہلی ہی صورت میں والی لے لو۔ مگر ان تیس کو خیال کرو کہ فی الحال تو تیس نیکیاں لکھی گئیں مگر آخرت میں ان میں ترقی ہو کر کہاں تک پہنچیں گی۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ صدقہ کے ایک خرما کو اس طرح پالتے ہیں جیسے کوئی اپنے بچھیرے کو دنیا

میں پرورش کرتا ہے۔ پس بعض لوگوں نے دنیا میں تھوڑے اعمال کئے ہوں گے اور ثواب ان کا پہاڑوں کے برابر دیکھیں گے عرض کریں گے کہ اس قدر کام تو ہم نے کیا نہیں۔ جواب مرحمت ہوگا کہ ہماری شانِ مربی ہونے کی ہے کہ جب سے تم نے عمل کر کے چھوڑا تو ہم اس کو پالتے رہے جس کی نوبت یہاں تک پہنچی۔ اور یہاں تو عمل بھی ہوا ہے جس میں ترقی ہو گئی وہاں تو بعض احوال میں صرف آرزو ہی کرنے سے اس میں بھی ترقی ہو جائے گی جہاں عمل بھی نہیں ہوا۔

چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص آخر تک دوزخ میں رہ جائے گا اور فریاد کرے گا کہ یا اللہ مجھ کو نکال کر جہنم کے دروازہ کی چوکھٹ پر بٹھا دیجئے وہیں بیٹھا رہوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہو جائے گا۔ آرزو کرے گا کہ میرا منہ دوزخ سے پھیر دیجئے یہ بھی منظور ہوگا پھر ادھر سے رخ پھیرنے سے جنت کے درخت نظر آنے لگیں گے جس سے صبر نہ ہوگا اور عرض کرے گا کہ مجھ کو اس درخت تک پہنچا دے وہاں سے آگے نہ بڑھوں گا۔ چنانچہ ایسا بھی کر دیا جائے گا۔ قصہ مختصر یہ کہ اس کو جنت میں داخل ہو جانے کا حکم ہو جائے گا۔ پھر اس سے آرزو کرنے کو کہا جائے گا اور اس کی آرزو سے دس گنا مرحمت ہوگا۔

سوا گرتیس نیکیاں مل جائیں اور وہاں ضرب کا بہت زیادہ قاعدہ ہو تو کہاں تک نوبت پہنچے گی۔ اور جب تین حروف پر اس قدر ملتا ہو تو کل کلام اللہ پر کتنا ملے گا اور ضرب در ضرب دینے سے کس قدر ہوگا۔

فضیلتِ رمضان

حدیث جو تلاوت کی گئی ہے۔ ترمذی شریف کی ہے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان شریف کی فضیلت ارشاد فرمائی ہے کہ ایک فرشتہ پکارتا ہے کہ یا باغی الخیر اقبل۔ الخ یعنی اے خیر کے طلب کرنے والے چل متوجہ ہو اور اے شر کے طلب کرنے والے اب تو رک جا۔ تیسرا جملہ وللہ عتقا من النار اللہ تعالیٰ بہت سے بندوں کو اس راہ کی برکت سے آزاد کر دیتے ہیں۔ متحمل ہے یعنی یا تو وہ بھی فرشتہ کی ندا ہو۔ یعنی فرشتہ کہتا ہے کہ اس وقت خدائے تعالیٰ کے یہاں عام رہائی ہو رہی ہے۔ اے شخص تو بھی مستحق رہائی ہو جا۔

دیکھو جب کوئی شاہی خوشی ہوتی ہے تو ہر قیدی کو شش کرتا ہے چھوٹنے کی، تو اس وقت رمضان المبارک کا مہینہ ہے۔ خدائے تعالیٰ کا فضل عام ہو رہا ہے۔ قیدی چھوٹ رہے ہیں۔ تم پر بھی تعزیراتِ آخرت کی بہت سی دفعات لگ چکی ہیں۔ اس لئے تم بھی انہی قیدیوں میں ہو۔ پس تم بھی سعی کرو کہ تمہاری رہائی ہو جائے۔ اور یا یہ جملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے

فرمایا ہو۔ دونوں کا حاصل ایک ہوگا اس کے متعلق جو کچھ کہنا ہے اس کو ان شاء اللہ بیان کروں گا۔
مگر اول یہ سمجھے کہ اس وقت اس حدیث کو کیوں اختیار کیا گیا۔ وجہ یہ کہ پہلے جمعہ کو حدیث
بیان کی تھی الصیام جنة یعنی روزہ ڈھال ہے گناہوں کے لئے۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ روزہ
گناہوں کے لئے ڈھال ہے کہ اس کو اختیار کر کے معاصی سے مجتنب ہو سکتا ہے۔

ترک معاصی کی ترکیب

اب اس امر کی ضرورت ہے کہ بعد معاصی ترک کرنے کے کیا ہونا چاہیے۔ تو اس کے بارہ
میں یہ عرض ہے کہ تکمیل کے دو درجے ہیں۔

ایک تخلیہ (اخلاق رذیلہ کو دور کرنا) ایک تحلیہ (اخلاق حمیدہ پیدا کرنا)

یا ایک تجلیہ اور ایک تحلیہ میں بھی تخلیہ ہی ہوتا ہے۔ جیسے برتن کی جب تکمیل کرنا چاہتے ہیں
تو پہلے اس کو میل کچیل سے صاف کرتے ہیں جس کا نام تجلیہ ہے۔ پھر اس پر قلعی یا اور دوسرا کام
کرتے ہیں۔ یا مریض کی مثال سمجھئے کہ جب کسی کا علاج طبیب کرتا ہے تو پہلے مادہ فاسد کو نکالتا
ہے۔ اس کے بعد ایسی دوا کیں استعمال کراتا ہے جس سے طاقت پیدا ہو۔ جسم میں رونق و تازگی
آجائے یا کسی مکان میں فرش اور جھاڑ فانوس وغیرہ سے زیبائش کرتے ہیں تو پہلے اس کو خس
و خاشاک سے پاک کر لیا جاتا ہے یا کسی کو عمدہ لباس اس وقت پہناتے ہیں جب کہ اس کے جسم
سے غسل کرا کر میل کچیل دور کر دیا جائے۔

غرض یہ کہ سب چیزوں میں تکمیل دو ہی طریقہ سے ہوتی ہے تجلیہ اور تحلیہ سے اور عادتہ تجلیہ
مقدم ہوتا ہے تحلیہ سے کیونکہ بدون تجلیہ کئے ہوئے تحلیہ ناقص رہتا ہے جیسے کوئی بدون برتن کا میل
صاف کئے ہوئے اس پر قلعی کر دے۔ ظاہر ہے کہ پوری صفائی اس میں نہ آئے گی۔ ہاں بعض اوقات
بوجہ بعض مصالح کے تحلیہ مقدم ہوتا ہے تجلیہ پر۔ جیسے کسی مکان کی آرائش مد نظر ہو اور مہارت اس قدر
نہ ہو کہ پہلے پوری صفائی کر کے پھر آرائش کریں۔ تو یہ کرتے ہیں کہ پہلے سامان آرائش کر کے تدریجاً
صفائی کرتے رہتے ہیں۔ سو یہ تو عارض کی وجہ سے ہوتا ہے اور عام قاعدہ پہلا ہی ہے۔

اسی طرح صوفیا کرام تجلیہ اور تحلیہ مریدین کا کرتے ہیں کہ پہلے ان سے اخلاق رذیلہ دور
کر کے پھر اخلاق حسنہ کا رنگ ان پر چڑھاتے ہیں۔ بالکل طبیب جیسی حالت ہے کہ پہلے

مسہلات سے تجلیہ کرے اور پھر قوت وغیرہ کی دوائیں استعمال کرائے۔ متقدمین شیوخ کا یہی طریقہ تھا کہ پہلے تجلیہ کر کے پھر تجلیہ کرتے تھے۔

حکایت شیخ ابوسعید رحمہ اللہ

اس مثال میں حکایت شیخ ابوسعید گنگوہی کی سنئے کہ یہ حضرت عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے ہیں۔ ابتدائے شباب میں کچھ عرصہ تک لاابالی پھرتے تھے۔ ایک روز ایک جولاہے نے بطور طعن کے یہ کہا کہ بڑا افسوس ہے کہ آپ کے آباؤ اجداد ایسے تھے اور آپ کی حالت ایسی ہے۔ یہ بات ان کے دل کو کھا گئی۔ اور لوگوں سے دریافت کر کے مبلغ حضرت نظام الدینؒ کی تلاش میں پہنچے کہ وہ ان کے دادا سے فیض پائے ہوئے تھے۔ حضرت نظام الدینؒ کو آنے کی خبر معلوم ہوئی تو وہ مع بادشاہ وقت کے (جو حضرتؒ کے معتقدین میں سے تھا) استقبال کو آئے اور اپنے ہمراہ لے گئے کچھ عرصہ عیش و عشرت میں رہ کر اپنی اصلی غرض کو ظاہر کیا۔ حضرت نظام الدینؒ نے فرمایا کہ اس حالت کو ترک کر دو تو وہ حاصل ہو۔ انہوں نے اپنی رضا ظاہر کی تو حضرت نے با تکلف سامان بدن سے اتروا کر گاڑھے کے پہنوائے اور فرمایا کہ ہمارا حمام جھونکا کرو اور ہمارے سامنے آنے کی کوئی حاجت نہیں۔ جب ہم بلائیں گے تو آنا۔ غرض اس حالت میں ایک طویل مدت گزر گئی۔

شیخ نے ایک روز بھنگن سے پوشیدہ کہا کہ ان پر کل کو کوڑا ڈال دینا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ان کی زبان سے نکلا کہ گنگوہ نہ ہوئی جو میں بتاتا۔ خبر پہنچنے پر شیخ نے فرمایا کہ ابھی قابلیت نہیں ہوئی۔ وہی خدمت سپرد رہی۔

ایک عرصہ کے بعد یہ ہوا کہ شیخ کی لڑکی نے کبوتر پال رکھے تھے ان کو بلی کھا جایا کرتی تھی۔ شیخ نے اک روز بلی سے حفاظت کرنے کی خدمت ان کے سپرد کر دی۔ یہ رات بھر جاگ کر مکان کے آس پاس حفاظت کرتے۔ پھر بھی شکایت ہوئی کہ بلی کبوتر کھا گئی۔ اور رات کا وقت تھا انہوں نے اس کی جستجو کی کہ بلی کہاں کو جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ پانی آنے کا جو راستہ ہے اس میں سے جاتی ہے۔ اس وقت وہاں کوئی چیز اس میں بند کرنے کو نہ ملی۔ انہوں نے اس میں اپنا سر دے دیا۔ کئی روز جاگتے ہو گئے تھے وہیں نیند آگئی۔ اتفاق سے بارش ہوئی اور پانی رکا۔ گھر کی ماما نے بانس ڈال کر صاف کرنا چاہا اور اس نے اس زور سے بانس مارا کہ سر میں لگ کر پانی خون آلود ہو گیا اور ان کے منہ سے یہ آواز نکلی کہ بلی تو نہیں آئی۔ وہ ماما ڈر گئی کہ قصہ کیا ہے۔ شیخ نے خبر ہونے پر فرمایا کہ کہیں وہ باولا نہ ہو۔

چنانچہ لوگ ان کو اٹھا کر لائے۔ شیخ نے دیکھا کہ صفائی ہو چکی ہے۔ اس وقت ذکر و شغل میں لگایا۔

قرب خداوندی کی صورت

میری غرض اس حکایت سے یہ تھی کہ شیوخ پہلے تجلیہ کرتے تھے اور پھر تحلیہ اور غایت اس تجلیہ و ریاضت کی یہی دفعہ اخلاق و ذیلہ ہے اور ریاضت ایسا ہی تذلل ہے نہ کہ کم کھانا کم سونا۔ بلکہ یہ تو ریاضت کا ادنیٰ درجہ ہے اور یہی شرط ہے پسندیدگی عند اللہ کا۔

پس جب انسان اپنے کو اچھا لگے اور اس میں تذلل نہ ہو تو خدا کو اچھا نہیں لگتا۔ یاد رکھو کہ جب اپنے کو ذلیل جانو گے تب ہی خدا کے مقرب بن جاؤ گے یہ عجب بری بلا ہے۔ صوفیا کرام اس کے علاج کے لئے بہت سہولت سے تربیت کرتے ہیں۔

مثلاً کسی مرید کو دیکھا کہ بنا ٹھنارہتا ہے اس کو حکم دیا کہ مسجد میں جھاڑو دیا کرو۔ ظاہر ہے کہ اس خدمت سے انسان اچھی ہیئت میں نہیں رہ سکتا۔ کچھ عرصہ بعد اس کا عجب ٹوٹ جائے گا۔ یا کسی میں کبر زیادہ ہے تو یوں تربیت کرتے ہیں کہ نمازیوں کی خدمت کیا کرو پانی بھر کر رکھا کرو کہ اس سے کبر جاتا رہتا ہے۔ یہ طریقہ پہلے خانقاہوں میں ہوتا تھا۔ اب نہیں ہوتا اس طرح تو لوگ آج کل بھاگ جائیں۔ غالباً ایک بھی فیضیاب نہ ہو۔ پہلے فرصتیں بہت تھیں۔ اور ذی ہمت بھی ہوتے تھے عورتوں تک کی یہ حالت تھی کہ شادی کرنے میں اللہ والوں کو دیکھتی تھیں۔ ایسے قصے ہیں کہ مستورات نے اپنی لڑکیاں بزرگوں کو دے دیں۔ بادشاہوں سے باوجود ان کی خواہش کے قطع نظر کر لی۔

چنانچہ حضرت شاہ عبدالقدوسؒ کی بی بی ان کے پیر کی لڑکی تھیں۔ ان کی ساس کو کتنا ہی لوگوں نے کہا کہ باؤ لے سے نکاح کرتی ہو۔ انہوں نے یہی کہا کہ مجھ کو یاؤ لا ہی پسند ہے۔ سلاطین اور امراء خواستگار تھے ان سے شادی نہیں کی۔

اب تو نہ ایسی ہمت نہ اس قدر عمر۔ بلکہ یہاں تک نوبت ہے کہ مرید ہوتے ہی خلافت کے طالب ہو جاتے ہیں اور مختلف پیرایوں سے شیخ کی اجازت طلب کرتے ہیں کہ حضرت کوئی آئے تو توبہ کرادوں یا کلمہ پڑھا دوں۔ بوجہ اس عذ کے متاخرین شیوخ نے یہ کیا کہ تجلیہ اور تحلیہ دونوں ایک ساتھ کرتے ہیں کہ اس سے بھی کام چل جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہر چیز میں تجلیہ اور تحلیہ کی ضرورت ہے۔ پہلے و فظ کا حاصل تجلیہ تھا اور اس وقت میں تحلیہ مقصود ہے۔

افعال کی قسمیں

تو یہ سمجھئے کہ افعال کی دو قسمیں ہیں۔ وجودی اور عدمی جیسے افعال وجودیہ نماز وغیرہ، عدمی جیسے ترک ریا وغیرہ، عدم سے مراد عدم محض نہیں بلکہ وہ افعال جو ترک اختیاری ہوں افعال وجودیہ کا۔ سو بعض عبادات تو ایسی ہیں جس میں افعال وجودیہ کم ہیں اور افعال عدمی زیادہ جیسے روزہ۔ کیوں کہ اس میں تین جزو عدمی ہیں۔ ایک ترک کھانے کا، دوسرے ترک پینے کا۔ تیسرے ترک جماع کا۔ اور ایک جزو ہے وجودی اور وہ ان تینوں چیزوں کا عزم اور نیت ہے اور بعض عبادات میں تو باوجودیکہ وہ مرکب ہیں وجودیات اور عدمیات سے مگر غلبہ وجودیات کو ہوتا ہے۔ جیسے نماز وغیرہ۔ اور جو افعال عدمیات کی قبیل سے ہیں۔ ان کے کرنے میں زیادہ مشقت نہیں ہوتی کیونکہ اس میں کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ بلکہ ایک شے کو عدم اصلی پر باقی رکھا جاتا ہے۔ اور افعال وجودی میں مشقت زیادہ ہے کیوں کہ ایک شے کو وجود کی طرف لانا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں جو فرمایا گیا ہے۔

واستعينوا بالصبر والصلوة وانها لكبيرة الاعلى الخشعين الذين

يظنون انهم ملقوا ربهم وانهم اليه راجعون.

یعنی مدد لو صبر اور نماز سے اور بیشک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہے ان پر کچھ دشوار نہیں۔ وہ خشوع کرنے والے وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بیشک اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ بیشک اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں۔ اکثر مفسرین نے صبر سے مراد صوم لیا ہے اس کو آیت میں نہیں فرمایا بلکہ صرف نماز کے ساتھ اس حکم کو مخصوص کیا اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ عورتیں روزہ رکھنے میں بڑی مستعدی کرتی ہیں اور نماز پڑھنا ان پر قیامت ہوتا ہے۔ اس لئے کہ افعال وجودی میں مشقت زیادہ ہے اور نہ کھانے میں عورتوں کا کچھ کمال بھی نہیں۔ اس لئے کہ اول تو مزاج بارد جس میں تحلیل رطوبات کم ہوتی ہے دوسرے کھانے پکانے سے طبیعت سیر ہو جاتی ہے اور مردوں میں یہ امور متحقق نہیں ہیں۔

خشوع کی ضرورت

نماز کو جو آیت میں دشوار کہا گیا ہے اس سے خاشعین کو مستثنیٰ بھی فرمایا ہے کہ وہ خاشعین پر

مشکل نہیں اس لئے خشوع کی بھی ضرورت ہے تاکہ اس سے نماز آسان ہو۔ اس واسطے خشوع پیدا کرنے کی ترکیب بھی الذین یظنون الخ میں ارشاد فرمائی۔ یعنی وہ یوں خیال کرتے ہیں کہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں بخدا یہ خشوع پیدا کرنے کے لئے عجیب علاج ہے آدمی ہر عبادت میں یہی خیال کر لے کہ یہ میرا خدا سے ملنے کا آخری وقت ہے تو بڑا خشوع ہوگا اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

صلوة مودع . مودع یعنی رخصت کئے گئے شخص جیسی نماز پڑھو۔

اور برے اعمال چھوڑنے کی عمدہ ترکیب یہی ہے کہ جو کام کرو یہ خیال کر لو کہ آخری وقت یہی ہے۔ یہ مراقبہ ہر دشواری کو آسان کرے گا۔ اس مراقبہ کی یہ بھی خاصیت ہوگی کہ موت سے وحشت جاتی رہے گی اور اس کے معنی ظاہر ہو جائیں گے۔

الموت تحفة المؤمن . (یعنی موت مؤمن کے لئے تحفہ ہے)

خرم آں روز کزین منزل ویراں بروم راحت جاں طلسم وز پے جاناں بروم
یعنی وہ دن بڑی خوشی کا دن ہے کہ اس عالم فانی سے کوچ کروں۔ راحت جاں طلب کروں اور محبوب کے پاس جاؤں۔

پہلے یہ میری سمجھ میں نہیں آیا کرتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باوجود یاد دہانی موت کے کس طرح ضروری و نیوی امور میں مشغول ہوتے تھے کیوں کہ اس کے ساتھ ظاہر ایہ ممکن نہیں۔ پھر سمجھ میں آیا کہ موت سے جب تک وحشت ہوتی ہے اس وقت تک یہ قصہ ہوتا ہے اور جب موت سے انس ہو گیا پھر وہ ضروری مشاغل سے مانع نہ ہوگی۔ یہ تقریر متعلق خشوع کے تبعاً تھی۔

روزہ کی عدمیت

بیان اس کا ہو رہا تھا کہ روزہ میں عدمیت غالب ہے اور نماز میں وجودیت۔ اس پر مجھ کو اپنا ایک خواب یاد آ گیا۔ میں نے لڑکپن میں ایک خواب دیکھا کہ ایک سائل یوں سوال کرتا ہے کہ اس کے کیا معنی کہ روزہ تو اللہ کا اور نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کے جواب میں میں نے کہا کہ نماز میں جو کام کرنے پڑتے ہیں ان میں چونکہ شان عبدیت بڑھی ہوئی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی عبد ہیں اس لئے نماز کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی اور روزہ کی حقیقت اکل

و شرب وغیرہ کا ترک کرنا ہے جس میں ایک صمدیت و استغناء کی شان ہے اس لئے اس کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف زیادہ مناسب ہے کہ وہ بھی مستغنی ہیں۔

تو اس جواب کا حاصل بھی وہی وجودیت و عدمیت کا تفاوت ہے اور چونکہ روزہ میں صرف گناہوں کا چھوڑنا کمال نہیں۔ روزہ میں وجودیت بھی مطلوب ہے، اسی کو حدیث:

یا باغی الخیر اقبل و یا باغی الشر اقصر (سنن الترمذی: ۶۸۲)

یعنی اے خیر کے طالب متوجہ ہو اور اے شر کے طالب رک جا

میں جمع کر دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس میں بھی تجلیہ اور تخلیہ دونوں مطلوب ہیں کیونکہ پہلے جملہ سے اعمال خیر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور دوسرے میں معاصی سے بچنے کو کہا گیا ہے اور اسی کا نام تجلیہ ہے۔

ندائے فرشتہ

گزشتہ جمعہ کو تجلیہ کے متعلق ضرورت کی قدر بیان ہو چکا ہے اب تخلیہ کی صورت بتاتا ہوں۔ مگر پہلے طلباء کا ایک اشکال دفع کئے دیتا ہوں۔

وہ یہ کہ حدیث یا باغی الخیر، الخ میں ندائے فرشتہ کا ذکر ہے اور ذکر بھی اس طرح کہ روزمرہ ندا ہوتی ہے مگر کوئی اس کو سنتا نہیں۔ پھر ندا پر عمل کی کیا صورت ہے۔ جواب یہ ہے کہ جیسے خود سننا قابل عمل ہے دوسرے کا خبر دینا بھی قابل عمل ہے پس ہم رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی خبر معلوم کر کے عمل کر سکتے ہیں۔ اگر ہمارے حواس اس قابل نہیں کہ فرشتہ کی ندا کو سن سکیں تو یہ ہماری کمی ہے۔ ندا اور منادی پر کوئی شبہ نہیں ہو سکتا اس کے متعلق شملہ کا قصہ عرض کرتا ہوں جو مجھ کو بالقل سفر میں پیش آیا۔

وہ یہ کہ اس سفر میں مولوی انور شاہ صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔ وعظ کے ایک جلسہ میں مولوی انور شاہ صاحب نے اعجاز قرآن کے متعلق تقریر فرمائی جو مشکل تھی سمجھ میں نہ آنے سے لوگ بددل ہوئے اور عموماً وہاں لوگوں نے اعتراض کیا کہ اس تقریر سے کیا فائدہ ہوا۔ بعد میں میں نے اپنے وعظ میں اس کے متعلق لوگوں سے کہا کہ مولوی صاحب کی تقریر سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ بعض مضامین علماء کے ایسے ہوتے ہیں جن کو آپ لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ مگر اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس تقریر میں کوئی نقص ہے بلکہ آپ صاحبوں میں اس کے سمجھنے کی قابلیت نہیں تو یہ نقص آپ صاحبوں کا ہے نہ کہ علماء کا۔ اسی

طرح فرشتہ کی ندا کو خیال کیجئے کہ اس کا مسموع نہ ہونا ہمارا نقص ہے نہ کہ ندا و منادی کا۔

اتباع سنت

دوسرے اس مسموع نہ ہونے میں ایک حکمت بھی ہے وہ یہ کہ معلوم ہو جائے اس عالم کے علاوہ کوئی دوسرا عالم بھی ہے کہ اس کی کائنات کی دوسری شان ہے۔ البتہ اس ندا کو قلب ادراک کرتا ہے۔ چنانچہ تجربہ یہ ہے کہ رمضان المبارک آتے ہی قریب قریب ہر ایک کو یہ شوق ہوتا ہے کہ آؤ نیک کام کر لیں۔ یہ اسی آواز کا اثر ہے جو قلب نے سنی ہے۔

اب بعد دفعہ اشکال کے تجلیہ کی صورت عرض کرتا ہوں۔ پس رمضان کے متعلق اس کے دو طریقے وارد ہیں۔ ایک خاص، دوسرے عام۔ خاص سے مراد خاص اعمال سے تخلیہ اور عام سے مراد مطلق حسنہ سے تخلیہ۔ سو اس مجموعہ کے لئے دو حدیثیں نقل کرتا ہوں۔

ایک حدیث بیہقی میں ہے کہ قرآن اور روزہ دونوں سفارش کریں گے۔ قرآن کہے گا کہ میں نے اس کو سونے نہیں دیا۔ اس لئے میری سفارش قبول فرما کر اس کو بخش دیجئے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام تمام رات بیدار رہے کیوں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت نہ تھی بلکہ مطلب یہ ہے کہ بہ نسبت اور دنوں کے کم سونے دیا۔ چنانچہ کلام اللہ میں ہے۔

قلیلاً من اللیل مایہجعون۔ یعنی رات کو بہت کم سوتے تھے۔

بزہد و ورع کوش و صدق و صفا و لیکن میفرمائے بر مصطفیٰ

یعنی زہد و تقویٰ میں کوشش کرو لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے نہ بڑھو۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے نہ بڑھنا چاہیے۔ یہی کمال ہے۔ پس ساری رات جاگنا ضرور نہیں۔ مقبولیت قدم بقدم رسول صلی اللہ علیہ وسلم چلنے سے ہی ملتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں قصہ ہے کہ تین شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کی تحقیق دریافت کر کے آپس میں کچھ کہنے لگے ایک نے کہا کہ میں صائم الدہر رہوں گا کبھی افطار نہ کروں گا۔ دوسرا بولا کہ میں سونا چھوڑ دوں گا تمام رات نوافل پڑھا کروں گا۔ تیسرا بولا کہ میں نکاح ہی نہ کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور فرمایا کہ اما انا فاصلی وارق واصلوم و افطر و اتزوج۔

میں تو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ جس سے یہ غرض تھی کہ میرا اتباع کئے بدون چارہ نہیں۔

حقیقی شہرت

اس میں یہ بھی راز ہے کہ اتباع سنت کے علاوہ دوسرے امور صورتہ موجب امتیاز ہونے سے سبب عجب و شہرت کا ہو جاتے ہیں جو کم قاتل ہے۔

خویش رانخور ساز و زار زار تاترا بیروں کنند از اشتہار
یعنی اپنے کو پست اور شکستہ بنا لو تا کہ عوام الناس تم کو شہرت و جاہ سے خارج کر دیں۔
اشتہار خلق بند محکم است بندایں از بند آہن کے کم است
خلائق میں مشہور اور ذی جاہ بن جانا ایک سخت حجاب ہے۔ راہ خداوندی میں یہ حجاب قید آہنی سے کم نہیں ہے۔

اور یہ جدا بات ہے کہ از خود شہرت ہو جائے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب اللہ میاں کسی کو محبوب بناتے ہیں تو آسمان و زمین میں بواسطہ ملائکہ ندا فرما دیتے ہیں کہ اللہ نے فلاں کو محبوب کر لیا ہے تم بھی محبوب رکھو۔ جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اس کو سب محبوب کہنے لگتے ہیں۔ مگر اپنی طرف سے قصد شہرت نہ چاہیے۔ اور جو شہرت منجانب اللہ ہو جائے اس میں کچھ خرابی نہیں جیسا کہ مقبولین کی شہرت ہو جاتی ہے بلکہ بعد موت بھی باقی رہتی ہے۔

ہرگز نہ بمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق مثبت است بر جریدہ عالم دوام ما
یعنی جس کو عشق حقیقی سے روحانی حیات حاصل ہو گئی وہ اگر مر بھی جائے تو واقعہ میں بوجہ اس کے کہ اس کو لذت قرب کامل طور سے حاصل ہو جاتی ہے اس لئے اس کو زندہ کہنا چاہیے۔
یہ تو قرآن کی سفارش کے متعلق مضمون تھا۔

روزہ کی سفارش

روزہ کہے گا میں نے دن میں کھانے پینے سے روکا اس طرح دونوں شفاعت کریں گے۔
اس سے معلوم ہوا کہ رمضان میں صرف روزہ کافی نہیں بلکہ قرآن بھی پڑھا کرو۔ جس کا اہل طریقہ اس ماہ میں تراویح ہے مگر دشواری یہ ہے کہ تراویح بھی باقاعدہ بہت کم پڑھتے ہیں۔ یہ کمال میں شمار ہوتا ہے کہ فلاں حافظ نے ایک گھنٹہ میں اس قدر پارے پڑھے حالانکہ کلام اللہ کے الفاظ تک درست نہیں ہوتے۔ نہ رکوع نہ سجود وغیرہ ٹھیک ہوتا ہے۔

گرتو قرآن بدیں نمط خوانی بہ بری رونق مسلمانی
اگر اس طور سے قرآن پڑھتا ہے تو رونق مسلمانی کو زائل کرتا ہے۔

ادھر تو مقتدیوں کو نہایت اضطراب ہوتا ہے کہ کوئی باقاعدہ پڑھنا چاہے تو وہ چین نہیں لینے دیتے۔ غرض جب فارغ ہو کر واپس ہوتے ہیں تو بجائے ثواب کے مواخذہ سر پر ہوتا ہے۔
از در دوست چہ گویم بچہ عنوان رستم ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرمان رستم
محبوب کے دروازے سے کیا کہوں کس طور سے میں گیا۔ پورے شوق سے آیا تھا۔ بالکل محروم ہو کر چلا۔
بعض شائقین تلاوت کو یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ ہم پورے طور سے کلام اللہ پڑھنے پر قادر نہیں بلکہ اٹک اٹک کر پڑھتے ہیں۔ پس وہ یہ سمجھ کر تلاوت سے بیٹھ رہتے ہیں کہ ایسے پڑھنے سے کیا فائدہ ہے۔ تو یہ سمجھ لیجئے کہ باوجود اٹک اٹک کر بہ دشواری تلاوت کرنے سے بھی دو ہزار اجر ہوگا مگر اس سے یہ نہ سمجھیں کہ صاف پڑھنے والے سے یہ بڑھ گیا۔ ممکن ہے کہ اس کا، اکہرا اس کے دوہرے سے بڑھ جائے۔ جیسے اشرفی اور دوروپے کہ کیت میں تو دوروپے زیادہ ہیں اور کیفیت میں ایک اشرفی بڑھی ہوئی ہے۔ اور جن کو پڑھنا نہ آئے ان کے لئے صرف سننے پر بھی ثواب مرتب ہو جاتا ہے۔ وہ بھی محروم نہیں ہیں۔ چنانچہ کلام اللہ میں:

واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا .

یعنی جب قرآن پاک پڑھا جائے تو خاموش ہو جاؤ اور اس کو سنو۔

موجود ہے۔ اگر چہ تالی و تلاوت کرنے والا، کے مثل ثواب نہ ہو۔ لیکن۔

مرا از زلف تو موئے بسند است ہوس راہ رہ مدہ بوئے بسند است

یعنی اگر محبوب نہ ملے تو اس کا ایک بال ہی بہت ہے۔ اگر بال نہ ملے تو خوشبو ہی سہی۔

جیسے قرآن کو نزول سے اس ماہ کے ساتھ مناسبت تھی ویسا ہی اس ماہ میں اس کی تلاوت

وسماع کا بھی سامان کر دیا کہ تراویح کا امر فرمایا تاکہ کوئی ثواب سے محروم نہ رہے۔

ہماری حالت

یہ تو بیان تھا تحلیہ کے طریق خاص کا اور اس کا طریقہ عام یہ ہے کہ اس ماہ میں فضیلت رکھی گئی ہے کہ نفل کا ادا کرنا فرض کے برابر رکھا گیا ہے اور فرض کا ادا کرنا برابر ستر فرض کے چنانچہ حدیث میں ہے۔

من تقرب فيه نجصله كمن اوى فريضة في غيره^۱. الخ

یعنی جس شخص نے اس ماہ میں نزدیکی ڈھونڈی اللہ تعالیٰ کی کسی خصلت کے ساتھ انواع نفل سے تو وہ مثل اس شخص کے ہے کہ جس نے ادا کیا فریضہ اس ماہ مبارک کے غیر میں۔ اس ماہ میں نفل کا ایسا ثواب ہوتا ہے جیسا کہ دوسرے مہینوں میں فرض کا۔

جس میں ہر نیک کام داخل ہو گیا۔ پس یہ مطلق خیر سے تخلیہ ہوا اور یہ تو اس تخلیہ کے باب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال تھے۔ اب اس ماہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تعامل دیکھئے کہ کیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔ اذا جاء رمضان شد ميز ره كان اجود بالخير من الريح المرسلة آپ اس ماہ میں نہایت سخی اور عبادت کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول سے بھی اور فعل سے بھی دونوں طریقہ سے کام کر کے دکھا دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی کیا اور دوسروں کو امر بھی فرمایا کہ اس قسم کا عمل در آمد کرو۔

اب اس باب میں لوگوں کی چار حالتیں ہیں۔ بعض کی تو یہ حالت ہے کہ نہ نیک کام کریں نہ برا چھوڑیں۔ بعض کی یہ ہے کہ برے کام تو ترک کر دیں مگر نیکی نہ کریں، بعضے نیک کام تو کریں مگر اپنے اوقات کو بیہودہ معاصی میں گزاریں۔ بعضے فعل نیک اور ترک بدی دونوں کو جمع کر لیں۔ اگر کسی میں کامل ہمت نہ ہو تو وہ کم از کم حسنات واجبہ و موکدہ پر اکتفا کر کے برائیاں تو چھوڑ دے۔ یہ ہے تجلیہ اور تخلیہ۔ اے اللہ ہم سب کو توفیق عطا فرما۔ آمین

۱۔ مسند احمد ۲: ۱۳، ۳: ۳۰، الترغیب والترہیب للمندری ۳: ۱۰۳، کنز العمال ۱۱۷۹، مجمع الزوائد ۱۰: ۱۹۶، ۱۹۷، ۲ مسند احمد ۱: ۲۶۳، ۶: ۱۳۰، السنن الکبریٰ للبیہقی ۳: ۵، ۳۰۵، إتحاف السادة المتقين ۷: ۱۳۸

الصَّوْم

روزہ کی فضیلت کے متعلق یہ وعظ ۱۴ شعبان ۱۳۳۸ھ کو
برمکان تحصیلدار صاحب نکر ر ضلع سہارنپور بیٹھ کر فرمایا
جو ۲ گھنٹہ ۲۰ منٹ میں ختم ہوا مجمع دو ہزار افراد کا تھا۔
محمد عبداللہ صاحب نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ
وَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا
مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ
لَا شَرِيكَ لَهُ وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ صَلَّى
اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ. آمَنَّا بَعْدُ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اللہ تعالیٰ کل حسنة تضاعف
بعشر الى سبع مائة ضعف الا الصوم فانه لی وانا اجزی به۔
ترجمہ: ارشاد فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ
ہر نیکی دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھائی جاتی ہے سوائے روزہ کے کہ وہ خاص
میرے لئے ہے اور میں (خود) اس کی جزا دوں گا۔

تمہید: یہ ایک حدیث قدسی ہے۔ حدیث قدسی جناب باری عز اسمہ کا وہ ارشاد ہے جس کی
تلاوت کبھی نہ کی گئی ہو۔ یہ حدیث جس کو اس وقت میں نے پیش کیا ہے اس میں حق تعالیٰ نے روزہ
کی فضیلت بیان فرمائی ہے اس وقت یہ مضمون اس لئے اختیار کیا ہے کہ اس وقت دو قسم کے روزہ
کا وقت قریب آ گیا ہے۔ ایک تو روزہ مستحب کا وقت قریب ہے۔ تو وہ کل یا پرسوں ہے۔ تفصیل
اس کی یہ ہے کہ بحساب خانگی رویت کے پرسوں کو پندرہ شعبان ہے اور بعض تحریرات سے کل پندرہ
شعبان ہے اگر کسی کو تحقیق ہو جائے اور پندرہ شعبان کا روزہ رکھنا مستحب ہے۔

دوسرے روزہ فرض کا وقت بھی قریب ہے کہ پورے ماہ کا روزہ فرض ہے چونکہ دونوں قسم کے روزہ

کا وقت قریب تھا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ روزہ کی فضیلت اور کچھ احکام بیان کر دیئے جائیں۔
 ہر چند کہ روزہ کے فضائل ایسے نہیں ہیں کہ کسی نے نہ سنے ہوں۔ بفضلہ تعالیٰ ہمیشہ علماء کے
 مواعظ سنے ہیں۔ کم و بیش خود بھی لوگ واقف ہیں۔ تو اس حیثیت سے احتیاج بیان نہ تھی۔ لیکن
 میں روزہ کی ایک فضیلت خاصہ بیان کرنا چاہتا ہوں اور وہ فضیلت من حیث ہی (اس اعتبار سے کہ
 وہ فضیلت فضیلت ہے) میرا مقصود بھی نہیں بلکہ اس سے میں ایک خاص طرز سے روزہ کے
 چند احکام مستنبط کروں گا اور احکام بھی لوگوں کے سنے ہوئے ہیں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ سن کر ان
 کو یاد نہیں رکھتے ہیں اور اگر یاد بھی رکھتے ہیں تو ان کی عظمت نہیں۔ میں ایسے عنوان سے بیان کرنا
 چاہتا ہوں کہ ان احکام کی عظمت ظاہر ہو جائے۔

وسعت ثواب

حاصل یہ ہے کہ جتنی نیکیاں ہیں سب کا ثواب کئی گنا کر کے ملتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ حق
 تعالیٰ کی رحمت چونکہ واسعہ ہے اور منظور یہ ہے کہ بندوں کو کچھ مل جائے۔ اس لئے نیکی کا بدلہ برابر برابر
 نہیں ملتا ہے۔ بلکہ اس میں اضافہ کا قانون ہے بخلاف گناہ کے کہ برابر لکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد
 ہے: من جاء بالحسنة فله خیر منها یعنی جو شخص نیکی لائے گا اس کے لئے اس سے بہتر ملے گا۔
 مطلق مضا عفت تو اس آیت سے ثابت ہے اور دوسرے مقام پر اس کی تعین بھی
 فرمادی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

من جاء بالحسنة فله عشر امثالها . الآیہ

یعنی جو شخص نیکی لائے اس کے لئے اس کی دس مثل اور جو برائی کرے تو اس کے برابر جزا ملے گی۔
 اس سے مضا عفت اور خیریت مذکور آیت سابقہ کی تعین ہو گئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ قانون
 عام ہے۔ اس لئے لفظ من عام ہے کوئی اس سے مخصوص نہیں۔ پس مضا عفت دس سے کم تو کسی
 حال میں نہ ہوگی اور جو حدیث میں نے اول پڑھی تھی اس سے منہجائے اکثری بھی اس مضا عفت
 کا معلوم ہوتا ہے کہ اخلاص کے تفاوت سے سات سو تک مضا عفت ہوتی ہے یعنی اگر کوئی ایک
 پیسہ دے تو سات سو پیسوں کا اگر ایک روزہ رکھے تو سات سو روزوں کا ثواب لگتا ہے۔ علیٰ ہذا ایک
 آیت پڑھے تو سات سو آیت کا۔ ایک قرآن ختم کرے تو سات سو قرآن کا ثواب ملتا ہے۔
 اس منہجہ کو جو میں نے اکثری کہا تو وجہ اس کی یہ ہے لیکن یہ کثرت اضافی نہیں بلکہ فی نفسہ

کثرت مراد ہے کہ قرآن وحدیث میں غور کرنے سے سات سو کی تحدید معلوم نہیں ہوتی بلکہ غیر متناہی مضاعفت ہوتی ہے۔ اور متناہی سے مراد غیر متناہی بالفعل مراد نہیں بلکہ بمعنی لا تقف عند حد (یعنی کسی حد پر موقوف نہیں) مراد ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنی راہ میں خرچ کرنے والوں کی ایک مثال ارشاد فرمائی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مضاعفت کا انتہا نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے: مثل الذين ينفقون اموالهم في سبيل الله كمثل حبة انبتت سبع سنابل في كل سنبلة مائة حبة۔

یعنی جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کا حال ایسا ہے جیسے ایک دانہ ہو وہ سات بالیں اگادے اور ہر بال میں سودا نے ہوں۔

اس کے آخر میں ارشاد ہے: واللہ يضاعف لمن يشاء واللہ واسع علیم یعنی اللہ جس کے واسطے چاہیں اس سے بھی زیادہ بڑھادیں اللہ تعالیٰ وسعت والے علم والے ہیں یہ جملہ ماسبق کی علت ہے کہ اس مضاعفت سے حیرت اور تعجب نہ کرو اللہ تعالیٰ صاحب وسعت ہیں۔ ان کے یہاں تنگی نہیں اور اس کے ساتھ ہی دھوکا میں پڑنے والے کا علاج بھی ارشاد فرما دیا کہ وسعت پر مغرور مت ہو جاؤ اور یہ مت سمجھو کہ ہماری نیکی قابل مضاعفت ہے۔ اس لئے کہ وہ علیم بھی ہیں۔ یعنی یہ بھی جانتے ہیں کہ کس کی نیکی مضاعفت کے قابل ہے اور کس کی نہیں۔ جس قدر اخلاص زیادہ ہوگا اسی قدر مضاعفت ہوتی جائے گی اور چونکہ اخلاص کی کوئی حد نہیں لہذا اس مضاعفت کی بھی تعیین نہیں کی جاسکتی ہے۔

نیکی کا قانون

الحاصل نیکی کا قانون عام کہ جس سے کوئی مومن مخصوص و متشخص نہیں یہ ہوا کہ ایک نیکی کے بدلے دس ملتی ہیں اور باعتبار اکثر کے سات سو تک مضاعفت ہوتی ہے اور سات سو سے آگے (غیر حد تک) مضاعفت ہو سکتی ہے یہ تو آیت سے مضاعفت کا غیر محدود ہونا معلوم ہوا۔

اب حدیث لیجئے۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر ایک شخص ایک چھوہارا صدقہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے دست مبارک میں لیتے ہیں اور اس کی پرورش فرماتے ہیں کما یربی احد کم فلوہ۔ یعنی ایسے پرورش فرماتے ہیں یعنی اس کو بڑھاتے ہیں۔ جیسے ایک تمہارا اپنے پچھیرے کو پرورش کرتا ہے اور بڑھاتا ہے۔

پچھیرے کی تخصیص اس لئے فرمائی کہ عرب کے لوگ گھوڑوں کو بہت محبوب رکھتے تھے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ ایک جنگ جو اور بہادر قوم ہے اور گھوڑا جنگ میں بڑا کام آنے والا ہے۔ قرار میں بھی اور فرار میں بھی۔ اگر میدان میں قائم رہ کر حرب میں مشغول رہیں تو اس میں بھی گھوڑا کام دینے والا ہے اور اگر مغلوب ہونے کی حالت میں بھاگنے کی ضرورت ہو تو اس موقع پر بھی گھوڑے سے زیادہ کوئی جانور کام کا نہیں اور حرب میں یہی دو موقع ہوتے ہیں۔ کبھی قرار ہوتا ہے اور کبھی فرار۔ اور جیسے قرار فی الحرب (لڑائی میں برقرار رہنا) شجاعت شمار ہوتی ہے اس لئے موقع سے اپنی جان بچا کر نکل بھاگنا یہ بھی درستی حواس سے ہوتا ہے اور درستی حواس جب ہی ہوگی جب کہ قلب ضعیف نہ ہو۔ آدمی دلیر اور بہادر ہو۔ چنانچہ عرب جہاں اشعار میں قرار پر یعنی جسے رہنے پر فخر کرتے ہیں۔ اسی طرح فرار یعنی میدان سے بھاگ جانے پر بھی فخر و ناز کرتے ہیں۔ اس لئے کہ عرب کی شاعری نہایت سادہ رنگ لئے ہوئے ہے۔ عجم کے تکلفات وہاں نہیں ہیں۔ غرض گھوڑا قرار اور فرار دونوں وقت میں چونکہ کام آتا ہے۔ اس لئے وہ عرب کو بہت محبوب تھا اور ظاہر ہے کہ بچہ تو ہر شے کا پیارا معلوم ہوتا ہے۔ خاص کر محبوب کا بچہ تو اور بھی زیادہ محبوب ہوگا۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جیسے تم پچھیرے کو پالا کرتے ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ اس چھوارہ کو پرورش فرماتے ہیں۔ آگے فرماتے ہیں:

حتى يكون اعظم من احد۔ یعنی اس چھوارہ کی اتنی تربیت فرماتے ہیں کہ وہ احد پہاڑ سے بھی زیادہ بڑا ہو جاتا ہے۔

اس حدیث کے اندر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سات سو کی تخصیص تحدید کیلئے نہیں۔ اس لئے کہ چھوارہ کے برابر احد پہاڑ کے ٹکڑے کئے جائیں تو سات سو کیا سناکھوں مہا سناکھوں سے بھی زیادہ پر نوبت پہنچے گی اور وزن کے اعتبار سے اگر چھوارہ کے برابر حصے کئے جائیں تو اور بھی زیادہ ہو جائیں گے مولانا فرماتے ہیں۔

خود یابد این چنین بازار را کہ بیک گل مے خری گلزار را
نیم جاں بتاند و صد جان دہد ہرچہ دروہمت نیاید آں دہد

ایسا بازار کہاں نصیب ہوگا کہ ایک پھول کے بدلے تمام چمن کے مالک بن جاؤ۔ یعنی اللہ تعالیٰ جان فانی لیتے ہیں اور باقی جان عنایت فرماتے ہیں۔ جو کچھ وہم و گمان میں نہیں آ سکتا وہ عطا کرتے ہیں۔

ثواب کا مدار

بڑھنا باعتبار اخلاص کے ہے جس قدر اخلاص زیادہ ہوگا اسی قدر ثواب بڑھتا جائے گا۔ اور اسی واسطے حدیث میں آیا ہے کہ میرا صحابی اگر نصف مد یعنی آدھ سیر جو اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو وہ دوسرے کے احد کی برابر سونا خرچ کرنے سے بہتر ہے تو اس کی وجہ کیا ہے۔ یہ تو ہے نہیں کہ ان کی اللہ تعالیٰ سے (توبہ توبہ) رشتہ داری ہے۔ صرف بات یہ ہے کہ ان حضرات کے اندر خلوص اور محبت اس قدر تھا کہ اوروں کے اندر اتنا نہیں اسی واسطے ان کے صدقات و حسنات بڑھتے چلے جاتے ہیں اور یہ کوئی عجیب بات نہیں دنیا میں بھی ہم اس کی نظیر دیکھتے ہیں کہ ایک ہی کام ہے۔ ایک آدمی اس کو ضابطہ کے موافق کرتا ہے اور دل سے نہیں کرتا۔ اس کی کچھ قدر نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ ضابطہ ہی کا برتاؤ بھی ہوتا ہے اور ایک دوسرا شخص اسی کام کو محبت سے اور دل لگا کر کرتا ہے۔ اس کے دل میں قدر ہوتی ہے اور اس کے ساتھ قانونی معاملہ نہیں کیا جاتا بلکہ جی چاہتا ہے کہ اس کو زیادہ نفع پہنچایا جائے۔

یہ بحث تو مضاعفت کے متعلق تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے اور جناب باری تعالیٰ کے کلام پاک سے۔ آگے استثنافرماتے ہیں۔

الا الصوم فانہ لی وانا اجزی بہ لیکن روزہ اس لئے کہ وہ میرے لئے خاص ہے اور میں خود ہی اس کی جزا دوں گا یعنی ہر حسنہ میں مضاعفت ہوتی ہے۔

روزہ کا خصوصی ثواب

لیکن روزہ اس قانون سے مستثنیٰ ہے اس کے لئے دوسرا قانون ہے فانہ لی۔ یہ وجہ ہے دوسرا قانون ہونے کی۔ یعنی وہ میرا ہے۔ میرے لئے خاص ہے اس لئے ہم اس کو قانون اور حسنات سے جدا قرار دیتے ہیں وانا اجزی (میں خود اس کی جزا دوں گا) یعنی وہ قانون دوسرا اس کے لئے یہ ہے کہ اس کی جزا بلا واسطہ ملائکہ کے ہم خود دینگے۔ ذرا بھی کسی کو عقل ہو تو یہ سمجھ سکتا ہے کہ جس عمل کی نسبت جناب باری تعالیٰ یہ فرمادیں کہ ہم خود اس کا بدلہ دیں گے تو وہ جزا بڑی عظیم الشان ہوگی جیسے حاکم یہ کہے کہ فلاں کارگزاری کا انعام ہم خود دیں گے۔ ہر شخص سمجھے گا کہ خدا جانے کیا عنایت ہوگی اور جب احکم الحاکمین یہ فرمادے تو وہ جزا تو بے حد ہوگی۔

بے حد کے یہ معنی نہیں کہ غیر متناہی بالفعل ہوگی کہ اس پر محال ہو نیک اشکال ہو بلکہ بے حد ہونے کی صورت یہ ہے کہ غیر متناہی بمعنی لا متقف عند حد ہے یعنی وہ جزا کسی وقت ختم نہ ہوگی۔ یہ امتیاز تو باعتبار کیفیت کے ہے اور ہو سکتا ہے کہ کیفیت کے اعتبار سے اس میں اور اجزیہ سے کچھ امتیاز ہو کہ روزہ کی جزا کیفا اور اعمال کے اجزیہ سے ممتاز ہو غرض روزہ کے درمیان میں خواہ مقدار کے اعتبار سے ہو یا کیف کی رو سے ہو اور حسنات سے اس اجزاء کی نوع علیحدہ ہوگی حدیث میں اس سے بحث نہیں کہ وہ جزا کیا ہے اور اس کو کیا مناسبت ہے اس لئے کہ حاکم کو یہ ضرور نہیں کہ رعایا سے وہ یہ بھی بیان کر دیا کرے کہ کیا جزا دیں گے اور اس کو کیا مناسبت ہے اور نیز مقصود تو امتثال کا امر کی ترغیب ہے اور جزاء کا بیان کرنا اس کا مدار نہیں مدار ترغیب امتثال کا تو اہل اطاعت کے نزدیک اتنا بھی کافی ہے کہ حاکم کا حکم ہے اور خیر ایک درجہ میں انتظار تو اسکا اجمالاً بھی ہو تو مضائقہ نہیں مگر یہ کہ اس کی تعمین بھی ہو اور اسکے وجوہ مناسبت بھی معلوم ہوں یہ کسی درجہ میں بھی ضروری نہیں۔

بلا ضرر لغزش

اس باب میں دو لغزشیں ہو جاتی ہیں۔ ایک لغزش تو دین میں مضر نہیں گواہ ایک درجہ میں لغزش ہے۔ مگر دوسری مضر ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ فضائل و ثواب کا جو وعدہ ہے اس پر امتثال کو مٹی کرنا کہ ان فضائل اور ثواب کے سبب تو عمل کرتا ہے۔ یہ لغزش تو ہے مگر مضر نہیں اس لئے کہ وعدہ تو ہو ہی چکا ہے۔ اس کا وجود تو متیقن ہے تو اس نے عمل کو ایسی شے پر مبنی کیا ہے کہ اس کا وجود یقینی ہے۔ ثابت بالنص ہے۔ تو اس میں ضرر کچھ نہیں لیکن یہ دلیل قلت محبت کی ہے اور یہی سبب ہے اس کے لغزش ہونے کا۔ اپنے مطلب کی محبت ہے، ذات محبوب اس کو محبوب نہیں۔ اگر ذات محبوب اس کو مطلوب ہوتی تو فضائل تو کیا۔ اگر امتثال امر میں کوئی تکلیف ہونا بھی معلوم ہوتا تب بھی امتثال ترک نہ کرتا۔ دیکھو دنیا میں اگر کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اس سے ملنے میں کتنی کتنی مصیبتیں جھیلے ہیں۔ گوارا اور ناگوارا سب ہی کچھ برداشت کرتے ہیں۔ واللہ اگر محبت صادق ہے تو اس کا مشرب تو یہ ہے کہ جس میں محبوب خوش ہو وہ کام کرنا چاہیے۔

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب کہ حیف باشد از وغیرہ و تمنائے فراق اور وصل کی کچھ حقیقت نہیں۔ محبوب کی رضا طلب کرنا چاہیے اگر محبوب فراق کو پسند فرمائیں تو تم وصال کے طالب مت بنو۔ اس لئے محبوب کی مرضی کے خلاف کی تمنا کرنا افسوس کی بات ہے۔

صرف اس کی خوشنودی کے لیے کرنا چاہیے۔ حتیٰ کہ یہ کہنا کہ آپ مل جائیں یہ بھی نہ چاہیے لیکن چونکہ ایسی طبیعتیں بہت کم ہیں زیادہ طبیعتیں ایسی ہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور وعیدوں کو سن کر عمل کی توفیق ہوتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اعمال پر وعدہ فرمایا ہے ایک بنا تو عمل کی یہ تھی جو کہ مضرب نہیں۔

فہم حکمت

ایک بنا دوسری ہے۔ وہ نہایت خطرناک ہے وہ کیا ہے فہم حکمت یعنی عمل جب کریں گے جب اس عمل کی حکمت اور وجہ مناسبت عمل و جزا بھی ہماری سمجھ میں آجائے۔ افسوس ہے کہ اس زمانہ میں جس قدر تعلیم بڑھتی جا رہی ہے اسی قدر اس بنا فاسد کا شیوہ ہوتا جاتا ہے جس کو دیکھئے کیا علماء کیا جہلا سب اس میں مبتلا ہیں۔

ماشاء اللہ میرے جاہل کہنے پر شاید بعض تعلیم یافتوں کو شبہ ہوا ہو کہ ہم تو خاصے لکھے پڑھے ہیں۔ چنانچہ خواندہ لکھے جاتے ہیں۔ ہم کو جاہل کیوں کہا۔ بات یہ ہے کہ جاہل کے معنی یہ نہیں کہ لکھنا یا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ بلکہ جس فن کو کوئی نہ جانے وہ اس فن کا جاہل ہے اگر میں ڈاکٹر نہیں ہوں تو اگر اس فن میں دخل دوں تو میری حماقت ہے۔ اس فن کے اعتبار سے میں جاہل ہوں۔ جس شخص نے جو فن حاصل نہ کیا ہو وہ اگر اس میں محقق ہونے کی حیثیت سے گفتگو کرے یہ اس کی غلطی ہے اور اگر سائلانہ گفتگو کرے تو اگر وہ سوال غیر ضروری ہے تو یہ بھی حماقت ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی طبیب کے پاس دو مریض جو کہ فن طب سے بالکل نا آشنا ہیں آئیں۔ تو ایک نے نبض وقارورہ کو دکھلا کر نسخہ لکھوا لیا اور دوائی ترکیب وغیرہ دریافت کر کے دوا پینا شروع کر دیا۔ اور دوسرے نے بھی نسخہ تو لکھوایا مگر نسخہ کو دیکھ کر آپ نے طبیب سے قیل وقال شروع کی۔ کیوں حکیم صاحب آپ نے گل بنفشہ کیوں لکھا ہے۔ بجائے اس کے فلاں دوا کیوں نہ تجویز فرمائی اور گل بنفشہ پانچ ہی ماشہ کیوں لکھا۔ چھ ماشہ کیوں نہ لکھا ظاہر ہے کہ طبیب کو یہ گفتگو اس مریض کی ضرورت ناگوار گزرے گی۔ اس کو تو اس قدر سوال کافی ہے کہ میرا مرض کیا ہے۔ اور دوا کیا ہے اور بلا حجت دوا پینا شروع کر دیتا۔ اس پر طبیب عتاب بھی کرے گا لیکن اسی عتاب کی حالت میں اگر کوئی طالب علم (جو اس طبیب سے فن حاصل کرنے کے لئے رہتا ہے) آ جاوے اور وہ بعینہ یہی سوالات کرے کہ شیخ نے اس دوا کی مقدار کی کیوں لکھی ہے اور بجائے اس کے فلاں دوا کیوں نہیں لکھی تو طبیب برابر جواب دینے لگے گا۔ اس پر وہ مریض سائل بگڑ جائے کہ

کیا وجہ ہے کہ ہم نے یہی سوال کیا تھا تو ہم پر تو عتاب ہوا۔ اور اس نے پوچھا تو آپ نے جواب دیا وہ طبیب ظاہر ہے کہ یہ کہے گا کہ یہ فن حاصل کرنے آیا ہے اس کو سوال کا حق حاصل ہے اور اس کا مقصود ہی ہے اور آپ کا مقصد یہ نہیں۔ آپ کو تو شفا مطلوب ہے۔

صاحبو! یہ مثال جب سمجھ میں آگئی تو اب اس سے صاف واضح ہو گیا کہ آپ صاحبوں کا حکمت سے سوال کرنا بالکل بے موقع ہے۔ تعجب ہے کہ شب و روز گراموفون اور فونو گراف اور کمروں و بنگلوں میں رہنے کا شغل ہو اور سوال یہ کریں کہ نماز کی فلاسفی کیا ہے اور روزہ کی حکمت کیا ہے۔ آپ اپنے امراض کا علاج کیجئے۔

مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ ایک مرتبہ قصبہ رام پور جاتے ہوئے موضع اسلام نگر میں تشریف لائے۔ ایک خان صاحب ایک جگہ کے رئیس اس مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کو خیال ہوا کہ مولوی صاحب تنہا ہیں۔ ان سے باتیں کرنا چاہیں۔ اب باتیں کریں تو کیا کریں۔ اس لئے کہ ہر شخص سے وہی باتیں کی جاتی ہیں جو اس کے مذاق کے موافق ہوں۔ سوچ بچار کر آپ پوچھتے ہیں کہ حضرت وہ چھوٹی چھوٹی باتیں کون سی ہیں جن سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ چھوٹی باتوں سے ہمارے یہاں نکاح نہیں ٹوٹتا۔ یعنی آپ کی مراد کن چھوٹی باتوں سے ہے؟ خان صاحب کہنے لگے کہ حضرت یہی کفر شرک کی باتیں۔ حضرت نے ہنس کر فرمایا کہ خان صاحب جب کفر شرک چھوٹی باتیں ہیں تو آپ کے نزدیک بڑی باتیں کون سی ہیں خان صاحب چپ رہ گئے۔ حقیقت میں اپنے مرتبہ سے زیادہ سوال کرنا خود ذلیل ہونا ہے۔

ایسے ہی ہمارے زمانہ کے تعلیم یافتہ حضرات ہیں۔ ان کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے ایک شخص پر فوجداری کا مقدمہ ہو گیا ہے اور وہ دریافت کرتا پھرتا ہے کہ فلاں دفعہ جو تعزیرات ہند میں ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ اس کے ذمہ تو ضروری ہے کہ اس کو فکر ہو جائے اور وکلا سے مشورہ کرے اور اپنی مرضی کی کوئی صورت تجویز کرے افسوس ہے کہ ہمارے اوپر ہزاروں مقدمے فوجداری کے قائم ہیں۔ لیکن ہم کو تنبیہ نہیں۔ ہم کو تو یہ ضروری تھا کہ قوانین دریافت کرتے اور اپنی گلو خلاصی کی کوئی تدبیر نکالتے۔ ہم اس کے پیچھے پڑ گئے کہ اس کی کیا وجہ ہے اور اس کی کیا وجہ ہے۔

احکام الہی کی عظمت

سو یہ سخت مضر ہے اس لئے کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو حکم و علل کچھ سمجھ میں آگئے یا نہیں۔

اگر سمجھ میں نہ آئے تب تو یہ ضرر ہوگا کہ امتثال کو مٹی کیا تھا فہم پر اور فہم ہوا نہیں۔ اس لئے احکام پر عمل ہی نہ کرے گا اور ان کو لغو سمجھے گا جیسا کہ آج کل بہت سے ہمارے نوجوان مذہب کی پابندی صرف قومیت کے لحاظ سے کرتے ہیں احکام الہیہ کی کچھ عظمت ان کے قلوب میں نہیں ہے بلکہ اس قسم کے سوالات کرنا یہ خود دلیل اس کی ہے کہ عظمت نہیں۔

دیکھو گورنمنٹ کے احکام کی چونکہ دل میں عظمت ہے اس لئے ان کی وجہ کبھی نہیں پوچھی جاتی۔ اگر کوئی پوچھتا بھی ہے تو یہ جواب ملتا ہے میاں احمق ہو سرکاری حکم ہے اور یہاں علماء سے حکمتیں اور علتیں دریافت کی جاتی ہیں۔

میں بقسم کہتا ہوں کہ علماء جو جاننے کی چیزیں ہیں سب کچھ جانتے ہیں بہت سے احکام کی حکمت بھی جانتے ہیں اور علت بھی مگر اس حکیم کی مثل ہیں کہ جاہل مریض کو اس نے جھڑک دیا تھا اور اگر کوئی طالب علم سوال کرتا ہے تو وہ شگفتہ ہو کر جواب دیتا ہے۔

ایک شخص میرے پاس ایک فرائض کا مسئلہ لائے۔ اس میں بھتیجا اور بھتیجی تھے میں نے کہا یہ میراث بھتیجے کو ملے گی۔ کہنے لگے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ بھتیجی کو نہ ملے گی۔ حالانکہ دونوں بھائی بہن ہیں۔ میں نے کہا جناب نوکری چھوڑی دیجئے اور فارغ ہو کر ہمارے پاس رہئے۔ ہم اول سے صرف و نحو فقہ پڑھا کر سرارجی آپ کو پڑھائیں گے اس قوت اس کی وجہ سے آپ سوال کرنے کے قابل ہوں گے اور اب تو یہ جواب ہے کہ سرکاری حکم اسی طرح سے ہے۔

بہر حال یہ طرز اور اس پر بنائے کار رکھنا سخت مضر ہے کہ اگر معلوم نہ ہو تب تو عظمت و وقعت نہ ہوگی اور اگر کچھ سمجھ میں بھی آئے تو چونکہ علل و حکم منصوص کم ہیں اس لئے اکثر تحسین و ظنی ہوں گے کیونکہ بدون خدا و رسول کے بتلائے ہوئے ہماری رسائی حقائق تک کب ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول کے علم سے ہمارے علم کو جو نسبت ہے وہ اس سے بھی زیادہ بعید ہے کہ جیسے ایک صغیر سن بچے کے علم کو باپ کے علم سے۔

چنانچہ اب ملاحظہ فرمائیے کہ چھوٹے بچے کو آپ منع کرتے ہیں کہ کھانا آم نہ کھاؤ اور دلیل اس کی کچھ بیان نہیں کرتے۔ دو وجہ سے ایک تو اس لئے کہ ہمارا اس پر زور ایسا ہے کہ ہم جو بات اس سے کہہ دیں گے بلا دلیل و بلا چون و چرا اس کو ماننا ضرور ہے۔ دوسری وجہ اس کی کم فہمی ہے کہ اگر وجہ بیان کی جائے گی تو اس کی سمجھ میں نہ آئے گی۔

صاحبو! کیا خدا تعالیٰ کا اتنا بھی زور نہیں یا یہ گمان ہے کہ ہمارا علم کافی ہے۔ جب تھوڑے حقوق اور تھوڑا تفاوت علم پر لم (علت) و کیف قطع ہو جاتا ہے۔ تو خداوند تعالیٰ شانہ کے حقوق و علم تو کہیں زیادہ ہیں۔ تعجب ہے کہ خدا تعالیٰ سے اس کا انتظار کریں کہ جب وجہ سمجھ میں آجائے گی اس وقت مانیں گے اور چونکہ وہ محسن ہیں خالق ہیں اس لئے بعض جگہ حکم واسطہ خود بھی بیان فرمادیئے ہیں جیسے بچہ کی مثال ہیں باپ بعض مرتبہ کہتا ہے کہ کھٹے آم مت کھاؤ پھنسیاں نکل آئیں گی۔ اور جہاں بیان نہیں فرمایا وہاں اپنی طرف سے تراشناخت مضر ہے۔

بعض لوگ اس کاوش اسرار کے عذر میں کہا کرتے ہیں کہ صاحب ہم کو خود تو شبہ نہیں ہے لیکن بعض مخالفین پوچھتے ہیں ہم کیا جواب دیں اس لئے ہم پوچھتے ہیں سو یہ بھی نادانی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پوچھ پوچھ کر جواب دو گے تو کہاں تک دو گے۔ کہیں تو بند ہو کر کہنا پڑے گا کہ ہم نہیں جانتے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ سیدھی بات کہہ دو کہ بھائی علماء سے پوچھو ہم نہیں جانتے۔ جب وہ علماء سے پوچھیں گے، تو علماء ان سے خود نبٹ لیں گے اور باقاعدہ ان سے گفتگو کر لیں گے۔

وہ قاعدہ یہ ہے کہ ہر مذہب حق کے کچھ فروع اور اصول عقلی ہیں۔ نقل کو اس میں دخل نہیں۔ تو جو شخص اصول کو تسلیم کئے ہوئے ہے اس کو تو اس قدر کافی ہے کہ جب اصول تمہارے مسلمہ ہیں تو فروع تم کو ضرور تسلیم کرنا ہوں گے اور اگر اصول ہی مسلم نہ ہوں تو اول اصول میں گفتگو کرنا چاہیے۔ جب اصول طے ہو جائینگے فروع خود ان کے تابع ہیں۔ پس اس قاعدہ سے معلوم ہو گیا کہ مسلمان ہو کر اگر جزئیات کی وجہ دریافت کرے اس کے کوئی معنی نہیں۔ جزئیات کی وجہ دریافت کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اصول اسلامیہ ہی کلام ہے تو ایسے شخص کو اول تو حید و رسالت میں گفتگو کرنا چاہیے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے وہ شخص ایک بادشاہ کی حکومت میں رہتے ہیں ایک شخص اہل اطاعت میں سے ہے اور ایک باغی ہے۔ جو مطیع ہے اس کو قوانین کی وجہ اور لم دریافت کرنے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ جب اس نے بادشاہ کا بادشاہ ہونا اور اپنا رعایا ہونا تسلیم کر لیا تو اب احکام میں حجت نکالنا بے معنی ہے اس کے لئے یہی کافی ہے کہ جس کو میں بادشاہ مانتا ہوں۔ یہ اس کے احکام ہیں اور باغی اگر دریافت کرے تو وہ اس لئے بیکار ہے کہ وہ بادشاہ کو بادشاہ نہیں مانتا۔ اس لئے بجائے توجیہ جزئیات کے اول تو اس سے بادشاہ کو بادشاہ منوائیں گے جب وہ مانے گا تو پھر احکام خود ہی اس کو ماننا پڑیں گے۔

غرض مخالفین کو جواب دینے کی غرض سے حکمتوں کا پوچھنا تو جیسا مثال مذکور سے مفہوم ہوا بالکل ہی لغو ہے اور اپنے عمل کے لئے اگر ہے تو اس لئے لغو ہے کہ مسلمان کا بس یہ مسلک ہونا چاہیے۔
زبان تازہ کردن باقرار تو ^{نیکی} علت ازکار تو
زبان سے اقرار کرنا چاہیے کوئی علت نہ ڈھونڈنا چاہیے۔

اگر کوئی کہے کہ بعض بزرگوں کے کلام میں بھی احکام کی حکمتیں پائی جاتی ہیں، تو بات یہ ہے کہ جن حضرات کی زبان سے کچھ حکمتیں نکلی ہیں وہ انہوں نے کسی سے پوچھ پوچھ کر حاصل نہیں کیں بلکہ اس کا طریق الہام کا بھی یہ ہے کہ بدون کاوش انہوں نے عمل شروع کر دیا تھا۔ عمل کرتے کرتے حق تعالیٰ کی طرف سے ایک نور عطا ہو گیا اس سے سب حقائق کھل گئے۔ تو تم بھی ایسا ہی کرو۔ حسب استعداد تم پر بھی فضل ہو جائے گا اور حقیقت میں شریعت نے یہ احسان کیا ہے کہ تفتیش حکمت سے منع کر دیا ہے اور اس میں

بڑی حکمت ہے اس لئے اگر حکمتیں سوچ کر تم نے عمل کیا اور ہوں گی وہ تخمینی جیسا پہلے معلوم ہوا تو ممکن ہے کہ پچاس برس کے بعد وہ حکمتیں مخدوش ثابت ہوں تو جب بنا منہدم ہو گئی تو مبنی بھی نہ رہے گا۔ تو ان حکمتوں کا دروازہ کھولنا گویا اسلام پر سخت حملہ کرنا ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے بھائی اس راز کو سمجھتے نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس پر امتثال کو مٹی کرنا سخت مضر ہے۔ اس لئے روزہ کے متعلق بھی اس کے درپے مت ہو۔

روزہ کی خصوصیت

ضروری بات سمجھ لو کہ روزہ کی جزا خود دیں گے۔ خواہ وہ جزا کچھ ہو۔ اور خواہ اس میں وجہ مناسب تم کو معلوم نہ بھی ہو۔ آگے فرماتے ہیں فائدہ لی، روزہ میری شے ہے یہ روزہ کی فضیلت ہے۔ رہی یہ بات کہ روزہ کو اپنا کیوں فرمایا۔ اس کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ جس قدر عبادات ہیں ان کو کچھ نہ کچھ صورت بھی محسوس ہوتی ہے مثلاً نماز کی صورت رکوع، سجود، قیام، قعود محسوس، زکوٰۃ کی صورت اعطاء محسوس ہے۔ حج کی صورت ارکان مخصوصہ ممکنہ مخصوصہ میں ادا کرنا محسوس ہے۔ نماز پڑھو تب سب کو معلوم ہو جائے گا کہ نماز پڑھ رہا ہے۔ حج کو تو سب دیکھیں گے بخلاف روزہ کے کہ کسی کو خبر نہیں ہوتی اس لئے کہ اس کی حقیقت چند اشیاء کا ترک ہے اور وہ محسوس نہیں۔

اگر کوئی کہے کہ ہم ایک شخص کو صبح سے شام تک مقید رکھیں یا ہر وقت اس کے پاس رہیں

تو معلوم ہو جائے گا کہ روزہ ہے یا نہیں۔ تو وہ بھی محسوس ہو گیا۔

جواب یہ ہے کہ اس سے بھی روزہ کا علم ہوگا اس لئے کہ پیشاب پاخانہ غسلاخانہ میں جانے کے وقت تو پہرہ ہٹاؤ گے۔ تو اس میں ممکن ہے کہ وہ روزہ توڑ ڈالے تو آپ کو کیا خبر ہوگی۔
غرض جب روزہ ایسی چیز ہوئی تو اور عبادتوں میں تو ریا کا بھی احتمال ہو سکتا ہے مگر روزہ کے اندر یہ احتمال بالکل نہیں ہے۔

اگر کوئی کہے کہ اگر کوئی ظاہر کر دے کہ میرا روزہ ہے تو پھر روزہ میں بھی احتمال ریا کا ہو جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ اس صورت میں بھی ریا نہ ہوگی۔ اس لئے کہ دیکھنے والوں کو روزہ کی صورت تو نظر آتی نہیں صرف اس کے اخبار سے ہی معلوم ہوا کہ روزہ ہے اور

الخبر یحتمل الصدق والكذب۔ یعنی خبر میں جھوٹ اور سچ دونوں کا احتمال ہے۔

ممکن ہے کہ اس کو جھوٹا سمجھا جائے بخلاف اور عبادتوں کے کہ اگر انکار بھی کرے تب بھی وہ انکار مفید نہیں اس لئے کہ مشاہدہ کے خلاف ہوگا پس ایک معنی تو فائدہ لی کے یہ ہو سکتے ہیں کہ یہ میرے ہی لئے خالص ہے اس میں نمائش کا احتمال نہیں ہے۔

صلوٰۃ اللہ کی حقیقت

دوسری وجہ فائدہ لی فرمانے کی یہ ہے کہ جتنے اعمال ہیں سب میں عبدیت کی شکل ہے مثلاً نماز حج وغیرہ یا بعض میں ایسی صفت ہے کہ مشترک ہے جیسے زکوٰۃ کی حقیقت کہ اعطاء ہے کہ عبد کی بھی صفت ہے اور آلہ کی بھی بخلاف روزہ کے کہ جس کی حقیقت ترک الاکل والشرب والجماع ہے اور ان امور سے منزہ ہونا خالص صفت حق تعالیٰ کی ہے حق تعالیٰ اس سے پاک ہیں۔

اگر کوئی کہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ شب معراج میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لے گئے اور ایسے مقام پر پہنچے جہاں فرشتے بھی نہ جاسکتے تھے اور آگے بڑھنا چاہا تو ندا آئی۔
قف یا محمد فان ربک یصلی یعنی ٹھہرو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے کہ آپ کا رب نماز پڑھتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صلوٰۃ بھی حق تعالیٰ کی صفت ہے۔

اس حدیث سے منکرین حدیث کو تو یہ ضرر ہوا کہ انہوں نے اس کے حدیث ہونے ہی سے انکار کر دیا۔ اور کم علم اور کم فہموں کو یہ غلطی ہوئی کہ وہ اس کے ظاہر کا اعتقاد کر بیٹھے بات یہ ہے کہ یہاں صلوٰۃ کے معنی توجہ اور رحمت کے ہیں جیسا قرآن شریف میں هو الذی یصلی علیکم۔

اللہ تعالیٰ ایسے ہیں کہ تم پر رحمت بھیجتے ہیں رہا یہ شبہ کہ رحمت و توجہ فرمانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آگے بڑھنے سے کیوں مانع ہوا۔ بات یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں تو ہر وقت مورد تجلیات اور رحمتوں کے رہتے تھے کہ کسی کو انبیاء و اولیاء میں سے یہ مرتبہ حاصل نہ تھا لیکن اس وقت حق تعالیٰ نے چاہا کہ خاص تجلیات اور قرب خاص سے مشرف فرمادیں اور ان تجلیات خاصہ و قرب خاص کے لئے ضرورت تھی استعداد خاص کی۔ اس لئے ٹھہرے رہنے کا حکم فرمایا کہ ابھی ٹھہرو، اللہ تعالیٰ تم پر اپنے انوار و رحمت فائض فرما رہے ہیں تاکہ تمہارے اندر استعداد تام ہو جائے آئندہ تجلیات کی۔ پس معلوم ہوا کہ یہاں نماز کے معنی نہیں۔ غرض نماز خاص صفت بندہ کی ہے۔ بخلاف روزہ کے کہ اس میں شان تنزیہ کی ہے پس اس میں شبہ ہے حق تعالیٰ کے ساتھ۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ وہ ہماری شے ہے۔

ایک لطیفہ غیبی

یہاں سے ایک لطیفہ ظنی طریق سے مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا اور ظالمین کی نیکیاں مظلوموں کو دی جائیں گی تو بعض اہل لطائف نے کہا ہے کہ روزہ نہ چھنے گا۔ اس لئے کہ سرکاری جائداد ہے۔ اس کو کوئی نہ لے سکے گا مگر اس کا دعویٰ لطیفہ کے درجہ میں ہے ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو اور اس کے ساتھ ہی ایک اور بات بھی یاد آئی۔ وہ یہ ہے کہ انا اجزی بہ . میں خود ہی اس کی جزا دوں گا۔

ایک نسخہ انا اجزی بہ بصیغہ مجہول بھی مشہور ہے اس کے معنی مشہور یہ ہیں کہ روزہ میرا ہے اور اس کے بدلہ میں دیا جاؤں گا۔ یعنی اس کا بدلہ یہ ہے کہ میں اس کو ملوں گا۔ اور یہ مضمون گوئی نفسہ صحیح ہو کہ حق تعالیٰ اس کے بدلے میں مل جائیں گے۔

اس پر مجھ کو ایک حکایت یاد آگئی کہ خلیفہ ہارون الرشید نے ایک دن دربار کیا اور یہ حکم کیا کہ جو شخص جس شے پر ہاتھ رکھ دے گا اس کو وہی شے دی جائے گی چنانچہ لوگوں نے اپنی خواہشوں کے موافق ایک ایک شے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک لونڈی نے ہارون رشید کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہارون نے کہا یہ کیا۔ کہا کہ جب آپ میرے ہو گئے تو یہ چیزیں میری ہو گئیں اس لئے میں نے آپ کو انتخاب کیا ہے۔ بس جس کو خدا تعالیٰ مل گئے۔ اس کو سب نعمتیں مل گئیں۔

غرض یہ مضمون تو فی نفسہ صحیح ہے مگر غلطی یہ ہے کہ اس حدیث سے نکالا جاتا ہے جو شخص ذرا

بھی عربیت سے مس رکھتا ہوگا وہ ہرگز اس سے یہ معنی نہ سمجھے گا اس لئے کہ عربیت کے اعتبار سے اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جزا دیا جاؤں گا۔ یعنی نعوذ باللہ مجھ کو کوئی جزا دے گا نہ یہ کہ میں جزا میں مل جاؤں گا۔ کہ یہ اس کا ترجمہ نہیں ہے پس یہ نسخہ غلط ہے صحیح وہی ہے

انا اجزی بہ۔ یعنی میں اس کو جزا دوں گا۔ اور روزہ کی فضیلت یہ کیا کچھ کم ہے کہ فرماتے ہیں کہ میں جزا دوں گا۔ خیر یہ مضامین تو تبعاً بطور لطیفہ کے ہیں۔

روزہ اور فدیہ

مجھ کو فائدہ لی (وہ روزہ میرے ہی لئے ہے) سے ایک مضمون خاص مستبط کرنا ہے جو کہ نہایت کارآمد ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب یہ فرمایا کہ روزہ میرا ہے تو جب ہم نے روزہ رکھا تو گویا ہم زبان حال سے یہ کہہ رہے ہیں کہ لیجئے حضور یہ آپ کے لئے ہے۔ اب آپ یہاں سے سبق حاصل کیجئے کہ اگر حاکم ضلع کے لئے کوئی شے تحفہ کے طور پر بھی لے جاؤ خاص کر جب کہ حاکم خود فرمائش بھی کرے تو اس کا کس قدر اہتمام کر دو گے۔ جہاں تک ہو سکے گا عمدہ صاف ستھری شے لے جاؤ گے۔ اور اگر احتمال بھی اس میں عیب کا ہوگا تو اس کو ردی کر دو گے دوسری منگاؤ گے۔ ذرا گریبان میں منہ ڈال کر حق تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کو کہنا کہ روزہ میں بھی اتنا یا اس سے آدھا ہی اہتمام ہوا ہے بفضلہ تعالیٰ اکثر لوگ تو روزہ ہی نہیں رکھتے اور کہتے ہیں کہ روزہ کی فلاسفی ہے کسر قوتہ بہمیہ۔ تو جب یہ علت ہے تو ہم اپنے اندر اس وقت کو مغلوب پاتے ہیں۔ خاص کر بعض نام کے مولویوں کا ترجمہ بعض نے جب سے دیکھا ہے تو اور زیادہ دلیری بڑھ گئی۔

اس زمانہ میں ایک قرآن شریف کا ترجمہ طبع ہوا ہے اس میں:

وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ۔ جو لوگ روزہ کی طاقت رکھتے نہ ہوں ان کے ذمہ فدیہ ہے۔

کی تفسیر میں لکھ دیا ہے کہ جو شخص روزہ نہ رکھے وہ فدیہ دے دے۔ اس سے لوگوں کی جرأت بڑھ گئی اور بجائے روزہ کے فدیہ کو کافی سمجھ لیا۔

یاد رکھو کہ یہ تفسیر اس آیت کی بالکل غلط ہے اور وجہ یہ ہے کہ یہ ترجمہ کرنے والا ہی علوم سے بالکل جاہل ہے اس لئے کہ مولوی تو مولا والا ہے اور نفس علم کی وجہ سے اگر کوئی مولوی ہو جائے تو شیطان بڑا عالم ہے بلکہ معلم المملکت و فرشتوں کا استاد مشہور ہے۔ خدا جانے یہ کہاں کی روایت ہے۔ کسی بزرگ کے کلام میں ہو تو اس کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ علوم میں فرشتوں سے زیادہ ہے۔ یہ

مطلب نہیں کہ فرشتوں کو میاں جی کی طرح پڑھایا کرتے تھے۔ اور شیطان کا علم میں زیادہ ہونا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مولویوں کو بہکا تا ہے۔ مولوی کو وہی شخص بہکا سکتا ہے جو اس سے زیادہ علم رکھتا ہو۔ دیکھئے اگر وکلاء کو کوئی دھوکا دے تو وہ وکالت دانی میں اس سے زیادہ ہوگا۔ جب مولویوں کو بھی دھوکا دیتا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ مولویوں سے زیادہ علم رکھتا ہے مگر صاحبو! علم تو اور ہی شے ہے علم وہ ہے جس کی نسبت فرماتے ہیں:

علم چہ بود آنکہ بنمایدت زنگ گمراہی ز دل بزوایدت

توندانی جز بجز لا بجز خوددانی تو کہ حوری یا بجز

حقیقت میں علم وہی ہے کہ تم کو راہ حق دکھائے اور تمہارے دل سے گمراہی کا زنگ دور کر دے۔ تم کو سوائے بجز (یہ چیز جائز ہے) اور لا بجز (یہ چیز ناجائز ہے) کے کچھ خبر نہیں۔ تمہیں اپنا علم نہیں کہ تم مقبول ہو یا مردود۔

جس نے تمام عمر ڈپٹی کلکٹری کی ہو وہ قرآن کا کیا ترجمہ کرے گا۔ بڑا کمال اس ترجمہ کا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ محاورہ کے موافق ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ مسلم ہے لیکن جب غلط ہوا تو کس کام کا۔ اگر حرمت علیکم امہاتکم۔ تم پر تمہاری مائیں حرام کی گئی ہیں۔

کا ترجمہ کوئی یہ کرنے لگے کہ نماز پڑھو تو یہ ترجمہ ہی نہیں۔ چنانچہ اس ترجمہ کا ایک مقام مجھ کو یاد آیا۔ سورہ یوسف میں ہے

ذہبنا نستبق۔ ہم آپس میں دوڑنے لگ گئے۔

استباق کا ترجمہ ان مترجم صاحب نے کبڈی کھیلنا کیا ہے۔ یہ ترجمہ نقل بھی بالکل غلط ہے اور عقلاً بھی۔ نقل تو اس لئے کہ لغت میں دیکھ لیجئے کہ استباق کے کیا معنی۔ کیا خلاف لغت ترجمہ بھی معتبر ہوگا۔ استباق کے معنی آپس میں دوڑنا ہیں کہ دیکھیں کون آگے نکلے اور چونکہ عقل پرستی کا آج کل زور ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ عقلاً بھی یہ ترجمہ غلط ہے اس لئے کہ کبڈی کھیلنے میں اتنی دوڑ نہیں جایا کرتے کہ جس سے محافظ بچہ کی نسبت بھیڑیے کے کھا جانے کا احتمال ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت یعقوب علیہ السلام ضرور جرح فرماتے۔

بہر حال و علی الذین یطیعونہ کی یہ تفسیر نہیں ہے اور نہ فدیہ دینے والے بری ہو سکتے ہیں۔ اور نہ یہ کہہ کر بری ہو سکتے ہیں کہ روزہ تہذیب نفس کے لئے ہے ہم تو خود مہذب ہیں اس

لئے کہ اول تو یہ کہنا غلط ہے کہ ہم مہذب ہیں اور دوسرے تہذیب نفس روزہ کی حکمت ہے نہ کہ تباہ و علت۔ یہ خرابی اس کی ہے احکام کی مخترع حکمتوں پر مبنی کرتے ہیں۔ یہ تو ان کا ذکر ہے جو تاویل میں کر کے روزہ رکھتے ہی نہیں۔

روزہ کی حقوق

بعض وہ ہیں جو رکھتے ہیں لیکن اس کے حقوق ادا نہیں کرتے انہوں نے روزہ نام فقط اس کو رکھا ہے کہ کھانا پینا چھوڑ دیا جائے۔ صاحبو! اگر حاکم تم سے یہ کہے کہ ہم کو ایک آدمی کی ضرورت ہے اور تم اندھا، بہرا، لنگڑا، لولا، اپاہج محض لے جاؤ تو کیا حاکم اس سے خوش ہوگا ہرگز نہیں بلکہ حتی الوسع اس کی کوشش کرو گے کہ مرضی کے موافق آدمی ہو تو روزہ میں یہ قاعدہ کیوں مہمل چھوڑ دیا۔ آنکھ، زبان، ہاتھ، پاؤں سب ہی کو گناہ سے بچانا چاہیے۔ دیکھو جب روزہ میں وہ چیزیں حرام کر دی گئی ہیں جو پہلے مباح تھیں تو جو پہلے سے حرام ہیں وہ تو بطریق اولیٰ واجب التکرار ہوں گی اور اگر روزہ میں گناہ ترک نہ کئے تو اس کا روزہ کیا ہے نام کا روزہ ہے۔

اسی واسطے حدیث شریف میں آیا ہے کہ بعض لوگوں کو روزہ میں سے صرف بھوک پیاس اور جاگنا ہی میسر ہوتا ہے اور بعض لوگ اطمینان حاصل کرنے کے لئے دنیا کے تعلقات تو کم کر دیتے ہیں لیکن بجائے اس کے شطرنج، گنجفہ، غیبت، بدزگا ہی ناول دیکھنا اختیار کرتے ہیں یاد رکھو کہ یہ افعال سم قاتل ہیں ان کو معمولی نہ سمجھیں۔ مگر پھونکنے کے لئے ایک چنگاری بھی کافی ہے۔ ظاہر ا یہ افعال خفیف معلوم ہوتے ہیں لیکن واقع میں سخت ہیں۔

ادنیٰ بات یہ ہے کہ شطرنج سے غفلت پیدا ہوتی ہے اور غفلت تمام امراض کی جڑ ہے طبیعوں سے پوچھئے کہ زکام کیا ہے اگر علاج میں ذرا غفلت کی جائے تو سینکڑوں امراض کا مقدمہ بن جاتا ہے اسی طرح ناول دیکھنا اس میں بھی اس قدر مشغولی ہوتی ہے کہ سوائے اس کے قلب میں کچھ نہیں ہوتا۔ اگر کوئی کہے کہ غفلت تو کچھری میں کام کرنے اور روٹی کھانے پکانے سب میں ہوتی ہے تو چاہیے سب چھوڑ دیں۔ بات یہ ہے کہ کام دو قسم کے ہیں ایک ضروری اور ایک غیر ضروری۔ ضروری اشغال میں یوں تجربہ ہوا ہے کہ مضر نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ اس کو ضروری سمجھ کر آدمی اس میں پھنستا ہے اور جب اس کو ضروری سمجھا تو اصلی کام دوسری شے کو سمجھے گا۔ تو دل اصلی کام کی طرف رہے گا کہ اس کام سے فارغ ہو کر اپنا اصلی کام کریں گے۔ اور جو تھوڑی سی غفلت اس میں ہو جاتی

ہے اس کے لئے استغفار کا حکم فرمایا ہے کہ استغفار سے وہ دھل دھلا جائیگی اور غیر ضروری کی نسبت یہ تو خیال ہے نہیں کہ یہ ضروری ہے اس لئے اس کو ہی مقصود سمجھے گا اور وہ مضر ہے اور مورث غفلت ہے اور یہ غفلت بڑھتے بڑھتے مفطی الی الکبار بلکہ الی الکفر و کبیرہ گناہوں بلکہ کفر کی طرف پہنچانے والی ہو جاتی ہے بالخصوص ناول سے ایک بڑا ہی سخت مرض پیدا ہوتا ہے۔

وہ یہ کہ اس کے دیکھنے سے بد معاشی کے طریقے خوب یاد ہو جاتے ہیں ہمارے ناول کے شیدائی پرانے قصوں پر اعتراض کرتے ہیں اور تاریکی اور خلاف تہذیب سمجھتے ہیں لیکن اس تاریکی اور اس روشنی میں اس قدر فرق ہے کہ اس تاریکی میں وقت تو ضائع جاتا ہے لیکن اخلاق پر برا اثر نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ وہ قصہ صریحاً کذب اور عادتاً مستحیل ہیں مثلاً گل بکاؤلی کا قصہ بکاؤلی کی تصویر اور جنون کی عملداری وغیرہ من الخرافات ان قصوں سے کوئی ترکیب بد معاشی کی نہیں سیکھ سکتا کیوں کہ اس میں وصال بکاؤلی کا طریقہ ایک جن کا مہربان ہو کر پہنچا دینا ہے تو اس کو کوئی کس طرح حاصل کرے گا۔ بخلاف ناولوں کے (ضبط کنندہ عرض کرتا ہے کہ ناول کا طرز چونکہ ایسا دکھلایا جاتا ہے کہ واقعات ہوتے ہیں اس لئے اس کا اثر خبیث پڑتا ہے کہ اکثر آدمی اس کے دیکھنے سے عشق نساء یا اطفالین میں مبتلا ہو جاتا ہے اور قلب میں سوزش جیسی کیفیت ہو جاتی ہے اور یہ سخت مضر ہوتا ہے۔ ۱۲ جامع) کہ اس میں لکھا ہے کہ ماما کے ہاتھ رقعہ بھیج دیا جس کو ہر شخص کر سکتا ہے۔

اسی طرح بعض لوگ دنیا کے سب کام چھوڑ کر روزہ میں غیبت کے اندر مشغول ہو جاتے ہیں۔ چار آدمی بیٹھ گئے۔ اس پر طعن، اس کی برائی اور جو کہا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ میاں روزہ بھی کسی طرح کئے۔ الحاصل روزہ میں ہاتھ، پاؤں، کان، آنکھ سب کی حفاظت رکھنا چاہیے۔ ان سب گناہوں سے روزہ کی برکت کم ہو جاتی ہے خصوصاً معدہ کا گناہ یعنی حرام کھانا اس کو تو ضرور ہی چھوڑ دو کہ یہ تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔

حفظ نفس

حکم تو یہی ہے کہ ہمیشہ کے لئے اس کو ترک کر دو۔ لیکن چونکہ اس طرح یک دم سے چھوڑنا کم ہمت لوگوں کو شاق ہے اس لئے میں یہ ضرور کہوں گا کہ ایک ہی ماہ کے لئے اپنے نفس سے صلح کر لو۔ اور نفس سے کہہ دو کہ اے نفس صرف ایک ہی ماہ کے لئے متقی بن جاؤ۔ پھر اختیار ہے اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اب جو نفس کو تقویٰ پہاڑ نظر آتا ہے۔ اس کے بعد تقویٰ اس قدر مشکل نہ سمجھے گا اور شدہ شدہ دائمی تقویٰ بھی میسر ہو جائے گا۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ایک ماہ متقی ہو جانے سے تقویٰ کی ایک حلاوت محسوس ہوگی کہ جس کو آپ اس وقت محسوس نہیں کرتے ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی اطاعت میں ایک حلاوت ہے کیونکہ جس وقت یہ نفس روکے گا اس کے روکنے میں ایک حظ ہوگا کہ اس کے برابر کسی شے میں حظ نہیں ہے اسی واسطے جوانوں کو جو لطف عبادت میں آتا ہے وہ بڑھاپے میں نہیں ہوتا۔
 خود قوی تری شود خمر کہن خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن
 پرانی شراب تو اور زیادہ تیز ہو جاتی ہے خاص کر وہ شراب جو حق تعالیٰ کی طرف سے ہو یعنی شراب محبت اور کیفیت باطنی۔

لیکن اگر جوانی گزر گئی تو بڑھاپے ہی کو غنیمت سمجھنا چاہیے کہ آئندہ آنے والی حالت میں یہ بھی نہ ہوگا جواب ہو سکتا ہے۔ بہر حال فلسفی طور پر ثابت ہے کہ عبادت میں لطف ہوتا ہے جب اسی طرح تقویٰ کے ساتھ پورا مہینہ گزر جائے گا تو شوال میں آپ کو یاد آئے گا کہ ہم نے نگاہ کو روکا تھا کیسا لطف آیا تھا۔ حلال کھانا کھایا تھا کیا نور پیدا ہوا تھا اور آپ کو ایک امتیاز حلال اور حرام میں ہوگا پھر ان ہی حظوظ کو جی چاہے گا اور ہمت بڑھے گی۔ اس طور سے ان شاء اللہ امید ہے کہ تقویٰ دائمی حاصل ہو جائے گا تقویٰ سے یہ بھی فائدہ ہے کہ جو شخص تقویٰ کرتا ہے اس کو پریشانیاں نہیں ہوتیں۔ ہر کام میں اس کو سہولت ہوتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس نیت سے تقویٰ نہ کرے، پھر بعد رمضان شوال میں نفس سے یہ صلح کرے کہ اے نفس ہر ماہ میں ایک ہفتہ کے لئے تقویٰ اختیار کر لے۔ اسی طرح رفتہ رفتہ دن بڑھاتا جائے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ ہوگا کہ یہ شخص متقی کامل بن جائے گا اور یہ علاج میں نے بزرگوں کے ملفوظات سے سمجھا ہے۔

بعض بزرگوں نے حال میں لکھا ہے کہ اگر ان کو بیس میل چلنا ہوتا تھا تو نفس سے صلح کرتے تھے کہ اے نفس دو میل تک ذکر میں مشغول ہو جا۔ پھر تجھ کو اختیار ہے جب دو میل ختم ہو گئے دو میل کے لئے پھر صلح کر لی۔ اسی طرح تمام منزل ختم کر دی اور اگر ابتداء ہی سے نفس کو یہ معلوم ہو کہ مجھ کو تمام راستہ یہ شغل ہوگا تو ہرگز اس پر راضی نہ ہوگا لیکن صابو! تقویٰ کلابی اختیار نہ کرنا کہ کتاب پیشاب کرتا ہے تو ناگ الگ کر لیتا ہے مگر کھانے میں نجاست بھی سامنے آجائے تو وہ بھی کھا جاتا ہے۔ پس ناگ کو تو بچایا اور منہ کو آلودہ کر لیا۔ اسی طرح بعض لوگ وظیفوں کو تقویٰ سمجھتے ہیں اور حرام سے نہیں بچتے۔

تقویٰ کی صورت

تقویٰ ہر شے کا ہے۔ آنکھ کا تقویٰ یہ ہے کہ بری نگاہ سے کسی عورت یا مرد کو نہ دیکھے۔ زبان کا تقویٰ یہ ہے کہ کسی کی غیبت نہ کرے کسی کو ستائے نہیں۔ اسی طرح ہاتھ کا تقویٰ یہ ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرے شہوت سے مس نہ کرے۔ پاؤں کا تقویٰ یہ ہے کہ بری جگہ چل کر نہ جائے۔ کان کا تقویٰ یہ ہے کہ کسی کی غیبت نہ سنے۔ راگ باجے سے بچے وضع میں بھی تقویٰ ہے کہ وضع خلاف شرع نہ رکھے۔ پیٹ کا تقویٰ یہ ہے کہ حرام مال نہ کھائے۔

شاید یہاں یہ اشکال پیدا ہوگا کہ صاحب سب چیزوں کا تقویٰ ہے لیکن حرام آمدنی سے کیسے بچیں۔ اس لئے کہ ہمارا تو سب مال حرام ہے۔ غلہ ہے وہ حرام آمدنی کا ہے لباس ہے وہ ناجائز۔ اب اس کو کیسے چھوڑیں۔ یہ سخت مشکل ہے۔

مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ کہ ایک مرتبہ چوہوں میں کمیٹی ہوئی۔ سب چوہے جمع ہوئے اس میں گفتگو ہوئی کہ بلی نے ہمارے بنی نوع کو بہت ستایا ہے ہمیشہ کھا جاتی ہے اس کا کچھ انتظام ہونا چاہیے۔ سب کی رائے اس پر قرار پائی کہ اس کو پکڑیں۔ کسی نے کہا میں ہاتھ پکڑ لوں گا۔ کسی نے کہا ٹانگ پکڑ لوں گا۔ علیٰ ہذا ایک بڑا چوہا خزانہ تھا چپکا سب کی باتیں سن رہا تھا اور بولتا تھا آخر میں اس نے کہا کہ صاحبزادو! یہ سب کچھ ہے لیکن جب وہ میاؤں کرے گی تو اس کو کون پکڑے گا کیا کرو گے۔ تو تمہارے نزدیک ایسے ہی اس حرام آمدنی کا اشکال ہے جس کا کچھ جواب ہی نہیں۔ جس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ دس روپیہ تو کل تنخواہ اور اس میں گزر رکنبہ کا پتہ چلتا نہیں اگر بالائی آمدنی نہ ہو تو کھائیں گے کہاں سے۔ تو صاحبو! میں میاؤں کا بھی علاج بتاتا ہوں اگر چہ اس کے ظاہر کرنے کی جرأت تو نہ ہوتی تھی مگر میں دیکھتا ہوں کہ مسلمان بہت تباہ حالت میں ہیں۔ دین سے بہت دور جا گئے ہیں۔ اس لئے بضرورت ظاہر کرتا ہوں کہ فقہاء رحمہم اللہ نے اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے ہمارے لئے ایسی سہولتیں نکال دی ہیں کہ اگر ان سہولتوں کے ہوتے ہوئے بھی کوئی مبتلائے حرام ہو تو بڑا ہی بد بخت ہے۔

وہ یہ ہے کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شے قرض کے روپیہ سے خریدی جائے اور وہ قرض حرام سے ادا کر دیا جائے تو اس شے میں خبث کا اثر نہیں آتا۔ گو حرام آمدنی کمانے کا گناہ ہوگا۔ تو آپ یہ کیجئے کہ رمضان بھر کے لئے تمام اشیا کھانے پینے کی نقد نہ خریدیے۔ بلکہ کسی مہاجن سے یا کسی دوسرے مسلمان سے جس کی آمدنی حلال ہو پچاس روپیہ قرض لے کر تمام جنس خرید لیجئے۔ اور پھر وہ

قرض جہاں سے چاہے ادا کر دیجئے۔ اس طور سے آپ حرام کے اثر سے رمضان بھر کے لئے بچ سکتے ہیں لیجئے وہ سب سے زیادہ سخت سوال تھا اس کا علاج ہو گیا۔ گو حرام روپیہ سے قرض ادا کرنے کا گناہ ہوگا۔ مگر حرام کھانے سے تو بچے اور جو گناہ بالکل مہمل اور تفریح کے طور پر کئے جاتے ہیں ان کے چھوڑنے میں تو آپ کو کوئی عذر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس طور سے آپ رمضان میں متقی بن سکتے ہیں اور پھر اس تقویٰ کا اثر آپ خود دیکھیں گے میرے بیان کرنے کی ضرورت نہیں یہ تو رمضان کے لئے ہوا۔

گیارہ مہینے کے لئے یہ کیجئے کہ نفس سے صلح کیجئے کہ ہر ماہ میں سے تین دن کے لئے اسی طرح تقویٰ اختیار کر لے تو بقاعدہ من جاء بالحسنة فله عشر امثالها۔ یعنی جو شخص نیکی لائے اس کے لئے اس کی دس مثل ہیں۔

مجھے اللہ سے امید ہے کہ وہ تین بجائے تیس کے برکت میں ہو کر بقیہ ایام میں بھی اللہ تعالیٰ آپ کو تقویٰ کی دولت سے مالا مال کر دیں گے۔

ایک کام کی بات اور یاد آئی اور وہ ایک چھوٹی سے بچی سے مجھے حاصل ہوئی ہے۔ بعض مرتبہ حقائق اور حکم مجانبین اور بچوں سے بھی مل جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک بچی نے یہ کہا ہے کہ نفس جس لذت و لطف کا تقاضا کرے اس کے جواب میں اس کو روکو موت بلکہ ترک کی مہلت دو اور کہو کہ جنت میں چل کر اس لطف و لذت کو حاصل کریں گے۔ حقیقت میں یہ عجیب بات ہے بات یہ ہے کہ نفس کو گھونٹنا اور روکنا زیادہ ناگوار ہوتا ہے۔ اور آزادی اور اس کی خواہش کو پورا کرنا یا وعدہ کر لینا آسان ہے۔ چنانچہ اس تدبیر کا میں نے اول خود تجربہ کیا بہت ہی نافع ثابت ہوئی۔ پھر میں نے اوروں کو بتایا۔ انہوں نے بھی اس کا نافع ہونا ظاہر کیا۔

غرض یہ ہے کہ تدبیر کیجئے۔ اور اپنی اصلاح کی فکر کیجئے۔ بے فکری بہت بری شے ہے اس سے گناہ بڑھتے چلے جاتے ہیں اور گناہ کے بڑھنے سے دل بے حس ہو جاتا ہے پھر اچھے برے کی بھی تمیز نہیں رہتی۔ اور پہلے تو وعیدات شرعیہ ہی متنبہ کرتی تھیں۔ اور اب تو انقلابات عالم سے بھی تنبیہ ہو رہی ہے اگر ان تغیرات سے بھی اصلاح نہ ہو تو سخت افسوس ہے۔

اب اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے آمین یا رب العالمین!

الصَّیَام

مغفرت ذنوب کے متعلق یہ وعظ ماہ رمضان المبارک
 ۱۳۴۱ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں قریباً ۲۰۰ سامعین
 کی موجودگی میں بیٹھ کر فرمایا جو ۳ گھنٹہ ۵ منٹ میں ختم
 کیا محمد عبداللہ نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ
وَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا
مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلَّهُ فَلَاهَادِي لَهُ وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ
لَا شَرِيكَ لَهُ وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ صَلَّى
اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ. آمَنَّا بَعْدُ

فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من صام رمضان ایمانا واحتسابا غفر له
ما تقدم ذنبه ومن قام رمضان ایمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه۔
ترجمہ: ارشاد فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”جس شخص نے رمضان
کے روزے رکھے ایمان اور اعتقاد اور طلب ثواب کے لئے تو اس کے پہلے گناہ
بخشتے جائیں گے اور جو شخص شب بیداری کرے رمضان میں ایمان سے اور طلب
ثواب کے لئے تو اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

فاعل بالاختیار

یہ ایک حدیث ہے جو مشتمل ہے دو جملوں پر۔ ایک جملہ میں صیام رمضان کی فضیلت
اور دوسرے میں قیام رمضان یعنی رمضان میں شب بیداری کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ خلاصہ یہ
ہے کہ رمضان کی دو عبادتوں کی فضیلت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے اول صیام کی
دوسرے قیام کی۔ میں اس وقت ان دونوں عبادتوں کے فضائل بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتا لیکن نہ

۱۔ الصحيح للبخاری: ۱۶۱، ۳۳، الصحيح لمسلم، صلوۃ المسافرين: ۱۷۵، سنن أبی داؤد
التطوع ب: ۲۹، سنن النسائی: ۱۵۶، ۱۵۷، سنن ابن ماجہ: ۱۶۲، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۹۵۸

اس وجہ سے کہ فی نفسہ بھی ضروری نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیوں بیان فرماتے اور فضیلت کا انکار کیسے ہو سکتا ہے۔ قطع نظر رمضان کی خصوصیت کے خود ان دونوں عبادتوں میں بھی فضیلت ہے اور رمضان کی وجہ سے اور زیادہ فضیلت ان میں بڑھ گئی ہے لیکن خود روزہ اس میں مشروع ہونا بوجہ اس ماہ کی برکت ہے۔

رہی یہ بات کہ برکت اس ماہ میں کیوں ہے تو یہ بات قابل سوال نہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ جس مخلوق کو چاہے بابرکت بنادے اور اس سوال کی مثال تو ایسی ہوگی جیسے کوئی انبیاء کی نسبت سوال کرے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے نبی کیوں بنایا۔ حق تعالیٰ فاعل بالاختیار ہے جس کو چاہے برکت عطا فرمادے۔ کوئی شخص سوال نہیں کر سکتا کہ ایسا کیوں کیا۔ نہ حکومت کے اعتبار سے سوال ہو سکتا ہے اور نہ حکمت کے۔ اس لئے کہ خدا تعالیٰ اس پر بھی قادر ہیں۔ کہ جو چاہیں کریں۔ اگرچہ اس میں کوئی حکمت نہ ہو۔ اور اگر حکمتیں بھی ہوں جیسا واقع میں حکمت ہوتی ہے تو ان حکمتوں سے ہم سوال نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ اگر حکمتوں کا ہم سوال کریں تو منتہی ان کے جوابات کا پھر یہی ہوگا کہ یہی کہنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ جو چاہیں کریں۔ اس لئے کہ جو جواب دیا جائے گا وہ ایک لم کا جواب تو ہو جائے گا لیکن وہ جواب خود ایک واقعہ ہوگا جو محتاج علت ہے۔ اسی طرح پھر اس علت کی علت اور حکمت کی حکمت ہوگی۔ آخر کار یہی کہنا پڑے گا کہ حق تعالیٰ فاعل بالاختیار ہے جو چاہیں کریں۔

سائنس اور شریعت

یہ مسئلہ تعصب اسلامی کا شعبہ نہیں۔ ہر سائنس پرست اور فطرت پرست کو بھی آخر کار یہی کہنا پڑے گا کہ اس کا کوئی جواب نہیں۔

مثلاً انہوں نے زلزلہ کے معلوم کرنے کا ایک آلہ بنایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب زلزلہ قریب ہوتا ہے تو مقناطیس سے قوت جذب کی باطل ہو جاتی ہے۔ تو وہ آلہ اس قسم سے ہوگا کہ مقناطیس سے لوہا چپکا دیا جاتا ہے اور نیچے کوئی بجتنے والا برتن رکھ دیا جاتا ہے جب وہ لوہا اس پر گرتا ہے تو وہ بجتا ہے گھروالوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ زلزلہ آنے والا ہے گھر چھوڑ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں تاکہ گھر گرے تو دب کر نہ مریں اور گھر چھوڑ کر چلے جانے میں کچھ حرج نہیں مسئلہ شرعیہ بھی ہے کہ جب زلزلہ آئے تو فرار مستحب ہے ہاں طاعون سے فرار ممنوع ہے وہاں قرار ضروری ہے۔

وجہ اس فرق کی یہ ہے کہ طاعون سے تو مرجانا غالب نہیں ہے کیوں کہ وہ لگتا نہیں چنانچہ

جب طاعون ہوتا ہے اگر اموات اور احیاء کا شمار کیا جائے تو عدد احیاء کا زیادہ ہوگا۔ اگر کسی جگہ دس ہزار آدمی ہوں گے تو چھ ہزار اموات کی تعداد نہ ہوگی۔ اگر وہ لگتا ہوتا تو واقعی اس کا عکس ہوتا۔

رہی یہ بات کہ حکما کہتے ہیں کہ ایک کا طاعون دوسرے کا لگ جاتا ہے یہ بالکل غلط ہے بات یہ ہے کہ شریعت کی نظر وہاں تک ہے کہ حکماء وہاں تک نہیں پہنچ سکے۔ حکماء اور اطباء کی تو صرف اسباب ہی پر نظر ہے اور شریعت کو اس سے آگے کا بھی لحاظ ہے۔ پس طاعون کا لگنا بے اصل محض ہے جس کو ہوتا ہے موثر حقیقی کی تاثیر سے ہوتا ہے۔

اگر کوئی کہے کہ ہم تو مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک کو طاعون ہوتا ہے پھر دوسرے کو بھی ہو جاتا ہے اس کا جواب وہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی کو دیا تھا۔ ایک اعرابی نے سوال کیا تھا رسول اللہ ایک اونٹ خارشٹی اگر اونٹوں میں آ جاتا ہے تو سب کو وہ خارش لگا دیتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فمن اعدى الاول یعنی یہ تو بتلاؤ کہ اول کو کس نے لگائی۔

یعنی اگر تمہارے نزدیک دوسرے کی خارش کا یہی سبب ہے، تو اول کے اندر تو یہ سبب مفقود ہے اس کو کس نے لگائی جو اول کے لئے سبب قرار دیتے ہو ثانی کے لئے بھی اسی کو قرار کیوں نہ دو۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص نے صرف اسباب ہی کو دیکھا ہے اس کی نظر اسباب ہی پر ہے اور اسباب ہی کو وہ موثر سمجھتا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

عقل در اسباب می وارد نظر ☆ عشق سے گوید مسبب را نگر

عقل اسباب کی طرف دیکھتی ہے عشق کہتا ہے کہ مسبب کو دیکھنا چاہیے۔

اسباب پرست کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی دیہاتی ناواقف دیکھے کہ ریل آرہی ہے اور ایک شخص سرخ جھنڈی لے کر کھڑا ہو گیا اور وہ ٹھہر گئی یہ دیہاتی سمجھا کہ سرخ جھنڈی میں یہ تاثیر ہے کہ وہ ریل کو کھڑا کر دیتی ہے۔ حالانکہ کھڑا کرنے والا دوسرا ہے سرخ جھنڈی تو ایک علامت ہے۔

عشق من پیداؤ معشوقم نہاں ☆ یار بیروں فتنہ اور جہاں

فتنہ غلبہ حال اور جوش میں کہہ دیا ہے مراد تصرف ہے یعنی یار تو جہان سے باہر ہے مگر اس کا تصرف جہان کے اندر ہے اور وہ خود نظر نہیں آتا۔

اگر ڈرائیور نہ ہو اور ریل ٹھہر جائے۔ تو ہم بے شک جانیں کہ سرخ جھنڈی موثر ہے ہزار

۱۔ الصحيح للبخاری ۴: ۱۶۶، ۱۷۹، ۱۸۰، الصحيح لمسلم، السلام: ۱۰۱، سنن ابی داؤد، کتاب

الطب باب: ۲۴، سنن ابن ماجہ: ۳۵۴۰

آپ سرخ جھنڈی دکھلائیں وہ ہرگز نہ ٹھہرے گی اور اسی طرح سبز جھنڈی سے چلے گی نہیں۔ اسی طرح اگر آگ نے ابراہیم علیہ السلام کو نہیں جلایا تو تعجب کی بات نہیں یہ تو امر اصلی ہے۔ ہاں جلانا اس کا یہ بے شک تعجب اور حیرت کی بات ہے۔ اس لئے کہ وہ تو بے اختیار محض ہے اس کا تاثیر کرنا باعث حیرت ہوگی اور تاثیر نہ کرنا اور نہ جلانا تو امر اصلی ہے مگر عقلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں کہ اس کا عکس سمجھ رکھا ہے اور اسی بنا پر معجزات کا انکار کرتے ہیں حالانکہ حیرت جلانے سے ہونا چاہیے تھا کہ وہ ایک امر جدید ہے اور تمام اسباب خواہ وہ یقینی ہوں یا ظنی یا وہمی سب کی یہی کیفیت ہے۔ پس حقیقت امر تو اس کو مقتضی ہے کہ اسباب کا کسی درجہ میں بھی اعتبار نہ ہوتا۔ لیکن چونکہ بندہ ضعیف ہے اس کی نظر کوتاہ ہے اس لئے حق تعالیٰ نے محض اپنی رحمت سے یہ قاعدہ مقرر فرما دیا ہے کہ جہاں عادت سبب کے بعد مسبب کا ترتیب غالب ہو بلکہ محتمل ہو وہاں اجازت نہیں دی۔

پس چونکہ زلزلہ کا سبب ہلاک ہونا غالب ہے اس لئے اس کا تو اعتبار کیا گیا اور طاعون کا سبب ہلاک ہونا غالب نہیں ہے بلکہ محتمل با احتمال مغلوب ہے اس لئے اس کا سبب اعتبار نہیں کیا گیا۔ پس اگر اس مثال میں یہ سوال کیا جائے کہ یہ لوہا کیوں گرا تو اس کا جواب یہ دو گے کہ مقناطیس نے چھوڑ دیا۔ اگر سوال کیا جائے کہ مقناطیس نے کیوں چھوڑ دیا تو یہ جواب دو گے کہ زلزلہ کی خاصیت یہی ہے۔ پھر اگر پوچھا جائے کہ زلزلہ کی یہ خاصیت کیوں ہے تو یہی کہو گے کہ خواص کا ہم کو علم نہیں۔ خدا تعالیٰ نے اس کو ایسا ہی پیدا کیا ہے پس اگر یہاں اگر سب سوالات قطع ہو جائیں گے اور آگے سوال نہ کیا جائے گا کہ اس کی کیا وجہ ہے پس معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کے افعال سے سوال نہیں ہوتا خود ارشاد فرماتے ہیں۔

لَا یَسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یَسْئَلُونَ یعنی وہ نہیں پوچھا جاتا جو کچھ کرتا ہے اور آدمی پوچھے جائیں گے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اگر ہم یہی جواب دیں کہ خدا تعالیٰ نے اس کو ایسا ہی پیدا کیا ہے تو موجب کے عجز پر محمول کیا جاتا ہے۔ حالانکہ جیسا یہ اعتراف ہم پر ہے ایسا ہی اہل سائنس پر بھی ہے۔ فرق اسی قدر ہے کہ ہم ہر شے کا فاعل خدا کو مانتے ہیں اور وہ طبیعت کو فاعل کہتے ہیں اور حیرت ہے کہ طبیعت کو فاعل بھی کہتے ہیں اور اس کو بے شعور بھی کہتے ہیں۔

اہل شرع اور ان کی ایسی مثال ہے جیسے دو شخص ہوں۔ انہوں نے ایک بہت عمدہ گھڑی دیکھی کہ اس کے پرزے نہایت عمدہ اور نہایت خوبصورت اور وقت بہت صحیح دیتی ہے۔ اب ان

دونوں میں اختلاف ہوا کہ یہ کیونکر بنی ہے۔ ایک کہتا ہے کہ اس کی صورت بننے کی یہ ہوئی کہ کہیں سے اس کا کس بہتا ہوا چلا آیا اور ایک جگہ سے بال کمافی اڑ کر آگئی۔ اسی طرح سب پرزے اتفاقاً آکر جمع ہو گئے۔ اور اس ترتیب خاص کے ساتھ جمع ہو گئے۔ بس گھڑی بن گئی۔ دوسرا کہتا ہے کہ نہیں اس طرح نہیں بنی بلکہ اس کا کوئی بنانے والا ہے جو بڑا عاقل، ہوشیار، ذی اختیار، ذی قدرت ذی علم ہے۔ باوجود اس کے کہ اس نے بنانے والے کو دیکھا نہیں لیکن اس کے باوجود کو یقیناً جانتا ہے اب عقلاء خود ہی فیصلہ کریں بلکہ یہی اہل سائنس ہی بتلائیں کہ ان میں کون حق پر ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص اول کو الو اور گدھا بتائے گا اور دوسرے کو عاقل کہے گا پس ایسا ہی اہل شریعت اور اہل سائنس میں اختلاف ہے کہ اہل سائنس جن کی نظر اسباب پر ہے ان کی مثال تو اول شخص کی سی ہے اور اہل شرع دوسرے شخص کی طرح۔

حکماء حقیقی

حکماء حقیقی واقع میں صرف اہل شرع ہیں۔ افلاطون کو کسی نے خواب میں دیکھا تھا۔ پوچھا کہ جالینوس اور ارسطو اور فلاں فلاں فلسفی تھے قال لا۔ یعنی اس نے کہا نہیں۔ اس کے بعد اس نے شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ اکبر وغیرہ صوفیہ محققین کا نام لیا۔ قال ہم الفلاسفہ تھا۔ یعنی افلاطون نے کہا کہ یہ لوگ ہیں سچے فلسفی۔ اور وجہ یہ ہے کہ فلسفی کہتے ہیں حقیقت شناس کو اور حقیقت شناس واقع میں یہی لوگ تھے۔ بس حقیقت ہر شے کی یہ ہے کہ جو کچھ واقع ہوتا ہے اس کا سوال مت کرو۔ سوال کرنا ممنوع ہے۔ جو بڑے عقل پرست ہیں وہ بھی آخر میں تھک کر اور پھر پھرا کر یہی کہیں گے۔ فرق اس قدر ہے کہ انہوں نے دھکے کھا کر اور وقت ضائع کر کے یہ بات کہی اور اہل شرع نے اول ہی کہہ دی تھی۔

آنچہ دانا کند کند ناداں لیک بعد از خر ابے بسیار

یعنی جو کچھ دانا کرتا ہے وہی نادان کرتا ہے لیکن بہت سی خرابی اور دھکے کھانے کے بعد۔

حضرات صوفیاء رحمہم اللہ اس نکتہ کو سمجھے اور انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ کسی شے کی حقیقت کی جستجو کرنا وقت ضائع کرنا ہے جو ضروری ہے یعنی اطاعت، اس میں مشغول ہونا چاہیے خود بخود اسرار اور حقائق حسب استعداد معلوم ہو جائیں گے۔ چنانچہ جن کو معلوم ہیں وہ اہل کے سامنے بیان کرتے ہیں اور نا اہل کی نسبت یہ کہتے ہیں۔

بامدعی گوئید اسرار عشق و مستی ☆ بگذارتا بمیرد در رنج و خود پرستی

یعنی ظاہر پرستوں کے سامنے عشق و مستی کے اسرار مت بیان کرو ان کو رنج و خود پرستی میں مرنے دو۔
اور جو اسرار سے سوال بھی کرتا ہے اس کو یہ کہتے ہیں۔

حدیث مطرب و مے گود رازد ہر کمتر جو کہ کس نکشو و نکشاید حکمت ایں معمارا
یعنی محبت و معرفت و اطاعت میں مشغول ہو۔ رازد ہر یعنی اسرار و حقائق کی فکر میں مت پڑو
کیونکہ یہ اسرار الہی کا معمانہ کسی سے حل ہوا نہ حل ہو سکے گا۔

عبث میں مشغولیت

یہاں سے غلطی ظاہر ہوتی ہے ان لوگوں کی جو پوچھا کرتے ہیں کہ مرتخ میں آبادی ہے۔
یا نہیں۔ رازد ہر کی تلاش میں رہنا اپنا وقت برباد کرنا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں
من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یغنیہ^۱۔

یعنی آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ غیر نافع شے کو چھوڑ دے
حضور تو تمام مرتخ و غیرہ طے کئے ہوئے تھے اور او تیت علم الاولین والآخرین^۲۔
مجھ کو اولین و آخرین سب کا علم عطا کیا گیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ ناطق فرما دیا ہے۔ کہ عبث
کے اندر مشغول ہونا خوبی کی بات نہیں ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ تو بہت بڑا ہے حضرات
اولیاء اللہ میں بہت ایسے ہیں کہ جو حقائق شناسی کے اندر حکماء سے بہت دور آگے بڑھ گئے۔

عبدالکریم جیلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دریا ایسا دیکھا ہے کہ ایک ایک
موج اسکی ایسی ہے کہ تمام زمین و آسمان سے دس لاکھ حصہ زیادہ بڑی ہے اور اس کو فرشتے روکے
ہوئے ہیں۔ اگر اس کو نہ روکا جائے اور وہ موج ادھر کو کھسک آئے تو زمین و آسمان سب کو بہا دے
اور فرماتے ہیں کہ میں نے دوزخ کی سیر کی اور اس کے ہر طبقہ کی پیمائش کی۔

بعض اہل کشف نے جنتیوں اور دوزخیوں کا عدد لکھ دیا ہے۔ مرتخ تو کیا چیز ہے مرتخ سے بڑی
بڑی چیزوں کی سیر کر لی ہے اور ان کو حق تعالیٰ نے ایسی قوت کشفیہ عطا فرمائی تھی کہ وہ جس جگہ کی چاہتے
تھے تحقیق کر لیتے تھے جب کہ افراد امت میں ایسے حضرات محققین موجود ہیں تو اگر خود حضور صلی اللہ علیہ

^۱ مجمع الزوائد للہیثمی ۱۸:۸، مسند أحمد ۲۰:۱، کنز العمال ۸۲۹۱:۳

^۲ مجمع الزوائد للہیثمی ۱۸:۸، مسند أحمد ۲۰:۱، کنز العمال ۸۲۹۱:۳

وسلم حقائق بیان فرماتے تو حکماء اور صوفیا سب کے علوم ان کے سامنے گرو تھے مگر سبحان اللہ کیا شفقت ہے کہ کچھ بھی بیان نہیں فرمایا بلکہ ان چیزوں کے سوال ہی سے روک دیا۔ اس لئے کہ دیکھا کہ اس میں کوئی نفع نہیں بلکہ احتمال ضرر کا ہے کہ اس میں مشغول ہو کر جو ضروری امر ہے وہ فوت ہو جائے گا۔

جیسے باپ شفیق کہ وہ بادشاہ بھی ہو، اس کے ہاں سب کچھ موجود ہے لیکن اگر بچہ چاہے کہ مکتب کے دوران دوسرے شہر میں جا کر سیر کر آؤں، تو اجازت نہ ہوگی۔ اس لئے کہ اگر وہ سیر و سیاحت میں رہا تو سلطنت کی قابلیت پیدا نہ ہوگی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ سیر گاہ تو بہت بڑی ہے اگر اس کو بیان کیا جائے گا تو کوئی حد نہیں۔ اس لئے تعلیم کی ایک حد بنادی ہے اور امر و نہی مقرر فرمادی اس لئے کہ سیر گاہ کے دکھانے میں احتمال تھا کہ آپ اسی میں رہ جاتے۔ اور سلطنت کی لیاقت آپ کے اندر پیدا نہ ہوتی اور خلیفۃ اللہ کہلانے کے آپ مستحق نہ ہوتے۔ اسی واسطے ارشاد فرمایا ہے:

لا تتكلموا فی القدر . کہ تقدیر کے بارے میں کلام مت کرو۔

آج ایسے لوگ جو ذلیل اور جاہل ہیں اور جن کو کچھ بھی سلیقہ نہیں ہے وہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیا بات ہے کہ فلاں مسئلہ میں بولومت یہ تو کمزوری کی بات ہے۔ سو یاد رکھو جس بات کے اندر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غور و خوض کرنے کو منع فرمادیا ہے واقعی اس میں بہت خطرے ہیں کہانیوں میں بچے کہا کرتے ہیں کہ تین کھونٹ شکار کو جائیو چوتھی کھونٹ نہ بھائیو۔ اسی طرح حضور نے جس کھونٹ میں شکار کرنے سے منع فرمادیا ہے واللہ وہاں صد ہا خطرات ہیں۔

در راہ عشق و سوسہ اہرمن بسی ست ☆ ہمدرد گوش را بہ پیام سروش دار
یعنی عشق کے راستہ میں شیطان کے وساوس بہت ہیں۔ ہوش رکھو اور وحی کی طرف کان لگائے رہو۔

اتباع کی ضرورت

یہ راہ وہ ہے کہ بے راہبر کے طے نہیں ہوتا ہے اور جو بے راہبر کے طے کرنا چاہے اس کے متعلق مولانا فرماتے ہیں ۔

یار باید راہ را تنہا مرد ☆ بے قلاؤز اندریں صحرا مرد

راہ حق قطع کرنے کے لئے یار یعنی مرشد ضروری ہے۔ بلا راہبر کے اس صحرا میں قدم مت رکھو۔
حضرت فرید الدین عطار کہتے ہیں ۔

بے رقیعے ہر کہ شد در راہ عشق ☆ عمر بگذشت و شد آگاہ عشق

بغیر رقیق یعنی بغیر مرشد کے جو شخص راہ عشق پر چلا اس نے اپنی عمر گنوائی اور عشق سے خبردار نہیں ہوا۔ جن کی آنکھیں ہیں وہ دیکھ رہے ہیں کہ راہ میں کیا کیا آفتیں ہیں لیکن جن کی آنکھیں نہیں ہیں ان کو یہ تو چاہیے کہ آنکھوں والوں کی اقتدا کریں۔ اگر آنکھ والا یوں کہے کہ آگے نالی ہے تو اندھے کو چاہیے کہ آگے قدم نہ رکھے ورنہ گرے گا۔

جیسے کہ ایک حافظ جی نابینا دعوت سے آرہے تھے۔ ایک لڑکا ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے لئے جا رہا تھا۔ خندق آئی۔ لڑکے نے کہا کہ حافظ جی کھائی۔ حافظ جی بولے کہ ہاں بیٹا خوب کھائی۔ اس نے کئی دفعہ کہا انہوں نے یہی جواب دیا۔ آخر سر کے بل جا گرے۔ جب گرے تو کہا کم بخت یوں نہ کہا خندق۔

جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لئے ایک حد مقرر فرمادی اس سے آگے مت بڑھو تو ہم کو نہ چاہیے کہ ہم آگے ایک قدم بھی رکھیں۔ اگر ہم آگے بڑھیں گے تو ہم اس شائستہ گھوڑے سے بھی بدتر ہوں گے جو روکنے سے رک جاتا ہے اور بڑھانے سے بڑھ جاتا ہے۔ پس جب کہ ہم کو مسئلہ قدر میں کلام کرنے سے منع کیا گیا ہے تو ہم کو رکنا چاہیے۔

وجہ ممانعت کی یہ ہے کہ اگر اس میں گفتگو کی بھی تو اس مسئلہ کا پوری طرح انکشاف تو ہوگا نہیں اور خواہ مخواہ اور زیادہ شبہات پیدا ہوں گے اور جس قدر اس میں کاوش کی جاتی ہے اسی قدر زیادہ شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے اس میں کلام کرنے سے قطعاً بند کر دیا گیا جیسے کوکین اور افیون ہے کہ جس قدر اول کوئی شخص اس کو اپنے لئے تجویز کرتا ہے یہاں تک مشاہدہ ہوا اس مقدار پر نہیں رہتی بلکہ بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے اطبا اور ڈاکٹر اس کو اول ہی سے بند کر دیتے ہیں۔

مسئلہ تقدیر

اسی طرح مسئلہ قدر ہے کہ اس کے متعلق ایک بات کا جواب دیا جائے تو چار شبے اور ہوں گے۔ اسی طرح سلسلہ چلا جائے گا کہیں ختم نہ ہوگا اور پریشانی بڑھتی چلی جائے گی۔
بدریاد در منافع بے شمار است ☆ اگر خواہی سلامت بر کنار است
دریا میں منافع بے شمار ہیں لیکن سلامتی کنارہ ہی پر ہے۔

آپ تو کیا چیز ہیں بڑے بڑے عقلا کے یہاں چھکے چھوٹ گئے ہیں۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اس دریائے خونخوار کو دیکھ رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ ایسا دریا ہے کہ اس میں جاتے ہی غرق ہو جائیں گے۔ نہ اس میں تیر سکتے ہیں اور نہ کشتی میں جا سکتے ہیں حالانکہ صحابہ جیسے عالم اور عارف اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے بتلانے والے اگر چاہتے تو سمجھا دیتے لیکن حالت کیا تھی کہ ایک مرتبہ چند صحابہؓ اس مسئلہ میں گفتگو کر رہے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور سن کر چہرہ مبارک سرخ ہو گیا اور ممانعت فرمائی کہ اس مسئلہ میں کلام نہ کریں غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جزئیاً بھی جیسا کہ اس حدیث میں اور کلیاً بھی جیسے حدیث

من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنہ^۱

آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ غیر نافع شے کو چھوڑ دے۔

میں تحقیق علل و اسرار و حکم سے ممانعت فرمادی ہے۔ پس خدا تعالیٰ کو اختیار کامل ہے کہ جس شخص کو چاہے برگزیدہ فرمالے۔ اور جس زمانہ کو چاہے بابرکت بنادے کسی کو یہ مجال نہیں کہ اس کی علت اور وجہ سے سوال کرے پس لم کا سوال تو فضول بلکہ مضر ٹھہرا۔ ہاں کیفیت کا سوال ہو سکتا ہے اس لئے کہ اس میں امتداد اور تسلسل نہیں۔

تصرف حق تعالیٰ

سو کسی وقت یا کسی شب یا کسی ماہ کے بابرکت ہونے کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ اپنی تجلیات میں سے کوئی تجلی اس طرف منصرف فرمادیتے ہیں۔ اس سے اس وقت کے اندر برکت ہو جاتی ہے اور اس سے تعجب نہ کرنا چاہیے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی شان تو اعلیٰ اور ارفع ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں ان کی نظر میں یہ اثر ہوتا ہے کہ دم کے دم میں کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں۔

حضرت نجم الدین کبری رحمۃ اللہ علیہ کو الہام ہوا کہ فلاں شہر میں ایک رئیس ہیں۔ ان کے ایک صاحبزادے ہیں۔ آپ ان کی تربیت کیجئے۔ یہ صاحبزادے حافظ شیرازی تھے یہ وارستہ (آزادی) سے پھر ا کرتے تھے اکثر جنگلوں میں رہا کرتے تھے اور یہ غلط ہے کہ شراب پیا کرتے تھے ہاں کسی قدر وارستگی سی تھی جس کی وجہ سے باپ ان کو بیوقوف اور دیوانہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضرت نجم الدین اس شہر میں تشریف لائے اور اس رئیس کے ہاں پہنچے۔ وہ رئیس بہت تعظیم سے

پیش آئے۔ حضرت نے فرمایا کہ اپنے بیٹوں کو بلاؤ۔ انہوں نے سب کو بلایا مگر حافظ صاحب کو بسبب ان کی دیوانگی کے چھوڑ دیا۔ حضرت نے فرمایا کوئی بیٹا باقی تو نہیں رہا۔ ان رئیس صاحب نے کہا کہ حضور ایک رہ گیا ہے وہ پیش کرنے کے قابل نہیں، دیوانہ سا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھے اسی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ان کو بلایا تو اس ہیت سے کہ کچھڑ میں کپڑے ستے ہوئے اور بال پریشان۔ جب حافظ صاحب کی نظر حضرت شیخ پر پڑی تو یہ شعر پڑھا۔

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند ☆ آیا بود کہ گوشہ چشمے بما کنند

وہ لوگ کہ خاک کو ایک نظر سے کیمیا کر دیتے ہیں کیا اچھا ہو کہ ہماری طرف بھی کچھ نظر کریں حضرت نے فرمایا کہ برخوردار ہو نظر کردم (برخوردار تیری طرف میں نے نظر کی)

اس کے بعد سے تو پھر حافظ صاحب کی حالت ہی وگرگوں ہو گئی پس جب کہ اہل اللہ کی نظر میں یہ خاصیت ہے کہ حالت کو بدل ڈالا تو حق تعالیٰ کی نظر اور توجہ میں کیوں نہیں یہ خاصہ بلکہ اس سے بڑھ کر تصرف ہوگا وہ تو قادر مطلق ہے۔

مجاہدہ کی ضرورت

مجھے اس مقام پر ایک اندیشہ اور ہوتا ہے اس لئے درمیان میں اس کا جواب دے دینا ضروری ہوا۔ وہ یہ ہے کہ شاید کوئی صاحب اسی پر ادھار کھائے بیٹھے ہوں کہ بس کوئی مل جائے گا ایک نظر میں کام بنا دے گا، ہم کو ہاتھ پاؤں بھی ہلانا نہ پڑیں گے اور اس لئے وہ بے فکر ہوں اور ایسے شخص کے انتظار میں ہوں۔ چنانچہ اس خیال کے بھی بہت لوگ ہیں۔ تو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ بے شک نظر میں یہ اثر تو ضرور ہے لیکن استعداد شرط ہے اور استعداد پیدا ہونے کے لئے مجاہدہ ریاضت شرف عادی ہے۔

ریاضت مجاہدہ کی مثال وضو کی سی ہے کہ نہ ترا وضو کافی ہے بلکہ نماز مستقل علیحدہ فعل ہے جو مستقل اہتمام سے ادا کرنا ہوگی۔ اور نہ نماز کا تحقق بغیر وضو کے ہوتا ہے اس لئے کہ وہ شرط ہے ہاں اگر کسی کو پہلے ہی سے وضو ہوگا مثلاً غسل کیا ہوتا لاب میں غوطہ لگایا ہو تو پھر مستقل افعال وضو کی ضرورت نہ ہوگی۔

اسی طرح نہ ترا مجاہدہ کافی ہے اور نہ مجاہدہ سے استغنا ہے بہر حال مجاہدہ شرط ہے۔ آگے مقصود کا ترتیب وہ حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے طالب کی تو یہ شان ہونا چاہیے۔

ملنے کا اور نہ ملنے کا مختار آپ ہے ☆ پر تجھ کو چاہیے کہ تک لو لگی رہے

ہمارے حضرت ایسے موقع پر یہ پڑھا کرتے تھے۔

یابم اور ایا یابم جستجوئے می کنم ☆ حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم
محبوب کو پاؤں یا نہ پاؤں اس کی جستجو میں لگا ہوا ہوں ملے یا نہ ملے اس کی آرزو کرتا ہوں۔
اس شعر میں یابم یا نیا بام (پاؤں یا نہ پاؤں) اور حاصل آید یا نہ آید (ملے یا نہ ملے) جو تعمیم
ہے مبالغہ کے لئے ہے ورنہ وعدہ تو یہ ہے۔ ”والذین جاہدوا، الخ“

یعنی جو لوگ ہمارے راستہ میں مجاہدہ کرتے ہیں تو ہم ان کو ضرور ہدایت کرتے ہیں۔
مجاہدہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنے گھونسے مارا کرے بلکہ مجاہدہ نفس کے خلاف کرنے
کا نام ہے اور مجاہدہ محض سبب عادی کے درجہ میں ہے ورنہ کار بفضل است باقی بہانہ (کام فضل سے
بنتا ہے باقی سبب بہانہ ہے) ملتا تو ہے سخی کے دینے سے لیکن مانگنا اور جھولی کا ہونا بھی ضروری ہے
۔ مالدار تو جب ہی ہوگا جب سرکار گنیاں جھولی میں اپنے ہاتھ سے بھر دیں گے لیکن جھولی ہونا بھی
ضروری ہے۔ پس یہ استعداد مثل جھولی کے ہے۔ حافظ شیرازی کے اندر استعداد پہلے سے تھی۔
چنانچہ طلب کے اندر تمام جنگلوں میں پھٹکتے پھرتے تھے۔ دفعۃً اللہ تعالیٰ نے فضل فرما دیا۔ پس تم بھی
اگر ایسی استعداد حاصل کر لو تو بے شک ایک نظر ہی کافی ہوگی۔ پیاس لگا لو، پانی بہت ہے۔
آب کم جو تشنگی آور بدست۔ پانی مت ڈھونڈو، پیاس پیدا کرو۔ پانی بہت ہے۔

توجہ کی اہمیت

آج کل یہ حالت ہے کہ کرنے کے تو کچھ نہیں اور خود بے فکر بیٹھے ہیں اور اس کے منتظر ہیں
کہ کوئی ہم کو ولی بنادے بہر حال اولیاء اللہ کی نظر اور توجہ بعد استعداد کے کام دیتی ہے اور یہاں توجہ
کے یہ معنی نہیں کہ پیر آنکھیں بند کر کے مرید کو سامنے بٹھلا دیں جیسا کہ متعارف طریقہ توجہ کا ہے
بلکہ مطلب یہ ہے کہ اہل اللہ کا جی چاہے کہ فلاں شخص کو کچھ حاصل ہو جائے۔

جیسے استاد کے دو شاگرد ہوں۔ دونوں کا ایک سبق ہے ایک ہی لیاقت کے ہیں اور ایک ہی
عمر کے۔ لیکن استاد ایک کو دل سے بتاتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کو آجائے چنانچہ اس کو آجاتا ہے
اور دوسرے کو نہیں چاہتا اس کو نہیں آتا۔ بلکہ اگر غور کرو تو تمام صفتوں میں اس کو نمونہ موجود ہے مثلاً
ایک درزی کے دو شاگرد ہوں یا ایک لوہار کے ہوں۔

بس توجہ کے معنی یہی ہیں کہ خاصان حق کو توجہ ہو کہ اس کو کچھ آجائے یہ بڑی دولت ہے۔
بس توجہ یہی ہے کہ شیوخ کا جی چاہتا ہے کہ مرید کے اندر فلاں بات پیدا ہو جائے اور بے توجہ شیخ
کے کچھ نہیں ہوتا۔ مولانا فرماتے ہیں۔

یار باید راہ راتہا مرو ☆ بے قلاؤ زاندریں صحرا مرو
راہ حق قطع کرنے کے لئے شیخ کی ضرورت ہے تنہا اپنی رائے اور کتابوں سے سلوک طے نہ
کرنا چاہیے۔ بے رہبر کے اس وادی میں قدم نہ رکھنا چاہیے۔
اس مضمون پر شبہ ہوتا ہے کہ بہت بزرگ ایسے بھی تو ہیں کہ ان کا شیخ کوئی نہیں تو اس شبہ کو
مولانا رفع فرماتے ہیں۔

ہر کہ تنہا نادرایں راہ را برید ☆ ہم بعون ہمت مرداں رسید
اگر کسی نے شاذ و نادر اس راہ سلوک کو تنہا بے صحبت پیر قطع کر بھی لیا ہے وہ بھی پیروں ہی کی
امداد ہمت و توجہ سے پہنچا ہے۔

یعنی اول تو ایسا کم ہوا ہے کہ بے شیخ کے کوئی اس راستہ چلا ہو اور اگر شاذ و نادر ایسا ہوا ہے تو وہ
بھی بدون توجہ مردان خدا کے نہیں پہنچا البتہ اس کو خبر نہیں ہے کہ کون کون مقبولان حق میری طرف
متوجہ ہیں۔ بچہ کو کیا خبر ہے کہ ماں نے سوتے ہوئے میری راحت کے لئے کیا کیا کیا۔ کتنی دیر پنگھا
جھلا ہے اور کتنی دیر گس رانی کی ہے تو بدون توجہ کے تو کام کسی کا نہیں چلا۔ پس مجاہدہ اور ریاضت
کر کے کوئی مغرور نہ ہو۔ بہر حال جب بزرگوں کی توجہ میں یہ اثر ہے تو خالق کی توجہ میں تو کس
قدر ہوگا۔ بزرگوں کی توجہ کے لئے تو استعداد کی بھی ضرورت ہے اور وہاں استعداد کی بھی ضرورت
نہیں۔ وہ استعداد اور کمال دونوں معا عطا فرماتے ہیں۔

داد اور قابلیت شرط نیست ☆ بلکہ شرط قابلیت داداوست

ان کی داد و دہش کے لئے قابلیت کی شرط نہیں ہے بلکہ ان کی داد ہی قابلیت کی شرط ہے۔

ان کی عطا سے قابلیت بھی ہوتی ہے اور داد بھی۔ وہ جھولی اور روپیہ دونوں ساتھ ساتھ دیتے
ہیں۔ کریموں کے یہاں دیکھا ہوگا کہ سائل کو ظرف بھی دیتے ہیں اور اس میں چیز بھی دیتے
ہیں۔ بہر حال ان کی نظر کی کیا انتہا ہے پس اگر وہ کسی زمانہ کی طرف توجہ فرمادیں تو اس کی برکت
کا کیا ٹھکانہ ہے۔ حدیث شریف میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے چنانچہ وارد ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان ربكم نفحات في الدهر
فتعرضوا لها یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ بیشک
تمہارے رب کے لئے زمانہ کے اندر جھونکے ہیں فیوض کے پس تم اس کی جستجو کرو۔
پس انسان کو چاہیے کہ ایسے زمانے کو بہت غنیمت سمجھے۔

غفلت انسانی

چنانچہ جن کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، وہ رمضان المبارک کے برکات کو کھلی آنکھوں محسوس
کرتے ہیں اور جو غافل ہیں ان کو یہ مہینہ اور دوسرے مہینے یکساں ہیں۔ رمضان آیا اپنی برکات
اور انوار کا مہینہ برسا یا اور چلا گیا۔ ان کو کچھ بھی خبر نہیں۔

ان لوگوں کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص مکان کے اندر بیٹھا ہے اور باہر یہ حالت ہو کہ
ابر آیا اور ٹھنڈی ہوائیں چلیں اور بارش ہوئی اور لوگ اس سے خوش ہوئے اور ابر برس کر چلا گیا
اور آسمان صاف ہو گیا اور یہ حضرت مکان کے اندر ہی رہے۔ ان کو کچھ بھی خبر نہیں کہ باہر کیا سے
کیا ہو گیا۔ اور رمضان میں تو یہ برکات اور انوار ہوتے ہی ہیں اور زمانوں میں بھی بعض وقت ایسا
ہوتا ہے کہ اگر اس وقت کوئی طالب ہو تو وہ ان برکات سے کہیں سے کہیں جا پہنچتا ہے۔ پس کسی
وقت غفلت نہ کرے۔ اسی مضمون کو کسی شاعر نے کہا ہے ۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی شاید کہ نگاہ کند آگاہ نباشی
یعنی حق تعالیٰ سے ایک پل بھر غافل نہ ہونا چاہیے ممکن ہے کہ کسی وقت وہ تم پر توجہ فرمائیں
اور تم بے خبر ہو۔ سو غفلت اور بے خبری میں وہ الطاف و عنایات تمہارے حال پر نہ ہوں گی۔

اے ان کا تو اتنا بڑا حق تھا کہ اگر کچھ بھی عطا نہ کرتے تو ادھر ہی تکتے رہتے۔ دیکھو اگر کوئی
محبوب یوں کہے کہ ہم کو تکتے رہو تو جو عاشق ہو گا وہ کبھی نہ کہے گا کہ کیا دو گے اور کہے تو وہ عاشق
نہیں۔ عاشق تو اس اجازت کو غنیمت سمجھے گا۔ اور اس کو عین اپنا مقصود جانے گا۔ ہم کو تو خدا تعالیٰ
کے ساتھ ایسی محبت ہونا چاہیے کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے اور اول تو ہمارے پاس ہے کیا جو کچھ ہے
جان اور مال اور مال اور اولاد وہ بھی ان کا ہی ہے۔ خیر مجازاً جو کچھ ہے اگر وہ سب کچھ لے لیں

۱۔ مجمع الزوائد للہیثمی ۲۳۱: ۱۰، المعجم الكبير للطبرانی ۲۳۳: ۱۹، إتحاف السادة المتقين
۲۱۳۲۳: ۲۸۰، ۳۷: ۹، ۲۱۳۲۳

اور ایک مرتبہ اپنا نام لینے کی اجازت دیں تو واللہ بہت ارزاں ہے۔
متاع جان جاناں جان دینے پر بھی سستی ہے
اور ایک بزرگ لکھتے ہیں۔

آنکس کہ ترا شناخت جانا چہ کند ☆ فرزند و عزیز و خانماں را چہ کند
جس کو آپ کی شناخت اور معرفت ہو گئی وہ کیا کرے گا مال کو کیا کرے گا جاہ کو اور کیا کرے گا اولاد کو۔
ایسے لوگوں کو ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ دیوانہ سمجھتے ہیں وہ ان کو جواب دیتے ہیں۔
اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد۔ یعنی جو دیوانہ نہ ہوا وہی دیوانہ ہے۔
اور ان کو نکما اور بیکار سمجھتے ہیں اور وہ ان کے جواب میں یوں کہتے
تا بدانی ہر کرایز داں بخواند ☆ از ہمہ کار جہاں بیکار ماند
جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف بلا لیا وہ دنیا کے تمام کاروبار سے بیکار ہو جاتا ہے۔
ان کا مذہب تو یہ ہے۔

دل آراے کہ داری دل درو بند و گر چشم از ہمہ عالم فرو بند
جس محبوب سے تمہارا دل پھنسا ہوا ہے تم اس کے علاوہ تمام دنیا سے آنکھیں بند کر لو یعنی بجز
محبوب حقیقی کے سب سے آنکھیں بند کر لو۔

ان کی آنکھ میں تو بجز محبوب کے کچھ نہیں رہتا اور جو کچھ ان کے سامنے آتا ہے وہ اس میں بھی
اسی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

بسکہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی ☆ ہر کہ پیدای شود از دور پندارم توئی
میری جان فگار اور چشم بیدار میں تو ہی بسا ہوا ہے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے میں تجھ ہی کو گمان کرتا ہوں۔
اور ایسی حالت ہو جانا کچھ عیب نہیں۔ اس کی مثال موجود ہے دیکھو جب تم کو کسی شخص کو
خصوص محبوب کا انتظار ہو تو جب یہ کیفیت شدید ہوگی اور بہت انتظار بڑھے گا تو ذرا آہٹ بھی ہوگی
تو بھی سمجھو گے کہ محبوب آیا ہے جو شے سامنے آئے گی اس کو وہی خیال کرو گے۔ اور جوش محبت میں
ایسے شخص کے منہ سے اگر کچھ کلمات بھی نکل جائیں تو اس کو معذور کہا جائے گا۔

گفتگوئے عاشقاں در کار رب ☆ جوش عشق است نے ترک ادب
عاشقوں کی گفتگو کا ررب میں جوش عشق کی وجہ سے ہے نہ ترک ادب کی وجہ سے۔

شریعت اور حقیقت

اول جب حال کا غلبہ ہوتا ہے تو یہی کیفیت ہوتی ہے اور آخر میں یہ کیفیت ہو جاتی ہے ۔
برکے جام شریعت برکے سندان عشق ☆ ہر ہوسنا کے نداند جام و سندان باخشن
ادھر شریعت کا خیال ادھر عشق کا ۔ شریعت و عشق دونوں کے مقتضی پر عمل کرنا ہر ہوسناک کا کام نہیں ۔
شریعت اور حقیقت دونوں میں اعتدال آ جاتا ہے گویا کہ ایک میزان ہے کہ اس کے دونوں
پلڑے بالکل برابر ہیں ۔ کیا ممکن ہے کہ ایک میں بھی اختلال آ جائے اور پہلے اس سے مغلوب
ہوتے ہیں شیخ شیرازی ایسے حضرات کے بارہ میں فرماتے ہیں ۔

مکن عیب درویش حیران و مست ☆ کہ غرق است ازاں می زند پاؤ دست
درویش حیران و مست کا عیب مت بیان کرو ۔ وہ عشق میں ڈوبا ہوا ہے اس سبب سے ہاتھ پیر مارتا ہے ۔
بس ایسے حضرات معذور ہیں اقوال میں بھی ، افعال میں بھی ۔ مگر خدا جانتا ہے کہ کون معذور
ہے کون نہیں ہے بعض لوگ مکاری سے صوفی بنتے ہیں اور بزرگوں کے اقوال لوگوں کے سامنے
بیٹھ کر نقل کرتے ہیں تاکہ لوگ معتقد ہوں ان کے بارہ میں مولانا فرماتے ہیں ۔

ظالم آں تو میکہ چشماں دوختند ☆ ازخن ہا عالمے راسوختند
بڑے ظالم ہیں وہ لوگ جو آنکھیں بند کر کے ایسی باتوں سے ایک عالم کو دیران کرتے ہیں ۔
یہ تو اقوال کے بارہ میں ہے اور افعال کی نسبت کہتے ہیں ۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست ☆ پس بہرہوتے نباید دادوست
یعنی آدمیوں کی شکل میں بہت سے شیطان بھی ہیں ۔ پس ہر ایک کے ہاتھ میں ہاتھ نہ
دینا چاہیے ۔ یعنی ہر ایک سے بیعت نہ کرنی چاہیے ۔

پس ایسے لوگ معذور نہیں ہوں گے ۔ دیکھو عدالت میں گنوار اگر کوئی گستاخی کرے تو معذور
سمجھا جائے گا اور عاقل کی گردن ناپی جاتی ہے ۔ کیا خدا کو خبر نہیں ہے کہ کون شریر ہے اور کون سادگی
سے کہہ رہا ہے ۔ سادگی میں تو دلربائی ہی دوسری ہوتی ہے میں اس کو بیان کر رہا تھا کہ عشق و محبت
کا مقتضی تو یہ تھا کہ اگر کچھ نہ ملتا تب بھی نہ ٹلتے چہ جائیکہ ملتا بھی ہے پس طالب کی شان یہ ہونا
چاہیے کہ ہر وقت اس طرف توجہ رکھے ۔ ضرور ایسا وقت ملے گا کہ اس پر فضل ہو جائے گا اس طرف
سے کمی نہیں ۔ کوئی لینے والا ہونا چاہیے حافظ شیرازی فرماتے ہیں ۔

عاشق کہ شد کہ یار بحال نظر نکرد ☆ اے خواجہ درد نیست و گرنہ طیب است
اے خواجہ جو بھی عاشق ہوا محبوب نے ضرور اس کے حال پر نظر کی ہے۔
حق یہ ہے کہ دور ہی نہیں ہے ورنہ طیب موجود ہے۔

پس رستہ یہی ہے کہ اپنے آپ کو مٹا دے۔ ذہانت سے یہاں کام نہیں چلتا۔ مولانا فرماتے ہیں۔
فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ ☆ جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ
فہم و خاطر تیز کرنا یہ حق تک پہنچنے کی راہ نہیں ہے بلکہ شکستگی کی ضرورت ہے۔ بجز شکستہ لوگوں
کے فضل خداوندی کسی کو قبول نہیں کرتا۔

فلسفہ و منطق

آج وہ زمانہ ہے کہ کوئی روزہ کی فلاسفی بیان کرتا ہے، کوئی نماز کی، حالانکہ اصل فلاسفی یہ ہے۔
جملہ اوراق و کتب در ناکن ☆ سینہ راز نور حق گلزار کن
تمام اوراق اور کتابوں کو آگ میں جھونک دو۔ سینہ کو انوار حق سے گلزار بناؤ۔
ان لوگوں کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کو پھانسی کا حکم ہوا تو اس کو تو فکر ہونا چاہیے تھا اور وکلا
سے مل کر اپنے اوپر سے الزام کو دفع کرنا چاہیے۔ اس نے یہ تو کیا نہیں۔ وہ اس میں مشغول ہوا کہ
پھانسی کی حقیقت بیان کرنے لگا۔ کہ پھانسی اس طور سے ہوتی ہے یا اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس
کو تختہ پر کھڑا کرتے ہیں پھر گلے میں اس کے پھانسی پہناتے ہیں اور تختہ کھینچ لیتے ہیں۔ ایسے ہی یہ
لوگ ہیں کہ جن بلاؤں میں خود مبتلا ہیں ان کا تو فکر نہیں اور فضول قصوں میں مبتلا ہیں۔ ارے تم
روزہ کی فلاسفی کیا بیان کرتے ہو تم کو اپنی فلاسفی کی بھی خبر ہے کہ یاد رکھو یہ فلاسفی اور معقولیت کسی
کام کی نہیں۔ نہ دنیا میں کام آتی ہے نہ دین میں جو زیادہ فلسفیت بگھارتا ہے اور علل کی تحقیق کے
درپے ہے وہ دنیوی کاموں میں ناکام رہتا ہے۔

ایک منطقی طالب علم کی حکایت مشہور ہے کہ ایک تیلی کے یہاں تیل لینے کیلئے پہنچے۔ دیکھا کہ تیلی
تو اپنے کام میں مشغول اور بیل چل رہا ہے اور گھنٹی اس کے گلے میں پڑی ہے۔ طالب علم صاحب کو مرض
تھا ہی کہ ہر شے کی علت تحقیق کرتے تھے۔ پوچھا کہ کیوں میاں تیلی! تم نے اس بیل کے گلے میں گھنٹی
کیوں ڈالی ہے۔ تیلی نے کہا کہ اس کے بجنے سے مجھ کو معلوم ہوتا رہتا ہے کہ بیل چل رہا ہے کہنے لگے کہ
اگر کھڑا ہی کھڑا سر ہلایا کرے۔ گھنٹی بجنے کیلئے چلنا لازم مساوی تو ہے نہیں۔ تیلی نے کہا کہ مولوی صاحب

آپ تشریف لے جائے میرے تیل نے منطق نہیں پڑھی۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بھی ایسے احتمالات سیکھ لے۔
میں آپ کو تیل بھی نہیں دیتا دیکھئے وہ اپنی منطق دانی کی بدولت تیل سے محروم رہے۔

ایک نحوی کی حکایت مولانا نے لکھی ہے۔ ایک نحوی صاحب کشتی میں بیٹھے جب کشتی چلی تو آپ کو نحو کا کچھ جوش آیا۔ ملاح سے پوچھا، میاں ملاح تم نے کچھ نحو بھی پڑھی ہے۔ ملاح نے کہا جی نہیں۔ نحوی نے کہا کہ تم نے تو آدمی عمر ہی برباد کر دی۔ آگے چل کر کشتی ایک بھنور میں آگئی۔ ملاح نے کہا میاں نحوی صاحب کچھ تیرنا بھی سیکھا ہے نحوی نے کہا نہیں۔ کہا تم نے تو اپنی ساری عمر ہی برباد کی۔ مولانا نے اس مقام پر لکھا ہے کہ سنو یہاں نحو کا کم نہیں آتی۔ یہاں نہ نحو سے کام چلتا ہے۔ پس پوچھو پاچھو مت۔ کام میں لگو۔ کام کرتے کرتے اللہ تعالیٰ کا فضل ہوگا۔ علوم تم پر خود بخود منکشف ہو جائیں گے مولانا فرماتے ہیں۔

بنی اندر خود علوم انبیاء ☆ بے کتاب و بے معید و استا
اپنے اندر بے کتاب و بے معین و استاد انبیاء جیسے علوم دیکھو گے۔

تجلیات کی تاثیر

اس وقت تم ان علل اور فلاسفی پوچھنے والوں پر ہنسو گے۔ بہر حال حق تعالیٰ کی تجلی اور نظر میں یہ تاثیر ہے کہ وہ شے بابرکت ہو جاتی ہے۔ پس رمضان المبارک کی طرف بھی کسی قسم کی تجلی فرمائی ہے کہ جس سے اس میں یہ برکت آگئی اور جس طرح زمان کی طرف یہ تجلی ہوتی ہے اور اس میں برکت آ جاتی ہے۔ اسی طرح کسی مکان کی طرف اگر تجلی ہوگی تو وہ مکان بھی متبرک ہو جائے گا۔ چنانچہ کعبہ کے اندر بھی تجلی الہی ہے کہ جس میں اس میں برکات اور انوار ہیں۔ اور اس کی طرف قلوب کو کشش ہوتی ہے۔

کعبہ راہروم تجلی می فرود ☆ ایں ز اخلاصات ابراہیم بود

کعبہ کو جو ہر دم تجلی افزوں ہو رہی ہے یہ ابراہیم علیہ السلام کے اخلاص کی بدولت ہے۔ جس شے کو برگزیدہ کیا جاتا ہے اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ اس پر تجلیات خاصہ میں سے کوئی تجلی فائز ہوتی ہے ایک بات طلباء کے کام کی یاد آئی۔ وہ یہ ہے کہ مجسمہ (ایک فرقہ ہے جو خدا تعالیٰ کے جسمانی ہونے کا قائل ہے) نے الرحمن علی العرش استوی، اللہ تعالیٰ نے عرش پر باعتبار صفت رحمانیہ کے تجلی فرمائی، کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ خدا تعالیٰ عرش پر ایسے ہی بیٹھے ہیں جیسے ہم چوکی پر بیٹھے ہیں۔ ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی کچھ قدر نہ جانی اور عرش کو انہوں

نے بڑھا دیا۔ کیونکہ مستقر بفتح القاف عاده مستقر با کسر القاف سے اوسع (یعنی جس چیز پر قرار پکڑا جاتا ہے وہ زیادہ وسیع ہوتی ہے قرار پکڑنے والی چیز سے) ہوتا ہے۔ حالانکہ عرش کو ذات باری تعالیٰ سے کوئی بھی نسبت نہیں۔ ایسی بھی نسبت نہیں ہے جیسے رائی کے دانہ کو ہم سے ہے۔ اگر کوئی رائی کا دانہ ہمارے قدم کے نیچے پڑا ہو تو کیا عاقل کہہ سکتا ہے اور کیا یہ محاورہ صحیح کہا جاسکتا ہے کہ ہم اس پر بیٹھے ہیں۔ رائی کا دانہ بیچارہ کیا چیز ہے۔ پس عرش کہاں اور خالق عرش کہاں۔ پس معنی اس آیت کے یہ نہیں ہیں جو مجسمہ نے سمجھے ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ پھر کیا معنی ہیں تو سلف صالحین نے اس آیت اور جو اس کے مشابہ اور آیات ہیں ان کے بارہ میں یہ فرمایا ہے کہ ان کے معنی کی تعیین نہ کرو۔ اور ان کے معانی کو اللہ کے حوالے کرو۔ صرف اتنا اعتقاد رکھو کہ جو کچھ مراد ہے وہ حق ہے اور اسلم طریقہ آیات متشابہات میں یہی ہے۔ باقی متاخرین نے اس میں کچھ تاویل فرمائی ہے بعض نے یہ کہ استویٰ کے معنی استول ہیں اور معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر غالب ہیں۔ اور ایک تاویل احقر کیا کرتا ہے کہ استویٰ علی العرش بمعنی برتخت نشستن کنایہ ہے نفاذ امور و تصرف فی الامور میں تصرف کرنا ہے۔ چنانچہ بعض جگہ اس کے بعد مدبر الامر (وہ ہر امر کی تدبیر کرتا ہے) کا آنا بطور اس کے تفسیر کے ہو سکتا ہے۔

(اور دوسرے مقام میں ہے اللہ الذی خلق السموت والارض فی ستة ايام ثم استویٰ علی العرش، اللہ ہی ہے جس نے آسمان و زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر تخت پر قائم ہوا استویٰ میں ضمیر اللہ کی طرف ہے۔ سو وہاں حسب قاعدہ القرآن یفسر بعضہ بعضا بعض جز قرآن کا بعض جز کی تفسیر کرتا ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں بھی مراد تجلی الہی بہ اعتبار صفت رحمانیہ کے ہے فافہم) ایک تاویل ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عجیب و غریب فرمائی۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا۔ اللہ علی العرش استویٰ (اللہ عرش پر بیٹھے ہیں) تاکہ یہ لازم آئے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھے ہیں بلکہ الرحمن فرمایا ہے۔ پس مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت عرش کو محیط ہے اور عرش تمام عالم کو گھیرے ہوئے ہے۔ پس حاصل یہ ہے کہ اللہ کی رحمت تمام چیزوں کو گھیرنے ہوئے ہے پس اس تاویل سے۔

یہ آیت۔ وسعت رحمۃ کل شیء۔ میری رحمت ہر چیز سے وسیع ہے۔

کی مرادف ہوگی۔ اور عرش کی خصوصیت اس لئے ہوگی کہ تعلق رحمت کا اولیٰ بلا واسطہ اس

کے ساتھ ہوا ہے اور دوسری اشیاء کے ساتھ بواسطہ اس کے ہے پس حاصل یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کی تجلی اس پر اولاً ہوتی ہے۔

تجلی کے معنی

یہاں سے تجلی کے معنی بھی واضح ہو گئے کہ تجلی کے معنی یہ ہیں کہ کسی صفت کا تعلق متجلی لہ (جس کیلئے تجلی کی گئی ہے) سے ہو جائے۔ تجلی کے معنی چمک دمک کے نہیں ہیں جیسے عوام سمجھتے ہیں۔ مجھ کو تجلی کے لفظ پر ایک حکایت یاد آئی۔ میرے ماموں صاحب نے نانا صاحب کی عجیب حکایت بیان فرمائی کہ نانا صاحب ذکر و شغل کرتے تھے لیکن کوئی کیفیت وارد نہ ہوتی تھی تو سخت حیرانی تھی۔ سالک کو ایسے وقت بہت پریشانی ہوتی ہے۔ خصوصاً اگر کوئی دست گیر نہ ہو تو اور بھی زیادہ مصیبت ہے اور یہی وہ حیرانی اور بھٹک جس کی نسبت ارشاد ہے۔ ووجدک ضالاً فہدیٰ۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت حیران ہوا پایا۔ سو اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو راہ سلوک دکھائی۔ مفسرین ضالانہ کی تفسیر میں بہت حیران ہوئے ہیں۔ کسی نے کچھ کہا ہے کسی نے کچھ لیکن جو بات میرے دل کو لگتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ضلالت بھی حیرانی اور بھٹک ہے جو سالک کو کشور کار سے پہلے پیش آتی ہے اور فہدیٰ میں سلوک کا ابتدا مراد ہے اور

الم نشرح لک صدرک۔ کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ کشادہ نہیں کر دیا۔ اس قسم کی بھٹک سالک کو پیش آتی ہے تو اگر کوئی مرشد کامل موجود ہو تو وہ تسلی کرتا ہے اور کہتا ہے کوئے نومیدی مرو کا مید ہاست ☆ سوئے تاریکی مرو خورشید ہاست ناامیدی کی راہ مت چل کیونکہ خدا کے فضل سے بہت سی امیدیں ہیں۔

ظلمت یعنی مدعیان مزدور کی طرف مت جاؤ خورشید یعنی سنور باطن لوگ موجود ہیں۔ اور یہ بھٹک ابتدا میں ہوتی ہے پس اس قسم کی حیرانی اور بھٹک نانا صاحب کو تھی اور رہبر کامل کوئی موجود نہ تھا۔ ایک مکار درویش بنا ہوا آیا اور اس نے کہا کہ پیر جی صاحب میں آپ کو تجلی دکھلا دوں گا حضرت یہ طلب ایسی شے ہے کہ لکھے پڑھوں کی عقل گم ہو جاتی ہے۔

عشق رانا زلم کہ یوسف را بیا زار آورد ☆ ہچو صنعا زاہدے رازیر زنا ر آورد عشق کو مجھ پر ناز ہے کہ یوسف علیہ السلام کو بازار میں لاتا ہے اور مقام صنعا کے زاہد جیسے شخص کے زنا رڈ لوادیتا ہے۔

طلب کے کرشمے

بعض مرتبہ اس طلب کی آگ میں بہت بڑی بڑی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ حق تعالیٰ کی عنایت ہے ابتدا ہی سے شیخ کامل میسر ہو جائے اور اگر طلب پیدا ہو جائے دست گیر کوئی نہ ہو تو پوری مصیبت ہے۔

غرض نانا صاحب اس کے بہکانے میں آ گئے۔ اس نے کہا کہ غوث گڑھ چلو۔ وہاں ایک ویران مسجد اور تنہا جگہ ہے اس میں دکھلاؤں گا۔ چنانچہ وہاں گئے۔ دیا سلائیوں اس وقت نئی نئی چلی تھیں۔ کوئی جانتا نہ تھا کہ کیا ہوتی ہیں کہنے لگا کہ وضو کر کے دو رکعت پڑھو اور لا الہ الا اللہ کی ضربیں لگاؤ۔ جب یہ ضربیں ذکر کی لگانے لگے تو اس مکار نے پیچھے سے ایک دیا سلائی کھینچی جس سے تمام مسجد روشن ہو گئی۔ اول نانا صاحب کو حیرت ہوئی اس کے بعد کچھ سنبھلے اور مسئلہ تصوف کا یاد آیا کہ حق تعالیٰ کی شان تو یہ ہے کہ نور غیب کے سامنے کوئی ظلمت باقی نہیں رہتی۔

چو سلطان عزت علم بر کشد ☆ جہاں سر نحسب عدم در کشد
جب شہنشاہ حقیقی علم عزت کھینچتے ہیں جہاں گریبان عدم کی طرف سر کھینچتا ہے یعنی جب انوار الہی کا غلبہ ہوتا ہے تو ماسوا باقی نہیں رہتا۔

تو یہ کیسا نور ہے کہ میرا سایہ آگے پڑ رہا ہے اور نور غیب کے ساتھ ظلمت مجتمع ہو رہی ہے۔ پیچھے جو دیکھا تو دیکھا کہ دیا سلائی جلا رہا ہے نکال کر جوتا خوب پیٹا۔

ایک اور حکایت یاد آئی۔ ایک نو مسلم نے مجھ سے بیان کی تھی کہ میں پہلے مہنت تھا۔ راتوں کو جاگتا تھا۔ دل میں طلب پیدا ہوئی کہ جس کا نام چہتے ہیں اس کو دیکھیں۔ اسی طلب میں حیران سرگرداں تھا کہ ایک شخص ملا اس نے کہا کہ ہلکی سی جوت پر میشر کی میں دکھلا دوں گا۔ میں نے کہا اچھا۔ چنانچہ وہ شخص مجھ کو ایک دریا پر لے گیا۔ دور سے ایک روشنی نظر آئی۔ مجھے کہا دیکھا یہ ہے پر میشر کی جوت میں نے جو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ روشنی اچھلتی کودتی ہے۔ مجھے شبہ ہوا کہ یہ کیسی جوت ہے جس میں حرکت ہے پر میشر کی جوت میں تو وقار و سکون ہونا چاہیے۔ پاس چل کر دیکھنا چاہیے۔ قریب جا کر دیکھا تو ایک کچھو ہے۔ اس کے سر پر اس نے گارا جمار کھا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ تو نے مجھ کو فریب دیا۔ اس نے کہا کہ ارے کیوں بیوقوف ہوا ہے۔ دنیا میں یوں ہی کام چلتا ہے۔ میرے پاس رہ کر پوری کچوری کھایا کر۔ کیوں حیران پھرتا ہے میرا دل اسی دن سے اس

مذہب سے اتر گیا اور مسلمان ہو گیا کہ شاید مسلمانوں میں کوئی ایسا مل جائے۔ میں نے اس سے کہا کہ تمہارا کوئی اعتبار نہیں ہے اگر مسلمانوں میں کوئی نہ ملتا تو اسلام کو بھی جواب دے دو گے۔ تم مقصود ہی کو نہیں سمجھتے تو مصرف اس قدر ہے کہ اپنے خالق کا یقین ہو جائے اور یہ یقین ایسی شے ہے کہ ذرہ ذرہ عالم کا اس پر دلالت کرتا ہے چنانچہ ایک اعرابی کہتا ہے۔

البعرة تدل على البعير والاثر يدل على المسير فالسماع ذات

الابراج والارض ذات الفجاج كيف لا تدلان على اللطيف الخبير

یعنی جب مینگنیاں اونٹ کے وجود پر دلالت کرتی ہیں اور نقش قدم چھپنے والے کے وجود پر دل ہے تو یہ آسمان برجوں والا اور زمین کشادہ راہ والی کیوں نہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر دل ہوگی۔ پس یہ ایسا علم ہے کہ ایک جنگلی کو بھی حاصل ہے اس لئے کہ فطری ہے اس نے کہا کہ نہیں اسلام کو نہ چھوڑوں گا۔ خواہ یہ مقصود حاصل ہو یا نہ ہو۔ میں نے کہا کہ ہم کو کیسے تسلی ہو۔ اس نے کہا میں نے اسلام میں ایسی بات پائی ہے جو کسی مذہب میں نہیں۔ میں نے پوچھا وہ کیا؟ کہنے لگا توحید۔ مجھ کو بہت تعجب ہوا اور یہ اثر توحید کے فطری ہونے کا ہے اور اس کا یقین دلائل کے یقین سے بڑھ کر ہوتا ہے۔

ایک معقولی ہر ایک سے پوچھتا پھرتا تھا کہ بتلاؤ خدا کی کیا دلیل ہے ایک جنگلی ملاٹھ لئے ہوئے اس سے پوچھا اس نے لٹھ دکھا کر کہا؟ ہاں آپ کو خدا کے وجود میں بھی شک ہے۔ میں بتلاتا ہوں تجھ کو دلیل اور یہ کہہ کر لٹھ اٹھایا اور معقولی صاحب وہاں سے بھاگے۔ یہ تھا یقین فطری اور جس کی فطرت سلیم نہ ہو اس کا عمدہ علاج وہی ہے جو گنوار نے دکھلایا تھا۔

پس اسی واسطے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے السنان يزع اكثر مما يزع القرآن جس قدر قرآن پاک برائی سے روکتا ہے اس سے زیادہ سنان یعنی بھالاروکتا ہے۔

مولانا محمد یعقوب صاحب کا قصیدہ ہے اسمیں اول شعر میں یہی مضمون ہے

الوعظ ينفع لو بالعلم والحكم والسيف ابلغ وعاظ على القمم

وعظ نافع ہے اگر علم و حکم سے پر ہو اور تلوار سے لوگوں کے لئے بہت بڑا وعظ ہے۔

اب اس زمانہ میں بجائے تلوار کے اللہ تعالیٰ نے طاعون مقرر فرما دیا ہے۔

• وہ ایسا وعظ ہے کہ بڑے لمبے چوڑے واعظوں سے وہ کام نہیں چلتا جو اس سے چلتا ہے۔

نمازی بہت بڑھ جاتے ہیں اور روزہ رکھنے والوں کی تعداد بہت ہو جاتی ہے۔ مگر بعض ایسے بہادر

ہیں کہ اس وقت بھی نہیں چوکتے یا چند روز طاعون تک پڑھی جب کام نکل گیا۔ چھوڑ دی گویا اسی لئے پڑھی تھی کہ بلائیں جائے۔

جیسے ایک بزرگ نے ایک شخص سے کہا تھا کہ اگر چالیس روز تک تکبیرہ اولیٰ سے نماز پڑھو گے تو ہم ایک بھینس دیں گے اور مصلحت اس میں یہ سمجھی تھی کہ چالیس دن میں اس کو نماز سے محبت ہو جائیگی۔ پھر خواہ کچھ ملے گا یا نہ ملے گا یہ چھوڑے گا نہیں۔ چالیس روز کے بعد آیا کہ لاؤ بھینس۔ انہوں نے کہا کہ میرے پاس بھینس کہاں۔ میں نے تو اس مصلحت سے کہہ دیا تھا۔ تو آپ کیا کہتے ہیں کہ جاؤ پھر ہم نے بھی بے وضو ہی ٹرخائی ہے۔

یہ گفتگو استطراداً آگئی پہلے سے یہ حکایتیں بیان کر رہا تھا کہ ایک نے تجلی دیا سلائی سے دکھائی تھی ایک نے کھوے سے۔ سو تجلی کے یہ معنی نہیں جو لوگ سمجھتے ہیں۔

ذکر و شغل کے اثرات

اسی طرح بعض لوگ ذکر و شغل کرتے ہیں اور ان کو کچھ انوار نظر آیا کرتے ہیں۔ وہ ان کو خدا کا نور سمجھتے ہیں۔ یاد رکھو کہ اکثر اوقات تو یہ اس کے دماغ کے الوان ہوتے ہیں۔ جو اس کو نظر آتے ہیں۔ آج ہی ایک خط ایک شخص کا دہلی سے آیا ہے ان کا دماغ ضعیف تھا میں نے ان کو بجائے ذکر و شغل کے درود شریف کو پڑھنے کو لکھا تھا۔ آج کے خط میں انہوں نے لکھا ہے کہ میں نے درود شریف پڑھا تو ایک چمکدار بازاردیکھا۔ میں نے ان کو لکھ دیا کہ اس کی طرف التفات نہ کرو۔ تم بوجہ پاس نہ ہونے کے تحریر سے اس کی حقیقت نہ سمجھو گے اپنے کام میں لگے رہو۔ تو وہ اس کے دماغ کی صورتیں ہیں جو متمثل ہو کر نظر کے سامنے آگئیں۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مرید نے عرض کیا کہ حضرت مجھ کو ایک روشنی نظر آتی ہے اور اس میں سنہری حروف میں کچھ لکھا ہے حضرت نے فرمایا کہ تم علاج کراؤ اور ذکر و شغل وغیرہ چھوڑ دو۔ تمہارے دماغ میں پیوست ہے اور یہ مقدمہ ہے جنون کا۔ اس نے کہنا نہ مانا نہ علاج کرایا اور نہ کام کو چھوڑا آخر خشکی بڑھی جنون ہو گیا۔ بالکل برہنہ مارے مارے پھرتے تھے نہ نماز نہ روزہ اور میرے سامنے حضرت نے ان کو وصیت فرمائی تھی کہ کھایا پیا کرو۔ قوت آئے گی اور یہ فرمایا تھا کہ دیکھو حدیث میں آیا ہے۔

المومن القوی خیر من المومن الضعیف وفی کل خیر

مومن قوی مومن ضعیف سے بہتر ہے اور ہر ایک خیر ہے۔

غرض یہ ماہ بھی حق تعالیٰ کی تجلی خاص سے با فضیلت و مبارک ہو گیا اور اس فضیلت سے تلبس حاصل کرنے کو اس میں روزہ مقرر کیا گیا اور ان فضائل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت بیان فرمایا ہے مگر میں بوجہ اس کے کہ اس سے بھی ایک اہم مضمون اس وقت پیش نظر ہے اس وقت ان کو بیان کرنا نہیں چاہتا میں ایک بات اور بیان کرنا چاہتا ہوں۔

روزہ کی شان خاص

ارادہ یہ تھا اس کے بیان میں زیادہ وقت صرف کیا جائے گا مگر خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے، نہ کلام اختیار میں ہے اور نہ کوئی شے بقول مولانا کے۔

می تراد و خود بخود از لب سخن خود بخود زبان سے کلام جاری ہوتا ہے

تمہید میں بہت دیر لگ گئی مگر الحمد للہ یہ سب مضامین بھی بہت مفید ہیں وقت بیکار نہیں گیا اور وہ مضمون جو میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ صیام کے متعلق ایک ایسا مضمون ہے جس کی طرف التفات بہت کم ہے یا التفات ہے تو عمل نہیں کرتے، توجہ نہیں اور اس مضمون کے دو جزو ہیں۔ ایک میں تو ایک عامیانہ خیال کی اصلاح ہے اور دوسرا خاص مضمون ہے وہ ایک علمی مضمون ہے اور پہلا مضمون عملی ہے۔ بسط جس قدر ہوگا وہ عملی مضمون ہوگا اور وہ یہ ہے کہ یہ تو سب جانتے ہیں کہ روزہ فرض ہے اور اس فرض روزہ ہی کی فضیلت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ جس شخص نے ایمان اور ثواب کی طلب کے واسطے روزہ رکھا اس کے پچھلے گناہ سب بخشے جائیں گے۔ لوگ اس فضیلت کو بھی جانتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ وہ کس شان کا روزہ ہے جس کی یہ فضیلت ہے اور آیا یہ خاصیت ہر روزہ میں ہے یا وہ کوئی خاص روزہ ہے۔ سو یہ بھی حدیث سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر روزہ نہیں ہے بلکہ خاص ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

رغم انفه رغم انفه رغم انفه یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس کی

ناک خاک میں مل جائے اس کی ناک خاک میں مل جائے۔ اس کی ناک خاک میں مل جائے۔

صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ کون ہے۔ فرمایا تین شخص ہیں ایک تو وہ جس نے اپنے

۱۔ الصحیح لمسلم، القدر: ۳۳، سنن ابن ماجہ: ۹، ۷۹، ۳۱۶۸، مسند أحمد: ۲، ۳۷۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۵۲۹۸

۲۔ الصحیح لمسلم کتاب البر والصلة: ۱۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۹۱۲، الدر المنثور: ۳، ۷۲، ۱

ماں باپ کو بڑھاپے میں پایا اور اس نے جنت نہ حاصل کی (یعنی ان کی خدمت کر کے)
دوسرا وہ جس کے سامنے میرا ذکر آیا اور اس نے درود شریف نہ پڑھا۔

تیسرا وہ جس کے اوپر رمضان کا مہینہ آیا اور اس نے گناہ معاف نہ کرائے اور وہ اسی طرح نکل گیا۔
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رمضان یا روزہ میں خود معافی کا اثر نہیں بلکہ اس کے اندر خاص
شان ہونا چاہیے اور وہ خاص شان وہ ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

من لم يدع قول الزور والعمل به فليس لله حاجة ان يدع طعامه وشرابه
جو شخص روزہ میں باطل بولنا اور برا کام کرنا نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو کچھ حاجت نہیں ہے اس
بات کی کہ چھوڑ دے اپنا کھانا اور اپنا پینا۔

یہ ہے وہ شرط کہ جس کے پائے جانے سے روزہ کے اندر معافی کی شان آ جاتی ہے اور اس شرط
کا حاصل ہے معاصی کا چھوڑ دینا۔ سو اس کی طرف عام کالتفات نہیں یا التفات ہے تو عمل نہیں ہے۔

روزہ کا ادب

دیکھ لیجئے کہ کتنے ہیں ایسے لوگ جنہوں نے رمضان سے پہلے کی حالت بدل دی ہو۔ جو
حالت رمضان سے پہلے تھی وہی اب بھی ہے جن کو لڑکوں اور عورتوں کو گھورنے کی عادت تھی وہ اب
بھی گھورتے ہیں۔ جو غیبت کیا کرتے تھے وہ اب بھی کرتے ہیں جن کو کسی سے کینہ تھا وہ اب بھی
ہے اور جو پہلے سے پر ایا حق کھا رہے تھے وہ اب بھی کھا رہے ہیں۔ کون سا فعل ہے کہ کسی نے اس
کو رمضان کی وجہ سے چھوڑا ہو بلکہ رمضان کے آنے سے اور زیادہ وبال بڑھ جائے گا۔ اس لئے
کہ جیسا کہ مکان کے مقدس ہونے سے معصیت کے اندر شدت آ جاتی ہے۔ اسی طرح زمان کے
مقدس ہونے کا بھی یہی اثر ہے کہ اس سے معصیت زیادہ بڑھ جاتی۔ جیسے کوئی مسجد کے باہر بیٹھ
کر شراب پیئے تو گناہ ہے لیکن مسجد کے اندر بیٹھ کر پینا اور زیادہ گناہ ہے پس رمضان سے جس سے
نیکیاں بڑھتی ہیں اسی طرح اگر اس میں معاصی ہوں گے تو وہ بھی شدید ہوں گے۔ رمضان کا ادب
یہ ہے کہ کان، آنکھ، ہاتھ پاؤں، تمام جوارح کی حفاظت کرو۔

تقویٰ کی مشق

ایک بات کہتا ہوں اگرچہ میرے منہ سے اچھی نہیں معلوم ہوتی اس لئے کہ ہم کو تو یہی کہنا

چاہیے کہ دائمی تقویٰ اختیار کرو لیکن کیا کیا جائے لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ بہت بلاؤں میں مبتلا ہیں تو جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے ساحروں سے فرمایا تھا۔

القوا ما انتم ملقون۔ یعنی ڈالو جو کچھ تم کو ڈالنا ہے

حالانکہ بظاہر یہ گناہ کا امر معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ سحر کرنا اور نبی کا مقابلہ کرنا تو کفر ہے لیکن چونکہ یہ ذریعہ تھا۔ حقائق حق کا اور غلبہ حق کا اس لئے ان کو امر فرمایا۔ اسی طرح اس امید پر کہ میرا یہ مشورہ ذریعہ ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ دوام تقویٰ کا، میں بھی کہتا ہوں کہ اگر آپ سے دائمی تقویٰ نہ ہو سکے تو صرف اس ماہ رمضان میں تقویٰ اختیار کرو بعد رمضان کے تم کو اختیار ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ باقی گیارہ ماہ میں تقویٰ مت کرو بلکہ مطلب یہ ہے کہ نفس سے ایک ماہ کے لئے صلح کر لو اور ایک ماہ کے لئے تقویٰ پر اس کو راضی کرو اور یہ کہو کہ اے نفس ایک ماہ کے لئے متقی بن جا ایک ماہ کے بعد پھر آزادی ہے اور جب مہینہ گزر جائے تو ایک ماہ کے لئے اور صلح کر لو۔ اسی طرح رفتہ رفتہ اسی کو دائمی تقویٰ سکھلاؤ۔

ایک بزرگ نے اسی طریقہ سے نفس کو ذرا دائمی بنانے کی تدبیر بتلائی ہے مثلاً تم کو مظفر نگر جانا ہے تو نفس سے اگر یہ کہتے کہ اے نفس مظفر نگر پہنچنے تک اللہ اللہ کرو تو نفس ہرگز راضی نہ ہوتا۔ نفس سے صلح کی۔ اے نفس صرف اسٹیشن تک ذکر کر لے پھر جب اسٹیشن تک پہنچے تو کہو کہ اے نفس صرف نانوتہ تک اللہ اللہ کر لے۔ اسی طرح نانوتہ پہنچ کر راپور تک صلح کر لے۔ حتیٰ کہ مظفر نگر تک اللہ اللہ کرتے چلے جائے۔ اگر ابتدا سے نفس پر بار ڈالتے تو نفس کبھی منقاد (تا بعد از) نہ ہوتا۔

لیکن ان بزرگ نے کسی بزرگ ہی نفس کو دیکھا تھا۔ ہمارا نفس تو اس حکمت کو اول ہی سے سمجھ کر کبھی کہنا نہ مانے۔ اللہ تعالیٰ ناس کرے اس نفس کا کہ اس نے بہت راہ مارا ہے تاہم باوجود شرارت کے اس میں یہ خاصا ہے کہ اگر اس کو راہ پر لانا چاہیں تو کچھ تو آ ہی جاتا ہے۔ اس کی بچہ کی سی خاصیت ہے کہ بچہ بہلائے سے بہل بھی جاتا ہے۔ پس تم بھی نفس سے کہہ دو کہ عید کے دن تک تو متقی ہو جا۔ بعد میں تجھ کو اختیار ہے۔

اگر کوئی کہے کہ عید تک متقی ہونے سے کیا نفع۔ تقویٰ تو جب ہی کارآمد ہے جب کہ مرنے تک ہو۔ صاحبو! میں اس میں ایک فائدہ سمجھے ہوئے ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ایک تدبیر ہے دائمی تقویٰ حاصل کرنے کی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ نفس جو تقویٰ کی طرف مائل اور معصیت سے نفور نہیں ہوتا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ تقویٰ کی لذت اور معصیت کی کدورت سے واقف نہیں۔ اس کو یہ خبر ہی نہیں کہ تقویٰ کے اندر کیا لذت اور نور ہے اور معصیت کے اندر کیا کدورت اور ظلمت ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ چونکہ ہمیشہ معصیت ہی میں رہا ہے اس لئے نور تقویٰ سے آگاہی نہیں ہے اور جب کہ نور تقویٰ سے آگاہی نہیں تو بقاعدہ

الاشیاء تعین بضدھا۔ اشیاء اپنی ضدوں سے ظاہر ہوتی ہیں۔

معصیت کی ظلمت کا بھی احساس نہیں۔ پس ضرورت اس کی ہے کہ اس نور اور ظلمت یا یوں کہو کہ اس لذت اور کدورت سے واقف بنایا جائے۔ جب اس کو تقویٰ کی لذت حاصل ہوگی تو معصیت میں کدورت محسوس ہوگی۔ پس لامحالہ تقویٰ کی حرص اور معصیت سے نفرت پیدا ہوگی۔ جب پورے رمضان المبارک میں متقی رہو گے تو کچھ تو احساس ہوگا۔ لذت تقویٰ و کدورت معصیت کا شوال میں جب کہ میعاد صلح کی ختم ہو جائے گی، تو اس میں نور اور حلاوت و لذت کو یاد کرے گا اور یہ کہے گا۔

بازگو از نجد و از یاران نجد ☆ تادر و دیوار را آری بوجد

پھر نجد اور یاران نجد کی داستان بیان کرو تا کہ درود یوار و جد میں آئیں۔

اور یہ کہے گا۔

باز دیوانہ شدم من اے حبیب ☆ باز سودائے شدم من اے طیب

اے حبیب پھر میں دیوانہ ہوا اور اے طیب پھر میں سودائی ہوا۔

اور اس وقت اس کو ولولہ ہوگا، طلب ہوگی اور اس حالت سے ایک جست کرے گا اور اس کو کاشی ہوگی۔ نور تقویٰ اپنی طرف کھینچے گا اور معاصی کی کدورت سے اس کو روکے گا اور وہ زبان حال یا قال سے یہ کہے گا۔

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش ☆ باز جوید روزگار وصل خویش

یعنی جو شخص اپنی اصل سے جدا ہوتا ہے پھر اس زمانہ وصال کو جو یا ہوتا ہے۔

پس وہ اسی طرح روتہ روتہ متقی بن جائے گا۔

معصیت اور اطاعت

اگر کوئی کہے کہ جیسے معصیت کے وقت طاعت کو یاد کرے گا اسی طرح طاعت کے وقت معصیت کو یاد کرے گا۔ پس وہ بین بین رہے گا۔ طاعت کا غلبہ کیسے ہوگا۔

جواب اس کا یہ ہے کہ اول دو مقدمے سمجھ لینا چاہیں۔ وہ یہ ہیں کہ ہر شے کا میلان اپنی اصلی حالت کی طرف ہوتا ہے۔ ہر عنصر اپنے جز کی طرف راجع ہوتا ہے اور دوسرا مقدمہ یہ سمجھو کہ مسلمان کی اصلی حالت طاعت ہے اور معصیت عارضی اور وہ کسی عارض کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ طاعت گواختیاری شے ہے لیکن اس کے مناشی اور اصول فطری ہیں۔ چنانچہ دیکھئے غیر عاقل بچوں میں گو طاعت نہیں ہے لیکن طاعت کے مبادی اور مناشی کہ اخلاق حمیدہ ہیں موجود ہیں۔ دیکھئے بچہ جھوٹ نہیں بولتا۔ جب کچھ ہوش آجاتا ہے اور دوسرے سے سیکھتا ہے اس وقت بولتا ہے اور جو کچھ اس سے پوچھو بے تکلف بتا دیتا ہے کچھ تصنع بناوٹ اس میں نہیں ہوتی۔ خاکساری ہے کینہ پروری نہیں۔

بچہ میں ایک صفت تو صوفیا کی سی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اپنے مربی سے رنج پہنچے تب بھی اسی کی طرف دوڑتا ہے۔ ماں مارتی ہے اور بچہ اماں ہی اماں پکارتا ہے۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ارشاد فرمایا ہے کہ اے موسیٰ ہمارے ساتھ ایسے رہو جیسے بچہ ماں کے ساتھ۔ اگر غور کیا جائے تو بچہ کے اندر لاکھوں پاکیزہ صفات ہیں۔ بچہ مطیع ہے فرمانبردار ہے اور بہت صفات ہیں اور اسلام نے یہی صفات سکھائے ہیں۔ پس جب یہ صفات فطری ہیں اور یہ اصلی حالت ہے تو معصیت میں طاعت یاد آنے سے معصیت کو چھوڑ کر طاعت کی طرف آؤ گے۔ یہ نہ ہوگا کہ طاعت میں معصیت کو یاد کر کے طاعت سے معصیت کی طرف آؤ۔ چنانچہ ایسا کہیں نہ دیکھا ہوگا کہ تارکین دنیا طالبان دنیا بنے ہوں۔ اور ایسے لاکھوں قصے ہیں کہ طالبان دنیا تارکان دنیا ہو گئے۔

اب راز سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ رمضان میں متقی بن جانے سے کس طرح دائمی متقی بن جاؤ گے۔ دیکھا آپ نے کہ کیا سہل نسخہ ہے۔

حلال و حرام

یہاں سے ایک آیت کی عجیب تفسیر سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے:

کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ

ایاماً معدودات۔

تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔ اس توقع پر کہ تم متقی بن جاؤ۔ تھوڑے دنوں روزہ رکھ لیا کرو۔

ایاماً معدودات کے عامل میں گفتگو ہوئی ہے کہ کون ہے۔ مفسرین نے ایک صوموا

مقدور نکال کر اس کا معمول بنایا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ تقون کے متعلق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ تقویٰ تو دواماً مطلوب ہے وہ ایسا کا عامل کیسے ہو سکتا ہے لیکن اس تقریر سے اس کا تقون سے معمول ہونا سمجھ میں آ گیا ہوگا مطلب یہ ہوگا کہ چند روز متقی بن جاؤ یہ تم کو دائمی متقی بنادے گا۔

باقی یہ بات کہ یہ تفسیر کسی نے کی نہیں سو یہ کوئی بات نہیں قواعد شرعیہ و عربیہ کی موافقت کے بعد نقل خاص کی ضرورت نہیں۔ بہر حال کیسی آسان صلح نکل آئی۔

اب یہاں پر ایک اشکال باقی رہا۔ وہ یہ ہے کہ آپ شاید یوں کہیں گے کہ ہم آنکھوں کی بھی حفاظت کر لیں گے اور ہاتھ پاؤں سب جوارح کی۔ لیکن یہ حضرت شکم علیہ السلام (اس پر ملامت ہو) کا تقویٰ ہم سے نہ ہو سکے گا اور ان ہی حضرت پر دار و مدار ہے۔ اس لئے کہ یہ بمنزلہ حوض بدن کے ہے اور دیگر جوارح بمنزلہ نالیوں کے ہیں۔ جو اس سے منشعب (نکلنے والی) ہوئی ہیں پس جیسا حوض میں پانی ہوگا نالیوں میں ویسا آئے گا اگر حوض میں پانی پاک و صاف ہے تو نالیوں میں بھی پاک و صاف ہوگا اور اگر حوض میں ناپاک اور خراب پانی ہے تو نالیوں میں بھی خراب پانی ہوگا۔ پس اگر پیٹ میں حرام غذا ہے تو جوارح سے افعال بھی خبیث ہی صادر ہوں گے اور اگر حلال غذا ہے تو افعال بھی نیک ہوں گے اور ہماری حالت یہ ہے کہ گھر میں جنس ہے وہ حرام ہے، کپڑا بدن پر ہے وہ حرام ہے۔ روپیہ ہے وہ حرام وجہ سے حاصل کیا جاتا ہے تو اب ہم رمضان بھر کیسے متقی بنیں۔ ہاں گھاس کھودیں تو حلال غذا کھائیں تو ہم ایسے سخت کام کے عادی نہیں ہیں۔ یہ اشکال ہے۔

حلال کی صورت

جواب اصلی تو اس کا یہ ہے کہ کچھ ہی ہو سب چھوڑ دو اور تقویٰ اختیار کرو۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ کوئی نہ چھوڑے گا۔ اس لئے اس کی ہل صورت اس کے لئے بھی بتلاتا ہوں گو دل تو چاہتا نہ تھا کہ بتلاؤں لیکن کیا کروں مسلمانوں کی حالت دیکھ کر واللہ بہت دل دکھتا ہے کہ خلاف شریعت کر کے دین تو تباہ کرتے ہیں دنیا بھی برباد کر رہے ہیں۔ اس لئے ایسی صورتیں بتلانے پر جسارت ہوتی ہے ورنہ فی الواقع یہ باتیں ظاہر کرنے کی نہیں ہیں۔

سو صابو! یہ سخت اشکال بھی تمہارا رفع کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اس پیٹ کا علاج یہ ہے کہ تم اپنی پہلی جنس اور پہلے روپیہ کو قفل کر کے رکھ دو اور رمضان رمضان کے لئے جنس کسی اجن سے

ادھار لے لو یا روپے قرض لے کر اس سے جنس خرید لو۔ پھر اس ادھار کو اپنی آمدنی سے ادا کر دینا اگر کوئی کہے کہ مہاجن کے پاس روپیہ یا اناج حلال کہاں سے آیا اس کے پاس تو سود وغیرہ کا ہے۔ بات یہ ہے کہ اگر سلطنت کے اندر دو شخص ہوں ایک تو باغی ہو اور ایک رعایا میں ہے جو نمبردار ہے۔ دونوں مثلاً زیادت ستانی کے جرم کے مرتکب ہوئے تو اس نمبردار کو تو زیادت ستانی کی قید ہوگی اور باغی کی اس پر قید نہ ہوگی۔ اس کے لئے یہ جرم ہی نہیں۔ اس کو سزا ہوگی بغاوت پر۔ وہ اگر بغاوت سے معافی چاہے تو سب کھایا معاف ہے بس کفر تو بمنزلہ بغاوت کے ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے احکام فرعیہ کا مخاطب ہی نہیں اور ہم ہیں رعایا میں سے پس مہاجن کے لئے سود وغیرہ جرائم نہیں ہیں اس کے یہ جرائم کفر کے اندر کھپ گئے اور ہمارے لئے یہ سب جرائم ہیں۔

بہت موٹی بات ہے کہ جب تک اپنا بیٹا یا شاگرد دائرہ اطاعت میں رہتا ہے تو اس سے ہر قسم کا مواخذہ کیا جاتا ہے اور جب کہ دائرہ اطاعت ہی سے نکل جائے تو پھر اس سے ہر بات پر گرفت نہیں ہوتی اس کی بڑی شکایت یہ ہوگی کہ اطاعت نہیں کرتا۔ یہ شکایت نہ ہوگی کہ فلاں شرارت کیوں کی اور جزئی نافرمانیاں معاف ہو جائیں گی۔

اب آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ مہاجن سے جو قرض آپ لیں گے اس میں کوئی شبہ نہ ہوگا یہ اس اشکال کی سہل تدبیر ہے جو آپ کو پیش آیا۔ جی نہ چاہتا تھا کہ بیان کروں۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں قیاس فاسد بہت شائع ہے۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ اس کو سن کر قیاس کریں اور حرام گیری اور حرام خوری پر کمر باندھیں۔ اب فرمائیے کیا عذر ہے تقویٰ اختیار کرنے میں۔

طالب علمی کا رنگ

اگر کوئی کہے کہ ہم تو ڈاڑھی کٹاتے ہیں، پاجامہ ٹخنے سے نیچے رہتے ہیں۔ ڈاڑھی کٹی ہوئی اور ٹخنے چھپے ہوئے ہم کو اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ تو یہ کوئی عذر نہیں۔ اس کو چھوڑ دینا کوئی مشکل نہیں۔ کیونکہ کوئی دنیا کی کارروائی اس پر موقوف نہیں اور مشکل تو واللہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اس پر بھی اگر کوئی تقویٰ نہ کرے تو اس کو یہی کہا جائے گا۔

ستم کو ہم کرم سمجھے، جفا کو ہم وفا سمجھے ☆ جو اس پر بھی نہ وہ سمجھے تو اس بت کو خدا سمجھے پس اب ۳۰ رمضان المبارک تک تو خدا کے لئے متقی بن جاؤ۔ بعد ۳۰ رمضان کے دیکھا جائے گا۔ ایک دفعہ تم کو اس کا ذائقہ آجائے پھر تو ان شاء اللہ رفتہ رفتہ تم کو دین اپنی طرف کھینچ لے

گا۔ جیسے کوئی ایک دفعہ طالب علمی کر لیتا ہے تو پھر اس کے اندر ایک سادگی اور بے تکلفی ایسی آجاتی ہے کہ خواہ کسی درجہ پر پہنچ جائے مگر وہ طالب علمی کا رنگ نہیں جاتا۔

شاہجہانپور میں ایک کورٹ انسپکٹر ملے۔ ان کے اوضاع و اطوار میں ایک محبوبانہ اور بے تکلفی کا انداز تھا۔ میں نے تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے عربی کی طالب علمی کی تھی۔ بس وہ رنگ گیا نہیں تھا۔ اسی طرح جو شخص اہل اللہ کی جماعت میں ایک دفعہ آ پھنستا ہے وہ گو کہیں پھرے لیکن پھر آئے گا۔ اب نہیں تو پھر کسی وقت آئے گا اور اگر زندگی میں نہ آئے گا تو مر کر تو ضرور ہی آئے گا۔ غرض نکلے گا نہیں۔

جرعہ خاک آمیز چوں مجنون کند ☆ گر بود صافی ندانم چوں کند
یعنی ایک گھونٹ خاک آلودہ جب ایسا مجنون بنا دیتا ہے اگر بالکل پاک و صاف ہووے
تو نہ معلوم کیا کرے گا۔

پس ہمارا یہ تقویٰ طہارت ذکر جو معاصی اور ظلمات ہوا و ہوس میں ملا ہوا ہے جب یہ اثر دکھاتا ہے تو اگر یہ ثمرات صاف کی طرح صاف ہو جائے۔ تو خدا جانے کیا حالت کر دے اسی واسطے میں مشورہ دیا کرتا ہوں کہ اپنے بچوں کو اہل اللہ کے پاس لے جاؤ اور ان کے پاس رکھو۔ اگر چہ وہاں رہ کر نہ نماز پڑھیں نہ روزہ رکھیں لیکن یہ خالی ان کے پاس کار ہنا پھل پھول لاتا ہے پچھلے سفر میں میں مچھلی شہر گیا تھا۔ میں نے یہ مضمون بیان کیا تھا کہ میں اولاد کو انگریزی پڑھانے کو منع نہیں کرتا۔ انگریزی پڑھاؤ مگر انگریز نہ بناؤ اور جو زمانہ ان کی تعطیل کا ہے اس کے دو حصے کر دو۔ آدھا حصہ گھر رہ کر تفریح و آسائش میں گزاریں اور آدھا حصہ کسی کامل کی صحبت میں رکھو اور اس کا وعدہ ہم کرتے ہیں کہ ہم ان کو روزہ نماز کے لئے بھی نہیں کہیں گے۔ چند روز ہی میں دیکھ لینا کہ وہ دین کا ہو کر رہے گا اور اس وجہ سے لوگ ان کے پاس اولاد کو نہیں بھیجتے کہ یہ دنیا سے جاتے رہیں گے۔

جناب حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص آنے لگا تھا۔ اس کے کسی عزیز نے کہا کہ جب سے یہ آپ کی خدمت میں آنے لگا ہے کسی کام کا نہیں رہا۔ حضرت نے فرمایا کہ بھائی ہم تو بگاڑتے ہی ہیں۔ اگر تم کو پسند نہ ہو تو اس کو روک دو۔ خیر یہ تو بڑے لوگوں کا کام ہے اپنے جیسا بنالیں۔ مگر اتنا تو ضرور ہوگا کہ عقائد تو ان کے صحیح ہو جائیں گے کا فرق تو نہ بنیں گے۔ یہ مضمون تھا مچھلی شہر کے وعظ کا۔

اب وہاں کے ایک مولوی صاحب رئیس کا خط آیا ہے کہ اگر اجازت ہو تو اپنے بچوں کو وہاں

بھیج دوں۔ میں نے جواب میں لکھ دیا ہے کہ اگر ان کو بھی رغبت ہو بھیج دو۔ اس لئے کہ اگر خود رغبت ہو تو صحبت نافع ہوتی ہے الحاصل صحبت نیک کی طرح رمضان کا تقویٰ بھی دل میں ان شاء اللہ گھر کر لے گا اور سوال اور دیگر مہینوں میں وہ وقتاً فوقتاً ابھرے گا۔ اب بتلائے اس سے زیادہ آسان طریقہ اور کیا ہوگا۔ اب اگر اس سے بھی زیادہ آسان طریقہ چاہتے ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کام ہی نہیں کرنا چاہتے ہو۔ یہ تو عملی مضمون تھا۔

تصوف اور فقہ

اب ایک دوسرا مضمون اس کے مقابل ہے۔ وہ ایک علمی مضمون ہے۔ یہ مضمون تو ان لوگوں کے متعلق تھا جو گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے کہ جو ان کے مقابل ہیں کہ وہ مباحات کے اشتغال پر بھی ملامت کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ رمضان میں پیٹ بھر کر نہ کھاؤ بلکہ کم کھاؤ۔ اگر زیادہ کھاؤ گے تو روزہ کی جو حکمت ہے کسر ہیئت نفس وہ باطل ہو جائے گی۔ اور روزہ رکھنا نہ رکھنا برابر ہو جائے گا یہ قول بعض اہل لطائف کا ہے اور بظاہر بہت لذیذ اور صحیح اور دقیق و غامض بات معلوم ہوتی ہے۔ اپنی اپنی بات ہے ہم کو تو یہ بات پسند نہیں آئی۔

للناس فیما یعشقون مذاہب

(جس چیز میں لوگوں کا عشق ہو اس میں ان کے مختلف مذاہب ہیں)

ہمارا تو مذہب یہ ہے۔

ماہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم ☆ الاحادیث یارکہ تکراری کنیم جو کچھ ہم نے پڑھا تھا۔ بجز حدیث یار کے سب کو فراموش کر دیا ہے۔ اسی (حدیث یار) کی تکرار کرتے ہیں۔

پس اگر یہ قول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر منطبق ہو جائے تو سبحان اللہ ہم اس کو حدیث سے جانچیں گے۔ اگر اس کو سوئی پر بھی درست رہا تو سر اور آنکھوں پر ہے۔ ورنہ جناب ہم کو پسند نہیں۔ اگر کوئی کہے کہ حدیث پر گو منطبق نہ ہو، تصوف پر تو منطبق ہے۔ تو حضرت یہ دیکھنا ہے کہ تصوف کیا شے ہے؟ تصوف بھی اصل میں حدیث ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جس نے رنگ بدل کر تصوف نام رکھا ہے اور فقہ بھی حدیث ہی ہے جس نے رنگ بدل لیا ہے اس لئے فقہا فرماتے ہیں۔ القیاس مظہر لا مثبت یعنی قیاس نص کے حکم کو ظاہر کرنے والا ہے ثابت کرنے والا نہیں

ثابت کرنے والا حکم کا نص ہے۔ پس تصوف اور فقہ جدا جدا شے نہیں ہیں ہاں رنگ مختلف ہیں۔
 عباد اتنا شتی وحسنک واحد وکل الی ذاک الجمال یشیر
 عنوان مختلف ہیں معنوں ایک ہی ہے۔ ہر ایک عنوان انہی مضمون کی طرف مشیر ہے۔
 بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش ☆ من انداز قدت رای شناسم
 جس رنگ کا جوڑا چاہے پہن لے میں انداز قد سے پہچان لوں گا۔

محبوب خواہ کسی رنگ سے آئے اور کسی لباس میں آئے عاشق اس کو ہر طرح پہچان لے گا۔
 اور جو نہ پہچانے وہ عاشق نہیں ہے۔ پس حدیث ایک ایسا محبوب ہے کہ جس نے اس کو پہچان لیا
 ہے تو وہ خواہ فقہ کے رنگ میں جلوہ گر ہو یا تصوف کے لباس میں ظاہر ہو پہچان لے گا۔

ہاں اگر حدیث ہی نہ ہو تو اس کی پہچان کیسے ہوگی۔ اس سے فوراً قلب میں استنکار ہوگا۔ ہم
 کو تصوف کا انکار نہیں ہے اس لئے ہم یہ جواب نہ دیں گے کہ تصوف پر منطبق نہیں ہے۔ دعویٰ ہمارا
 یہ ہے کہ یہ قول فی نفسہ صحیح نہیں کہ کم کھاؤ کم پیو اور اس کی دلیل یہ بیان کرنا کہ بھوک اور پیاس کی
 تکلیف نفس کو ہو، یہ ان کی دلیل ہے اور ان کی مسلم ہے۔

شرعی مجاہدے

ہم یہ کہتے ہیں کہ اس مقدمہ کی کیا دلیل ہے کہ روزہ کی حکمت یہی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ روزہ
 سے مقصود تو مجاہدہ اور کسر قوت نفس ہے اور مجاہدہ اور مشقت جب ہی ہوگا جب کہ کم کھائے گا اور اگر
 ہمیشہ کی عادت سے بھی زیادہ کھایا پیا تو مجاہدہ ہی کیا ہوا تو جواب یہ ہے کہ یہ تو صحیح ہے کہ حکمت
 مجاہدہ ہے، لیکن مجاہدہ تقلیل طعام و شراب میں ہونے میں کلام ہے۔ مجاہدہ نام کھانے پینے کے
 ترک یا تقلیل کو نہیں کہتے بلکہ مجاہدہ نام ہے ترک عادت کا۔ اگرچہ رات بھر کھاؤ پیو لیکن دن کو جب
 وقت کھانے کا آئے گا تو فوراً تقاضا کھانے کا ہوگا اور یہ اس تقاضے کے خلاف کرے گا۔ بس یہی
 مجاہدہ ہے گو بھوک بھی نہ ہو لیکن میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ تقلیل طعام مطلوب نہیں بیشک مطلوب
 ہے اور احادی میں ترغیب بھی اسکی آئی ہے کلام اس میں ہے کہ آیا تقلیل طعام و شراب مکمل صوم ہے
 یا نہیں اس پر کوئی دلیل نہیں۔ دلیل ظنی تخمینی یا قرآن کا تو اعتبار ہے نہیں۔ کتاب و سنت، یا اجماع
 قیاس سے دلیل ہونا تقلیل طعام کی وجہ سے جو برکت ہوتی ہے وہ جدا شے ہے اور روزہ کی وجہ سے
 جو برکت حاصل ہوتی ہے وہ علیحدہ ہے اول موقوف علیہ ثانی کی نہیں ہے۔

روزہ کی برکت خاص یہ ہے کہ عادت کے وقت نفس کو نہیں ملا۔ اور یہ کوئی نہ کہے کہ عادت دو چار روز میں بدل جائے گی پھر یہی عادت ہو جائے گی کہ رات کو کھایا کریں۔ بات یہ ہے کہ نفس ایسی شے ہے کہ خواہ کتنا ہی زمانہ گزر جائے مگر وہ تقاضا اس کا نہیں جاتا۔

ایک چور کی حکایت مشہور ہے کہ وہ ایک پیر کا مرید ہو گیا۔ پیر نے چوری سے توبہ کرائی۔ خانقاہ میں رہنے لگا۔ صبح کو جب سب اٹھتے تو دیکھتے کہ ہر ایک کی ایک جوتی دوسرے کی جوتی کے ساتھ رکھی ہے۔ دو چار دن تک تو صبر کیا پھر تحقیق کرنا شروع کیا تو چور صاحب پکڑے گئے۔ پکڑ کر پیر کے پاس لے گئے۔ پیر نے پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے۔ کہا سنے حضرت بات یہ ہے کہ مجھے عادت تھی چوری کی۔ جب وہ وقت آتا ہے تو میرے نفس میں تقاضا ہوتا ہے، تو چوری تو میں کرتا نہیں، بڑی مشکل سے نفس کو اس ہیرا پھیری پر راضی کرتا ہوں۔

تو جناب یہ نفس صاحب وہ ہیں کہ خواہ کتنا ہی زمانہ گزر جائے مگر عادت کا تقاضا ہوتا ہے گو خفیف اور لطیف ہو لیکن ہوتا ہے ضرور۔ اور شریعت کے مجاہدے جو گیوں کے سے مجاہدے نہیں ہیں کہ اپنا ہاتھ سکھا لو یا کئی کئی سال بھوکے رہو یا بالکل مستحیل ہو کر آبادی کو چھوڑ کر ویرانہ اختیار کر لو۔ شریعت کے مجاہدے نہایت لطیف اور آسان اور نفع میں بہت زیادہ اس پر مجھ کو ایک صاحب علم کا مقولہ یاد آیا۔ وہ علم معقول و منقول کی مثال میں فرمایا کرتے تھے کہ علم معقول کے اندر جو شخص عمر کھپا دے اس کی مثال اس شکاری کی سی ہے کہ تمام بدن شکار میں رہے۔ شام کو گھبرائے تو بچوں نے پوچھا کہ ابا کیا لائے ابا نے تمام دن میں سور کا شکار کیا تھا جو کسی مصرف کا نہیں۔ نہ اس کا گوشت کام کا نہ کھال کام کی۔ ہاں جشہ میں بہت بڑا اور شکار بھی بڑی مشکل سے ہوا۔

روزہ اور تقلیل طعام

میری دلیل (یکن ان یقول الخصم ان عدم وجد انکم الدلیل لایستلزم عدم الدلیل وایضاً یلزم الاحتجاج بعدم الدلیل وھولیس بصحیح عندنا کماھو مصرح فی اصول الفقہ) ممکن ہے کہ خصم یہ اعتراض کرے کہ تمہارا دلیل کا عدم وجد ان عدم دلیل کو استلزم نہیں اور نیز لازم آتا ہے احتجاج عدم دلیل سے یہ ہمارے نزدیک صحیح نہیں جیسا کہ اصول فقہ میں اسکی صریح کی ہے، چونکہ اس کے متعلق نصوص معلوم ہیں۔ ان میں نہ ہونا دلیل ہے عدم دلیل کی اور چونکہ بدون دلیل کے حکم ثابت نہیں ہوتا اس لئے یہ احتجاج بالدلیل ہے بعدم

الدلیل نہیں۔ ۱۲ منہ) یہ ہے کہ اگر روزہ کا کمال اس پر موقوف ہوتا تو کہیں تو اللہ تعالیٰ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ کم کھاؤ۔ کسی حدیث میں ایسا مضمون نہیں۔ ہاں اگر ہے تو اس کے خلاف ہے فرماتے ہیں:

كلوا واشربوا حتى يتبين لكم الخيط الابيض من الخيط الاسود من الفجر
یعنی صبح ہونے سے پہلے کھاؤ پیو۔

اس لئے میری سمجھ میں تو یہ آتا نہیں کہ رمضانیت کی فضیلت تقلیل طعام پر موقوف ہے۔
اب یہاں پر ایک شبہ باقی رہا۔ وہ یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے
خلوف فم الصائم اطيب عند الله من ريح المسك
یعنی صائم کے منہ کی بدبو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ پاکیزہ ہے۔

اور یہ بواہی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ معدہ میں کچھ نہ ہو۔ جب معدہ بالکل خالی ہوتا ہے تو اس سے کچھ رواتح اوپر کی طرف صعود کرتے ہیں۔ ان کا اثر منہ میں بھی آتا ہے تو اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم کھانا مطلوب ہے ورنہ اگر زیادہ کھایا اور وہ کھانا معدہ میں رہا تو خلوف کا وجود کہاں ہوگا اور لیجئے ایک دوسری حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بعض لوگ ایسے ہیں کہ ان کو روزہ سے سوائے بھوک پیاس کے کچھ وصول نہیں ہوتا۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ روزہ میں بھوک پیاس مطلوب ہیں۔

جواب یہ ہے کہ ان دونوں حدیثوں سے یہ لازم نہیں آتا کہ کم کھانا کم پینا مطلوب ہے۔
اول حدیث کی مثال تو ایسے ہے جیسے ماں کہے کہ مجھے تو اس بچہ کا پیشاب بھی پیارا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ماں کو مقصود یہ ہے کہ بچہ اس کے اوپر پیشاب کرے۔ مقصود تو اس کی محبوبیت کا اظہار ہے پس مطلب یہ ہے کہ اگر روزہ کی یہاں تک نوبت پہنچے کہ اس کے منہ سے بدبو آنے لگے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند نہیں اب اس سے یہ لازم نہیں کہ ایسی حالت پیدا کیا کرو کہ یہ مطلوب ہے۔

دوسری حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص نے روزہ میں معاصی نہیں چھوڑے تو اس کو اگرچہ بھوک پیاس کی بھی مشقت لاحق ہو تو کوئی فائدہ نہیں ہے اس سے مطلوبیت کیسے لازم آئی۔ اگر کسی کو اس کے خلاف تحقیق ہو تو مہربانی فرما کر وہ مجھ کو بتادیں۔ مجھ کو اپنے قول پر اصرار

نہیں۔ جو میری سمجھ میں آیا ہے وہ بیان کر دیا۔

اگر کوئی کہے کہ جناب اگر حدیث میں تقلیل طعام کو مکمل صوم ہونا نہیں آتا تو اس کے خلاف پیٹ بھرنے کا بھی ذکر نہیں آیا تو اس اعتبار سے دونوں مساوی ہو گئے۔ اگرچہ یہ شبہ سطحی ہے مگر ہمارے مدعا کو مضرت نہیں۔ اس لئے کہ ہمارا مقصود تو یہ ہے کہ تقلیل مکمل صوم نہیں ہے اور یہ ثابت ہے لیکن تبرعاً اب ہم اس کے خلاف کے دلائل بیان کرتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ اگر کوئی روزہ دار کو افطار کرادے اس کے گناہوں کی مغفرت ہو جاتی ہے اور اس کو بھی اتنا ہی ثواب ملتا ہے صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمارے سب کے پاس روزہ دار کے افطار کرانے کی قدر نہیں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ثواب تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھی دے دیتے ہیں جو تھوڑے دودھ یا ایک چھوہارہ یا ایک گھونٹ پانی پر افطار کرادے اور جو اس کو پیٹ بھر کر کھلا دے اللہ تعالیٰ اس کو میرے حوض سے سیراب کریں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ پیٹ بھر کر کھانا ثواب کی بات ہے اور اس کا پیٹ بھر کر کھانا ذرا نقص نہیں ورنہ اس کی اعانت باعث فضیلت نہ ہوتی۔ پس بحمد اللہ ثابت ہو گیا کہ تقلیل طعام کو روزہ سے کوئی تعلق نہیں۔ باقی یہ ظاہر ہے کہ بہت زیادہ کھانا اور ناٹری کی بندوق کی طرح بھرنا یہ ناپسند ہے۔ بس تفصیل یہ ہے کہ جو شخص قوی ہو اس کے لئے کسی قدر قلت بہتر ہے اور جو ضعیف القوی ہو اس کے لئے قلت طعام نہیں چاہئے۔ اس کو قلت سے تشویش ہوگی۔ اسی واسطے ہمارے بزرگ اس زمانہ میں تقلیل طعام کا مشورہ نہیں دیتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ پیٹ بھر کر کھاؤ۔ اس سے قوت آئے گی۔ قوت ہوگی تو کام بھی کر سکو گے۔ اور اگر تقلیل کی تو قوی چونکہ اس زمانہ میں ضعیف ہیں اور زیادہ ضعف ہو کر باعث تشویش اور پریشانی ہوگی۔

اگر کوئی کہے کہ جب پیٹ بھرنے سے قوت آتی ہے تو زیادہ کھانے سے اور زیادہ قوت آئے گی۔ تو جواب یہ ہے کہ قوت کا مدار ہے ہضم پر اور ہضم جب ہوتا ہے کہ پیٹ کے برابر یا کچھ کم کھایا جائے اور پیٹ بھرنے کے بعد جو کچھ کھایا جائے وہ ہضم نہیں ہوتا۔ لہذا اس شبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ وہ مضمون تھا جو خواص کے متعلق تھا۔

روزہ کی حکمت

ایک بات مفید اور یاد آئی۔ وہ یہ ہے کہ میں نے دعویٰ کیا تھا کہ مجاہدہ ترک عادت کو کہتے ہیں

الحمد للہ اس کی دلیل بھی حدیث سے سمجھ میں آئی۔

ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ اس نے روزہ کے متعلق مختلف سوالات کئے۔ منجملہ ان کے یہ سوال بھی کیا۔

کیف من صام الدهر قال لا صام ولا افطر^۱

یعنی یا رسول اللہ وہ شخص کیسا ہے جو ہمیشہ روزہ رکھے فرمایا کہ اس نے نہ روزہ رکھا اور نہ افطار کیا۔
یعنی اس کا روزہ رکھنا اور نہ رکھنا برابر ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو روزہ رکھنے نہ رکھنے کو برابر فرمایا تو اس کی کیا وجہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ حکمت روزہ کی نہ رہی۔ اس لئے کہ حکمت تو تھی ترک عادت اور اب اس کو یہی عادت ہوگئی اور اگر کم کھانا ہی حکمت ہوتی تو ایسا نہ فرماتے اور صوم داؤد علیہ السلام کی فضیلت بھی اس حکمت کی بناء پر ہے۔ اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ میری تحقیق تصوف پر منطبق ہے یعنی مجاہدہ کہ جس کو صوفیا مطلوب کہتے ہیں وہ کم کھانے میں منحصر نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک غلطی عوام کی ہے کہ روزہ میں بھی معاصی سے اجتناب نہیں کرتے اور ایک غلطی خواص کی ہے کہ مباحات کے اندر تنگی کرتے ہیں۔ بحمد اللہ دونوں کے متعلق کافی بیان ہو گیا ہے اور مجموعہ حدیث شریف کے اول جزو

من صام رمضان ايماناً واحتساباً غفر له ماتقدم من ذنبه^۲

جس شخص نے رمضان کے روزے ایمان اور ثواب سمجھ کر رکھے تو اس کے اگلے پچھلے گناہ سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔

کا بیان ہوا۔ اب دوسرے جزو کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ دوسرے وقت ہوگا۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو معاصی سے بچنے کی توفیق عطا فرما دیں۔ اور روزہ کی برکات نصیب کریں۔

واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد

والہ واصحابہ اجمعین . آمین

^۱ الصصحیح لمسلم کتاب الصیام باب: ۳۶ ، رقم: ۱۹۶، ۱۹۷، سنن أبی داؤد: ۲۴۲۵ ، سنن

الترمذی: ۷۶۷، سنن النسائی: ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۹، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۰۳۳

^۲ الصصحیح للبخاری: ۱۹: ۳۰، ۳۳، الصصحیح لمسلم صلوٰۃ المسافرین: ۷۵، سنن أبی داؤد باب: ۲۹

الفطر

احکام فطرہ کے متعلق یہ وعظ ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۳۱ھ کو
جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر فرمایا جو ۳ گھنٹہ میں ختم ہوا
حاضری قریباً ایک ہزار کی تھی۔ سید احمد حسن سنبھلی صاحب نے
قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِیْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْهِ
وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا
مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ یُّضِلِلْهُ فَلَا هَادِیَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ
لَا شَرِیْكَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ صَلَّی
اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهِ وَاَصْحَابِهِ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ
بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

انما یوفی الصبرون اجرهم بغیر حساب. (الزمر: ۱۰)

ترجمہ: مستقل مزاج والوں کو اس کا اجر بے شمار ہی ملے گا

تمہید: یہ ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے اور اس میں کسی خاص موقع کے یا کسی خاص عبادت کے متعلق مضمون نہیں ہے۔ ایک عام مضمون ہے اور اس وقت کا مقتضایہ تھا کہ کوئی ایسا مضمون بیان کیا جاتا جس کو صیام و فطر سے مناسبت ہوتی۔ زیادہ مناسبت فطر سے ہوتی کیونکہ احکام صیام و قیام کے مختلف موقعوں پر بیان ہو چکے ہیں۔ اس وقت موقع احکام فطر کے بیان کرنے کا تھا۔ سو یہ مناسب تھا کہ اسی کی خصوصیت کے موافق کوئی آیت یا حدیث ہوتی جس میں اس کے احکام مذکور ہوتے اور یہ آیت جو پڑھی ہے۔ اس کو کوئی خاص خصوصیت اس مقام سے نہیں ہے لیکن تاہم اپنے عموم کے اعتبار سے ظاہراً کچھ زیادہ مناسبت صیام سے معلوم ہوتی ہے مگر چونکہ حدیثوں میں عید کے متعلق ایسا مضمون آیا ہے کہ حق تعالیٰ روزہ داروں کی نسبت ملائکہ سے فرماتے ہیں۔

ما جزاء اجیر وفی عملہ اجیر کی اس کے کام میں کیا جزا ہے

اور وہ کہتے ہیں جزائہ ان یوفی اجرہ۔ اس کی جزا یہی ہے کہ اس کا اجر پورا دیا جائے۔

اسی طرح یہ مضمون آیا ہے کہ رمضان کی آخری شب میں امت کی مغفرت ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ یوفی اجرہ اذا قضی عملہ جب وہ اپنا کام پورا کرے تو اس کو اس کا پورا اجر دیا جائے گا۔

فرمائی ہے اور اس آیت میں بھی صابرین شامل للصائمین (جو روزہ داروں کے شامل ہیں) کے توفیقہ اجر (اجرت پوری دینے) کا ذکر ہے۔ اس اعتبار سے اس کی خصوصیت مضمون فطر سے بھی ثابت ہوگئی۔ چنانچہ اول اس کا ترجمہ سن لیتا چاہیے اس کے بعد ان حدیثوں کو سن لیا جائے۔

صبر کے مواقع

پس حق تعالیٰ فرماتے ہیں: انما یوفی الصابرون اجرہم بغير حساب (مستقل مزاج والوں کو اس کا اجر بے حساب ہی ملے گا) یعنی اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہے۔ یعنی یہ امر ضرور متحقق ہے کہ صبر کرنے والوں کو ان کا اجر پورا دیا جائے گا۔ صبر کے معنی ہیں روکنے کے، کبھی کسی چیز سے روکنا ہوتا ہے اور کبھی کسی چیز میں نفس کو روکنا اور کبھی کسی چیز پر روکنا ہوتا ہے مثلاً معاصی سے نفس کو روکنا اس صورت میں اس کا صلہ عن آتا ہے اور مثلاً شدت و فقر میں روکنا یہ مصائب پر ہوتا ہے اور اس صورت میں صبر کا صلہ فی آتا ہے جیسے والصبرین فی السراء والضراء (اور صبر کرنے والے خوش حالی اور سختی میں) جب اس کا صلہ علی ہو تو مراد یہ ہوگی کہ کسی فعل پر ثابت و قائم رہے اور اس کا تحقق عبادات کے موقع پر ہوتا ہے یعنی عبادت پر۔ سو صبر کے تین موقعے ہوئے۔

۱۔ معاصی سے صبر کرنا ۲۔ مصائب میں صبر کرنا ۳۔ عبادات پر صبر کرنا

آیت میں عام صبر کی فضیلت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ صبر کرنے والے ہیں ان کو ان کا اجر پورا دیا جائے گا اور بغیر حساب اس لئے بڑھایا کہ پورا دینے سے صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ اجر میں کمی نہ ہوگی۔ رہی یہ بات کہ زیادہ ملے گا یا نہیں اس میں دونوں احتمال تھے۔ پس بغیر حساب بڑھانے سے اس احتمال کو متعین فرما دیا یعنی پورے اجر سے بھی زیادہ عطا فرمایا جائے گا مطلب یہ کہ کمی تو کیا ہوتی اور زیادہ مرحمت ہوگی۔

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد ☆ آنچہ دروہمت نیاید آں دہد
نیم جاں یعنی جان فانی لیتے ہیں اور سینکڑوں جان یعنی جان باقی عطا کرتے ہیں۔ وہ عنایت کرتے ہیں جو تمہارے وہم میں بھی نہیں آسکتا۔

صد سے مراد ہے تکثیر نہ کہ تعیین عدد مخصوص کی۔ چنانچہ آگے خود کہا ہے۔
خود کہ یابد ایس چنیں بازارا ☆ کہ بیک گل مے خری گلزار را
ایسا بازار کہاں نصیب ہوگا کہ ہر ایک پھول کے بدلے سارا چمن خرید لو۔
ظاہر ہے کہ گل سے گلزار ہزار حصے بڑھا ہوا ہے اور وہ زیادتی اس قدر ہوگی کہ جس کا حساب نہ ہوگا۔

قانون اجر

دین میں اجر کا قانون یہ ہے کہ کمی جائز نہیں رکھی گئی اور زیادتی جس قدر بھی ہو جائے اس کی روک نہیں اور عمل کا قانون یہ ہے کہ جس طرح اس میں کمی جائز نہیں۔ حدود کی۔ اسی طرح لحاظ واجب قرار دیا گیا۔ حتیٰ کہ فرض نماز ہے جو تمام عبادات میں افضل ہے اور قرب جس قدر فرائض ادا کرنے سے ہوتا ہے کسی عبادت سے اس قدر نہیں میسر ہوتا۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں میرا بندہ مجھ سے فرائض کے واسطے سے جو قرب حاصل کرتا ہے ویسا قرب اور کسی عبادت سے اس کو نہیں حاصل ہوتا۔ مگر اس میں زیادت جائز نہیں۔ مثلاً ظہر کے فرض چار ہیں کوئی شخص پانچ یا چھ پڑھنا چاہے تو اس کو اجازت نہیں بلکہ ایسا کرنا حرام ہے۔ پس کام تو اتنا ہی کرو جتنا بتلایا ہے اور زیادہ مت کرو اور اجر کی انتہا نہیں۔ سبحان اللہ کیا شان کریمی ہے کہ محنت کی زیادتی کو منع کر دیا اور اجر کی زیادت کا وعدہ فرمایا البتہ نوافل میں تکثیر کی اجازت ہے۔ مثلاً شب و روز نوافل پڑھنا چاہے تو اجازت ہے مگر طلوع و غروب و استوار کے وقت اور بعد الفجر الی طلوع الشمس (فجر کے بعد سورج نکلنے تک) اور بعد العصر (عصر کے بعد) ممانعت ہے ان اوقات میں پڑھنا گناہ ہے۔ سو اس میں بھی علی الاطلاق کثرت کی اجازت نہیں۔ کیا عنایت و رحمت ہے کہ اجر کا تو حساب نہیں اور طاعت حساب ہی ہے ہو گو کتنی ہی بڑی طاعت ہو حتیٰ کہ بعض جگہ یہ سخت حکم لگایا ہے کہ اگر کوئی زیادہ کرے گا تو طاعت نہ ہوگی بلکہ معصیت ہوگی۔

روزہ اتنی بڑی عبادت ہے کہ روزہ دار کے منہ کی بد بو حق تعالیٰ کو مشک کی خوشبو سے زیادہ محبوب ہے۔ مگر ۳ رمضان کے بعد یا اگر ۲۹ رمضان کو چاند نظر آجائے تو ۲۹ کے بعد وہی روزہ جو سب میں زیادہ پسندیدہ تھا۔ مبغوض ہو جاتا ہے یعنی عید کے روز روزہ رکھنا مکروہ تحریمی اور مبغوض الی اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی راز کو اہل اللہ نے سمجھا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

بزد و ورع کوش صدق و صفا ☆ لیکن میفرائے بر مصطفیٰ

زہد و پرہیزگاری اور صدق و صفا میں کوشش کرو مگر نہ اتنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ جائے۔
شمارع پر زیادتی کرنا گویا شریعت میں اصلاح دینا ہے اور اس کو ناقض سمجھنا ہے اور ظاہر ہے
کہ قانون شاہی کا مقابلہ کرنا بغاوت ہے۔ شریعت کے آگے مت بڑھو۔ جہاں اور اسرار ہیں
بدعت کے حرام ہونے میں وہاں ایک یہ بھی حکمت ہے کہ حق تعالیٰ بندوں کے ساتھ سہولت چاہتے
ہیں اور بندہ اپنی ذات پر سختی کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

یُرید اللہ بکم اليسر ولا یُرید بکم العسر . اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں۔
حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رسی کا ایک سراستون سے بندھا
ہوا دیکھا۔ فرمایا یہ کس نے باندھا ہے۔ عرض کیا گیا ہذا لہذہ لذینب، یہ نہ نب نے باندھا ہے۔ عبادت
کرتی رہتی ہیں۔ اور اونگھ آتی ہے تو لپٹتی نہیں ذرا اس سے سہارا لے لیتی ہیں اور رات بھر عبادت
کرتی ہیں فرمایا اس کو توڑ ڈالو۔ جب تک طبیعت تازہ ہے نماز پڑھے: لیصل احدکم
نشاطہ۔ (جب تک تم کو نشاط رہے اس وقت تک نماز پڑھتے رہو) جتنا بتلادیا اتنا کرو اور جب
نیند غالب ہو سو رہو۔ ان اللہ یحب ان یوتی رخصہ کما یحب ان یوتی عزائمہ^۱
یعنی اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے اس بات کو کہ اس کی رخصتیں ادا کی جائیں جیسے کہ اس بات کو
محبوب رکھتا ہے کہ اس کی عزیمتیں بجالائی جائیں۔

خدا تعالیٰ اس کو بھی پسند کرتا ہے کہ یہ بندہ ہے اور محتاج و ضعیف ہے اور اس کی سہولت سے
خوش ہوتے ہیں کیونکہ وہ رحیم ہیں حتیٰ کہ بعض اقسام رخصت میں یعنی رخصت اسقاط میں عزیمت
پر عمل بھی ناجائز ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص پوری نماز سفر میں پڑھے گا تو عاصی ہوگا۔

اس کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ
قرآن مجید میں ہے ان خفتم یعنی اگر تم کو دشمن سے اذیت کا خوف ہو تو قصر کرو۔ سواب
تو خوف نہیں رہا۔ پس اب اس قید کے اعتبار سے سفر میں قصر نہ ہونا چاہیے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ
انعام تھا اور خاص تھا اب عام ہو گیا۔ فاقبلوا صدقۃ (اللہ تعالیٰ کے انعام کو قبول کرو)
چنانچہ اگر حاکم انعام دے اور کوئی نہ لے تو مورد عتاب ہوتا ہے۔

چوں طمع خواہد ز من سلطان دیں ☆ خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

۱۔ سنن ابی داؤد، التطوع باب: ۱۹، سنن ابن ماجہ: ۱۳۷۱، سنن النسائی قیام اللیل ب: ۱۴
۲۔ مسند احمد: ۲/۱۰۸، حلیۃ الأولیاء، ۲/۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، کنز العمال: ۵۳۳۳، ۵۳۳۵

جب شاہ دین ہم سے طمع کے خواہشمند ہوں اس کے بعد ہم کو قناعت کو ترک کرنا چاہیے۔

دعا کی اہمیت و افادیت

یہی لطف و عنایت مہنی ہے اس کا کہ حضرت باری عز اسمہ دعا کو محبوب فرماتے ہیں اور دعا نہ کرنے سے ناخوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے: **من لم يسأل الله يغضب عليه**۔ (جو شخص اللہ تعالیٰ سے نہیں مانگتا اس پر ناراض ہوتے ہیں) عجیب بات ہے کہ بندہ ناراض ہوتا ہے مانگنے سے اور حق تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں نہ مانگنے سے اور مانگنے سے خوش ہوتے ہیں اور دیکھئے عام عادت ہے کہ دروازہ پر سائل آتا ہے اور جنگ کرتا ہے اور الحاح و الحاف (مبالغہ) سے مانگتا ہے تو ہر شخص ناراض ہوتا ہے اور اسی واسطے شریعت نے بھی فی مابین العباد (بندوں کے درمیان) لحاظ کیا ہے ان طبائع کا کہ مانگنے کو پسند نہیں فرمایا اور ان لوگوں کی مدح کی ہے جو الحاف سے نہیں مانگتے چنانچہ قرآن مجید میں ہے: **لا يسئلون الناس الحافا** (وہ لوگوں سے مانگنے میں الحاح اور مبالغہ نہیں کرتے) اور اس امر طبعی کا اس درجہ لحاظ فرمایا کہ اس کو شرعی بتا دیا۔ مگر حق تعالیٰ الحاح سے خوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان اللہ محب احسین فی الدعاء حدیث میں وارد ہے یعنی اللہ تعالیٰ محبوب رکھتے ہیں ان لوگوں کو جو دعا میں الحاح کرتے ہیں کیونکہ اس میں احتیاج اور انکسار بندہ کو ظاہر ہوتا ہے اور اسی احتیاج کی وجہ سے حدیث میں دعا کو مخ العبادۃ فرمایا ہے۔ یعنی عبادت کا مغز دعا ہے۔ اسی تذلل و افتقار کی وجہ سے نماز جو بڑی محبوب ہے حق تعالیٰ کو تو اسی لئے کہ اس میں تذلل زیادہ ظاہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزمرہ پانچ بار فرض کی گئی ہے۔ تاکہ ہر وقت موقع ملے اظہار افتقار کا جو کہ حق تعالیٰ کو محبوب ہے۔ پس بندگان نفس تو تکرار صلوة سے سمجھتے ہیں کہ ہم پر مشقت ڈالی گئی مگر ان کو یہ خبر نہیں کہ حق تعالیٰ غایت محبت سے تمہاری ان حرکات کو محبوب رکھتے ہیں۔ اس لئے اس کو بار بار دیکھنا چاہئے ہیں۔ جیسے بچہ کو ماں ٹہلاتی ہے اگرچہ کسی قدر تھک بھی جائے۔ صرف اسی لئے کہ چلتا ہوا اچھا معلوم ہوتا ہے البتہ جب دیکھتی ہے کہ زیادہ چلنا مضر ہوگا تو روک لیتی ہے۔

شیطان کا مکر

ایک لطیفہ ہے جس سے ایک عمدہ نتیجہ نکلتا ہے کوئی عورت تھی جس کو لوگوں نے ایک دفعہ دیکھا کہ رستہ چلتے ہوئے اپنے بچہ کی انگلی پکڑے ہوئے ہے اور سوکن کے بچہ کو کندھے پر چڑھائے

ہوئے ہے۔ عورتوں کو تعجب ہوا اور انہوں نے کہا کہ بی تمہاری خوبی کی بات ہے کہ موت کے بچہ سے اس قدر محبت کرتی ہو۔ وہ بیچاری تھی سچی۔ کہا کہ وجہ اس کی یہ ہے کہ مجھ کو موت کا بچہ چلتا پھرتا برا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے اس کو اپنا بیچ کر دیا۔ ایک نتیجہ معترضہ تو یہ ہے کہ دشمن چاہے کیسی ہی دوستی ظاہر کرے وہ دشمنی ہی ہوتی ہے۔

ایک شخص تھے جو شیطان پر ایک ہزار روزمرہ لعنت کیا کرتے تھے۔

اللهم العن ابليس. یعنی اے اللہ اپنی رحمت سے دور فرما دے شیطان کو۔

ایسے لوگوں کی صحبت رہی ہوگی جن کا یہ مذہب ہوگا کہ لعنت عبادت ہے۔ اتفاق سے برسات میں لیٹے تھے کہ شیطان آیا اور کہا جلدی ہٹو دیوار گرتی ہے۔ چنانچہ وہ ہٹ گئے اور دیوار گر پڑی۔ کہنے لگے آپ تو میرے محسن ہیں۔ آپ کون ہیں؟ یہ بیچارے واقف نہ تھے کہ دشمن ہے اور اس احسان میں بھی اس کے کچھ دام ہیں۔ اس نے کہا کہ میں وہی ابلیس ہوں جس پر ایک ہزار بار یومیہ لعنت کیا کرتے ہیں کہنے لگے کہ تعجب ہے کہ تم نے میرے ساتھ ایسا احسان کیسے کیا۔ اس نے کہا یہ احسان نہیں ہے حقیقت میں بدخواہی ہے۔ اس لئے کہ حدیث میں ہے۔ من مات تحت الہدم فہو شہید (جو شخص کسی چیز کے گرنے سے اس کے نیچے دب کر مر جائے وہ شہید ہے)

سو میں نے تم کو شہادت سے محروم رکھنا چاہا۔

اسی طرح ایک حکایت مولانا نے مثنوی میں لکھی ہے کہ ایک بار حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تہجد کے لئے شیطان نے جگایا۔ پہچان کر پوچھا کہ تجھ کو کیا مناسبت کہنے لگا۔ آخر کبھی تو میں بھی اسی وضع کا تھا۔ پرانی حالت کا جوش آجاتا ہے۔ بقول شخصے (مومن خان مومن) کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

انہوں نے فرمایا کہ میں ایسے دھوکوں میں نہ آؤں گا۔ اس وقت کہا کہ میں کل تہجد کے وقت آپ کو سلا کر بہت چھٹایا کیونکہ آپ نے صبح کو بہت گریہ وزاری کی جس سے آپ کا مرتبہ اور بڑھ گیا۔ میں نے دل میں کہا کہ آج جگا دو تا کہ اور مرتبہ نہ بڑھ جائے۔ مولانا نے ٹھیک کہا ہے۔

دشمن ارچہ دوستانہ گویدت دام داں گرچہ زوانہ گویدت

یعنی دشمن اگرچہ تم سے دوستانہ طور پر کوئی بات کہے تو اس کو جال ہی سمجھو اگرچہ دانہ کی بات کرے یعنی اس کو مکر و حیلہ ہی سمجھو۔

زانکہ صیاد اور بانگ صغیر ☆ تاکہ گیر دمرغ را آں مرغ گیر
 اس سبب سے شکاری پرندہ کی بولی بولتا ہے تاکہ وہ پرندے پکڑنے والا پرندے کو پکڑے۔
 اسی واسطے اہل اللہ نے فرمایا ہے کہ شیطان کے مکر و حیلہ سے نہایت اہتمام کے ساتھ بچنا
 چاہیے۔ اس لئے کہ اس کا مکر نہایت سخت ہے۔ کبھی تو ابتداء ہی سے گناہ کا راستہ بتاتا ہے جس کی
 مدافعت اکثر اشخاص کو سہل ہے اور کبھی نیکی کے پیرایہ میں گناہ کراتا ہے جس کا مقابلہ اور فہم نہایت
 دشوار ہے اور جیسا شیطان مکار ہے نفس بھی ایسا ہی مکار ہے اس کے فریب سے بھی عذر رکھنا چاہیے۔
 ایک نتیجہ اس حکایت سے یہ بھی نکلا اس کو اپنے بچہ کی حرکات محبوب تھیں۔ ان کے دیکھنے
 کے لئے اس کو پیادہ چلایا لیکن اس کے تحمل سے زیادہ کبھی اس کو نہ چلنے دیتی۔

بغیر حساب

اسی طرح حق تعالیٰ ہم سے عبادات کا کام لیتے ہیں وہ ان حرکات کو پسند کرتے ہیں لیکن تحمل
 سے زیادہ خود نہیں کرنے دیتے۔ کتنی بڑی رحمت ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ربنا
 ولا تحملنا مالا طاقة لنا به (اے ہمارے پروردگار ہم پر ایسے مصائب اور واقعات نہ ڈالے
 جس کی ہم کو برداشت نہیں ہے)

اس تعلیم کے ضمن میں بتلایا ہے کہ ہم طاقت سے زیادہ کام نہیں لیا کرتے ہیں۔ یہ
 معاملات ہیں خدا تعالیٰ کے۔ کوئی شخص واقعات دیکھے پھر کتاب اللہ میں غور کرے تو ہر جگہ رحمت
 ہی رحمت نظر آئے گی۔ غرض وہ ہمارے تحمل سے زیادہ ہم کو کام کی اجازت نہیں دیتے۔ چنانچہ اگر
 مجاہدہ کی حرص میں کوئی دو پہر کو نماز پڑھے تو مواخذہ ہوگا۔ غرض خدا تعالیٰ کی عجیب رحمت ہے عمل
 میں تو حد سے زیادہ ممنوع اور اجر میں زیادت موجود۔ اسی لئے بغیر حساب بڑھا دیا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس قدر اجر ملے گا جو ہمارے حساب سے باہر ہے اس لئے کہ فرماتے ہیں۔
 وکل شیء احصینہ فی امام مبین۔ یعنی ہم نے ہر چیز کو ایک واضح کتاب میں ضبط کر دیا ہے۔
 ان کے احاطہ علمی سے کوئی شے خارج نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم نہیں شمار کر سکتے۔ جیسا کہ
 دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

ان تعدوا نعمة الله لا تحصوها۔ یعنی اگر تم نعمت خداوندی کو شمار کرنا چاہو تو نہ شمار کر سکو گے۔
 پس جس طرح یہ عدم احصاء (نہ احاطہ کرنا نہ شمار کرنا) بندہ کے اعتبار سے ہے۔ چنانچہ

لا تھوھا نہیں احاطہ کر سکتے تم ان کا) میں عدم احصاء کی اسناد مخاطب کی طرف اس کی واضح دلیل ہے۔ اسی طرح اس آیت میں بغیر حساب کے یہ معنی ہیں کہ تم حساب نہیں کر سکتے۔ ورنہ وہ اللہ تعالیٰ کے اندازہ سے باہر نہیں ہے۔ وہ تو خوب بالتفصیل جانتے ہیں۔

حاصل یہ کہ عمل محدود ہے اور متناہی ہے اور اجر غیر محدود اور غیر متناہی بمعنی لا تقف عند حد (کسی حد پر موقوف نہیں ہے)۔ یہ تو اس آیت کے متعلق بیان تھا اب وہ حد شیخ سن لی جائیں جن کی نسبت میں نے وعدہ کیا تھا کہ اول اس آیت کا ترجمہ سن لینا چاہیے پھر حدیثوں کا مضمون بیان کیا جائے گا۔

نعمت فقر

سو وہ حدیثیں دو ہیں جن کا مضمون مختصر عرض کرتا ہوں۔ امام احمدؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب اخیر شب ہوتی ہے رمضان کی تو اللہ پاک میری امت کی مغفرت فرماتے ہیں۔ عرض کیا صحابہؓ نے کیا وہ لیلۃ القدر ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں لیکن العامل انما یوفی اجرہ اذا قضیٰ اعملہ یعنی جب کام کرنے والا کام پورا کر دیتا ہے تو اس کو پوری مزدوری مل جاتی ہے۔

مگر یہ سمجھ لو کہ پورا ہونا کسے کہتے ہیں۔ ٹھیکے داروں سے پوچھ لو جب کہتے ہیں کہ پل پورا ہو گیا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جانچ میں پورا ہو گیا۔ چنانچہ جب جانچ میں وہ تعمیر پوری نہیں ہوتی تو حکم دیا جاتا ہے کہ اس کو از سر نو بناؤ پیمائش میں پورا ہونا معتبر نہیں جب تک منظوری کے نمونہ کے موافق نہ ہو جائے۔ ذرا متنبہ ہونا چاہیے۔

مگر یہاں اور وہاں کے معاملہ میں اتنا فرق ہے کہ یہاں تو اگر حکم ہوا تھا میں فرلانگ سڑک بنانے کا اور اس کو انتیس تک ہوش نہیں اور تیسویں میں ہوش آیا تو تمہارے تمیں کے تمیں برباد گئے۔ یہ تو یہاں کے قانون میں ہے اور قانون خدائی یہ ہے کہ اگر تیسویں روزہ میں بھی ہوش آجائے اور اس کو باقاعدہ ادا کیا جائے اور ماضی (گزرے ہوؤں) سے معذرت کر لی جائے تو تیسویں ٹھکانے لگ جاتے ہیں اور مقبول ہو جاتے ہیں۔ مگر کون قدر کرے۔ چونکہ آسانی اور سہولت سے یہ نعمت میسر ہوتی ہے، یہی سبب ہو گیا بے قدری کا۔

ہر کہ اور زان خردار زان دہد ☆ گوہرے طفلی بہ قرص ناں دہد

جو شخص کسی چیز کو ارزاں لیتا ہے وہ ارزاں دے بھی دیتا ہے اس کی قدر نہیں کرتا۔ چنانچہ بچہ نادان قیمتی موتی کو ایک قرص نان کے عوض میں دے دیتا ہے۔

اے گرانجاں خوار و بد مستی مرا ☆ ز اں کہ بس ارزاں خریدتی مرا
اے کابل تو نے مجھ کو بے قدر سمجھ رکھا ہے وجہ یہ ہے کہ میں تجھ کو مفت مل گیا ہوں۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے کسی نے فقر کی شکایت کی۔ فرمایا کہ اس کی قدر مجھ سے پوچھو۔ اس کے لئے میں نے سلطنت چھوڑ کر فقر اختیار کیا ہے۔ اس کی قیمت میں جانتا ہوں۔ چنانچہ ایک بار آپ نے جنگل میں کنوئیں میں وضو کے لئے پانی نکالنے کو ڈول ڈالا پہلی بار چاندی ڈول بھر کر نکلی۔ آپ نے اس کو پھینک دیا۔ پھر دوبارہ ڈول ڈالا تو سونا بھر کر ڈول نکلا۔ پھر آپ نے اس کو الٹ دیا۔ پھر تیسری بار اسی طرح جواہرات نکلے۔ آپ نے حضرت باری میں عرض کیا اے جناب باری! آپ میرا امتحان کرتے ہیں، یہ چیزیں تو میرے پاس بہت تھیں۔ اے اللہ اب میں کیا ان کی رغبت کروں گا۔ مجھے وضو کے لئے پانی عنایت فرما دیجئے۔ چنانچہ پھر ڈول ڈالا تو اس میں پانی آ گیا۔

اگر فقر ایسی چیز نہ ہوتی تو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اس کو کیوں پسند اور اختیار فرماتے۔ جب حق تعالیٰ نے بلسان جبریل آپؐ سے دریافت فرمایا کہ اگر آپؐ چاہیں تو احد پہاڑ آپؐ کے لئے سونا کر دیا جائے۔ فرمایا کہ میں یہ نہیں چاہتا میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اجوع یوماً واشبع یوماً: یعنی کسی دن بھوکا رہوں اور کسی دن شکم سیر ہوں۔

نعمت میں تو نعمت پر نظر ہے اور صبر میں منعم پر۔ جو اس راز کو سمجھ گیا وہ فقدان کو وجدان پر ترجیح دے گا اور ایسا ہی شخص توقف عدم قبول دعا سے بھی تنگ نہ ہوگا۔ بلکہ خوش ہوگا۔ اور علامت محبوبیت کی سمجھے گا۔ جیسے کوئی حسین شخص مانگنے جائے اور گھر والا اس پر عاشق ہو تو وہ ٹالتا ہے کیونکہ اس کو شدت سے تعلق ہے لہذا چاہتا ہے کہ یہ میرے پیش نظر رہے اور مجھ سے بات چیت کرتا رہے اور اس وجہ سے وہ اس کو شے مطلوب کے دینے میں تامل کرتا ہے۔ ایک طبیب امر حسین کی حکایت ہے کہ کوئی عاشق مزاج پاگل خبطی اس پر عاشق تھا۔ اتفاق سے یہ بیمار ہوا اور علاج کے لئے وہی طبیب بلایا گیا۔ پس وہ مریض دعا کرتا تھا کہ میں اچھا نہ ہوں۔ اگر اچھا ہو گیا تو پھر حکیم صاحب کا ہاتھ میرے ہاتھ کو کیوں محیط ہوگا۔ جو لذت میں عاشق کے محیط اور محبوب کے محاط ہونے سے بڑھ کر ہے۔ چنانچہ معشوق کو بغل میں لینے اور معشوق اگر اس کو اپنی اپنی بغل میں لے لے ان

دونوں میں جو فرق ہے اس کو عشاق جانتے ہیں۔

یہاں سے اندازہ کرنا چاہیے اس نعمت کا

الا انہ بكل شئء محیط۔ یاد رکھو وہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو احاطہ میں لئے ہوئے ہیں۔

اور پھر یہ کیوں آئیں گے۔ بہر حال فقر کی طرح اور جتنی نعمتیں مفت مل گئیں ان کی قدر

نہیں۔ انہی نعمتوں میں سے یہ نعمت بھی ہے جس کا میں بیان کر رہا تھا کہ حق تعالیٰ کا عجیب قانون ہے کہ اگر تیسویں روزہ میں بھی تدارک کر لے تو پچھلے انیس بھی مقبول ہو جاتے ہیں۔

بہر حال جس پورا ہونے پر وعدہ ہے وہ وہ ہے جو نمونہ کے موافق ہو۔ اور اگر نہ ہو تو توبہ

کر کے موافق کر لیا جائے۔ اس وقت وعدہ ہے مغفرت (یونی اجرہ) (اس کی اجرت پوری دی جائے گی) ایک حدیث تو یہ تھی۔

نیک صحبت کا اثر

دوسری حدیث وہ ہے جس کو بیہقی نے حضرات انسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذا كان يوم عيد هم یعنی یوم فطرهم باہمی ملائکتہ فقال

یا ملائکتی ماجزاء جیرو فی عملہ قالو ربنا جزاءہ ان یوفی اجرہ۔ جب ہوتا ہے ان

کی عید کا دن یعنی عید الفطر کا۔ تو ان کے سبب سے اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فخر کرتے ہیں۔ پس

فرماتے ہیں اے میرے فرشتو! کیا ہے بدلا اس اجر کا جس نے اپنا پورا عمل کر لیا ہو۔ فرشتے کہتے

ہیں اس شخص کا بدلہ یہ ہے کہ اس کی اجرت پوری دی جائے اس کے بعد فرماتے ہیں۔

ارجعوا قد غفرت لکم وبدلت سیناتکم حسنات

اپنے گھروں کو جاؤ۔ میں نے تم سب کی مغفرت کر دی۔ تمہارے سینات کو حسنات سے بدل دیا۔

اور حق تعالیٰ کو اجر دینا تو ہے مگر فرشتوں کو اس لئے بار بار جلاتے ہیں کہ انہوں نے آپ کی

نسبت ظاہر اعتراض کیا تھا کہ اتجعل فیہا من یفسد فیہا ویسفک الدماء ونحن

نسبح بحمدک ونقدس لک کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو اس میں

فساد کریں گے اور خونریزیاں کریں گے اور ہم برابر تسبیح کرتے رہتے ہیں آپ کی حمد کے ساتھ

اور تقدیس کرتے رہتے ہیں۔

اور یہ کلام بلا تشبیہ ایسا ہے جیسے کلکٹر کہے کہ ہم ایک عملہ فلاں کام انجام دینے کے لئے تجویز کریں گے اور اس پر پرانا عملہ کہے کہ حضور دوسری جماعت کی کیا حاجت ہے ہم تو خدمت میں حاضر ہی ہیں جو کچھ کام ہو ہم ہی سے لیجئے۔ تو یہ نہ فخر ہے نہ اعتراض بلکہ وفاداری ہے۔ لیکن صورتہ اعتراض تھا۔ حق تعالیٰ اس کے جواب دینے کے لئے قیامت تک ملائکہ جمع کر کے انسان کے اعمال محمودہ ان کو جتلاتے رہیں گے تاکہ ان کے خیال کی تغلیط اور انسان کے فضائل کی تازگی ان کے سامنے ہوتی رہے۔

چنانچہ ایک اور حدیث میں ہے جہاں ذکر الہی یا وعظ وغیرہ ہوتا ہے تو ملائکہ ٹھٹھ کے ٹھٹھ وہاں جمع ہو کر ذکر سنتے ہیں اور متلذذ ہوتے ہیں جب واپس جاتے ہیں حق تعالیٰ دریافت فرماتے ہیں میرے بندے کیا کر رہے تھے۔ اگرچہ وہ سب کچھ جانتے ہیں مگر حبیب کا ذکر تو اچھا معلوم ہوتا ہی ہے۔ دوسرے ملائکہ ہی کی زبان سے ان کے فضائل کا بیان کرانا، جس میں راز

انی اعلم ما لاتعلمون۔ میں اس بات کو جانتا ہوں جس کو تم نہیں جانتے

کا ظاہر ہوتا ہے زیادہ مناسب ہے۔ پھر فرشتے عرض کرتے ہیں کہ آپ کا ذکر کر رہے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے اور کیا کرتے ہیں۔ عرض کرتے ہیں کہ جنت ملنے اور دوزخ سے بچنے کے لئے دعا کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ کیا انہوں نے مجھے یا جنت و دوزخ کو دیکھا ہے؟ عرض کرتے ہیں نہیں اگر دیکھے تو اور بھی زیادہ رجاء و خوف کا غلبہ ہوتا۔ ارشاد ہوتا ہے کہ میں نے سب کو بخش دیا۔ ملائکہ عرض کرتے ہیں کہ حضور فلاں شخص اس مجلس میں بغرض سماع ذکر نہیں آیا تھا بلکہ کسی اور کام کے لئے آیا تھا وہاں بھی بیٹھ گیا۔

اس سے یہ غرض نہیں کہ اس کو کیوں بخشا جاتا ہے وہ اس کا اہل نہیں اس لئے اس کی مغفرت نہ ہونی چاہیے بلکہ وہ ملائکہ گویا پولیس میں سے خفیہ پولیس ہیں کہ ان کا کار منصبی یہی ہے کہ واقعات کو کا حقہ نقل کریں۔ پس جب وہ مامور اسی پر ہیں اور اس میں مرضی باری ہے تو یہ صورت اعتراض اور اس بندہ کی بدخواہی کی نہ رہی۔ ارشاد ہوتا ہے: غفرت له هو القوم لایسقی جلیسہم یعنی میں نے اس کو بخش دیا اس لئے کہ جن لوگوں میں وہ بیٹھا تھا وہ ایسے ہیں جن کے پاس بیٹھنے والا بھی محروم نہیں رہتا۔

بزرگوں کی ہم نشینی بھی بڑی دولت ہے۔

حضرت سیدنا و مولانا قطب الاقطاب غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے عرض کیا کہ

حضرت فلاں مردہ کے لئے دعائے مغفرت فرما دیجئے۔ فرمایا کہ وہ شخص میرا مرید تھا یا میرے وعظ میں کبھی بیٹھا تھا یا مجھ سے ملاقات تھی یا کبھی سے دور سے دیکھا تھا یا مجھ کو جانتا تھا۔ عرض کیا گیا کہ ان باتوں میں سے کوئی بھی بات نہ تھی۔ فرمایا کہ پھر اللہ تعالیٰ سے کسی طریقہ سے مغفرت طلب کروں یعنی خصوصیت کے کس طرح اس کی مغفرت کی دعا کروں پھر خود ہی فرمایا کہ خصوصیت کی تو کوئی وجہ نہیں ہے ہاں اس طرح دعا کرتا ہوں:

ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذين آمنوا

(اے ہمارے پروردگار بخش دیجئے ہم کو اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ایمان لائے ہیں) کہ یہ الفاظ عام ہیں۔ ان میں سب کے لئے دعا ہے خواہ وہ مخصوص حضرات ہوں یا اجنبی۔

بزرگوں کی صحبت بڑی دولت ہے ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا گو نشیند در حضور اولیاء جو شخص خدائے تعالیٰ کی ہم نشینی کا خواہاں ہو تو اس کو چاہیے کہ اولیائے کرام کے پاس بیٹھا کرے۔ حدیث انا جلیس من ذکرنی (جو مجھ کو یاد کرتا ہے میں اس کا جلیس ہوں) اس کی موید ہے اس طرح کہ اولیاء چونکہ ذاکر ہیں پس وہ ہم نشین خدا ہیں۔ تو ان کے پاس بیٹھنے والا بھی ہم نشین خدا ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ بزرگوں سے لپٹا رہنا بھی بڑی رحمت ہے گو خود ان میں سے نہ ہو۔

روزہ داروں کی فرحتیں

بہر حال یوم فطر میں فرشتوں سے ارشاد ہوتا ہے کہ اے فرشتو! کیا بدلہ ہے اس شخص کا جو اپنا کام پورا کر چکے۔ وہ عرض کرتے ہیں: جزاءہ ان یوفی اجرہ (یعنی اس شخص کا بدلہ یہ ہے کہ اس کی اجرت پوری دی جائے)

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اپنے گھر کو جاؤ۔ میں نے تم کو سب کی مغفرت کر دی اور تمہارے سینات کو حسنات سے بدل دیا۔ یہ وہ حدیثیں ہیں ختم صوم و یوم عید کے متعلق جن کا تعلق آیت سے بھی اوپر مذکور ہو چکا اور اگر صابرین کی تفسیر صائمین سے کی جائے تو آیت کا اور زیادہ تعلق ظاہر ہو جائے گا اے صاحبو! اب تک تو ہم رمضان میں خالی ہاتھ رہے۔ اگر بقیہ ایام بھی اسی طرح گزر گئے تو حسرت اس کا انجام ہے۔ پس تین چار دن جو باقی ہیں ان میں بھی تلافی ممکن ہے، تلافی کرلو۔ یوم عید میں علاوہ مجاورت صیام کے اور خاص برکات بھی ہیں۔ چنانچہ اس میں افضل

العبادات یعنی نماز ہے اور پھر صدقہ فطر ہے۔ اور نادار حسرت نہ کریں کہ ہم برکات صدقہ سے محروم ہیں۔ بات یہ ہے کہ صدقہ کچھ صدقہ مالیہ میں منحصر نہیں ہے بلکہ کپڑا پہننا صدقہ ہے۔ بیوی کے منہ میں لقمہ دینا نیز خود بھی کھانا صدقہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ امور سب اللہ کے واسطے بجالائے جائیں تو سب صدقات میں شمار ہوتے ہیں۔

مثلاً بیوی کو اس نیت سے کھلائے کہ اس کا نان و نفقہ میرے ذمے فرض ہے اس کو ادا کرتا ہوں۔ اور اسی طرح کپڑا مثلاً اس نیت سے پہنے کہ حق تعالیٰ نے ستر ڈھکتا فرض اور باقی جسم کا مستور کرنا مستحب فرمایا ہے۔ سوان نیتوں سے مباح بھی عبادت ہو جاتا ہے اور امور دنیاویہ بھی دینی عبادات ہو جاتے ہیں۔ لوگ یوں خیال کرتے ہیں کہ بیوی بچوں کی خدمت کرنا دنیا میں داخل ہے حالانکہ یہ بھی دین میں شمار ہے اور اسی طرح سونا بھی جو راحت ہے عبادت ہو جاتا ہے۔ جیسے کوئی شخص عبادت عملی خواہ علمی کرتا ہو تھک کر سو جائے تو یہ سونا بھی عبادت ہے۔ کیونکہ سونے والے کا یہ قصد ہے کہ میں راحت حاصل کر کے پھر خدمت الہیہ میں مشغول ہو جاؤں گا۔ اور عبادت کا ذریعہ عبادت ہوتا ہی ہے۔ اس واسطے نوم العالم عبادۃ حدیث میں آیا ہے یعنی عالم کی نیند عبادت میں شمار ہے جاہل کے جاگنے سے عالم کا سونا بہتر ہے اور لطف حق دیکھئے کہ عید میں علاوہ عبادات کے جمع کرنے کے ہمارے امور طبیعہ کا بھی لحاظ کیا گیا ہے کیونکہ عبادت بوجہ رعایت امر عادی کی سہولت سے ادا ہو جاتی ہے اور متروک نہیں ہوتی۔ خواہی نحو ای ہو ہی جاتی ہے۔ چنانچہ عید میں سامان فرحت طبعی کا جمع کیا گیا۔ لباس وزینت سے آراستہ ہونا، خوشبو لگانا، جمع ہونا، اظہار بشارت کرنا و مثل ذلک۔ چنانچہ اس کے دلائل جزئیاً جزئیاً بھی وارد ہیں اور کلیاً حدیث للسانم فرحتان (روزہ دار کیلئے دو فرحتیں ہیں) کا عموم بھی اس پر دال ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ روزہ دار کو دو فرحتیں حاصل ہوتی ہیں۔

فرحة عند الافطار وفرحة عند لقاء الرحمن

(ایک فرحت افطار کے وقت اور ایک فرحت اللہ تعالیٰ کے لقا کے وقت)

سوا یک تو افطار اصغر ہے جو روزانہ ہوتا ہے اور دوسرا افطار اکبر ہے جو مجموعہ رمضان کا افطار ہے یعنی عید و اوران دونوں کو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام جو منجملہ جوامع الکلم کے ہے

شامل ہے۔ پس یوم عید جامع ہو گیا عبادات و فرح طبعی کا پھر خود ان عبادات میں بھی فرح و نشاط طبعی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ جوش مسرت میں مسلمان کا طبعی امر ہے اللہ اکبر! اللہ اکبر کہنا۔ سو نماز میں یہی داخل کیا گیا۔ ولتکبروا للہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو۔ کی یہ بھی تفسیر کی گئی ہے۔ غرض جو امر طبعی تھا اس کو جز و نماز کر دیا اور چونکہ موقع تھا اظہار سرور کثیر کا و اقل الجمع ثلاث۔ کم سے کم جمع میں تین ہوا کرتے ہیں۔ تین تکبیریں ایک رکعت میں اور تین دوسری رکعت میں مقرر فرمائیں اور بعض بعض صحابہؓ کے نزدیک زائد بھی ہیں مگر تین سے کم نہیں۔ پھر قرأت کے فصل سے رکوع و سجدہ کے اللہ اکبر بھی سب جمع ہو گئے کہ اظہار سرور کے کلمہ کا تواتر بھی امر طبعی ہے اور یہ رکعت ثانیہ میں تو ظاہر ہے باقی پہلی رکعت میں تعجیل اظہار کے نکتہ سے قرأت پر تکبیر مقدم ہو گئی۔ غرض امر طبعی کو جز و نماز بنا دیا گیا۔ یہ تو نماز کا بیان تھا۔

صدقہ فطر: اب صدقہ فطر کا ذکر کیا جاتا ہے اور یہ صدقہ صاحب نصاب کے ذمہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے اور اپنے نابالغ بچوں کی طرف سے ادا کرے۔ اولاد بالغ اور بیوی کی طرف سے واجب نہیں اگر بیوی اور بالغ اولاد خود مالدار نصاب صدقہ فطر ہوں تو خود اپنی طرف سے ادا کریں ورنہ ان کے ذمہ بھی واجب نہیں۔ اگر گیتھوں سے صدقہ فطر ادا کیا جائے تو پونے دو سیر نمبری سیر سے ادا کرنا چاہیے اور اگر پورے دو سیر دے دے تو زیادہ بہتر ہے اور اگر جو دیوے تو اس سے مضاعف (دوچند) دیوے۔ مگر یہ دوچند وزن کے اعتبار سے دینا جو بعضی اردو کی کتابوں میں لکھا ہے غلط ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس برتن میں پونے دو سیر گیتھوں سماویں اس سے دوچند بڑے برتن میں جتنے جو سماویں وہ صدقہ فطر میں دیئے جائیں گے۔ حاصل یہ ہے کہ دوچند ہونے میں کیل یعنی ناپ کا اعتبار ہے وزن اور تول کا اعتبار نہیں خوب سمجھ لو اور یاد رکھو اسی طرح جن کے نام حدیث میں آئے ہیں مثلاً تمر و گندم سے مضاعف ہیں اور جن کا نام نہیں آیا ہے جیسے مکی، چاول، چنے وغیرہ۔ سو اس کا حکم یہ ہے کہ کسی منصوص کی برابر قیمت میں دے دیا جائے۔ بنگال میں چاول کا یہی حکم ہے کہ چاول اتنے دینے پڑیں گے جو قیمت میں نصف صاع گندم یا ایک صاع جو یا تمر کے برابر ہو۔ اور جہاں گیتھوں وغیرہ نہیں ہوتے وہاں قیمت کا اندازہ کرنے کا طریق جزئیہ تو دیکھا نہیں مگر قواعد سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اقرب البلاد میں جس نرخ سے فروخت ہوتے ہیں اس کی قیمت کا اعتبار کیا جائے۔

ایک امر قابل ذکر یہ ہے کہ صدقہ فطر نماز سے پہلے دینا مناسب ہے۔ جناب رسول مقبول

صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی سنت ہے اور اس میں حکمت یہ ہے کہ جیسے تمہارے عید ہے ایسے ہی مساکین کی عید ہے تو اگر نماز سے پہلے ان کو پہنچ جائے گا تو بیچارے پکا کر کھالیں گے یہ قومی ہمدردی ہے۔

زیر دستوں کے حقوق

مدعیان، ہمدردی تو ہمہ درد ہیں۔ اس لفظ کا مصداق تو وہاں نظر ہی نہیں آیا۔ چنانچہ برتاؤ ظاہر ہے۔ فقط نام ہے کہ ہمدردان قوم ہیں۔ دیکھئے جو ہمدرد قوم ہوتے ہیں وہ تو نوکروں کے ساتھ بھی باوجود ان پر حکومت ہونے کے ترحم اور نرمی سے کام لیتے ہیں۔

مامون الرشید ایک خلیفہ ہیں جن کے زمانہ میں سلطنت اسلامی کا بڑا عروج تھا۔ ان کے یہاں حضرت یحییٰ بن اکثم قاضی مہمان تھے جو امام بخاری کے استاد ہیں۔ رات میں ان کے مہمان کو پیاس لگی۔ خود انہوں نے اٹھ کر ان کو پانی پلایا۔ انہوں نے کہا کسی غلام کو آپ نے حکم کر دیا ہوتا فرمانے لگے غلام بیچارے تھکے تھکے رات کو سو جاتے ہیں۔ دل کو گوارا نہیں کہ ان سے رات کو بھی کام لیا جائے۔ ذرا بھی شان کا خیال نہ کیا۔ اور حضرت شان کیا چیز ہے مہمان کا اکرام سنت ہے اور گویہ ماموں معتزلی ہے مگر زمانہ کی برکت ہے۔

اسی کی یہ حکایت ہے کہ ایک بار رات میں اس نے غلام کو پکارا یا غلام یا غلام۔ وہ اٹھا بڑبڑاتا ہوا کہ یا غلام یا غلام کئے جاتے ہو۔ خدا کا خوف نہیں۔ کوئی وقت ہمارے چین ہی کا نہیں اور خلیفہ خاموش تھے۔ یحییٰ بن اکثم قاضی کو غلام کے اس گستاخانہ کلام پر غصہ آیا۔ خلیفہ نے کہا کہ میں اس طریق سے اور اس تحمل سے اپنے اخلاق کی اصلاح کرتا ہوں۔

اب تو امراء ملازمین کی بری گت بناتے ہیں۔ ان لوگوں کو چونکہ ذی اختیار ہیں اس لئے زیادہ ترحم اختیار کرنا چاہیے کیونکہ حکومت کی حالت میں اتلاف حقوق پر زیادہ قدرت ہونے سے اس کا وقت چنداں بعید نہیں اور بعض امراء اچھے بھی ہوتے ہیں جن کو اہل اللہ کی صحبت نصیب ہو گئی ہے کیونکہ یہ بات اہل اللہ ہی میں ہوتی ہے کہ ان کو اس کا بڑا خیال رہتا ہے کہ کسی کو ہم سے تکلیف نہ ہو۔

ایک قصہ حدیث میں ہے کہ لیلۃ البراءۃ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے مکان کے باہر سے پکارا اور خود اندر نہیں آئے کہ رات کا وقت تھا۔ حضرت عائشہؓ مکان کے اندر تھیں۔ کچھ بدن وغیرہ سونے میں کھل جاتا ہے۔ تو حدیث میں آیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح باہر تشریف لے گئے کہ

قام رویدا۔ یعنی آہستہ کھڑے ہوئے وانتعل رویدا یعنی جوتا آہستہ پہنا۔ وفتح الباب رویدا۔ یعنی دروازہ آہستہ کھولا وخرج رویدا۔ یعنی تشریف لے گئے آہستہ واغلاق الباب رویدا۔ اور دروازہ کو آہستہ بند کر دیا۔ ہر جگہ رویدا کہا۔ کہاں تک سننے والا سبق نہ سیکھے گا۔ یہی مذاق اہل اللہ کا ہے کہ نائم کی آنکھ نہ کھل جائے۔ یہ مدعی کیا ہمدردی کا دعویٰ کرتے ہیں فقط زبان سے کہتے ہیں کرتے نہیں۔ قوال یعنی کثیر القوال ہیں اور افعال نہیں یعنی کثیر العمل نہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: انتم الی امام فعال احوج منکم الی امام قوال۔ (یعنی تم لوگ بہ نسبت واعظ و امام قوال کے زیادہ محتاج ہو) اہل شریعت بولتے کم ہیں کرتے زیادہ ہیں۔

خلاصہ بیان: غرض عید الفطر میں بھی مساکین کی رعایت سے تقدیم صدقہ کا حکم ہے اور اس میں غریبوں کے ساتھ ہمدردی ہے تا عید و عید نہ ہو جائے بلکہ سارے محل میں عید ہو جائے۔ سب مسکینوں کو پہنچنا چاہیے چاہے وہ نہ پکاوے۔ مگر اطمینان تو ہو گیا کہ سب بھائیوں کے پاس کھانا موجود ہے۔ پس اس طرح صدقہ مقرر کر دیا۔ اور چونکہ حاجت مند کو دے کر بھی مسرت طبعی ہوتی ہے تو اس عبادت میں بھی سرور طبعی کی رعایت رکھی گئی۔

تیسری عبادت اس یوم کی امر بالمعروف ہے جس کے لئے خطبہ مقرر فرما دیا۔ یہ بھی طبعاً علامت محبت کی ہے کہ اپنے بھائیوں کی خیر خواہی کی جائے اور محبت سے زیادہ سرور طبعی کس چیز میں ہوگا۔ تو یہ تو احکام خاص یوم عید کے ہوئے۔

اب چونکہ روزہ کی عادت پڑ چکی تھی۔ جب عید کے دن لقمہ منہ میں جائے گا روزہ یاد آئے گا اور ارمان ہوگا کہ کاش یہ نعمت قائم رہتی۔ پس عید سے اگلے دن سے پھر صیام شروع فرما دیا۔ اگر جی چاہے تو پھر چھ روزے رکھ لو تا کہ ارمان پورا ہو جائے بلکہ فضیلت بھی حاصل ہو جائے۔ قانون رحمت ہے کہ

من جاء بالحسنة فله عشر امثالها۔ جو ایک نیکی کرتا ہے اس کو اس سے دس گنا ملتا ہے۔ پس اس اعتبار سے ایک ماہ رمضان اور ان چھ روزوں کے رکھنے سے سال بھر کے روزوں کا ثواب مل جاتا ہے۔ پس ان احکام کو سمجھ لو اور یاد رکھو اور عمل کرو۔

اب ختم کرتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق نیک دے۔ آمین!

النسوان فی رمضان

روزہ کی آسانی کے متعلق یہ وعظ ۲۹ رمضان ۱۳۳۵ھ کو بوقت صبح
اپنے مکان میں کرسی پر بیٹھ کر مستورات کی فرمائش پر فرمایا
جو ایک گھنٹہ ۴۵ منٹ میں ختم ہوا۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے
قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِیْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْهِ
وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یُّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا
مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ یُّضِلِلْهُ فَلَا هَادِیَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ
لَا شَرِیْكَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ صَلَّی
اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهِ وَاَصْحَابِهِ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ
بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ . بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ .

عسیٰ ربہ ان طلقکن ان یبدلہ ازواجاً خیراً منکن مسلمات مؤمنات
قانتات تائبات عبادات سائحات ثیبت وابتکاراً . (التحریم: ۵)

ترجمہ: اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تم عورتوں کو طلاق دے دیں تو ان کا پروردگار بہت
جلد تمہارے بدلے ان کو بہت جلد تم سے اچھی بیبیاں دے دے گا جو اسلام والیاں
ایمان والیاں فرمانبرداری کرنے والیاں توبہ کرنیوالیاں عبادت کرنیوالیاں روزہ
رکھنے والیاں ہوں گی کچھ بیوہ کچھ کنواریاں۔

اہل بیت

یہ ایک آیت ہے سورہ تحریم کی جس میں ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کو خطاب
ہے۔ جس کا سبب نزول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت خانہ میں ایک واقعہ ہو گیا تھا جس
سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکدر ہو گئے تھے۔ اجمالاً صرف اتنا جان لینا کافی ہے کیونکہ مقصود بیان
تفصیل پر موقوف نہیں۔ چونکہ حق تعالیٰ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناگواری منظور نہیں۔ اس لئے حق
تعالیٰ نے اس کا علاج یہ کیا کہ ازواج مطہرات کو عتاب کیا گیا اور ان کو دھمکی دی گئی۔

ان آیات میں اسی عتاب کا ذکر ہے اور یہ دھمکی ایسی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت ہی محبت تھی اور یہ کہ وہ دنیا دار نہ تھیں بلکہ کامل دیندار تھیں کیونکہ یہاں جہنم وغیرہ کی دھمکی نہیں دی گئی نہ کسی آفت ارضیہ و سماویہ سے ڈرایا گیا بلکہ دھمکی یہ دی گئی کہ اگر تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکدر کرو گی تو اندیشہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تم کو طلاق دے دیں اور ہم آپ کو تم سے بہتر پیہیاں دے دیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دھمکی عاشق ہی کو دی جاسکتی ہے جو بیوی عاشق نہ ہو اس کے حق میں یہ کچھ بھی دھمکی نہیں بلکہ وہ تو اس کو بشارت سمجھے گی۔ خصوصاً جب کہ عدم محبت کے ساتھ یہ بات بھی ہو کہ شوہر کے یہاں کھانے پہننے کی بھی تنگی ہو۔ دنیا کی عیش و راحت بھی نہ ہو جیسا کہ حضور کے یہاں حالت تھی کہ بعض دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں فاقہ بھی ہوتا تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بعض دفعہ دو مہینہ تک ہمارے گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا۔ بس کچھ چھوڑے اور پانی کھاپی کر گزر کر لیتے تھے اور یہ سخت تنگی کی حالت اوائل ہجرت میں تھی۔ بعد میں یہ حالت تو نہ رہی تھی کیونکہ جب فتوحات کی کثرت ہوئی تو آپ کے پاس اس قدر سامان آتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک آدمی کو سو سو اونٹ عطا فرمائے۔ ایک اعرابی کو بکریوں کا اتنا بڑا ریوڑ عنایت فرمایا جس سے جنگل بھرا ہوا تھا۔ ایک ایک آدمی کو سو سو اونٹ اور ہزاروں بکریاں دے دینا اس کی دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت سامان تھا مگر اس پر بھی یہ توسیع اپنے لئے نہیں تھا بلکہ دوسروں ہی کے لئے تھا۔ اپنے واسطے تو یہ حالت تھی کہ اگر شام کو کچھ سونا چاندی آیا تو رات سے پہلے خرچ فرما دیتے تھے اور صبح کو آیا تو شام سے پہلے خرچ فرما دیتے تھے۔

چنانچہ ایک دفعہ عصر کی نماز سے سلام پھیر کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت تیزی کے ساتھ اپنے دولت خانہ میں تشریف لے گئے۔ صحابہ گواہ سرعت سے تشویش ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس تشریف لا کر فرمایا کہ میرے گھر میں کچھ سونا رکھا تھا جو ابھی تک تقسیم نہیں ہوا تھا اور نبی کو مناسب نہیں کہ رات کو اس کے گھر میں دینا رہے۔ اس لئے میں نے جا کر اس کی تقسیم کا انتظام کر دیا۔

اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں بعض دفعہ فتوحات کے بعد ہی تنگی ہو جاتی تھی کیونکہ آپ نئی بے حد تھے۔ گھر میں روپیہ پیسہ رکھتے نہ تھے ورنہ آپ نعوذ باللہ مفلس نہ تھے حق تعالیٰ نے آپ کو بہت کچھ دیا تھا۔ بھلا کہیں مفلسوں کو بھی ایسا دیکھا ہے کہ ایک ایک آدمی کو سو سو اونٹ اور بکریوں کا ریوڑ جنگل بھرا ہوا دے دیں۔

غرض اول اول تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں فاقہ کی ثوبت آتی تھی اور فتوحات کے بعد یہ تو نہ رہا تھا بلکہ آپ اپنی سب بیبیوں کا سال بھر کا خرچ ایک دم سے دے دیا کرتے تھے مگر پھر بھی زیادہ وسعت نہ تھی کیونکہ مال آپ کے یہاں جمع تو ہوتا ہی نہیں تھا اور اس سال بھر کے خرچ کی تفصیل تو معلوم نہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا یہ ہے:

اللهم اجعل رزق آل محمد قوتاً۔ کہ اے اللہ آل محمد کا رزق بقدر قوت کیا جائے۔ اور قدر قوت وہ ہے جس سے بقدر کفایت گزر ہو جائے کچھ فاضل نہ ہو اور اس میں شک نہیں کہ ازواج مطہرات بھی آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہیں۔ اس لئے یہ دعا ان کو بھی شامل تھی اور اسی طرح ذریت بھی داخل ہیں۔ بلکہ اصل مقتضائے لغت یہ ہے کہ ازواج مطہرات تو آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اصالتاً داخل ہوں اور ذریت طبعاً داخل ہو کیونکہ آل کہتے ہیں اہل بیت کو یعنی گھر والوں کو اور گھر والوں کے مفہوم میں بیوی سب سے پہلے داخل ہے۔ پس یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ ذریت تو آل میں داخل ہوں اور ازواج داخل نہ ہوں۔

بعض لوگوں کو ایک حدیث سے شبہ ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت علی وفاطمہ و حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اپنی عبا میں داخل فرما کر فرمایا

اللهم هؤلاء اهل بيتي (کہ اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں)

اس سے بعض عقلمندوں نے یہ سمجھا ہے کہ ازواج مطہرات اہل بیت میں داخل نہیں۔ حالانکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ یہ بھی میرے اہل بیت میں سے ہیں۔ ان کو بھی انما یرید اللہ لیذهب عنکم الرجس اهل البیت و یطہرکم تطہیراً کی فضیلت میں داخل کر لیا جائے۔ یہاں حصر مقصود نہیں کہ بس یہی اہل بیت ہیں اور ازواج مطہرات اہل بیت نہیں ہیں اور یہ جو اس حدیث کے بعض طرق میں ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کو عبا میں داخل فرما کر یہ دعا کی تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے بھی ان کے ساتھ شامل فرما لیجئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنی جگہ ہو۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ تم کو عبا میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں تم تو پہلے ہی سے اہل بیت میں داخل ہو دوسرے حضرت علیؓ حضرت ام سلمہؓ سے اجنبی تھے ان کے ساتھ حضرت ام سلمہؓ کو عبا میں کیونکر داخل کیا جاسکتا تھا۔ یہ

تواشکالات کا جواب تھا۔

اصل مدعا کے لئے دلیل اول تو لغت ہے کہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں ازواج اولاً داخل ہیں دوسرے قرآن کا محاورہ یہی ہے۔ حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں جب کہ ملائکہ نے ان کو ولد کی بشارت دی اور حضرت سارہ کو اس بشارت پر تعجب ہوا، ملائکہ کی طرف سے یہ قول نقل فرمایا ہے۔

قالوا تعجبین من امر الله رحمة الله وبركاته عليكم اهل البيت انه

حمید مجید

ترجمہ: فرشتوں نے کہا کہ کیا تم خدا کے کاموں میں تعجب کرتی اور (خصوصاً) اس خاندان کے لوگوں پر اللہ کی (خاص) رحمت اور اس کی (انواع اقسام) کی برکتیں (نازل) ہوتی رہتی ہیں بے شک وہ (اللہ تعالیٰ) بڑی تعریف کے لائق (اور) بڑی شان والا ہے۔
ظاہر ہے کہ یہاں اہل بیت میں حضرت سارہ علیہا السلام یقیناً داخل ہیں کیونکہ خطاب انہی سے ہے معلوم ہوا کہ اہل بیت میں ازواج بھی داخل ہیں۔

ازواج مطہرات

جب یہ ثابت ہو گیا اور ادھر یہ ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آل محمد کے لئے یہ دعا فرمائی ہے کہ ان کا رزق بقدر قوت ہو تو خود ازواج کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قدر قوت سے زیادہ کیوں تجویز کیا ہوگا۔ پس گوئی نفقہ سالانہ کی مقدار معلوم نہیں مگر اس دعا سے اجمالاً اتنا معلوم ہو گیا کہ ازواج کا سالانہ نفقہ قدر قوت سے زیادہ نہ تھا۔ پھر اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات تخی بھی تھیں۔ خصوصاً حضرت زینب و حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کی سخاوت تو مشہور تھی اور بخیل تو ان میں سے ایک بھی نہ تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو تخی تھے ہی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر مہمان نواز تھے کہ ایک وقت میں بعض دفعہ بارہ بارہ مہمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ہوتے تھے اور گھر میں گھڑے کے پانی کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ اس سخاوت اور مہمان نوازی کے ساتھ تو اگر زیادہ سامان بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ہوتا جب بھی تھوڑا تھا چاہے جائیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں کچھ سامان جمع بھی نہ ہوتا تھا۔

پس ایسی حالت میں حضرات ازواج مطہرات کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنے کی تمنا کرنا ان کی عافیت محبت کی دلیل ہے اور ان کی یہ حالت خود اس آیت سے معلوم ہو رہی

ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو صرف یہ دھمکی دی ہے کہ ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تم کو طلاق دے کر اور نکاح کر لیں اس دھمکی ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عاشق تھیں۔ اگر وہ دنیا دار ہوتیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو محبت نہ ہوتی تو اس دھمکی کا کچھ بھی اثر نہ ہوتا اور ایسی حالت میں اس کا نزول عبث ہوتا حالانکہ ایسا نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔

ازواج مطہرات میں جو کبھی سوکنوں جیسے واقعات ہوئے ہیں تو وہ دنیا دار مال کی وجہ سے نہیں تھے بلکہ ان سب کا منشا صرف یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عنایات و محبت کسی کے ساتھ زیادہ دیکھ کر باہم رشک ہوتا تھا اور یہ محبت و عشق کے لوازم میں سے ہے۔

باسایہ ترانمی پسندم ☆ عشق است و ہزار بدگمانی

(میں تمہارے سایہ کے ساتھ بھی کسی کو پسند نہیں کرتا، عشق میں ہزاروں بدگمانیاں ہوتی ہیں)

عاشق تو یوں چاہتا ہے کہ میرے سوا کسی کو میرے محبوب کی خبر بھی نہ ہو۔ چنانچہ ایک بزرگ نے حق تعالیٰ سے دعا کی کہ میں آپ کے کسی عاشق کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ حکم ہوا کہ فلاں پہاڑ پر جاؤ۔ وہاں تم کو ہمارا ایک عاشق ملے گا یہ وہاں پہنچے اور جا کر اس کو سلام کیا۔ بس سلام کی آواز سنتے ہی اس نے ایک چیخ ماری اور فوراً مر گیا۔ یہ بزرگ بڑے حیران ہوئے کہ یہ کیا قصہ ہے۔ میں تو اس سے ملنے اور بات کرنے آیا تھا۔ یہ میری آواز سنتے ہی ختم ہو گیا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد ☆ روئے گل سیرندیدیم و بہار آخر شد

(افسوس پلک جھپکتے ہی موسم بہار ختم ہو گیا۔ ابھی پھول کو جی بھر کر دیکھا بھی نہ تھا کہ موسم بہار ختم ہو گیا)

حق تعالیٰ سے اس کا راز دریافت کیا۔ جواب ملا اس شخص کو اب تک یہ خیال تھا کہ بس اللہ تعالیٰ کو جاننے والا دنیا میں تنہا میں ہی ہوں۔ اس خیال میں یہ خوش تھا اور مست تھا۔ تمہارا سلام اور اس میں رحمت اللہ سن کر اسے خبر ہوئی کہ نہیں اور بھی خدا تعالیٰ کے جاننے والے دنیا میں موجود ہیں (اور قباء سے محفوظ نہیں ہوں) اس کا اس کو اس قدر غم ہوا کہ تحمل نہ کر سکا اور فوراً جان دیدی۔

جب عشق کا یہاں تک تقاضا ہے تو بھلا عاشق کو یہ کیونکر گوارا ہو سکتا ہے کہ محبوب کو کسی دوسرے کی طرف زیادہ توجہ و میلان ہو۔ اسی وجہ سے ازواج مطہرات میں کبھی کبھی کچھ چھیڑ چھاڑ ہو جاتی تھی جس کا منشا عداوت نہ تھا، نہ دنیا کی محبت و حرص تھی بلکہ محض حضور کی محبت اس کا منشا تھی۔ چنانچہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے فتوحات عطا فرمائیں اور غلام باندی

اور مال و متاع اور باغات غنیمت میں بکثرت آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں اسے تقسیم فرمایا تو اس وقت حضرات ازواج مطہرات نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ جیسا آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں کو بے دریغ عطا فرما رہے ہیں تو ہم کو بھی مال غنیمت میں سے کچھ عطا فرمایا جائے اور ہمارے نفقہ میں بھی پہلے سے زیادہ کچھ اضافہ فرما دیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے انکار کیا۔ ازواج مطہرات نے کچھ اصرار کیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار ہوا۔ اس پر آیاتِ تنخیر کا نزول ہوا۔ جن میں حضرات ازواج کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر وہ متاع دنیا کی طالب ہیں تو بس ایک دفعہ جی بھر کر دنیا لے لیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو طلاق دے کر علیحدہ کر دیں اور اگر اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دارِ آخرت کی طالب ہیں تو اسی حالت میں راضی رہیں جس حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم رکھنا چاہیں۔

ياايها النبي قل لازواجك ان كنتن تردن الحيواة الدنيا وزينتھا
فتعالين امتعنن واسرحكن سرا حاً جميلاً، الخ.

ترجمہ: اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ اپنی بیویوں سے فرمادیجئے کہ تم اگر دنیوی زندگی (کامیابی) اور اس کی بہار چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو کچھ مال و متاع (دنیوی) دے دوں اور تم کو خوبی کے ساتھ رخصت کروں۔

جب یہ آیات نازل ہوئیں تو سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو یہ آیات سنائیں اور فرمایا جواب میں جلدی نہ کرنا بلکہ اپنے والدین سے مشورہ کر کے جواب دینا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہوا کہ عائشہ کم سن بچی ہیں اور بچپن میں دنیا کی حرص ہونا کچھ بعید نہیں تو ایسا نہ ہو یہ جلدی سے دنیا کو اختیار کر لیں۔ اس لئے فرمایا کہ اپنے والدین سے مشورہ کرے جواب دینا کیونکہ ان کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان تھا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مفارقت کی رائے کبھی نہ دیں گے۔ مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آیاتِ تنخیر کو سن کر فوراً جواب دیا۔

فی هذا استامرا بوی . کیا اس معاملہ میں اپنے والدین سے مشورہ کروں گی۔

قد اخترت الله ورسوله والدار الآخرة. میں نے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار کیا اور دارِ آخرت کو۔

ان کے اس جواب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت مسرت ہوئی۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بہت محبت تھی۔

عشق و محبت

احادیث میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح اس وقت ہوا تھا جب کہ یہ چھ سال کی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں جس وقت آئی تھیں اس وقت ان کی عمر نو سال کی تھی۔ ظاہر ہے کہ نو سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ ہندوستان میں تو نو سال کی لڑکی شوہر کے پاس جانے کے اور گھرداری کے قابل نہیں ہو سکتی۔ مگر عرب میں نشوونما اچھا ہوتا ہے وہاں نو سال کی لڑکیاں اٹھان میں اچھی ہوتی ہیں۔ اس لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نو سال کی عمر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آ گئی تھی۔ مگر اس عمر میں بچپن کی باتیں تو ہوتی ہی ہیں۔ نشوونما اچھا ہونے سے بچپن تو زائل نہیں ہو جاتا۔ تو اس عمر میں اگر مال و متاع دنیا کی زیادہ حرص ہو تو کچھ تعجب نہیں۔ بچوں کو زیور، گہنے کی حرص ہوتی ہے۔

مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا باوجود اس کم سنی کے بڑی بڑی عورتوں سے عقل و فہم و ادب میں کم نہ تھیں۔ بلکہ سب سے بڑھی ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے صحابہ ان سے مشکل مسائل میں رجوع کرتے تھے اور ان کی فہم و سلامت رائے معلوم کرتے تھے۔ اسی عقل و فہم کا یہ اثر تھا کہ نو سال کی عمر میں بھی ان کے اندر بچیوں کی سی حرص و طمع نہ تھی بلکہ دانا عورتوں کی طرح استغناء کی شان تھی۔

بڑی بات یہ تھی کہ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے محبت تھی وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عاشق تھیں۔ چنانچہ یہ جواب دے کر عرض کرتی ہیں کہ یا رسول اللہ میری ایک درخواست ہے۔ فرمایا وہ کیا؟ کہا، وہ یہ کہ آپ میرے اس جواب کو دوسری ازواج سے بیان نہ فرمائیے گا۔ مطلب یہ تھا کہ کہیں میرا جواب سن کر میری تقلید میں سب یہی کہہ دیں اور وہ چاہتی یہ تھیں کہ سب اپنی اپنی رائے سے جواب دیں تو اچھا ہے۔ ممکن ہے کسی کی رائے دینا لینے ہی کی ہو تو وہ الگ ہو جائے اور رقیبوں کی تعداد کچھ کم ہو جائے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درخواست کو منظور نہیں فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے گی کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کیا جواب دیا تو میں بتلا دوں گا۔ ہاں بدون پوچھے مجھے بتلانے کی ضرورت نہیں۔

تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس درخواست سے ان کی محبت کا رنگ معلوم ہو گیا کہ وہ

یوں چاہتی تھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں جو اتنے شریک ہیں وہ کم ہو جائیں تو اچھا ہے اور اس میں دوسروں کے ساتھ برائی کا قصد نہ تھا بلکہ اپنے لئے بھلائی کا قصد تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تنہا میرے ہی لئے ہوں اور اس تمنا میں عاشق معذور ہوتا ہے ایک رنگ تو یہ تھا۔

ایک رنگ یہ تھا کہ حضرت ام حبیبہؓ نے ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ میری بہن سے شادی کر لیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم کو یہ گوارا ہے؟ انہوں نے کہا یا رسول اللہ میں آپ کے پاس اکیلی تو ہوں نہیں بلکہ اب بھی میرے شریک بہت ہیں تو اگر اس خیر میں میری بہن شریک ہو جائے تو اس سے معتبر کیا ہے۔ غیروں کی شرکت سے بہن کی شرکت تو پھر اہوں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ میرے واسطے حلال نہیں۔

عشق کا ایک رنگ یہ بھی ہے جو حضرت ام حبیبہؓ میں تھا کیونکہ وہ بہن کا سوت ہونا محض اس لئے گوارا کرتی تھیں کہ میری بہن کو بھی حضور سے خاص تعلق ہو جائے جو اس کے لئے سعادت آخرت کا سبب ہو۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ام حبیبہؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کی کتنی قدر دان تھیں۔

بہر حال جب یہ آیت تخییر نازل ہوئی تو سب ازواج نے حضور ہی کو اختیار کیا۔ دنیا کو کسی نے بھی اختیار نہیں کیا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کس درجہ کی محبت تھی کہ فقر و فاقہ اور تنگی میں رہنا منظور تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے علیحدگی منظور نہ تھی۔ چنانچہ اس محبت ہی کی وجہ سے ان کو حق تعالیٰ نے جہنم کی دھمکی وغیرہ نہیں دی بلکہ صرف اس سے ڈرایا کہ دیکھو کبھی تم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سے علیحدہ نہ کر دیں۔ اور تم یہ نہ سمجھنا کہ اگر ہم کو الگ کر دیا تو ہم سے بہتر بیبیاں کہاں سے ملیں گی۔ خوب سمجھ لو کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو طلاق دے دی تو حق تعالیٰ قادر ہیں کہ وہ تم سے بہتر بیبیاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیں۔ عسیٰ ربہ ان یرسلک ان یبدلہ ازواجاً خیر منکن۔ یہ تو اجمالاً ان کی خیریت کا ذکر تھا۔ آگے اس خیریت کی تفصیل ہے کہ وہ بیبیاں کیسی ہوں گی۔

مسلمات کی خصوصیات

مسلمات مؤمنات قانتات ثابتات عبادات سائحات۔ وہ اسلام والیاں ہوں گی اور ایمان والیاں اور خشوع خضوع والیاں، اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنے والیاں اور عبادت

اور سائحات ہوں گی۔ سائحات کی تفسیر عنقریب آتی ہے۔ یہ تو تشریحی صفات ہیں آگے تکوینی صفات مذکور ہیں ثبیت و ابکاراً۔

اس مقام پر ایک اشکال طالب علمانہ ہے۔ وہ یہ کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ازواج مطہرات سے خیر و بہتر عورتیں موجود تھیں۔ اگر نہیں تھیں تو یہ دھمکی کیسی؟ اور اگر تھیں تو یہ بظاہر بہت بعید ہے کہ ان سے بہتر عورتیں دنیا میں ہوں اور حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کمتر تجویز فرمائیں۔

دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال فیض و قوت تاثیر صحبت پر نظر کر کے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت یافتہ عورتوں سے بہتر کوئی ایسی عورت ہو سکے جس نے ابھی تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل نہیں کی اور خود نص میں بھی تو ہے یا نساء النبی لستن کا احد من النساء اتقین (اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو) اس آیت میں قلب ہے مطلب یہ ہے لیس احد من النساء کمثلک کہ کوئی عورت تم جیسی نہیں ہے اگر تم متقی ہو۔ اور ازواج مطہرات کا متقی ہونا معلوم تو ثابت ہوا کہ ان کے مثل کوئی عورت دنیا میں اس وقت نہ تھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تب نہ ہو اور تقدیر اس طرح ہو۔

یا نساء النبی دینات کغیرکن۔

اس اشکال کا جواب میں نے ایک عالم کے خادم سے سنا ہے۔ وہ اپنے شیخ سے نقل کرتے تھے کہ انہوں نے یہ فرمایا کہ ازواج مطہرات کی خیریت تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح ہی کی وجہ سے تھی۔ قبل از نکاح تو وہ اور دوسری عورتیں یکساں تھیں۔ پھر اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو طلاق دے دیتے تو ان سے خیریت کم ہو جاتی اور دوسری جس بیوی سے نکاح کر لیتے نکاح کے بعد وہ ان سے بہتر ہو جاتی۔ پس خیرا منکن بالفعل کے اعتبار سے نہیں فرمایا گیا بلکہ مایودل کے اعتبار سے فرمایا گیا ہے۔ اب کوئی اشکال نہیں یہ جواب مجھے بہت پسند آیا۔ یہ تو اشکال کا جواب تھا۔ اب میں ان صفات کو بیان کرتا ہوں جو حق تعالیٰ نے خیریت کے متعلق بیان فرمائی ہیں کیونکہ مقصود بیان کا انہی صفات سے مستنبط ہے تو فرماتے ہیں۔

مسلمات : کہ وہ عورتیں مسلمان ہوں گی اور اسلام جب ایمان کے مقابل مستعمل ہوتا ہے تو اس سے عمل مقصود ہوتا ہے یعنی وہ احکام الہیہ کی عملاً مطیع ہوں گی۔

مؤمنات: یعنی وہ ایمان والیاں ہوں گی۔ اس میں درستی عقائد کا بیان ہے کہ جن چیزوں کی تصدیق ضروری ہے جیسے توحید و رسالت و معاد وغیرہ ان سب پر ان کو ایمان ہوگا۔ یہاں تک تو عقائد و اعمال کا ذکر ہوا آگے فرماتے ہیں۔

فقتت: کہ وہ صاحب قنوت ہوں گی جس کے معنی خشوع و خضوع کے ہیں۔ میرے نزدیک اس میں حال کی طرف اشارہ ہے کہ ایمان و اسلام کے ساتھ وہ صاحب حال بھی ہوں گے جس میں اصل خشوع و خضوع ہے جو حاصل ہے فنا کا اور فنا رفع احلال ہے اور ممکن ہے کہ قنوت سے مراد یہ ہو کہ وہ زوج کی مطیع ہوں گی۔

تثبت: وہ توبہ کرنے والی ہوں گی۔ یعنی وہ عمل کے ساتھ توبہ کرنے والی ہوں گی اور یہ نظیر اس آیت کی ہے جو سورہ ذاریات میں ہے۔ کانوا قلیلاً من اللیل مایہجعون وبالا سعادہم یتستغفرون (وہ رات کو بہت کم سوتے تھے اور اخیر شب میں استغفار کیا کرتے تھے) جس کی تفسیر میں علماء نے فرمایا ہے۔ اے یتستغفرون لتقصیرہم فی العبادۃ (یعنی اپنی عبادت میں کوتاہیوں پر استغفار کرتے تھے) کہ وہ رات کو بہت کم سوتے ہیں اور زیادہ حصہ رات کا عبادت میں صرف کرتے ہیں اور صبح کے وقت استغفار کرتے ہیں کہ ہائے ہم سے کچھ بھی نہ ہو سکا۔ شیخ شیراز فرماتے ہیں:

فرس کشتہ از بس اشب راندہ اند ☆ سحرگہ خروشاں کہ داماندہ اند
(ساری رات گھوڑا دوڑایا یعنی عبادت میں مصروف رہے اور صبح کے وقت اپنی کوتاہی کا اظہار کرتے ہیں)

یہی تفسیر یہاں مناسب ہے کہ وہ یہ بیاں ایسی ہوں گی کہ باوجود عمل کے اپنی تقصیر سے توبہ کریں گی۔ عبادات: اور وہ عورتیں عبادت کرنے والی ہوں گی یعنی توبہ کے بعد بھی وہ عبادت و عمل میں تقصیر نہ کریں گی۔ بلکہ پہلے سے زیادہ کوشش کریں گی۔ ہماری طرح نہ ہوں گی کہ ہم توبہ کے بھروسے گناہ کرتے اور عمل میں کوتاہی کرتے ہیں۔ بھلا یہ کون سی عقلمندی ہے۔ اس کی تو ایسی مثال ہوئی جیسے تریاق کے بھروسے کوئی سانپ سے کٹوائے۔

دوسرے آج کل بہت سے آدمی توبہ کو ہر گناہ کے لئے کافی سمجھتے ہیں حالانکہ حقوق العباد میں محض توبہ کافی نہیں بلکہ بندوں سے حقوق معاف کرانا یا ادا کرنا بھی لازم ہے اور حقوق اللہ میں بھی توبہ سے صرف گناہ معاف ہوتا ہے ادائے حقوق کے لئے توبہ کافی نہیں۔

مثلاً کسی نے نمازیں قضا کر دی ہوں۔ زکوٰۃ نہ دی ہو، حج نہ کیا ہو تو توبہ سے گناہ معاف ہو جائے گا لیکن قضا کردہ نمازوں کی قضا لازم ہوگی۔ زکوٰۃ بھی گزشتہ سالوں کی لازم ہوگی۔ حج کے لئے بھی وصیت وغیرہ لازم ہوگی۔ آگے فرماتے ہیں۔

سناحت: یہی صفت اس وقت مقصود بالبیان ہے۔ جمہور سلف نے سیاحت کی تفسیر صائمات کی ہے کہ وہ بیبیاں روزہ رکھنے والی ہوں گی اور بعض نے اس کی تفسیر مہاجرات کی ہے۔ اس میں بھی معنی صوم کے مرعی و محفوظ ہیں۔ کیونکہ ہجرت میں بھی کھانا پینا چھوٹ جاتا یا کم ہو جاتا ہے۔ اول تو گھر سے بے گھر ہونا ترک مالوف میں صوم کے مثل ہے کیونکہ انسان کو اپنے گھر سے بھی بہت الفت ہوتی ہے اور جیسے کھانا پینا چھوڑنا اس کو گراں ہے ایسے ہی وطن کو چھوڑنا اور گھر سے بے گھر ہونا بھی گراں ہے دوسرے لغت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاحت کے اصل معنی ترک مالوف کے ہیں۔ یہ مفہوم اس کے سب معافی میں مشترک ہے۔ اب جس میں ترک مالوف زیادہ واضح ہوگا وہ سیاحت کا مصداق زیادہ ہوگا اور جس میں یہ مفہوم کم ہوگا وہ سیاحت کا مصداق دوسرے درجہ میں ہوگا اور ظاہر ہے کہ ترک طعام و شراب وغیرہ میں جو کہ حقیقت صوم ہے ترک مالوف زیادہ ہے۔ کیونکہ غذا پر حیات انسان کا مدار ہے اس سے ہر شخص مالوف ہے اور کسی کو اس سے چارہ نہیں اور بدون گھر کے بہت سے لوگ زندہ ہیں اور رہ سکتے ہیں اس لئے سیاحت کی اصل تفسیر صوم نہیں ہونا چاہیے۔

جس نے ہجرت سے تفسیر کی ہے اس نے بھی معنی صوم کی اس میں رعایت کی ہے کہ ہجرت بھی صوم کی مثل ہے اور اس میں کھانا پینا بھی چھوٹ جاتا ہے کیونکہ سفر میں کھانے کا وہ انتظام نہیں ہوتا جو گھر میں ہوتا ہے۔ بے وقت تو اکثر ہی ملتا ہے اور یہ وصف مردوں کی تعریف میں بھی وارد ہوا ہے سورہ توبہ میں آیا ہے۔

التائبون العابدون الحامدون السانحون الراکعون الساجدون

الآمرون بالمعروف والناہون عن المنکر والحافظون لحدود اللہ.

(وہ ایسے ہیں جو) گناہوں سے) توبہ کرنے والے ہیں اور (اللہ کی) عبادت

کرنیوالے ہیں اور حمد کرنیوالے ہیں اور روزہ رکھنے والے ہیں رکوع کرنیوالے اور

سجدہ کرنے والے نیک باتوں کی تعلیم کرنیوالے اور بری باتوں سے باز رکھنے

والے اور اللہ کی حدود (احکام) کا خیال رکھنے والے ہیں)

جس کی تفسیر بعض نے صائمون ہی سے کی ہے اور بعض سے سیاحت و سفر سے کی ہے

جو غزوہ کے لئے ہو یا طالب علم کے لئے یا حج کے لئے۔ کیونکہ سیاحت مطلقہ شرعاً مطلوب نہیں کہ امریکہ اور پیرس اور چین کی مصنوعات دیکھنے کے لئے سفر کرو۔

سیاحت الدین

اگر آج کل کے نوجوانوں کو یہ تفسیر بالسیاحت اس آیت کی مل جاتی تو وہ اسی سے اکتشافات جدیدہ اور سیاحت متعارفہ کو ثابت کر لیتے جیسے انہوں نے انگریزی تعلیم کا ثبوت اطلبوا العلم ولو بالصین سے نکالا ہے اور استدلال اس طرح کیا کہ حضور ﷺ نے چین سے بھی طلب علم کا امر فرمایا ہے حالانکہ وہاں اس وقت علم دین بالکل نہ تھا۔ محض مصنوعات کا علم تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ علم بھی شرعاً مطلوب ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ حدیث ثابت نہیں۔ محدثین نے اس کو ضعیف بلکہ بعض نے بے اصل کہا ہے۔ قال السخاوی فی المقاصد ر بوجہین عن انس وهو ضعیف من الوجہین بل قال ابن حبان انه باطل لا اصل له وذكره ابن الجوزی فی الموضوعات. (ص ۳۰) دوسرے اگر بطریق تنزل اس کو مان بھی لیا جائے تو خود اس حدیث ہی کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس میں ایسے علم کی تحصیل کا ذکر فرما رہے ہیں جو چین میں نہ تھا کیوں کہ اس میں لفظ ولو ہے جو کہ لغت فرض و تقدیر کے لئے ہے اور فرض معدومات کے ساتھ خاص ہوتا ہے موجودات کو فرض نہیں کیا جاتا۔ اب تو اس حدیث سے بھی یہ ثابت ہو گیا کہ حضور ﷺ ایسے علم کی تاکید فرما رہے ہیں جو چین میں اس وقت مفقود تھا اور بطور فرض کے فرما رہے ہیں کہ اگرچہ وہ چین ہی میں کیوں نہ ہو اور وہ علم دین ہے نہ کہ علم مصنوعات۔

اسی طرح اگر ان لوگوں کو اس آیت کی تفسیر نظر پڑ جاتی تو وہ اطلبوا العلم ولو بالصین کی طرح اس آیت سے بھی علم مصنوعات پر استدلال کرنے لگتے اور اگر سخت پر نظر پہنچ جاتی تو وہ عورتوں کے لئے بھی سیاحت امریکہ اور سیاحت لندن کو ثابت کرنے لگتے کیونکہ جو لوگ عبدالدینار و عبدالدرہم ہیں ان کو ہر جگہ دنیا ہی سوچتی ہے۔ جیسے کسی نے ایک بھوکے سے کہا تھا کہ دو اور دو کے ہوتے ہیں۔ کہا چار روٹیاں۔ حالانکہ مطلق سفر مقاصد شرعیہ سے نہیں بلکہ سفر کے متعلق تو ایک حدیث میں یہ آتا ہے۔

السفر قطعة من العذاب فاذا قضى احدكم نهمه فليعجل الرجوع الى اهله^۱
سفر جہنم کا ٹکڑا ہے جب کام ہو چکے، جلدی سے اپنے گھر لوٹ آؤ۔

ہاں جو سفر دین کے واسطے ہو جیسے حج اور طلب علم و جہاد وغیرہ تو وہ البتہ مشروع ہے اور نعت میں بھی لفظ سیاحت مطلق سفر کے لئے موضوع نہیں بلکہ سیاحت کے معنی ہیں الذہاب فی الارض للعبادة والسائح الصائم الملازم للمسجد کذا فی القاموس۔ پس سخت یا سحون سے مطلق سفر کی فضیلت ثابت نہیں کی جاسکتی۔ پس سلف نے خوب سمجھا ہے السحون اور سخت کی تفسیر سیاحت سے بھی کی تو اس میں عبادت کی قید بڑھادی کہ اگر سفر ہو تو طلب علم کے لئے ہو یا حج کے لئے یا جہاد کے لئے اور حدیث میں بھی تو ہے۔ سیاحۃ امتی الجہاد فی سبیل اللہ اس سے بھی معلوم ہوا کہ مطلق سیاحت و سفر اس امت کی عبادت نہیں جب تک اس کو عبادت کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

اب میں اس تفصیل کے بعد قصر مسافت کرتا ہوں کہ سائنحات کی تفسیر یا سیاحت سے یا صوم سے اور رائج معنی صوم کے ہیں مگر دونوں میں وجہ اشتراک یہ ہے کہ سیاحت میں بھی بعض دفعہ کھانے پینے کو نہیں ملتا کیونکہ سیاح کا مقصود کوئی خاص مقام نہیں ہوتا وہ تو ویسے ہی مارا مارا پھرتا کرتا ہے اور اس کا یہ حال ہوتا ہے۔

دست از طلب نہ دارم تا کام من بر آید ☆ یاتن رسد بجاناں یا جاں زتن بر آید
(میں طلب سے اس وقت ہاتھ نہیں ہٹاؤں گا جب تک میرا کام بن نہ جائے یا تو میرا بدن محبوب تک پہنچ جائے یا میری جان نکل جائے)

اور یہ حالت لندن اور پیرس کے سفر میں کہاں جس میں کھانے پینے کے لئے صد ہاتھم کے سامان ساتھ ہوتے ہیں۔ کہیں سوڈا کہیں برف۔ یہ حالت صرف اسی سفر میں ہوتی ہے جو خدا کے لئے ہو جیسے جہاد کا سفر یا طالب علم کا سفر یا حج کا سفر۔

اس پر مجھ کو ایک حکایت یاد آئی۔ اس سے سیاحت الدین کی شان معلوم ہوگی۔ ایک قاری صاحب جو ریاست رام پور کے رہنے والے تھے ان کو حج کا شوق ہوا اس وقت ان کے پاس صرف ایک روپیہ چار آنے تھے۔ بس اسی طرح انہوں نے حج کا ارادہ کر لیا۔ ایک روپیہ کے توپنے بھنوائے اور چار آنے کا ایک تھیلہ سلوا لیا جس میں وہ چنے بھر لئے اور پیادہ پا چل کھڑے ہوئے۔

۱۔ الصحيح للبخاری ۳: ۱۰۰، ۷: ۷۱، ۷: ۷۲، ۱۰۰: ۱، الصحيح لمسلم کتاب الإمارة: ۷۹، سنن ابن ماجہ: ۲۸۸۲، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۸۹۹، إتحاف السادة المتقين ۷: ۲۹۵، المغنی عن حمل الأسفار: ۱: ۲۶۷

دن کو روزہ رکھتے۔ راستہ میں اگر بلا طلب کھانا مل گیا تو کھالیا ورنہ ایک مٹھی چنے کھائے اور پانی پی لیا۔ اسی طرح کئی مہینے میں بمبئی پہنچے واقعی یہ سیاحت ہے جو ملحق بالصوم ہے۔

اب بمبئی سے آگے دریا تھا اس میں تو چلنا مشکل تھا اور جہاز میں سوار ہونے کیلئے ٹکٹ کے دام چاہئیں اور ان کے پاس دام کہاں، جب حاجی جہاز پر سوار ہونے لگے تو یہ بھی جہاز میں پہنچے اور کپتان سے کہا کہ مجھے بھی جہاز میں نوکری کی ضرورت ہے اس نے ان کی صورت عالمانہ اور بزرگانہ دیکھی تو عذر کر دیا کہ آپ کی شان کے لائق میرے پاس کوئی ملازمت نہیں وہ صورت سے سمجھ گیا کہ یہ کوئی نیک اور بزرگ آدمی ہیں۔

نور حق ظاہر بود اندر ولی ☆ نیک میں باشی اگر اہل دلی
(انوار الہی ولی میں نمایاں ہوتے ہیں اگر تو اہل دل ہے تو آن کا ادراک کر سکتا ہے)
کسی نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔

مرد حقانی کی پیشانی کا نور ☆ کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور
قاری صاحب نے فرمایا کہ آپ لائق اور غیر لائق سے بحث نہ کیجئے جو نوکری بھی ہو کیسی ہی ذلیل ہو میں کر لوں گا۔ (کیونکہ نوکری مقصود تھوڑا ہی تھی جہاز میں سوار ہو کر مکہ پہنچنا مقصود تھا) کپتان نے کہا کہ آپ سے وہ نوکری نہ ہو سکے گی۔ کہا تم بتلاؤ تو ایسی وہ کیا نوکری ہے؟ کہا میرے پاس صرف بھنگی کی نوکری خالی ہے۔ قاری صاحب نے فرمایا کہ مجھے منظور ہے۔ کپتان بڑا حیران ہوا کہ یہ فرشتہ صورت آدمی یہ کام کیسے کرے گا۔ اس نے قاری صاحب کو عاجز کرنے کے لئے کہ اس کے ساتھ ایک کام مشقت کا بھی ہے تم سے نہ ہو سکے گا۔ اگر تم کو اسی پر اصرار ہے تو اچھا یہ بورا اٹھاؤ۔ وہاں دواڑھائی من کا ایک بورا پڑا ہوا تھا۔ قاری صاحب اس کی طرف چلے اور بسم اللہ کہہ کر ہاتھ لگایا اور حق تعالیٰ سے دعا کی کہ یہاں تک تو میرا کام تھا میں نے کر دیا اب آپ کا کام ہے میری امداد فرمائیے اور دعا کر کے جو اٹھایا ہے تو سر سے اوپر لے گئے۔ اور پھر رکھ دیا کپتان نے کمر تھپکی اور کہا شاباش شاباش! اچھا ہم نے تم کو ملازم کر لیا۔ اس کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس دبلے پتلے کمزور آدمی نے اتنا بڑا بورا کیونکر اٹھایا۔ یہ محض خدا تعالیٰ کی امداد تھی ورنہ وہ بیچارے مجاہدے ریاضتیں کرنے والے اور مہینوں کا راستہ پیدل طے کئے ہوئے کب اتنا بوجھ اٹھا سکتے تھے۔

اس وقت اور بھی دو غریب آدمی جو حج کے متمنی تھے کھڑے تھے انہوں نے بھی کپتان سے کہا

کہ ہم کو بھی کوئی ملازمت جہاز کی دے دیجئے اس نے کہا کہ یہی بھنگی کی ملازمت تم کو بھی مل سکتی ہے وہ اس کے لئے آمادہ نہ ہوئے تو قاری صاحب نے فرمایا کہ ارے اللہ کے بندو جج سے کیوں محروم رہتے ہو۔ اگر تم کو اس کام سے عار آتی ہے تو تم یہ نوکری منظور کر لو۔ تمہارا کام بھی میں ہی کر دیا کروں گا۔ چنانچہ کئی آدمیوں کا کام اپنے سر لے لیا اور اب یہ حالت ہوئی کہ روزانہ جہاز کے پاخانوں کو کھاتے اور دھوتے تھے۔ ہائے ۔

ایں چنیں شے گدائے کو بہ کو بہ ☆ عشق آمد لا ابالی فاتقوا
(ایسا فقیر صفت شیخ عشق میں بڑا لا ابالی ہے پس ڈرتے ہی رہو)
یہ عشق کی نیرنگیاں ہیں اس کا کچھ ضابطہ نہیں ہے ۔

عشق رانا زم کہ یوسف را بازار آورد ☆ ہچو صنعا زاہدے راز پر ز نار آورد
(عشق کو اس پر ناز ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ہر بازار سے آیا صنعا جیسے زاہد کو ز نار پہنایا)
بس اس کا ایک ضابطہ تو رہ جاتا ہے کہ شرعی حدود پر رہے باقی سب رخصت اور اگر کوئی عاشق مجذوب ہو گیا تو اس کے لئے یہ ضابطہ بھی نہیں رہتا۔

قاری صاحب دن کو یہ کام کرتے۔ نمازوں کے وقت دوسرے کپڑے غسل کر کے پہن لیتے اور رات کو تہجد میں قرآن خوش الحانی سے پڑھتے ایک دفعہ کپتان بھی رات کو قاری صاحب کے پاس گزرا۔ ان کا قرآن سن کر کھڑا ہو گیا اور سنتار ہا جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو پوچھا، کہ تم یہ کیا پڑھ رہے تھے۔ فرمایا کہ یہ ہمارے خدا کا کلام ہے۔ کپتان بولا کہ ہم کو بھی سکھلاؤ۔ ہم کو یہ اچھا معلوم ہوتا ہے فرمایا کہ اس کے پڑھنے کے لئے پاک ہونا شرط ہے۔ اس نے کہا ہم نہ لیں گے۔ قاری صاحب نے فرمایا وہ پاکی نہانے سے نہیں ہوتی۔ اس کے لئے ایک کلمہ پڑھنا پڑتا ہے۔ اس سے وہ پاکی ہوتی ہے۔ کہاں ہاں ہم سب کچھ کریں گے۔

چنانچہ قاری صاحب نے اس کو غسل کرایا اور غسل کے بعد کلمہ پڑھایا پھر چند سورتیں چھوٹی چھوٹی سکھلائیں۔ وہ کپتان ہر وقت کلمہ یا سورتیں پڑھتا پھرتا تھا۔ دوسرے انگریزوں نے جو اس کا کلمہ اور قرآن پڑھتے ہوئے سنا، کہا یہ تم کیا پڑھتے ہو۔ کہا یہ خدا کا کلام ہے ہم کو اچھا معلوم ہوا اس لئے پڑھتے ہیں انگریزوں نے کہا تم تو اس سے مسلمان ہو گئے۔ کہا نہیں نہیں ہم مسلمان نہیں ہوا انگریزوں نے کہا کہ اس کے پڑھنے سے تو آدمی مسلمان ہو جاتا ہے کہا اچھا ہم اپنے بھنگی سے پوچھ کر آتے ہیں۔

وہ قاری صاحب کے پاس آیا اور کہا کیا ہم مسلمان ہو گیا ہے؟ فرمایا تم کو آج خبر ہوئی تم تو کئی دن ہوئے مسلمان ہو چکے۔ یہ سن کر اول تو اس کو تحیر سا ہوا۔ پھر قرآن کی نورانیت نے اپنی طرف کھینچا اور کہا کہ کچھ پروا نہیں۔ اب بس ہم مسلمان ہی رہیں گے۔ مگر اس کلام کو نہ چھوڑیں گے۔ چنانچہ اس نے اپنی میم سے بھی کہہ دیا کہ ہم تو مسلمان ہو گئے ہیں۔ اگر ہمارے ساتھ رہنا چاہو اسلام قبول کرو ورنہ ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر جب جہاز جدہ کے قریب پہنچا، تو اس پکتان نے بھی اپنے عہدہ سے استعفاء دے دیا اور قاری صاحب کے ساتھ جا کر حج کیا اور بڑا پکا مسلمان ہو گیا۔

یہ قصہ اس پر یاد آ گیا تھا کہ سیاح کے پاس زاد راہ نہیں ہوا کرتا۔ وہ تو مارا مارا پھرا کرتا ہے جیسے یہ قاری صاحب سیاح ہو کر حج کر آئے۔

عمرو بن دینار فرماتے ہیں کہ میں حج کو جا رہا تھا۔ ایک نوجوان لڑکے کو دیکھا کہ بدون زاد و راہلہ کے قافلہ کے ساتھ ہے۔ میں نے پوچھا، صاحب زادے کہاں کا قصد ہے۔ کہا بیت حبیب کا۔ میں نے کہا، اور تم نے زاد و راہلہ کچھ بھی ساتھ نہ لیا۔ تو فوراً جواب دیا

وفدت علی الکریم بغیر زاد من الحسنات والقلب السلیم

(میں کریم کے دروازے پر بغیر سامان سفر کے حسنات اور قلب سلیم سے فدا ہوں)

یہ معنی نہیں کہ اعمال حسنہ بھی ترک کر دیئے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اعمال کو ادا کر کے ان کو زاد نہ سمجھے۔ ان پر اعتماد نہ کرے۔

فان الزاد اقبح کل شیء اذا کان الوفود علی الکریم

(کیونکہ سامان ساتھ لینا ہر شیء سے برا ہے جبکہ وجود کریم کے دروازہ پر ہوں)

میں اس جواب سے سمجھا کہ معمولی شخص نہیں بلکہ عاشق ہے۔ عمرو بن دینار فرماتے ہیں کہ پھر میں اس لڑکے کو منی میں دیکھا جب کہ سب لوگ قربانیاں کر رہے تھے، اس نے حسرت کے ساتھ آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور عرض کیا، بارالہ! سب لوگ آپ کی جناب میں نذر پیش کر رہے ہیں اور میرے پاس بجز اپنی جان کے کچھ نہیں ہے۔ اگر یہ قبول ہو جائے تو حاضر ہے۔ یہ کہہ کر ایک چیخ ماری اور جان دے دی۔ عمرو بن دینار فرماتے ہیں کہ اسی وقت میں نے ہاتھ کی آواز سنی کہ وہ کہہ رہا ہے کہ اس قربانی کی بدولت سب کی قربانیاں اس سال قبول ہو گئیں اور اس کے حج کی بدولت سب کا حج قبول ہو گیا۔

خیر یہ مضمون بیچ میں استطراد آ گیا تھا جس کو مضمون مقصود سے زیادہ تعلق نہ تھا مگر کچھ مضائقہ نہیں اس کی بھی ضرورت تھی کیونکہ اب حج کا بھی موقع آرہا ہے۔

سر اپا انعامات

بہر حال بعض علماء نے جو سائح کی تفسیر سیاحت کنندہ سے کی ہے انہوں نے سیاحت کرنے والے کو تشبیہا بالصائم سائح کہہ دیا ہے۔ صائم کو سیاحت کرنے والے کے ساتھ تشبیہ دے کر سائح نہیں کہا گیا۔ پس اصل تفسیر سخت کی صائمات ہے اور قول جمہور دلیل مستقل ہے کہ اکثر علماء مفسرین نے سخت کی تفسیر یہی کی ہے جب یہ معلوم ہو گیا کہ سخت کی تفسیر روزہ رکھنے والیاں ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ روزہ بڑی عبادت ہے کیونکہ تخصیص بعد تعمیم اہتمام کے لئے ہوتی ہے تو حالانکہ مسلمات اور عبادات میں روزہ بھی داخل تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو اہتمام کے ساتھ الگ بیان فرمایا ہے جس سے اس کی خاص عظمت و فضیلت معلوم ہوئی کہ یہ بہت بڑی عبادت ہے مگر اس سے ناز نہ کرنا کہ ہم نے بڑا کام کیا بلکہ حق تعالیٰ کا احسان سمجھو کہ انہوں نے ہم سے یہ کام لے لیا۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمیں کنی ☆ منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت
(تو اس بات کا احسان نہ رکھ کہ بادشاہ کی خدمت کرتا ہے بلکہ بادشاہ کا ممنون احسان ہو جس نے تجھے ملازم رکھ لیا ہے)

دیکھو! اگر کسی سائیکس کو عید کے دن آقا سے آٹھ آنے انعام ملنے کی امید ہو اور اس کو آٹھ ہزار مل جائیں تو وہ ناز کرے گا یا حیا سے گڑ جائے گا۔ کہ مجھ نالائق پر ایسا انعام۔ اسی طرح آپ اس پر ناز نہ کیجئے کہ آپ روزہ رکھ رہے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا احسان مانئے کہ انہوں نے آپ سے یہ کام لے لیا اور شکر کے طور پر یوں کہئے۔

تصدق اپنے خدا پہ جاؤں یہ پیار آتا ہے مجھ کو انشا
ادھر سے ایسے گناہ پیہم ادھر سے انعام یہ دم بدم
حضرت جتنے کام حق تعالیٰ ہم سے لے رہے ہیں، یہ خود انعام ہے پھر انعام پر انعام کیسا؟
انعام تو عمل پر ہوا کرتا ہے اور یہاں خود یہ اعمال ہی سر اپا انعامات ہیں ورنہ ہم کس قابل تھے کہ حق تعالیٰ کی عبادت کر سکیں اس کو شیخ فرماتے ہیں۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمیں کنی ☆ منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

(تو بادشاہ پر اپنا احسان نہ سمجھ کہ تو اس کی خدمت کرتا ہے مگر بادشاہ کا تجھ پر احسان ہے کہ اس نے تجھے خدمت کرنے کی اجازت دی ہے)

سہولت صوم

اس وقت بیان سے ایک مقصود تو فضیلت صوم تھی جو مختصراً بیان ہو گئی۔ دوسرا مقصود سہولت صوم کا بیان ہے جس کا بیان اس جمعہ کے وعظ میں ہو چکا ہے۔ مگر بعض باتیں اس وقت بیان نہ ہوئی تھیں وہ اب بیان کروں گا۔ گویا یہ اس کا تہہ ہوگا۔ اس لئے اہل طابع کو بھی مناسب ہے کہ ان دونوں کو ایک ساتھ ہی طبع کیا جائے۔

اب سنئے کہ اس آیت سے بھی ایک وجہ سہولت صوم کی معلوم ہوتی ہے مگر اس کے لئے ایک مقدمہ سمجھنے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ اقتران بالذکر فضول نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ اس سے بھی کچھ فائدہ مقصود ہوتا ہے۔ جب دو چیزوں کو ذکر میں مقترن کیا جاتا ہے تو ان دونوں میں کچھ تعلق و ارتباط و مناسبت و مشابہت ضرور ہوتی ہے۔ جس کی دلیل دو حدیثیں ہیں۔

ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور (تم لوگ گندگی سے یعنی بتوں سے (بالکل) کنارہ کش رہو اور جھوٹی بات سے کنارہ کش رہو) کی تفسیر میں فرمایا ہے عدلت شهادة الزور بالشرك بالله لمر جھوٹی گواہی شرک باللہ کے برابر کر دی گئی۔ حالانکہ آیت میں محض اقتران ذکر ہے اس کے سوا تسویہ پر کوئی امر بظاہر دال نہیں۔

دوسرے جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا و مروہ کے درمیان سعی فرمائی ہے تو یہ آیت پڑھی ان الصفا والمروة من شعائر اللہ پھر ارشاد فرمایا نبداً بمابداء اللہ۔ پھر یہاں بھی محض ترتیب ذکر کی وجہ سے صفا کو مروہ پر مقدم فرمایا۔ اور خود ہمارے محاورات میں بھی یہ بات ہے کہ جب کوئی ایسی دو چیزوں کو ذکر میں مقترن کرے جن میں باہم ارتباط نہ ہو یوں کہتے ہیں کہ اس میں اور اس میں کیا جوڑ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اقتران فی الذکر فضول نہیں ہوا کرتا بلکہ اس سے مقترنین میں مناسبت و تعلق پر دلالت ہوتی ہے۔

۱۔ سنن ابی داؤد ۳۵۹۹، سنن الترمذی: ۲۳۰۰، سنن ابن ماجہ: ۲۳۷۲، مشکوٰۃ: ۳۷۷۹
 ۲۔ سنن الترمذی: ۸۶۲، ۲۹۶۷، سنن النسائی کتاب الحج باب: ۱۵۷، باب: ۱۶۲، باب: ۱۶۶، سنن ابن ماجہ: ۳۰۷۴، مؤطا مالک: ۳۷۲

اب سمجھئے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے سائنحات کو جس کی تفسیر ابھی معلوم ہو چکی ہے کہ اس کے معنی روزہ رکھنے والیوں کے ہیں مقرون کیا ہے ثبوت و ابکار کے ساتھ۔ جو صفات غیر اختیاریہ ہیں اور صفات غیر اختیاریہ سب سے زیادہ سہل ہیں کیونکہ ان میں کچھ بھی کرنا نہیں پڑتا حتیٰ کہ ارادہ و اختیار کو بھی صرف کرنا نہیں پڑتا بلکہ وہ بدون ارادہ و اختیار کے خود بخود ثابت ہیں اور اوپر ابھی معلوم ہوا کہ اقترن حکمت سے خالی نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ صفت صوم کو صفات غیر اختیاریہ سے مقرون کرنے میں بھی کچھ حکمت ہے۔ اور وہ حکمت میرے نزدیک یہی ہے کہ صوم بھی مثل صفات غیر اختیاریہ کے سہل ہے کہ اس میں بھی کچھ فعل و جود ہی کرنا نہیں پڑتا۔ پس اس آیت سے سہولت صوم پر عجیب طرز سے دلالت ہے۔

رہا یہ کہ یہ صفات غیر اختیاریہ کیسے ہیں تو سنئے کہ ثبوت تو اس لئے غیر اختیاری ہے کہ لغت میں ثبوت بکارت کے مقابل ہے۔ اور شرعاً شیب وہ ہے جو صاحب زوج ہو چکی ہے پھر اس سے فرقت ہو گئی ہے۔ بوجہ طلاق یا موت کے اور بکروہ ہے جو ابھی تک صاحب زوج نہیں ہوئی۔ پس ثبوت کے مفہوم میں دو جز ہیں۔ ایک صاحب زوج ہونا جو نکاح پر موقوف ہے اور نکاح کو بعض صورتوں میں حقیقتاً عورت کی منسوب ہوتا ہے مگر اس کی نسبت ایسی ضعیف ہے کہ گویا بمنزلہ عدم کے ہے اور اس بنا پر اگر کوئی یوں کہنے لگے کہ عورت خود اپنا نکاح نہیں کرتی بلکہ اس کا نکاح ولی کرتا ہے تو یہ بات غلط نہیں۔ کیونکہ اگر وہ صغیرہ ہے تب تو ظاہر ہے کہ اس کا نکاح میں کچھ بھی دخل نہیں اور اگر بالغہ ہے تو نکاح اول میں جو کہ ثبوت کا پہلا جزو ہے اس کا لزوم تعلق شرعاً معدوم ہے۔ صرف اس کا سکوت ہی اذن قرار دیا گیا اور اس بنا پر جو بوجہ اس کے کہ اس کو اتنا اختیار تھا کہ انکار کر دیتی اس کے سکوت کو نکاح کا سبب اختیاری کہا جائے گا۔ لیکن پھر بھی یہ اختیار عادت طبعیہ کے اعتبار سے مثل عدم اختیاری کے ہے۔ یہ تو جز اول کی حالت پر اور دوسرا جزو یہ ہے کہ نکاح کے بعد فرقت ہو جائے۔ یہ تو بالکل ہی عورت کے اختیار میں نہیں کیونکہ فرقت اگر طلاق سے ہے تو وہ زوج کے اختیار میں ہے عورت کا اس میں کچھ اختیار نہیں اور موت سے ہے تو یہ کسی کے بھی اختیار میں نہیں اور جن صورتوں میں عورت کو طلب فرقت کا اختیار بھی ہے وہاں قضاء قاضی شرط ہے یا متارکت زوج ضروری ہے تو وہاں بھی فرقت عورت کے اختیار میں نہ ہوئی بلکہ زوج ہی کے اختیار میں ہوئی۔ کیونکہ جہاں قضاء قاضی سے فرقت ہو سکتی ہے ان صورتوں میں قاضی زوج کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ رہی

ردت وہ ناگوار و مکروہ اور مسلمان کی شان سے بعید و مستنکر ہے۔ اس کے اعتداد کی کوئی وجہ نہیں۔ پس ثبوت کو اگر اپنے جز و اول کے اعتبار سے من کل الوجوہ غیر اختیاری تسلیم نہ بھی کیا جائے تب جز و ثانی کے اعتبار سے تو یقیناً غیر اختیاری ہے کہ اس صفت کا ثبوت عورت میں بدون اس کے اختیار کے ہو جاتا ہے۔ تو جز و اخیر ثبوت کی علت تامہ کا ہر حال میں غیر اختیاری رہا۔ اگر مجموعہ اجزاء پر نظر کی جائے تب بھی مجموعہ اختیاری و غیر اختیاری کا غیر اختیاری ہوتا ہے تو ثبوت غیر اختیاری ہی رہی۔ اور بکارت کا غیر اختیاری ہونا تو ظاہر ہے پس سحت کا مثبت و ابکارا کے (وہ اسی اقتران کی مثل ایک اور صفت ہے اقتران اسی کا ہم اثر ہے تقدیر اس کی یہ ہے کہ سورۃ احزاب میں صائمین و صائمات کا اقتران محافظین فروجہم و محافظات کے ساتھ ذکر میں واقع ہوا ہے اور حفظ فروج اہل طبائع کا سلیمہ کا اور ان میں سے بھی بالخصوص اناث کا امر طبعی ہے تو اس امر طبعی کے ساتھ اقتران نیز مویذ ہر صوم کے مشابہ امور طبعیہ ہونے کا جو کہ بے حد سہل ہوتے ہیں جیسا کہ متن میں مذکور ہے یہ مضمون بعد میں ذہن میں آیا۔ اس لئے حاشیہ میں لکھ دیا گیا۔ ۱۲ منہ) ساتھ مقرون کرنا بتلا رہا ہے کہ صوم مثل امور طبعیہ کے سہل ہے اور واقعی غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ صوم امر طبعی ہے کیونکہ امر طبعی وہ ہے جس کے لئے قصد و ارادہ کی ضرورت نہ ہو اور ظاہر ہے کہ کھانے پینے کے لئے تو قصد و ارادہ کی ضرورت ہے اور نہ کھانے اور نہ پینے کے لئے قصد و ارادہ کی کیا ضرورت ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ ہم گھنٹوں بدون کھانے پینے کے کام میں لگے رہتے ہیں اس وقت اس حالت پر التفات بھی نہیں ہوتا کہ ہم اس وقت کھاتے پیتے نہیں ہیں۔

دوسرے یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کے زیادہ تر اوقات نہ کھانے اور نہ پینے ہی کے ہیں۔ کھانے پینے کے تو چند اوقات معین ہیں۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ نہ کھانا نہ پینا امر اصلی ہے۔ اگر کھانا پینا امر اصلی ہوتا تو اس کے اوقات زیادہ ہوتے مگر واقعہ اس کے خلاف ہے اور اصلی میں اصل سہولت ہے۔

رہا یہ شبہ کہ نہ کھانے پینے کی حالت میں جو التفات شراب و طعام کی طرف نہیں ہوتا تو یہ اسی وقت تک ہے جب تک بھوک نہ لگے اور جب بھوک لگتی ہے تو خاص التفات ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو بھوک میں بھی طعام و شراب کی طرف التفات بیکاری کی حالت میں ہوتا ہے اور اگر کسی کام میں لگ جائے تو کھانے پینے کی تو کیا بھوک کی خبر نہیں ہوتی۔

چنانچہ بہت واقعات ایسے ہو چکے ہیں اور کم و بیش ہر شخص کو اس کا تجربہ ہوتا ہوگا اور اگر مان بھی لیا جائے کہ بھوک میں طعام و شراب کی طرف التفات ہوتا ہے تو اس کا تو انکار ہی نہیں ہو سکتا کہ یہ ایک عارض کی وجہ سے ہے۔ اب معدہ ان رطوبات اصلیہ کے ہضم کی طرف متوجہ ہو گیا جس سے تکلیف ہوتی ہے۔ جب یہ عارض مرتفع ہو جائے گا التفات بھی جاتا رہے گا۔

اب یہاں سے میں ایک اور شبہ کا جواب دینا چاہتا ہوں جس کا جواب دینا جمعہ کو (یاد نہ رہا ہوگا ورنہ اس وعظ میں بھی مذکور ہے ۱۲ منہ) بھول گیا تھا۔ وہ یہ کہ نہ کھانا اور نہ پینا اگر آسان ہے تو کسی کو مہینہ بھر تک بھوکا رکھ کر دیکھا جائے۔ معلوم ہو جائے گا کہ نہ کھانا کیوں کر آسان ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عدم اکل کی حقیقت فی نفسہ دشوار نہیں بہت سے بہت آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ استدعا عدم اکل دشوار ہے۔ تو یہ دشواری استدعا عارض سے ہو گئی نہ کہ حقیقت عدم اکل سے۔ اور شریعت نے جو عدم اکل و شرب کی حد مقرر کی ہے وہ ممتد نہیں ہے۔ اسلئے صوم کچھ دشوار نہیں ہے پس اب سب اشکالات رفع ہو گئے اور سہولت صوم کا یہ دعویٰ بے غبار ہو گیا۔

نماز روزہ کی پابندی کا فرق

پھر اقتران سخت و ثبیت و ابکارا علاوہ خصوصیت مقام سے اس سہولت میں ایک اور اضافہ ہو گیا۔ وہ یہ کہ اس جگہ عورتوں کے روزہ کا ذکر ہے اور عورتوں کو طبعاً بھی روزہ اس لئے آسان ہے کہ ان میں رطوبت و برودت زیادہ غالب ہوتی ہے۔ ہاں کوئی ضعیف و نحیف ہو تو اور بات ہے ورنہ عام طور سے مزاج عورتوں کا رطب و بارد ہے اور ایسے مزاج والے کو روزہ دشوار نہیں ہوتا۔ روزہ حار و یابس مزاج والے کو زیادہ گراں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورتیں نماز میں تو سست ہیں مگر روزہ میں بچیاں بھی ہمت والی ہیں۔

نیز عورتوں کا طرز عمل بھی بتلاتا ہے کہ ان کو روزہ سہل ہے۔ وہ یہ کہ عورتیں جب کبھی نذرو منت مانتی ہیں تو زیادہ تر روزہ کی منت مانتی ہیں۔ نماز کی نذر کوئی کوئی کرتی ہے کیونکہ نماز ان کو گراں ہے۔ اس میں پابندیاں بہت ہیں اور افعال اختیار یہ بھی زیادہ ہیں۔

پابندی کا تو یہ حال ہے کہ نماز میں بات بھی نہیں کر سکتے۔ گو ہمارے ہاں ایک بڑھیا ہے وہ تو نماز میں بولتی رہتی ہے مگر یہاں بڑھیا عورتوں کا ذکر ہے جو سمجھ دار ہیں اور وہ بڑھیا تو پاگل ہے اور یہ خاص پابندی عورتوں پر سب سے زیادہ سخت ہے کیونکہ ان کو بولنے اور باتیں کرنے کا زیادہ شوق ہوتا

ہے۔ اور نماز میں افعال اختیار یہ زیادہ اس طرح ہیں کہ کہیں قرأت ہے کہیں ذکر کبھی قیام ہے، کبھی قعود، کبھی رکوع ہے، کبھی سجود اور روزہ نہ کچھ پابندی ہے نہ کچھ کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر طرح آزادی ہے۔ جدھر چاہو دیکھو جہاں چاہو چلو پھرو۔ چاہے باتیں کرو، چاہے سو رہو، روزہ ہر حالت میں موجود ہے مگر نماز میں ان سب پابندیوں کے ساتھ ایک آزادی ایسی ہے جو کسی عبادت میں بھی نہیں۔ وہ یہ کہ نماز کی حالت میں انسان مخلوق کی تعظیم بجالانے سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اگر ایک ادنیٰ سپاہی بھی نماز میں ہو اور بادشاہ وقت اس کے پاس سے گزر جائے تو وہ کبھی عدم تعظیم کا شاکہ نہ ہوگا۔ گو کافر ہی بادشاہ کیوں نہ ہو۔ بشرطیکہ وہ نماز کی حقیقت سے واقف ہو۔ روزہ میں یہ بات نہیں ہے روزہ میں تو آپ کو اپنے پاس آنے والے مہمانوں کی خاطر تواضع، تعظیم و تکریم سب ہی کچھ کرنا پڑے گی۔

خلوت گاہ حق

مجھے اپنے پھوپھا کے بھائی مولوی ظہیر الدین مرحوم کا قصہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی۔ وہ درویش آدمی تھے اور ایسے آدمی کو مخلوق کے اختلاط سے تکلیف ہوتی ہے۔ تو انہوں نے گوشہ نشینی کی یہ صورت اختیار کی کہ اپنی بیٹھک میں رہتے اور ہر وقت نماز پڑھتے رہتے۔ یہ خلوت درانجمن تھی۔ اس حالت میں بھی کوئی ان سے ملنے آ جاتا تو نماز کا سلام پھیر کر وہ ایک دو بات کر لیتے تھے اور بقدر ضرورت بات کر کے پھر اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کر دیتے۔ اس طرح سے جلوت میں بھی خلوت ہو گئی تھی۔ ورنہ اگر خلوت کی یہ صورت اختیار کرتے کہ جنگل میں چلے جاتے یا گھر کے کواڑ بند کر لیتے تو اس سے شہرت ہو جاتی اور شہرت کے بعد انسان کو چین نہیں ملتا۔ لوگ خواہ مخواہ آ کر گھیر لیتے ہیں جن سے بد خلقی بھی نہیں کی جاسکتی۔ بس یہ ترکیب بہت اچھی تھی کہ نماز کی کثرت کرتے تھے، اس سے نہ تو شہرت ہوئی نہ خلوت فوت ہوئی۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں

گر گریزی بر امید راحتے ☆ ہم از آنجا پشت آید آفتے

ہیج کنجے بے دود بے دام نیست ☆ جز خلوت گاہ حق آرام نیست

(اگر کسی راحت یا آرام کی امید پر بھاگتا ہے تو اس جگہ بھی تجھ کو کوئی آفت پیش آئے گی، کوئی

گوشہ بغیر دوڑ دھوپ اور بغیر دام کے نہیں ہے سوائے خلوت گاہ حق کے کہیں آرام نہیں ہے)

خلوت گاہ حق سے یہ مراد نہیں کہ حجرہ میں بند ہو کر رہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ خلوت درانجمن

کرو۔ جس کے لئے نماز کی ترکیب سب سے زیادہ بہتر ہے کہ اس میں کوئی کچھ شکایت ہی نہیں

کر سکتا۔ وظیفہ میں مشغول رہنے سے بھی آرام نہیں مل سکتا۔

چنانچہ میں ایک بار نماز کے بعد وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ ایک صاحب پیچھے سے آئے اور میرا کندھا پکڑ کے مصافحہ کا مطالبہ کیا۔ اور اگر کوئی یوں چاہے کہ آنکھیں بند کر کے سونے کا بہانہ کر کے پڑ رہوں تو اس طرح بھی چین نہیں مل سکتا۔

ایک دفعہ میں سیوہارہ گیا تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ رات کو سفر کیا تھا صبح نیند کا غلبہ ہوا۔ ایک تخیلہ کے مکان میں سونے کے قصد سے جالیٹا۔ ایک صاحب جوج کو جاتے تھے ملنے کیلئے آئے اور بلند آواز سے کہا، السلام علیکم۔ اس وقت مجھے کچھ کچھ نیند آچلی تھی۔ مگر ان کے سلام سے نیند کا فور ہو گئی میں جاگ تو گیا مگر میں نے قصد آنکھیں نہ کھولیں۔ اور ویسے ہی آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ بعض حاضرین نے ان سے کہا کہ اس وقت آنکھ لگ گئی ہے۔ آپ تشریف لے جائیں کہنے لگے واہ! ہم حج کو جا رہے ہیں۔ ہم تو مصافحہ کر کے جائیں گے۔ ان ہی بعض حاضرین احباب نے کہا، بھائی یہ وقت مصافحے کا نہیں مگر انہوں نے ایک نہ مانی۔ اور اسی حالت میں اپنے ہاتھوں کو میرے ہاتھوں سے رگڑ کر اور اپنے نزدیک مصافحہ کر کے چلتے ہوئے۔ ان کا تو مصافحہ ہوا مگر میری نیند برباد ہو گئی۔

لکھ کر ہمارا نام زمین پر مٹا دیا ☆ ان کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا
پس تجربہ سے معلوم ہوا کہ سونے کی حالت میں بھی مخلوق چین نہیں لینے دیتی۔ مولانا تو یوں فرماتے ہیں۔
گر گریزی برامید راحۃ ☆ ہم از آں جاپشت آید آفتے
(اگر کسی راحت یا آرام کی امید پر بھاگتا ہے تو اس جگہ بھی تجھ کو کوئی آفت پیش آئے گی)

کیونکہ میں تو راحت ہی کے لئے نیند کی صورت بنا کر لیٹا تھا مگر اس حالت میں بھی آفت کا سامنا ہوا۔ بس ان آفات سے نجات نماز ہی میں مل سکتی ہے۔ تو نماز میں گودا غلی پابندیاں ہیں مگر مخلوق سے بالکل آزادی ہو جاتی ہے۔ یوں کہنا چاہئے کہ نمازی خدا کا غلام ہو کر مخلوق کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ تو یہ آزادی تو نماز میں سب سے زیادہ ہے۔

نماز روزہ کا فرق

باقی دوسری آزادیاں روزہ میں زیادہ ہیں کہ نماز ہنسنے بولنے اور رونے اور پیشاب پاخانہ سے ٹوٹ جاتی ہے۔ روزہ میں ایسی آزادی ہے کہ وہ کسی بات سے نہیں ٹوٹتا۔ سوائے اکل و شرب و جماع کے۔ وہ بھی اس وقت جب کہ عمدہ کھایا پیاجائے اور بھول کر کھاپی لے تو کچھ ہرج نہیں

اور نماز میں عمدہ نسیان سب برابر ہیں وہاں جتنے مقصدات ہیں ہر حال میں مفید ہیں۔

ہاں ایک مولوی صاحب کی مریدنیوں کا مذہب لیا جائے تو پیشاب پاخانہ سے بھی روزہ ٹوٹے گا۔ ان مریدنیوں کی یہ حالت تھی کہ مغرب کی اذان سنتے ہی اور تو سب کھانے پینے کی طرف دوڑتے اور وہ لوٹا لے کر پاخانہ کی طرف دوڑتے۔ اوروں کا افطار تو چھوڑا اور پھلکیوں سے ہوتا تھا اور ان کا افطار رفع حاجت سے ہوتا تھا۔ بیچاری دن بھر پیشاب پاخانہ کو دبائے پھرتی تھیں۔ مغرب کے وقت ان کو سب سے پہلے اسی کا اقتضا ہوتا تھا۔

خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا ورنہ روزہ میں ایسی آزادی ہے کہ وہ کسی کام سے نہیں ٹوٹتا جب تک عدا اکل و شرب و جماع نہ ہو۔ یہ دوسرا مقصود بالبیان تھا کہ روزہ بہت سہل ہے اس کی تفصیل جمعہ کے وعظ میں ہو چکی ہے بعضی اسی وقت رہ گئی تھیں وہ اب بیان کر دی گئیں۔

یہ مضمون میں نے اس لئے بیان کیا ہے تاکہ لوگ روزہ کو گراں نہ سمجھیں کیونکہ بعضے لوگ ایسے موجود ہیں جو روزہ کو گراں سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اسی لئے تو ختم رمضان پر آخری جمعہ کو کہتے ہیں الوداع الوداع یا شہر رمضان۔ کہ اے رمضان رخصت رخصت اور بار بار اس لفظ کا تکرار کرتے ہیں اور جو شخص دو بار یا تین بار کہے رخصت رخصت تو سارے زبان دانوں سے پوچھ لو کہ وہ کیا کہیں گے۔ سب یوں ہی کہیں گے کہ پاپ کاٹ رہا ہے۔ اگر اس کو حسرت ہوتی تو بار بار رخصت رخصت نہ کہتا بلکہ ایک ہی بار دبی زبان سے رخصت کہتا۔

نیز اگر ان کو رمضان کے جانے کی حسرت ہوتی تو رمضان کے آنے کی خوشی بھی تو ہوتی۔ تو ابتداء رمضان میں ایک خطبہ مرحبا مرحبا یا شہر رمضان کا بھی پڑھنا چاہیے اور وہاں تکرار مرحبا مفید مسرت ہے یہ محاورہ کے موافق ہے۔ اور صاحبو! یہ سب زبانی دعوے ہیں ورنہ دلوں کو ٹوٹل کر دیکھ لیا جائے ان لوگوں کو رمضان کے جانے کی حسرت ہوتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ آج رمضان کی ۲۹ تاریخ ہے۔ نہ معلوم کتنوں کی نیتیں بگڑ رہی ہوں گی کہ کسی طرح آج ہی چاند ہو جائے۔ خصوصاً یہ سن کر کہ بعض جگہ آج ۳۰ تاریخ۔ مگر وہ ہیں کی تیس ہے۔ ہمارے یہاں تو آج ۲۹ ہی ہے۔ اب اس حالت میں کیسے مان لیا جائے کہ ان کو رمضان کے جانے کا رنج ہے اور آنے کی مسرت ہے بلکہ حالت اس کے برعکس ہے کہ رمضان کے آنے سے گرانی ہوتی ہے اور جانے سے خوشی ہوتی ہے۔ میں اس بیان سے اس کا علاج کرنا چاہتا ہوں کہ روزہ کو گراں نہ سمجھو وہ تو بہت آسان و سہل

ہے اس لئے اس کے آنے سے گرائی اور جانے سے مسرت نہ ہونی چاہیے۔

فرحت افطار

ہاں ایک طرح اختتام رمضان شرعاً بھی موجب فرح ہے کہ اس خیال سے فرح ہو کر الحمد للہ خدا تعالیٰ نے ہم سے یہ کام لے لیا۔

شکر للہ کہ نہ مردیم ورسیدیم بدوست آفریں باد بریں ہمت مردانہ ما
(اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم خیریت سے دوست تک پہنچ گئے ہماری اس ہمت مردانہ پر آفرین ہے)

چنانچہ اکثر علماء نے حدیث للسانم فرحتان فرحة عند الفطر وفرحة عند لقاء الرحمن کی تفسیر میں یہی فرمایا ہے کہ افطار کے وقت جو فرحت ہوتی ہے وہ اتمام عمل کی وجہ سے ہوتی ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام لے لیا۔ اور روزہ تمام آفات سے منزہ ہو کر پورا ہو گیا۔ اور بعض نے فرحت افطار کا سبب ظاہری بیان کیا ہے کہ افطار کے وقت زوال جوع اور تناول غذا و شراب سے خوشی ہوتی ہے اور یہ اختلاف تفسیر اختلاف مذاق پر مبنی ہے۔ لوگوں کے مذاق مختلف ہیں۔ کسی کو افطار کے وقت کھانے پینے کی خوشی ہوتی ہے اور کسی کو اتمام عمل کی۔

اختلاف مذاق پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک بادشاہ نے ملک کی چار سستوں کی چار عورتیں اکٹھی کر کے ان کو داخل محل کیا تھا۔ ایک مشرقی تھی، ایک مغربی، ایک جنوبی، ایک شمالی، پھر اس نے سب کی ذہانت و لطافت مزاج کا امتحان کرنا چاہا تو ایک رات صبح کے قریب سب سے پوچھا کہ بتلاؤ اب کیا وقت ہے۔ سب نے بالاتفاق کہا کہ صبح قریب ہے۔ بادشاہ نے ہر ایک سے دلیل پوچھی کہ تم کو محل کے اندر بیٹھے ہوئے کس طرح معلوم ہوا کہ صبح ہو چکی، ایک نے جواب دیا کہ میری نتھ کا موتی ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ جواہرات صبح کی ہوا سے ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ دوسری نے کہا کہ شمع کی روشنی دھیمی ہو گئی ہے۔ تیسری نے کہا کہ پان کا مزہ منہ میں بدل گیا ہے۔ چوتھی نے کہا کہ پیشاب آ رہا ہے صبح ہی کو پیشاب پاخانہ کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ بات ایک ہی تھی مگر اختلاف مذاق کی وجہ سے ہر ایک نے اپنے اپنے مذاق کے موافق وجہ بیان کی۔

اسی طرح فرحت صائم کی توجیہات میں اختلاف مذاق سے اختلاف ہو گیا۔ ہم جیسوں

نے فرحت دنیویہ پر محمول کیا اور اکابر نے فرحت دینیہ پر۔

تکمیل صوم

اب ایک تیسرا مقصود اور ہے اس کو بیان کر کے میں ختم کر دوں گا۔ وہ یہ کہ جس طرح صوم سہل ہے ایسے ہی تکمیل صوم بھی سہل ہے اور یہ مضمون بھی جمعہ کو بیان سے رہ گیا تھا اور اس کے بیان کی ضرورت اس لئے ہے تاکہ ہم تکمیل صوم کی فکر کریں۔ بہت لوگ اس میں کوتاہی کرتے ہیں حالانکہ یہ نہایت اہم ہے۔ حدیث میں ہے: **من لم يدع قول الزور والعمل به فليس لله حاجة ان يدع شرابه وطعامه** جو شخص بیہودہ باتیں اور بیہودہ عمل ترک نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ بھوکا اور پیاسا رہے۔

اس میں تنبیہ ہے کہ روزہ میں ترک اکل و شرب وغیرہ سے زیادہ ترک محرمات کا اہتمام کرنا چاہیے کیونکہ اکل و شرب و جماع فی نفسہ تو حرام نہیں بلکہ روزہ کی وجہ سے ایک وقت خاص وحد متعین تک ممنوع ہو گئے ہیں اور قول زور و عمل زور تو فی نفسہ حرام ہے۔ یعنی جھوٹ، غیبت، زنا، سود، رشوت وغیرہ جب تم نے محرمات کا ارتکاب کر کے روزہ کو ناقص کر دیا تو اللہ تعالیٰ کو تمہارے بھوکے پیاسے رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جھوٹ اور غیبت اور سود و رشوت سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ نہیں! روزہ تو نہیں ٹوٹتا مگر ان اعمال کے ساتھ جو روزہ ہوتا ہے وہ ایسا روزہ ہے جیسے تم کسی سے کہو کہ فلاں کام کے واسطے ایک آدمی کی ضرورت ہے اور وہ وکیل تمہارے سامنے ایک مضغہ گوشت لا کر رکھ دے جو نہ حرکت کر سکے نہ کام کر سکے اور جب اس سے کہا جائے کہ میاں یہ کس کے لئے آئے تو وہ جواب میں کہے کہ آپ نے آدمی کو کہا تھا اور یہ آدمی ہے کیونکہ حیوان ناطق اس پر صادق ہے۔ پس جیسے یہ مضغہ لحم معقول آدمی تھا مگر کام کا آدمی نہ تھا ایسے ہی آپ کا روزہ محض اصطلاحی روزہ ہوگا مگر کام کا روزہ نہ ہوگا۔

اس حالت میں آپ ایسے روزہ دار ہوں گے جیسے ایک نوجوان مولوی صاحب گاؤں میں گئے تھے اور وہاں جا کر وعظ میں بے نمازیوں کی خوب خبر لی کہ بے نمازی آدمی سو اور کتے سے بھی بدتر ہے۔ اس پر گاؤں کے چوہدری خفا ہو گئے اور لاشعیاں لے کر رات کو مولوی صاحب کے مارنے کو اکٹھے ہو گئے جس شخص کے یہاں مولوی صاحب کا قیام تھا وہ یہ خبر سن کر گھبرا یا ہوا آیا اور کہا

مولوی صاحب آپ اپنی جان کی خیر مناؤ۔ گاؤں والے آپ کو مارنے کے واسطے آگئے۔ کہا، کیوں؟ کہا اس لئے کہ آپ نے ان کو سورا اور کتا بنایا تھا کہا بس اتنی بات پر تھا ہیں ان سے تو میں نمٹ لوں گا۔ چنانچہ گاؤں والے جب سامنے آئے تو مولوی صاحب نے پوچھا کہ بھائیو! تم کیوں آئے ہو؟ سب نے کہا ہم تم کو ماریں گے کیونکہ تم نے ہم کو سورا اور کتے سے بدتر کہا ہے مولوی صاحب نے کہا کہ میں نے تم کو سورا اور کتے سے بدتر نہیں کہا بلکہ بے نمازیوں کو کہا ہے اور تم تو نمازی ہو۔ بتلاؤ تم نے کبھی آخری جمعہ کی نماز بھی پڑھی ہے؟ کہا ہاں! کئی دفعہ۔ پھر پوچھا اور عید بقر عید کی نماز بھی پڑھی ہے؟ کہا یہ تو ہر سال پڑھتے ہیں۔ کہا پھر تم بے نمازی کدھر سے ہوئے تم تو نمازی ہو بے نمازی تو وہ ہے جس نے عمر بھر میں ایک دفعہ بھی نماز نہ پڑھی ہو۔ یہ سن کر گاؤں والے خوش ہو گئے کہ ہم بھی نمازیوں میں داخل ہو گئے۔

تو جیسے یہ لوگ نمازیوں کی فہرست میں داخل ہو کر خوش ہو گئے ایسے ہی ہم اپنے کو روزہ داروں میں شامل سمجھ کر خوش ہیں۔ گو گاؤں والوں کی یہ خوشی ایک معنی کو صحیح بھی تھی۔ وہ گوپکے نمازیوں کے سامنے بے نمازی تھے مگر پھر بھی غنیمت تھے کیونکہ یہ عید کے نمازی میرٹھ کے اس مسلمان بیرسٹر سے تو اچھے تھے جس سے عید کے دن مسلمان ملنے گئے تو وہ کہتا ہے کہ ویل (Well) آج آپ لوگوں کا عید تھا اس کم بخت کو اس سے بھی عار تھی کہ اسلامی عید کو اپنی طرف منسوب کرے۔ تو وہ گاؤں کے عید کے نمازی اس سے بدرجہا بہتر تھے۔ وہ اسلامی عید کو اپنی عید تو سمجھتے تھے اور سال بھر میں ایک دفعہ تو خدا کے سامنے جھک جاتے تھے۔ گو پنج وقتہ نماز پڑھنے والوں کے اعتبار سے وہ بے نمازی ہی ہیں۔ جیسا کہ پنج وقتہ معمولی نماز پڑھنے والے کامل نماز پڑھنے والوں کے سامنے بے نمازی ہیں جس کو مولانا فرماتے ہیں۔

پنج وقت آمد نماز اے رہنموی ☆ عاشقاں ہم فی صلوة دامنوں

(نماز تو پانچ وقت آئی ہے مگر عاشق ہمیشہ نماز میں رہتے ہیں)

اس کا یہ مطلب نہیں جیسا کہ آج کل کے جاہل صوفیوں اور ملحدوں نے سمجھا ہے کہ آج پنج وقتہ کی کچھ ضرورت نہیں۔ یہ تو اہل ظاہر کی نماز ہے عاشقوں کی نماز تو مراقبہ ہے جو ہر وقت ہو سکے۔ یہ مطلب بالکل غلط ہے کیونکہ اس میں نصوص کی تحریف ہے جس سے مولانا بری ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ عام لوگ تو صرف پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہیں اور عشاق چونکہ ہر وقت ان پانچ وقتوں کی

نماز کی فکر میں مشغول رہتے ہیں وہ ہر وقت نماز ہی میں ہیں کیونکہ حدیث میں ہے۔ من کان ينتظر الصلوة فهو الصلوة ما كانت تحبسه۔ (جو شخص نماز کا انتظار کرتا ہے پس وہ نماز میں ہے جس کیلئے وہ مجبوس ہے) او کما قال۔ کہ منتظر صلوٰۃ نماز ہی میں ہے اور عشاق ہر وقت نماز کے انتظار اور فکر میں رہتے ہیں تو وہ ہر حالت میں نماز ہی کے اندر ہیں اور ظاہر ہے جو ایسا ہوگا وہ پانچ وقت کی نماز کا پابند کیوں نہ ہوگا؟ غرض عشاق کی حالت تو یہ ہے جو حدیث میں ہے جعلت قرة عینی فی الصلوٰۃ۔ کہ ان کو نماز ہی میں چین ملتا ہے

اس لئے ان کی طبیعت ہر وقت نماز کی طرف راغب و مائل رہتی ہے اور اس کی فکر لگی رہتی ہے کہ کب وقت آئے اور نماز پڑھیں۔ تو ان کا ملین کے مقابلہ میں تو ہم اور آپ بے نمازی ہیں اور ہمارے آپ کے سامنے عید کے نمازی بے نمازی ہیں مگر وہ اس بیرسٹر کے سامنے نمازی ہیں جو یوں کہتا تھا کہ آپ لوگوں کا آج عید تھا۔ اس نے ایسی انگریزی پڑھی تھی کہ زبان بھی اردو نہ رہی۔ افسوس انگریزی تو صحیح بولنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی تقلید کرنے والے ان کی ریس میں اردو بھی غلط بولنے لگے۔

کانپور میں ایک خانساں کو جو ہندوستانی تھا میں نے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہم یہ بات سننا نہیں مانگتا۔ بھلا ان کم بختوں کو کیا ہوا جن کی اردو زبان مادری زبان ہے جو صحیح بولنے پر پوری طرح قادر ہیں۔ انگریز تو معذور ہیں کہ ان کی زبان غیر ہے مگر وہی تقلید کا شوق جس سے عقلیں مسخ ہو رہی ہیں۔ بہر حال تکمیل صوم کی سخت ضرورت ہے ورنہ ہمارا روزہ برائے نام روزہ ہوگا۔ کام کا روزہ نہ ہوگا اور میں دعویٰ کرتا ہوں کہ تکمیل صوم بھی بہت سہل ہے کچھ دشوار نہیں۔

تکمیل کے درجے

مگر اول ایک مقدمہ سمجھ لیجئے۔ وہ یہ کہ تکمیل کے دو درجے ہیں۔

ایک تکمیل ضروری..... دوسری تکمیل کامل

تکمیل ضروری وہ ہے جس سے شے نقصان سے نکل جائے اور اس کو ناقص نہ کہہ سکیں۔ اور تکمیل کامل یہ ہے کہ رفع نقصان کے علاوہ اس میں کچھ حسن و خوبی اور پھول پتیاں بھی لگ جائیں۔ جیسے ایک تو حسن ہے جو قبح کے مقابل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ناک اور نقشہ اچھا ہو

الہم اجد الحديث في " موسوعة اطراف الحديث النبوي الشريف " ۲ فتح الباری لابن حجر ۳۳۵: ۱، إتحاف السادة المتقين للزبيدي ۳: ۱۳۱، ۳۸، ۵، ۳۱۱: ۷، ۳۳۸: ۹، ۵۵۳: ۱۸۹۱۲

اور رنگ نکھرا ہوا ہو۔ دوسرے زینت کا درجہ ہے کہ علاوہ حسن کے لباس اور زیور بھی بہت کچھ ہو۔ پس تکمیل ضروری تو حسن کا درجہ ہے اور تکمیل کامل زینت و آرائش کا درجہ ہے۔

اب سمجھئے کہ روزہ کی تکمیل ضروری تو کچھ بھی دشوار نہیں بلکہ بہت ہی آسان ہے کیونکہ وہ بھی عدمی ہے اس میں کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ محرمات کو ترک کر دو۔ غیبت نہ کرو، جھوٹ نہ بولو، لڑائی جھگڑا نہ کرو۔ نگاہ بد نہ کرو۔ رشوت نہ لو۔ سود نہ لو۔ اور یہ سب عدمیات ہیں۔ پس روزہ کی تکمیل ضروری محض سکوت اور نوم سے بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے نقلیں پڑھنے اور تلاوت قرآن کرنے یا درود و اذکار بجالانے کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی شخص دن بھر سوتا رہے صرف نماز کے وقت جاگ کر نماز پڑھ لیا کرے تو اس کا روزہ کامل ہو گا ناقص نہ ہو گا۔

فقہاء نے جو کثرت نوم کو روزہ میں مکروہ لکھا ہے وہ اس کے لئے ہے جو روزہ کا وقت کاٹنے کے لئے سوئے اور جو محرمات سے بچنے کے لئے سوئے اس کے واسطے کراہت نہیں۔ نیز وہ کراہت اس کے لئے ہے جس کو جاگنے میں ابتلاء فی المحرمات کا اندیشہ نہ ہو اور جس کو یہ اندیشہ ہو کہ میں جاگنے کی حالت میں لڑائی جھگڑا کروں اور جھوٹ غیبت سے نہ بچ سکوں گا اس کے لئے سونا مکروہ نہیں۔
(گفتہ امیں فتنہ است خوالش بردہ یہ)

تو دیکھا آپ نے کہ تکمیل ضروری کس قدر آسان ہے جو خاموش رہنے اور سوتے رہنے سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ البتہ تکمیل کامل میں زیادت اعمال کو بھی دخل ہے کہ روزہ میں تلاوت قرآن زیادہ کرو۔ ان اعمال سے روزہ کی تکمیل زیادہ ہوگی مگر مطلق تکمیل اس پر موقوف نہیں۔ بس جس کو تکمیل کامل کی ہمت نہ ہو وہ تکمیل ضروری کو ہاتھ سے نہ دے کہ اس میں تو کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا۔ بالخصوص غیبت سے بہت پرہیز کرو کیونکہ عورتوں کو غیبت کا بہت مرض ہے۔ وہ عورت ہی نہیں جو غیبت نہ کرے اور غیبت تو غیر رمضان میں بھی حرام ہے اور رمضان میں تو بہت ہی بڑا گناہ ہے کیونکہ شرف زمان سے جیسے اعمال صالحہ کا ثواب بڑھتا ہے ایسے ہی گناہوں کا گناہ بھی بڑھ جاتا ہے جیسے شرف مکان کو عمل صالحہ کے ثواب بڑھانے اور عمل بد کے گناہ بڑھانے میں دخل ہے۔ مثلاً کوئی شخص مسجد میں نماز پڑھے تو ثواب زیادہ ہے اور اگر مسجد میں منہ کالا کرے تو گناہ بھی بہ نسبت خارج مسجد کے زیادہ ہوگا۔ خوب سمجھ لو۔

پھر غیبت میں نہ معلوم لوگوں کو کیا مزہ آتا ہے۔ تھوڑی دیر کیلئے اپنا جی خوش کر لیتے ہیں۔ پھر اگر

اس کو خبر ہوگئی اور اس سے دشمنی پڑ گئی تو عمر بھر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اور اگر ذرا اول میں حس ہو تو غیبت کرنے کے ساتھ ہی قلب میں ایسی ظلمت پیدا ہوتی ہے جس سے سخت تکلیف ہوتی ہے جیسے کسی نے گلا گھونٹ دیا ہو۔ اس لئے میں مستورات سے کہتا ہوں کہ تم خاص طور پر اس سے بچنے کا اہتمام کرو۔ کیونکہ تمہارے یہاں اس کا بازار بہت گرم ہے عورتوں کو روزہ کا شوق تو بہت ہے مگر جتنا شوق ہے اتنا ہی ان کا روزہ ناقص ہوتا ہے اور وہ صرف اس منحوس غیبت کی وجہ سے کیونکہ اور گناہ رشوت اور ظلم اور سود وغیرہ سے یہ محفوظ ہیں۔ تو بھائی خدا کے لئے روزہ میں اپنی زبان کو روک لو۔

اب تو ایک دن یا ڈیڑھ ہی دن رمضان کا رہ گیا ہے۔ جتنا حصہ باقی ہے اس میں تو اپنی بخشش کرا لو۔ اور بخشش کرانے کا طریقہ یہی ہے کہ گزشتہ گناہوں سے توبہ کرو۔ اور آج سے اپنی زبان کو گناہوں سے روک لو اس سے تو بخشش ہو جائے گی اور روزہ کامل ہو جائے گا اور جس قدر ہو سکے اعمال صالحہ میں زیادتی کر لو اس سے تکمیل ہو جائے گی۔

شب قدر کی عبادت

میں اس حدیث کا اس وقت پھر اعادہ کرتا ہوں جو جمعہ کے بیان میں پڑھی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: رَغِمَ أَنْفٌ رَجُلٍ أَدْرَكَ رَمَضَانَ فَانْسَلَخَ قَبْلَ أَنْ يَغْفِرَ لَهُ^۱ کہ اس شخص کی ناک رگڑ جائے مٹی میں مل جائے یعنی وہ ذلیل ہو جائے جس نے رمضان کو پالیا اور وہ اس کی اپنی مغفرت سے پہلے ختم ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا کس قدر سخت ہے آپ کی دعایا بدعا کے قبول ہونے میں کیا شک ہے (اور اس پر جو شبہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو بدعا بھی دعا ہو کر لگتی ہے اس کا جواب جمعہ کے وعظ میں دیا جا چکا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ حکم اس بددعا کا ہے جو ازراہ بشریت ہو اور جو بددعا تشریفی طور پر اس کا یہ حکم نہیں)۔

صاحبو۔ ہم نے یہ رمضان پالیا ہے جو اس وقت قریب ختم ہے اگر ہم نے اکمیں اپنی مغفرت نہ کرائی تو ہم اس وعید میں داخل ہو جائیں گے پس اہتمام کے ساتھ اپنی مغفرت کا اہتمام کرنا چاہیے۔ کیا ڈیڑھ دن بھی گناہوں سے رکنا کچھ مشکل ہے اور شاید آدھا ہی دن ہو۔ اس موقع کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ یہ رحمت و برکت کا وقت ہے۔ کیا خبر پھر کس کو رمضان نصیب ہوتا ہے کس

کو نہیں۔ ابھی کچھ حصہ رمضان کا باقی ہے جس کی فضیلت یہ ہے کہ اس میں فضل کا ثواب فرض کے برابر ہے اور فرض کا ثواب ستر فرضوں کے برابر ملتا ہے اور لیلة القدر کی عبادت کا ثواب تو اسی سال کی عبادت سے بھی زیادہ ہے۔

خود کہ یابدایں چنین بازار را ☆ کہ بیک گل می خری گلزار را
نیم جاں بستاند و صد جاں دہد ☆ آنچه دروہمت نیاید آں دہد
(تمہیں ایسا بازار کہاں مل سکتا ہے کہ ایک پھول کے بدلے میں چمن ہی خرید لے۔ حقیر و فانی جان لیتے ہیں باقی جان دیتے ہیں جو تمہارے وہم گمان میں نہیں آ سکتا وہ دیتے ہیں) واقعی ہم اس قابل کہاں جو یہ نعمتیں حاصل کر سکیں۔ جو کچھ ہے محض حق تعالیٰ کا فضل و کرم ہے جو لوگ شب قدر کو پا چکے ہیں ان کے لئے بشارت ہے اور جو محروم رہے وہ آئندہ اس مضمون کو یاد رکھیں اور اگر خدا تعالیٰ پھر رمضان تک پہنچادیں تو اس میں شب قدر کی عبادت کا اہتمام کریں۔

یہ میں نے اس لئے کہہ دیا کہ شاید کسی کو یہ وسوسہ ہوتا کہ اب تو شب قدر کا وقت گزر چکا ہے اب اس مضمون کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی تو میں نے بتلادیا کہ اس لئے بیان کر دیا تا کہ آئندہ کے لئے اس کو یاد رکھا جائے اور صاحب اگر مسلمان خدا تعالیٰ سے اپنا تعلق درست کرے تو اس کے لئے وہی رات لیلة القدر ہے جس میں اس کا تعلق خدا تعالیٰ سے درست ہو جائے اس کو ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

اے خواجہ چہ پرسی ز شب قدر نشانی ☆ ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی
(اے خواجہ تو شب قدر کی نشانی کیا پوچھتا ہے اگر تو قدر سمجھتا ہے تو ہر رات لیلة القدر ہے)
جو شخص شب قدر میں مردود تھا مگر آج کی رات مقبول ہو گیا تو اس کے لئے یہی رات لیلة القدر ہے بس اس سے بھی بہتر ہے۔ پس اگر شب قدر گزر گئی تو اس کا غم نہ کرو۔ خدا تعالیٰ سے علاقہ جوڑنے کی فکر کرو۔ جب ان سے علاقہ جوڑ لو گے تو وہ تمہارے واسطے رمضان کی اخیر رات کو بھی شب قدر کر سکتے ہیں۔

ایک فضیلت رمضان کی یہ ہے کہ اور اعمال کا ثواب محدود ہے کہ دس گنے سے سات سو گنے تک ملتا ہے اور روزہ کا ثواب غیر محدود ہے کہ اس کے ثواب کی کوئی حد ہی نہیں۔ میں نے اس مضمون کو ایک وعظ میں بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ روزہ کا ثواب غیر متناہی بمعنی لایقف

عند حد ہے۔ وہ اس بارے میں بہت ہی اچھا وعظ ہے۔ خدا کرے جلد شائع ہو جائے۔ تو ان فضیلتوں کو سن کر جو حصہ تھوڑا سا رمضان کا باقی ہے اس کی قدر کرنا چاہیے اور جو کچھ ہو سکے اس میں کر لینا چاہیے۔ جو فوت ہو گیا وہ تو قبضہ کے باہر ہے مگر جو باقی ہے اس کو تو فوت نہ کیا جائے۔

پس اب قصد کر لو کہ آج کا دن طاعت ہی میں گزاریں گے اور زبان کو گناہوں سے بچائیں گے۔ اسی وقت سے کام میں لگ جاؤ۔ قرآن پڑھو اور نقلیں پڑھو اور خدا کو یاد کرو، توبہ واستغفار کرو اور اپنی کوتاہی پر رنج و افسوس کرو ان شاء اللہ اس طرح تم اس رمضان کی برکات سے محروم نہ رہو گے اور اس وعید میں داخل نہ ہو گے جو حدیث میں مذکور ہے۔ بس یہی میرا مقصود تھا کہ ڈیڑھ دن یا ایک دن تو شریعت کے موافق اپنی حالت بنا لو اور اس میں تو خدا تعالیٰ کو راضی کر لو۔ سو بحمد اللہ مختصر طور پر یہ مقصد پوری طرح بیان ہو گیا۔

اب دعا کرو اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق عمل عطا فرمائیں اور رمضان کی برکات ہم کو نصیب فرمائیں۔ جن میں سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہو جائیں اور ہماری مغفرت فرمائیں۔ آمین ثم آمین۔
وصلی اللہ علی خیر خلقہ سیدنا محمد وعلی آلہ

واصحابہ اجمعین

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین۔

رمضان فی رمضان

یہ وعظ ۲۴ شعبان ۱۳۳۸ھ بروز جمعہ جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر فرمایا۔ جسے خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحب نے قلمبند فرمایا۔

نوٹ: پیشتر حضرت والا نے جمعہ کے دوسرے خطبہ کے ختم کے قریب رمضان المبارک کے متعلق ایک مختصر سی تقریر فرمائی جو ذیل میں نقل کی جاتی ہے اس کے بعد نماز سے فارغ ہو کر مستقل وعظ فرمایا وہ مختصر تقریر اور مفصل وعظ بالترتیب نقل کئے جاتے ہیں۔

تقریر قبلہ و عطا

روزہ کے حقوق

صاحبو! ہم لوگوں کو خوش ہونا چاہیے کہ رمضان المبارک کا مہینہ آرہا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ روزہ کتنی بڑی عبادت ہے اور یہ مہینہ کس قدر بابرکت ہے۔ ہمیں چاہئے کہ روزہ کے حقوق ادا کرنے کا بہت اہتمام رکھیں اور ہمیشہ اس کے حقوق ادا کرتے رہیں۔ رمضان المبارک کے ختم تک اس کا خاص طور سے خیال رکھیں کہ کوئی گناہ سرزد نہ ہونے پائے۔ بالخصوص، غیبت، بری نگاہ، حرام روزی بالکل ہی چھوڑ دیں گو یہ گناہ ہمیشہ ہی برے ہیں اور ان کو ہمیشہ ہی کے لئے چھوڑ دینا چاہیے، مگر رمضان میں بالخصوص ان سے اور زیادہ بچنا چاہیے۔

ایک عبادت رمضان المبارک کی تراویح ہے۔ اس میں پریشان نہ ہوں کہ صاحب گرمی میں کھڑا نہیں رہا جاتا۔ ابھی تو بفضلہ راتوں کو ٹھنڈ رہتی ہے اور اگر کچھ مشقت بھی ہو تو کیا ہے۔ یہ رمضان المبارک کی خاص عبادت ہے۔ آخر دنیا کے واسطے بھی تو کتنی کتنی مشقتیں اٹھاتے ہیں۔ صرف ایک گھنٹہ کا کام ہے پھر تھوڑی تھوڑی دیر بعد سلام پھیرتے رہتے ہیں اور ہر چار رکعت کے بعد آرام کے لئے وقفہ ملتا رہتا ہے۔ اس میں پنکھا کر لیا کریں۔ لیکن امام کے ساتھ فوراً نماز میں شامل ہو جانا چاہیے۔ یہ نہیں کہ جب امام رکوع میں جانے لگا تب شریک ہوئے۔ غرض اس مبارک مہینہ میں نہایت خوشی کے ساتھ اور نہایت رغبت اور شوق کے ساتھ عبادت کرنی چاہئے اور جتنے گناہ سب کو چھوڑ دینا چاہیے یہ اجمالاً حقوق ہیں رمضان المبارک کے۔

باقی اس سے قبل کا حق یہ ہے کہ چاند کی تحقیق کی جائے۔ سوا ب تک جو تحقیق ہوئی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شعبان کی پہلی بدھ کی روز تھی۔ تو بدھ بدھ ۲۹، لہذا بدھ کے روز چاند کی تلاش چاہیے۔ بدھ کے دن چاند کو دیکھیں۔ اگر نظر آجائے تو دوسرے دن سے روزے رکھیں۔ اور تراویح

اسی دن سے شروع کر دیں۔ ورنہ ۳۰ دن پورے کر کے شروع کریں یہ ہے حکم چاند کے متعلق۔
 لیکن جو کوئی چاند دیکھے وہ مدرسہ میں اطلاع کر دے کیونکہ بہت سے مسائل ایسے باریک ہیں جن کو اہل علم ہی جانتے ہیں۔ لہذا خود اپنی تحقیق پر عمل نہیں چاہیے۔ کسی عالم کے فتویٰ کے موافق عمل کرنا چاہیے۔ اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ شعبان کی پہلی منگل کو تھی تو پھر چاند منگل کی شام کو بھی دیکھنا چاہیے۔ بہر حال یہ چاند کے احکام ہیں اور وہ جو میں بیان کر چکا ہوں اجمالاً روزہ کے حقوق تھے۔

میں نے اس واسطے اتنے جملے اس وقت کہہ دیئے ہیں کہ بعد نماز کے شاید بعض بیچارے چلے جائیں۔ ورنہ اگر بعد نماز کے بھی ٹھہرنا ہو تو بیان کا بھی ارادہ ہے۔ جس کا جی چاہے سننے کے لئے ٹھہر جائے اور جو اس وقت حاضر نہیں ہیں ان کو بھی یہ احکام پہنچا دیں۔ خصوصاً عورتوں کو غیبت سے بچنے کی اور نماز کی پابندی کی ذرا زیادہ تاکید کروں۔ یہ غیبتیں بہت کرتی ہیں اور اپنے روزوں کو تباہ کرتی ہیں۔ اور اکثر نماز کی بھی پابندی کم ہوتی ہیں۔ خوب اچھی طرح سمجھا دیں کیونکہ مردوں کے ذمے ان کا حق ہے۔ سمجھا بھی دیں اور جب خلاف کریں ٹوک بھی دیں کہ دیکھو تم نے کیا کہا تھا اور اب تم کیا کر رہی ہو۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِیْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یُّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ یُّضِلِلْهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ . بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ . شَهْرُ رَمَضَانَ الْح

تمہید: یہ سب کو معلوم ہے کہ رمضان المبارک کا مہینہ قریب آ پہنچا ہے۔ لہذا مناسب بلکہ واجب ہے کہ رمضان المبارک کے متعلق کچھ ضروری مضامین بیان کر دیئے جائیں اور وہ مضامین مختلف ہیں۔ ایک قسم تو ان مضامین کی ہے فضائل رمضان کے۔ ایک قسم ہے آداب رمضان المبارک کے۔ ایک قسم ہے حقوق رمضان المبارک کے۔

حقوق اور آداب میں میں نے اپنی اصطلاح کے موافق یہ فرق رکھا ہے کہ حقوق تو وہ ہیں جو واجب ہوں اور آداب وہ ہیں جو غیر واجب ہوں لیکن میں آسانی تعبیر کے واسطے ایک قسم کا نام آداب رکھتا ہوں اور ایک کا حقوق۔ غرض یہ کہ رمضان المبارک کے متعلق مضامین مختلف ہیں۔

اب دیکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ کون سا مضمون زیادہ ضروری ہے اس کو مقدم رکھا جائے اور اگر وقت رہے تو دوسرے مضامین کے متعلق بھی بیان کر دیا جائے ورنہ ضروری امر تو فوت نہ ہو۔ تو ان تینوں قسموں کی شان اور درجہ میں غور کرنے سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ سب سے زیادہ ضروری کون سی قسم ہے یعنی یہ ظاہر ہے کہ جو حقوق واجب ہیں وہ سب سے زیادہ ضروری اہمیت رکھتے ہیں لہذا ان کے متعلق جو مضمون ہوگا وہی سب سے زیادہ ضروری ہوگا کیونکہ حقوق کے فوت

ہونے سے مضرت ہے اور آداب کے فوت ہونے سے مضرت نہیں گو منفعت میں کمی واقع ہو جائے اور تمام عقلاء کا اس پر اتفاق ہے کہ مضرت کا دفع کرنا زیادہ ضروری ہے بہ نسبت منفعت کے حاصل کرنے کے۔ تو حقوق کا آداب سے زیادہ ضروری ہونا اور زیادہ اہم ہونا اس طرح ثابت ہوا۔

رہا فضائل کا درجہ۔ سو وہ دراصل ترغیب کے لئے موضوع ہیں۔ تو یہ شعبہ عمل کے باب میں سے ہے نہ کہ عمل کے اور حقیقت میں مقصود علم سے بھی عمل ہی ہے۔ عمل ہی کی اعانت کے واسطے فضائل کا علم ظاہر کیا جاتا ہے تاکہ عمل کی رغبت پیدا ہو۔ کیونکہ طبعیتیں ضعیف ہیں محض امر اور نہی عمل کے لئے محرک نہ ہوتے۔ ان کی تاثیر میں قوت پیدا کرنے کے لئے شارع نے طریقہ اعانت کا یہ رکھا کہ ترغیب اور ترہیب سے بھی کام لیا۔ یعنی رغبت دلا کر اوامر پر ابھارا اور خوف دلا کر نواہی سے روکا۔ تو حقیقۃً فضائل ترغیب کے لئے بیان کئے جاتے ہیں جن کا تعلق علم سے ہے اور اس عمل سے بھی مقصود عمل ہے پھر عمل میں بھی دو درجے ہیں ایک درجہ کا تعلق تو آداب سے ہے اور ایک درجہ کا تعلق حقوق سے ہے۔ خلاصہ یہ کہ علم و عمل میں مقصود حقوق کا اہتمام ہے۔

ماہ رمضان کا اہتمام

تینوں قسموں میں اہم اور اقدم یہی ہوا یعنی حقوق کا اہتمام۔ لہذا میں اس وقت اسی مضمون پر اکتفا کرتا ہوں۔ کیونکہ حقوق فی نفسہ بھی اہم ہیں۔ علاوہ اس کے ہم لوگ زیادہ کوتاہی ان ہی کے متعلق کرتے ہیں یعنی رمضان المبارک کے حقوق کی ہم کو پروا اور اہتمام نہیں۔

اس کے فضائل کا تو کم و بیش علم ہے بھی۔ تفصیلاً نہیں تو اجمالاً تو ضرور ہے کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ رمضان المبارک بہت فضائل کا مہینہ ہے، بہت اجر کا مہینہ ہے، بہت عبادت کا مہینہ ہے، بہت برکت کا مہینہ ہے یہ سب جانتے ہیں۔ غرض بقدر ضرورت فضائل رمضان المبارک کا تو علم ہے بھی۔ رہے آداب، سوا اول تو یہ اس درجہ کا ضروری مضمون نہیں جس درجہ کا حقوق کے متعلق مضمون ہے مگر خیر جس درجہ میں بھی مطلوب ہے اس پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بھی کسی قدر اہتمام ہے یا یوں کہئے کہ اگر اہتمام نہیں تو علم تو ضرور ہے جہاں فضائل کا علم ہے آداب کا بھی کسی قدر علم ہے کیونکہ جب رمضان کے متبرک ہونے کا علم ہے اور متبرک چیز کے لئے ادب کا لحاظ عادتاً لازم ہے تو جب برکت کا اعتقاد ہو تو ادب کی بھی ضرورت قلب میں پیدا ہوگئی۔ غرض اس کا بھی کسی درجہ میں اہتمام اور علم ہے گو وہ اجمال کے درجہ میں ہے لیکن بقدر ضرورت اس کے ساتھ بھی علم متعلق ہے۔

باقی رہے حقوق سوان کے متعلق نہایت درجہ کا اخلاص واقع ہو رہا ہے علماً بھی اور عملاً بھی۔ یعنی اس طرف کبھی ذہن بھی نہیں جاتا کہ رمضان المبارک کے کچھ حقوق بھی ہیں۔ اس واسطے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ رمضان آنے سے لوگ زوائد کا تو اہتمام کرتے ہیں مثلاً دودھ کا بندوبست کر لیا جاتا ہے۔ صفائی کرائی جاتی ہے۔ کچھ برف کا انتظام سوچ لیا جاتا ہے۔ شکر، کھجوریں، تخم بالنگو وغیرہ جمع کر لیا جاتا ہے۔ یہ دیکھ لیتے ہیں کہ گھر میں لکڑی بھی ہے، غسل و سل کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔ یہ تو اہتمام ہوتے ہیں لیکن یہ کبھی ذہن میں بھی نہیں آتا کہ بھائی رمضان المبارک کا مہینہ آتا ہے، لاؤ غیبت سے بچنے کا کوئی انتظام کریں۔ یہ کہیں نہیں ہوتا کہ یا ہم مشورہ کر کے چند احباب نے یہ طے کر لیا ہو کہ اگر کوئی غیبت کرنے لگا تو ایک دوسرے کو روک دیا کرے۔ ٹوک دیا کرے اکثر دنیا کے کاموں میں تو ایک دوسرے سے اعانت کی جاتی ہے۔ دین کا کام ایسا آسان سمجھ رکھا ہے کہ اس میں کسی کی اعانت کی حاجت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ اس کے لئے کبھی ذہن میں آتا ہی نہیں کہ آپس میں التزام کر لیں۔

کانپور میں ہم نے دیکھا کہ بعض مجہین نے یہ التزام کر لیا تھا کہ جب رمضان المبارک کا مہینہ آتا تو ایک دو دن پہلے ایک دوسرے سے درخواست کرتے تھے اور آپس میں مشاورت کر لیتے تھے کہ جس کے منہ سے غیبت نکلے دوسرا فوراً روک دے کہ روزہ ہے۔ روزہ میں غیبت مت کرو لیکن ایسا التزام بہت ہی شاذ و نادر ہے۔ بس یہ دیکھ لیجئے کہ میں نے ساری عمر میں اس قسم کا یہ ایک ہی جلسہ دیکھا ہے بہر حال ان لوگوں کو توجہ تو تھی۔

اسی طرح اس کا ذہن میں بھی کبھی خیال نہیں آتا کہ بھائی قرآن مجید سننے کا زمانہ آ رہا ہے کوئی ایسا حافظ تلاش کرو جو اچھا اور صحیح پڑھتا ہو۔ بھائی اس کے پیچھے تراویح پڑھنی چاہیں۔ جو تجوید کے ساتھ قرآن مجید پڑھتا ہو۔ کلام مجید جس کو رمضان المبارک کے مہینہ کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے۔ کیونکہ وہ نازل ہی اس ماہ مبارک میں ہوا ہے کبھی اس کے سننے میں بھی آپ کو اہتمام کی فکر ہوئی ہے بلکہ اہتمام تو ایسے سامان کا کیا جاتا ہے جس میں اور سستی بڑھے۔ اور اگر کوئی تجوید کے ساتھ پڑھنے والا حافظ تجویز کیا جاتا ہے تو مخالفت کی جاتی ہے کہ تراویح میں دیر لگے گی۔ کھڑا نہیں رہا جائے گا۔

غرض رمضان المبارک کے لئے پہلے سے اور تو سب اہتمامات اور انتظامات کئے جاتے ہیں کہ سحری میں یہ ہو۔ افطاری میں یہ ہو لیکن ہم نے کہیں نہیں دیکھا کہ اپنے نفس کا آمادہ کیا ہو کسی نے کہ میں مطلق غیبت نہ کروں گا یا گناہوں کے ترک کا عزم کیا ہو کہ میں بالکل گناہ نہ کروں گا۔ تو گویا رمضان

المبارک کے حقوق کے باب میں بہت ہی زیادہ کوتاہی اور بہت ہی بے پروائی ہے عملاً بھی کوتاہی ہے اور علماً بھی کوتاہی ہے اہتمام بھی حقوق کا کم ہے اور ان کا علم بھی کم ہے اس واسطے یہ مضمون ضروری ہوا۔

معصیت کے آثار

تو میں اس وقت رمضان المبارک کے حقوق کے متعلق بیان کرنا چاہتا ہوں۔ آیت میں جو میں نے تلاوت کی ہے اس میں ہر چند مضمون فضائل رمضان کا ہے لیکن میں اسی آیت سے حقوق رمضان کو مستنبط کرنا چاہتا ہوں۔ بعض مقدمات کی تمہید کے بعد ایک مقدمہ تو اجمالاً میری تقریر سے معلوم ہوا ہوگا۔ کہ رمضان المبارک کے چند حقوق ہیں۔ ان کا خلاصہ کیا ہے؟ یہ ہے کہ جملہ معاصی کو ترک کرنا چاہئے خواہ وہ معاصی یوم کے متعلق ہوں یا لیل کے متعلق ہوں۔ عبادت کے متعلق ہوں یا عبادت کے متعلق ہوں یا معاملات کے متعلق ہوں۔ یہ گویا خلاصہ ہے حقوق رمضان کا کہ کل معاصی کو ترک کر دے۔ اس میں وہ امور بھی آگئے جن سے روزہ میں خلل آ جاتا ہے یا تراویح میں خلل آ جاتا ہے۔ غرض سب معاصی سے احتراز لازم ہے ایک مقدمہ تو یہ ہے جو خلاصہ ہے حقوق رمضان کا۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ معصیت اپنی ذات کے اعتبار سے بھی اور اپنے اثر کے اعتبار سے بھی ایک قسم کی ظلمت اور تاریکی ہے حدیثوں سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ یعنی معصیت کے ان آثار سے جو بیان کئے ہیں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

ان آثار کا حاصل یہ ہے کہ فرماتے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ جو کوئی گناہ کرتا ہے ایک سیاہ دھبہ اس کے قلب کے اوپر پیدا ہو جاتا ہے اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو حق تعالیٰ اس دھبہ کو صاف کر دیتا ہے۔ اور اگر توبہ نہیں کرتا اور پھر عود کرتا ہے اس گناہ کی طرف اور اس پر اصرار کرتا ہے تو وہ دھبہ پھیلتا ہے۔ پھر پھیلتے پھیلتے وہ بہت بڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ محیط ہو جاتا ہے سارے قلب کو۔ پھر استشہاد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

کلا بل ران علی قلوبہم ما کانوا یکسبون۔

(ہر گز ایسا نہیں بلکہ انکے دلوں پر انکے اعمال (بد) کا زنگ بیٹھ گیا ہے)

اس کا ترجمہ مولانا نے کیا ہے۔

ہر گناہ زنگے ست بر مرآت دل ☆ دل شود زین زنگ ہا خوار و خجل

چوں زیادت گشت دل را تیرگی ☆ نفس دوں را بیش گر دو خیرگی

(ہر گناہ شیشہ کے مانند صاف دل پر ایک داغ ہے اور اس داغ سے دل ذلیل و خوار ہوتا ہے جب دل پر سیاہی زیادہ بڑھ جاتی ہے تو کمینہ نفس میں بے حیائی اور ظلمت میں اضافہ ہو جاتا ہے)

اور یہ ایک ایسا امر ہے کہ اگر انسان تھوڑا سا بھی اپنے قلب کی طرف رجوع کرے تو فقط یہی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے اس لئے بے شک سچ ہے بلکہ خود بھی مشاہدہ کر لیجئے اول تو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر کے بعد ہم کو مشاہدہ کا انتظار نہیں چاہئے کیونکہ اس کی ضرورت ہی نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خبر دے دینا ہمارے لئے مشاہدہ سے بھی بڑھ کر ہے لیکن تائید کے واسطے عرض کرتا ہوں کہ اگر ذرا بھی وسوسہ ہو تو خود مشاہدہ کر لیجئے اور اپنے قلب کی طرف رجوع کر کے اور اپنے قلب کو ٹٹول کر دیکھ لیجئے کہ گناہ صادر ہو جانے کے بعد قلب میں ظلمت محسوس ہوتی ہے یا نہیں۔

ممکن ہے اگر کوئی کہے کہ ہم تو رات دن گناہ کرتے ہیں ہمیں تو اپنے قلب میں کچھ بھی ظلمت محسوس نہیں ہوتی۔ جیسے کسی سرحدی دیہاتی نے ایک وعظ میں یہ سن کر بغیر وضو کے نماز ہی نہیں ہوتی یہ کہا تھا۔ بارہا کہ کر دیم و شد۔ ہم نے تو بہت دفعہ بے وضو پڑھی اور ہو گئی۔ تو وہ جاہل حقیقت ہی نہ سمجھا تھا نماز کے ہونے کی۔ بس منہ میں جو آیا بک دیا۔ اسی طرح ممکن ہے کہ کوئی یوں کہے کہ ہم تو ہمیشہ گناہ کرتے ہیں ہمیں تو کچھ بھی ظلمت محسوس نہیں ہوتی۔ ہمارا قلب تو اچھا خاصا تروتازہ رہتا ہے ویسا ہی خوش بہ خوش جیسے گناہ کرنے سے پہلے تھا ذرا بھی میلا نہیں ہوتا۔

تو میں اس کی تکذیب تو نہیں کرتا لیکن یہ کہوں گا کہ وہ جھوٹ تو نہیں بولتا مگر دھوکا میں ضرور ہے کہ بے چارے غریب نے ظلمت کے مقابل جو چیز ہے یعنی نور اس کا کبھی مشاہدہ ہی نہیں کیا۔ اسے کبھی احساس ہی نور کا نہیں ہوا۔

معرفت کا مدار

یہ مسلم مسئلہ عقلیہ ہے کہ الاشیاء تعرف باضدادھا کہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے جس نے کبھی نور نہ دیکھا ہو وہ بے چارہ کیا سمجھے کہ ظلمت کیا چیز ہوتی ہے جیسے کسی نے تنگ کوٹھڑی میں پرورش پائی ہو تو اس کیلئے کوٹھڑی کے اندر تنگی نہیں ہوگی۔ کیونکہ اسے خبر ہی نہیں کہ میدان فراخ کس کو کہتے ہیں اور فراخی کیسی ہوتی ہے۔

چوں آں کرے کہ درنگے نہاں ست ☆ زمین و آسمان وے ہماں ست

(جو کیزا پتھر میں پوشیدہ ہے اس کیلئے زمین و آسمان وہی ہے)

لیکن جس شخص نے میدان دیکھا ہوگا اگر اس کو کوٹھڑی میں قید کر دیا جائے تو اس کی وحشت کا کچھ ٹھکانہ اور اس کی تنگی کی کچھ انتہا نہ ہوگی۔ اسی طرح جس نے انوار کا مشاہدہ کیا ہو اگر اس کو ظلمات میں لا کر ڈال دیں تو اسے ظلمت سے کیا وحشت ہو سکتی ہے جس نے عمر بھر ظلمت میں پرورش پائی ہو وہ کیا جانے کہ نور کیسا ہوتا ہے اور انوار کس کو کہتے ہیں جیسے مٹی کا کیزا کہ چونکہ اس کو خوشبو کی خبر نہیں اس لئے بدبو کی بھی خبر نہیں اس لئے وہ خوشبو بدبو کا نام سن کر سوچتا ہے کہ خوشبو کیا چیز ہوتی ہے۔ پھول میں کیا بات ہوتی ہے جو سب لوگ اس کی تمنا کرتے ہیں اگر اس کے سامنے پھول لائے جائیں تو وہ تو یہی کہہ دے کہ ان میں کیا رکھا ہے ہم تو انہیں نہیں چاہتے۔ لوگ کہتے ہیں خوشبو خوشبو۔ ہماری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ خوشبو بھی کوئی چیز دنیا میں ہے اور کہتے ہیں کہ پاخانہ میں بدبو ہوتی ہے۔ صاحب ہم تو عمر بھر سے اسی میں رہتے ہیں ہمیں تو کبھی نہیں محسوس ہوئی۔

جس نے کبھی دھوپ نہ دیکھی ہو وہ سایہ کی حقیقت ہی نہیں جان سکتا۔ اس واسطے کہ سایہ مقابل ہے دھوپ کے۔ لہذا سایہ کی معرفت دھوپ سے ہو سکتی ہے اور دھوپ کی معرفت سایہ سے ہو سکتی ہے ایک کی معرفت کا مدار دوسرے کی معرفت پر ہے دونوں لازم ملزوم ہیں۔

حضرت یہاں تک اس قاعدہ کا اثر ہے کہ بعض اہل اللہ نے جن پر غلبہ ذکر کا تھا قسم کھا کر مدتوں بعد کسی غافل کے واقعہ کو دیکھ کر کہا کہ واللہ! ہم یہ نہ جانتے تھے کہ دنیا میں کوئی غافل بھی ہے یہ گمان تھا کہ دنیا میں جتنے لوگ ہیں سب ذکر ہیں۔ تو بات یہی ہے کہ چونکہ وہ ابتداء ہی سے ولی مادر زاد تھے ذکر ان کے لئے امر فطری ہو گیا تھا۔

جیسے حدیث میں اہل جنت کی عفت یہ آئی ہے **يَلْهَمُونَ التَّسْبِيحَ كَمَا يَلْهَمُونَ النَّفْسَ**۔ تسبیح کا انہیں الہام ہوگا جیسے سانس بلا اختیار آتا ہے اسی طرح سبحان اللہ سبحان اللہ! یا اللہ یا اللہ بے اختیار ان کے منہ سے نکلا کرے گا۔ کسی وقت غفلت طاری نہ ہوگی۔ بعض اولیاء کی شان دنیا میں بھی ایسی ہی رہی ہے کہ ان پر کبھی غفلت طاری نہیں ہوئی۔ وہ ہمیشہ ذکر ہی رہے اور چونکہ خود ہر وقت ذکر میں مشغول رہے انہیں اہل دنیا کی غفلت کا احساس ہی نہیں ہوا اور خبر بھی نہیں ہوئی کہ دنیا میں اہل غفلت بھی موجود ہیں۔ جب کسی کو معصیت میں مبتلا دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت متنبہ ہوئے اور حیرت سے

پوچھا کہ اللہ اکبر! کیا ایسے بھی لوگ دنیا میں ہوا کرتے ہیں جو حق تعالیٰ کی یاد سے غافل ہوں۔

نور طاعت

غرض جب اہل نور نے اہل ظلمت کو نہ پہچانا تو اگر اہل ظلمت اہل نور کو نہ پہچانیں تو تعجب کیا۔ تو بہر حال معصیت کا ظلمت ہونا محسوس نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس شخص نے کبھی طاعت کے نور کو نہیں دیکھا۔ اگر نور طاعت کو کبھی دیکھ لیتا تب معلوم ہوتا کہ معصیت میں کیسی ظلمت ہوتی ہے اگر یقین نہیں آتا تو اس کو امتحان کر کے دیکھ لو۔ امتحان ہی کے طریقہ سے تھوڑے دنوں طاعت کر کے دیکھو زیادہ نہیں دو چار ہی دن سہی یا ایک ہی رات سہی مولانا فرماتے ہیں۔

خواب را بگذا رامشب اے پسر ☆ یک شبے در کوئے بے خواباں گذار
(اے لڑکے ایک رات سونے کو ترک کر دے اور کسی اللہ والے کے پاس ایک رات گزار
لے اور ان بے خوابوں کی گلی کا لطف دیکھ)

ایک دن تو ایسا کرو کہ رات کو سونا چھوڑ دو اور جاگنے والوں کے محلہ کو گزر جاؤ۔ تب تمہیں معلوم ہو کہ جاگنا کتنی بڑی دولت ہے جس کے سامنے سونے کی کوئی حقیقت نہیں اب تک تو تم نے یہی دیکھا کہ سونا کیا ہے۔ ایک دن جاگنا بھی تو دیکھ آؤ کیا ہے۔ تب معلوم ہو کہ ہم کتنے بڑے خسارہ میں ہیں اور کس قدر ٹوٹے میں ہیں۔ غرض۔

یک شبے در کوئے بے خواباں گزار (اور ایک رات ان بے خوابوں کی گلی کا لطف دیکھ)
صرف ایک شب جا کر بے خوابوں کو دیکھ لو۔ یہ بھی نہیں کہتے کہ جا کر ان کے ساتھ عبادت کرو۔ نہیں بلکہ صرف ان کی حالت ہی دیکھ لو۔ ان کے پاس کو ہی ہو کر گزر جاؤ۔ ان کے انوار تم پر منعکس ہونگے۔ اس وقت منکشف ہوگا کہ ہم سراسر خواب میں ہیں سراسر غفلت میں ہیں۔ سراسر ظلمت میں ہیں۔ بہر حال امتحان یہ ہے کہ تھوڑے دنوں طاعت اختیار کر کے دیکھ لو۔ تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ طاعت میں کیسا نور ہے اور کیا کیفیت ہے اور اس کیفیت کو ذہن میں محفوظ رکھ کر پھر اس حالت کے اثر کو ذہن میں مستحضر کرو۔ جو حالت غلبہ ہے ہماری یعنی معاصی۔ اس کے بعد جو کیفیت طاعت کی ذہن میں محفوظ ہے اس سے اس حالت غالبہ کے اثر کو موازنہ کرو اس وقت معلوم ہوگا کہ ہل تسوی الظلمت والنور، کہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ وہ نور تھا یہ ظلمت ہے وہ اور چیز تھی یہ اور چیز ہے۔ تو عبادت اگر خلوص سے بھی نہ بھی نہ کرو محض

امتحان ہی کے لئے کرو جب بھی ان شاء اللہ تعالیٰ یہ تفاوت محسوس ہونے لگے۔ اور اگر خلوص سے کہیں نصیب ہوگئی عبادت تب تو کچھ انتہا ہی نہیں۔ میں کہتا ہوں امتحان ہی کے لئے کچھ دن عبادت کرلو۔ اور یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ اکابر کا ارشاد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امتحان کی نیت سے بھی عبادت کر لینا کافی نہیں حقیقت پر پہنچنے سے ایک درجہ میں۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں۔

سالمہا تو سنگ بودی دل خراش ☆ آزموں رایک زمانے خاک باش
(برسوں تو تم دلخراش پتھر (متکبر) بنے رہے، آزمائش اور امتحان کی نظر سے کچھ دن خاک بن کر دیکھ لو) یوں نہیں فرمایا۔

از خلوصے یک زمانے خاک باش (خلوص سے ایک زمانہ خاک بن جاؤ) (تواضع اختیار کرو) بلکہ یوں فرمایا ہے۔

آزموں رایک زمانے خاک باش (ایک زمانہ بطور آزمائش کے خاک بن کر دیکھ لو)
یعنی خلوص سے توفیق طاعت نہیں تو امتحان ہی کے لیے کچھ روز خاک بن کر دیکھ لو پتھر تو بہت دنوں بن کر دیکھا۔ لیکن کیا دیکھا۔ کچھ بھی نہیں اب کچھ روز خاک بن کر بھی دیکھو تب تفاوت معلوم ہوگا کیا معلوم ہوگا؟ یہ معلوم ہوگا۔

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ ☆ خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ
(موسم بہار میں پتھر کب سرسبز ہوتے ہیں خاک ہو جاؤ تو رنگ رنگ کے پھول اگیں گے)
تفاوت یہ معلوم ہوگا کہ مدتوں پتھر رہے تھے لیکن کبھی ایک پھول بھی نہ کھلا لاکھوں بار شیں ہوتی رہیں خاک بن دیکھا تو بس ایک بارش ہی کافی ہوگئی طرح طرح کے پھول کھل گئے۔ تمام میدان معطر و معنر ہو گیا تو مولانا نے تصریح فرمائی ہے کہ۔

آزموں رایک زمانے خاک باش (بطور آزمائش کچھ عرصہ کے لئے خاک بن جاؤ)
امتحان ہی کے لئے کچھ روز خاک بن کر دیکھو۔ تو معلوم کیا آپ نے تفاوت معلوم کرنے کا طریقہ؟

صحبت کا اثر

اس طرح سے اگر امتحان کیا جائے گا تو ظلمت اور نور میں تفاوت معلوم ہو جائے گا۔ اور اس وقت معلوم ہوگا کہ واقعی معصیت سخت ظلمت ہے۔ چنانچہ جن کو نور نصیب ہو گیا ہے ان کا خود مشاہدہ ہے کہ جن گناہوں سے پہلے مدتوں تک پریشانی تو کیا ہوتی حظ حاصل ہوتا رہا اور جن گناہوں

میں مدتوں مشغول رہنے سے بھی حس نہیں ہوتا تھا۔ پریشانی کا آج عزم تو کیا ان کا حدیث النفس بھی ہونے لگتا ہے تو بے انتہا پریشان ہو جاتا ہے اور یہ حالت ہو جاتی ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں۔

بر دل سالک ہزاراں غم بود ☆ گرز باغ دل خلا لے کم بود

(سالک کے دل میں ہزاروں رنج و غم صادر ہوتے ہیں اگر باطنی حالت میں ذرا برابر کمی ہوتی ہے)

ایک تنکا بھی اگر باغ دل میں کم ہو جاتا ہے تو بس پوچھو مت کیا حالت ہوتی ہے لیکن یہ پریشانی اسی کو محسوس ہوتی ہے جو سالک ہو چنانچہ حدیث میں ہے کہ جس کی عصر کی نماز جاتی رہی فکا نماو تو مالہ و اہلہ ، وہ لٹ گیا اس کا سارا مال و دولت چھن گیا تو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اوروں کو تو علم الیقین کے ذریعہ سے صادق معلوم ہوتا ہے لیکن اہل اللہ اس ارشاد کو عین الیقین کے ذریعہ سے سچ جانتے ہیں اور اہل اللہ کی تو بڑی شان ہے۔ ہم لوگوں کو جن کو نہ کچھ علم ہے نہ ادراک ہے البتہ فہو منہم میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اسی کی برکت سے ان حضرات کا ایک چھینٹا ہم پر بھی پڑ گیا ہے اور ایک حالت تمیز کی پیدا ہو گئی ہے۔

اس وقت ایک نظیر یاد آگئی۔ حدیث شریف میں عشاء کے بعد بات چیت کرنے کی ممانعت اور کراہت آئی ہے۔ اس کا اعتقاد تو تھا طالب علمی کے زمانہ میں لیکن ذوقاً اس کا درجہ مضرت نہیں معلوم تھا اس وقت سے اس فعل سے وحشت عقلی تھی طبعی نہ تھی۔ اور اب یہ کیفیت ہے الحمد للہ کہ عشاء کے بعد اگر کوئی سامنے بھی آکھڑا ہوتا ہے تو سچ جائے اس قدر غصہ آتا ہے کہ گولی مار دوں۔ کیوں غصہ آتا ہے اب میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ بس ان حضرات کی صحبت کا اثر ہے اور کچھ بھی نہیں۔ لیکن مدتے باگل نشستم (لیکن ایک عرصہ تک پھول کے ساتھ نشست و صحبت رہی)

لیجئے اتنی تمیز تو اندھے ہونے پر بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ حالانکہ ہم اندھے ہیں لیکن اتنا حس تو ہمیں بھی ہونے لگا ہے اور واقعی بعضے اندھوں کو دیکھا ہے کہ ٹٹولنے سے بیل کا رنگ بتا دیتے ہیں۔ یعنی کمر پر ہاتھ پھیرا اور بتلا دیا کہ سفید ہے گویا باصرہ صحیح نہیں لیکن مس کرتے کرتے لامسہ میں بھی باصرہ مودع ہو گیا اور ودیعت ہو گیا۔ گو آنکھیں درست نہیں لیکن چھوتے چھوتے تکرار اتصال کی برکت سے ہاتھوں ہی میں آنکھوں کی صفت پیدا ہو گئی کہ ٹٹولنے سے رنگ محسوس ہونے لگا۔

اسی طرح حضرات اہل اللہ کی صحبت میں رہتے رہتے ہمیں بھی کچھ محسوس ہونے لگا ہے کہ ہاں واقعی عشاء کے بعد جاگنا بڑی وحشت اور کراہت کی چیز ہے تو میں نے یہ ایک نمونہ پیش کیا ہے۔

پس جب اہل اللہ کی صحبت سے کچھ تھوڑی بہت تمیز ہم لوگوں میں بھی ہونے لگی کہ پہلے جو علم الیقین تھا وہ پھر گویا آنکھوں سے نظر آنے لگا تو جو پوری پوری اطاعت کرے گا وہ تو کیوں نہ دیکھ لے گا کہ واقعی جو حضورؐ نے فرمایا کہ وتراہلہ ومالہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ٹھیک تو پہلے بھی مانے ہوئے تھا لیکن اب خود اپنی آنکھوں سے نظر آ گیا۔ اور اس کو مشاہدہ ہو گیا کہ واقعی میں لٹ گیا اسی کو کہتے ہیں مولانا۔

بر دل سالک ہزاراں غم بود ☆ گرز باغ دل خلایے کم بود

(سالک کے دل میں ہزاروں رنج و غم صادر ہوتے ہیں اگر باطنی حالت میں ذرا برابر کمی ہوتی ہے)

تو یہ گویا مضرت ہے معاصی کے درمیان میں اور یہ گویا ضرر ہے نافرمانی کے درمیان میں لیکن یہ ضرر اسے محسوس ہوتا ہے جو کبھی طاعت کے نفع کا مشاہدہ کر چکا ہو۔ تو گویا انعکاس سے انوار کے تھوڑا بہت احساس ظلمت کا ہونے لگتا ہے تو بہر حال کیا اس کا امتحان ممکن نہیں ہے۔ اس امتحان سے بھی محسوس ہونے لگتا ہے کہ واقعی معصیت کے درمیان میں پریشانی ہوتی ہے پریشانی اس کو اپنی آنکھوں سے نظر آنے لگتی ہے۔

تو اس کو میں بیان کر رہا تھا کہ یا تو گناہوں میں مدتوں مشغول رہنے پر بھی پریشانی کا احساس نہ ہوتا تھا یا طاعت اختیار کرنے کے بعد آج حدیث النفس ہونے سے ہی بے حد غم اور پریشانی لاحق ہو جاتی ہے اور جو ابتداء ہی سے حالت میں مشغول ہیں ان کی حالت تو پوچھو ہی مت۔ معصیت کے دیکھنے ہی سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ خود ارتکاب بھی نہیں کیا۔ دوسرے مرتکب ہی کو دیکھ کر یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک بزرگ تھے انہوں نے کسی کو کہیں معصیت میں مبتلا دیکھ لیا۔ گھر جو گئے اور پیشاب جو کیا تو دیکھا کہ بجائے پیشاب کے خون آتا ہے اس قدر کلفت اور تکلیف انہیں ہوئی محض معصیت کے ارتکاب کو دیکھنے سے معصیت کے ارتکاب کو دیکھ کر ہی اس قدر دل گیر ہوئے کہ پریشانی میں پیشاب کی راہ سے خون آنے لگا۔ خود ارتکاب تو بڑی چیز ہے۔ حضرات اہل اللہ تو دوسرے کو مرتکب دیکھ کر بھی بے حد پریشان ہوتے ہیں اسی واسطے بھاگتے ہیں مخلوق سے کہ اہل ظلمت کے دیکھنے سے بھی انہیں تکلیف ہوتی ہے۔

ظلمت معصیت

دوسرا مقدمہ یہ ہوا کہ معصیت کے درمیان میں ظلمت ہے تو ایک مقدمہ تو میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ رمضان المبارک کے حقوق کا حاصل ترک معصیت ہے۔ دوسرا مقدمہ یہ ہوا کہ

معاصی جو ہیں وہ ظلمت ہیں اور تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ ہر چیز اپنی ضد سے فرار کرتی ہے۔ یہ قاعدہ عقلی ہے یعنی ظلمت نور سے بھاگتی ہے اور نور ظلمت سے مرتفع ہو جاتا ہے۔ اور ہر چند کہ ہر ضد میں بعض خارجی دلائل سے یہ خاصیت زیادہ پائی جاتی ہے اور یہ امر مشاہدہ سے متعین ہے کہ ایک ضد پر یہ خاصیت رافع ہونے کی زیادہ صادق آتی ہے اور ایک ضد پر کم۔ یعنی مثلاً نور اور ظلمت ہے محض تضاد کی بناء پر تو نور سے ظلمت رفع ہو جاتی ہے اور ظلمت سے نور مرتفع ہو جاتا ہے کیونکہ فی نفسہ دونوں میں صفت ارتقاء یکساں ہے لیکن اگر غور سے مشاہدہ کیا جائے تو نور میں زیادہ قوت رفع کی ہے اور ظلمت میں کم قوت ہے۔ نور میں تو اس قدر قوت ہے کہ ظلمتیں چاہے کتنی ہی جمع ہو جائیں نور ان کا دافع ہو جاتا ہے۔ ظلمت میں یہ خاصیت نہیں۔ البتہ ظلمت میں یہ خاصیت ہے کہ اگر اسباب ظلمت کے جمع ہو جائیں تو وہ نور کے ساتر ہو جاتے ہیں مزیل نہیں ہوتے تو نور تو رافع ظلمت ہے اور ظلمت ساتر نور ہے اپنے اسباب کے اعتبار سے۔

دیکھئے چراغ جس وقت جلایا جاتا ہے تو اس کا نور تو مکان کی تاریکی کو رفع کر دیتا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے مکان میں تاریکی گھس ہی نہیں سکتی۔ جب تک چراغ گھر میں موجود ہے تاریکی کے آنے کی مجال نہیں۔ باقی ظلمت تو خاصیت فی نفسہ تو اس کی بھی یہی ہے کہ وہ نور کو مرتفع کر دیتی ہے لیکن قضیہ شرطیہ ہی کے درجہ میں رہی کہ ”اذا جاء ت الظلمة ارتفع النور“ (جو نہی ظلمت آئی نور اٹھ گیا) لیکن مقدم ہی کا وجود نہیں۔ اس لئے کہ یہی ممکن نہیں کہ نور کے ہوتے ہوئے ظلمت آئے۔ البتہ اگر کسی تدبیر سے اور کسی طریق سے آسکے تو وہ حکم صحیح ہوگا۔ مگر وہ براہ راست آتی ہی نہیں۔ البتہ اس کا کوئی سبب ایسا ہو جو نور کا ساتر بن جائے تو ظلمت اپنی سبب کے واسطے سے نور کی ساتر ہو جاتی ہے۔ جیسے کوئی چراغ روشن ہے۔ اس کے اوپر کسی نے آکر ہنڈیا رکھ دی تو ظلمت بواسطہ ظرف کے ظاہر ہوئی اور اصل میں ظرف صرف ساتر ہو گیا نور کا۔ تو ظرف سبب ہے ظلمت کا۔ اس کے واسطے سے ظلمت نمودار ہوئی۔ یہ نہیں ہوا کہ ظلمت نے بالکل رفع کر دیا ہو نور کو صرف ظرف ساتر بن گیا نور کا۔ اور جہاں تک احاطہ اس ظرف کا ہے وہاں تک ساتر ہے حد سے اور جو حد سے خارج ہے وہاں تک ساتر نہیں۔ چنانچہ ہنڈیا دائرہ کی شکل ہے تو ہنڈیا کے ادھر ادھر تو ستر ہے نور کا۔ لیکن دائرہ کے اندر اندر وہ ظرف حائل نہیں۔ بلکہ اندر تو اور زیادہ نور بڑھ گیا ہے کیونکہ نور کا خاصہ ہے کہ جتنا اس کی شعاعوں کو محدود کرتے جائیے اتنا ہی اس کی قوت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا

ہے۔ البتہ ہنڈیا کے باہر نور کو زائل کہئے یا مستور کہئے یا مضحل کہئے وہاں البتہ وہ مضحل ہو گیا ہے۔
باقی نور کو اس کی حاجت نہیں کہ کسی سبب کے واسطے سے پھیلے یہ نہیں ہے کہ خود نور کے علاوہ
کوئی اور سبب نور ہو۔ بخلاف ظلمت کے جو اپنے اثر رفع نور میں سبب کی محتاج ہے جیسے گہ ہنڈیا کی
مثال سے واضح ہو چکا ہے یعنی چراغ پر جو ظرف کو رکھا گیا تو جس حد تک وہ ظرف مظلم تھا وہیں تک
ظلمت پھیل سکی اور جو اس کی حد سے باہر تھا وہاں ظلمت نہ پہنچ سکی۔

یوں سمجھئے کہ دو طرفیں ہیں اس کی حد کی۔ ایک تو باہر کی طرف اور ایک اندر کی طرف۔ باہر کی
طرف جو حد ہے یعنی جو اس کی محیط ہے وہاں سے تو نور کو دفع کر سکا۔ اور جو حد اندر کی طرف ہے
وہاں سے نور کو زائل نہ کر سکا۔ یہاں تو وہ ظرف اس نور کو ایک حد خاص تک دفع کر سکا۔ باقی نور
میں ایسی قوت ہے کہ وہ سائر ظلمت یا مزیل ظلمت حد کے اندر اندر تک نہیں۔ یہ نہیں کہ جہاں تک
چراغ ہو وہاں تک تو نور ہو اور جہاں تک چراغ نہ ہو وہاں تک نہ ہو۔ نہیں! بلکہ نور اپنی شعاعوں
سے نورانی کرتا ہے اور وہ خاص اس حد تک جس حد تک چراغ ہے۔ البتہ اگر کسی وجہ سے کہیں
شعاع نہ پہنچی تو وہاں البتہ ظلمت رہے گی لیکن پھر بھی اس کی شعاعیں وہ چیز ہیں کہ جس حصہ میں
ظلمت ہے وہاں بھی ظلمت محضہ نہیں ہے بلکہ ایسی ظلمت ہے کہ مرکب ہے نور ظلمت سے جس سے
وہ نور ضعیف ہو گیا جس کو ظلمت کہتے ہیں۔ چنانچہ سایہ کی حقیقت یہی ہے کہ وہ ایک کیفیت ہے
جو مرکب ہے ظلمت اور نور ہے۔

بہر حال یہ تو سائنس کا مسئلہ ہے جو تفسن کے طور پر ذہن میں آ گیا۔ اس مضمون سے جو میں
بیان کر رہا تھا اس کا کچھ زیادہ تعلق نہیں لیکن کچھ تعلق ضرور ہے کیونکہ طاقت جو نور ہے اور معصیت
جو ظلمت ہے ان میں سے بھی ہر ایک کا۔ دوسرے پر اثر ہوتا ہے نور طاعت کا تو یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ
ظلمت معصیت کو دور کر دیتا ہے اور ظلمت معصیت کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اگر ظلمت معصیت ہو تو
نور طاعت کا اثر کم ہوتا ہے۔ صرف اس قدر تعلق ہے اس مضمون سے۔

مگر مقصود اصلی یہ فرع بیان کرنا نہیں بلکہ مقصود اصلی یہ ہے کہ ظلمت اور نور میں تضاد ہے یعنی
نور جو ہے وہ ظلمت کا رافع ہوا کرتا ہے۔ یہ گویا تیسرا مقدمہ ہوا میں ان تینوں مقدمات کا مختصراً
پھر اعادہ کرتا ہوں۔ پہلا مقدمہ تو یہ ہے کہ رمضان المبارک کے حقوق یہ ہیں کہ جملہ معاصی کو ترک
کر دے۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ معصیت ظلمت ہے۔ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ نور دافع ظلمت ہے۔

نور کی حقیقت

ان تینوں مقدمات کے بعد اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اس آیت میں جو میں نے تلاوت کی ہے رمضان المبارک کے حقوق کی طرف اشارہ ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں رمضان المبارک کی ایک خاص فضیلت بیان فرمائی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ مہینہ نورانی ہے۔ چنانچہ نورانی ہونا اس کا ابھی مذکور ہوگا۔

اب ان مقامات کو مختصر کر لیجئے کہ نور کی خاصیت ہے دفع ظلمت جب نور کی خاصیت دفع ظلمت ٹھہری تو اس کا مقتضی یہ ہوا کہ ظلمت دفع ہوا اور وہ تھی معصیت تو معصیت کو ترک کرنا گویا حقوق رمضان میں سے ہوا یہ دلالت ہوگئی۔

اسی طرح یہ مہینہ نورانی ہے وہ اس طرح کہ حق جل شانہ فرماتے ہیں شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ہدی للناس و بینت من الہدی والفرقان یعنی ایسا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔ اور قرآن کی خاصیت ہے ہدی للناس و بینات من الہدی والفرقان، یہ سب مادے دلالت کرتے ہیں قرآن مجید کے نور ہونے پر۔ ہدی، بینات، فرقان۔

ہدی و بینات تو ظاہر ہے۔ رہا فرقان سو فرقان کسے کہتے ہیں ممیز بین الحق والباطل کو۔ یعنی قرآن مجید سے فرق ہوتا ہے حق اور باطل میں۔ اور یہ حقیقت شناسی ہی نور ہے کیونکہ نور یہ تھوڑا ہی ہے کہ اس میں چمک اور دمک ہو۔ کہیں چمک اور دمک پر مغرور نہ ہو جانا کہ کچھ تارے سے نظر آنے لگے تو سمجھ لیا کہ ہمارے قلب میں نور پیدا ہو گیا۔ ارے! وہ نور ہی کب ہے قلب میں تو وہ نور ہے کہ اس کے آگے نور شمس کی بھی کچھ حقیقت نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

شمس تبریزی کہ نور مطلق است ☆ آفتاب ست وزانوار حق ست

(حضرت شمس تبریزیؒ جو سراپا نور ہدایت اور آفتاب ہدایت اور انوار الہی سے منور ہیں)

اب شمس تبریزیؒ کوئی نور تھے کیا ان سے کوئی لائین روشن ہو جاتی تھی۔ حکماء بھی نور کی حقیقت کو کچھ سمجھے ہیں مگر عوام وہاں تک نہیں پہنچے۔ حکماء علم کو کہتے ہیں کہ نور ہے حالانکہ علم آنکھوں سے نظر آنے والا نور نہیں مثلاً ہم کو علم ہے کہ زید قائم تو کیا اس علم کی وجہ سے کوئی چمک نظر آنے لگی۔ اگر اندھیری کو ٹھہری میں بھی تصور کریں اور زید کا ادراک کریں تو کیا کوئی چمک محسوس ہوگی۔ اس تصور سے کون سی چمک پیدا ہوگئی۔ عوام نور کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھتے۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ جب اللہ تعالیٰ کی یہ صفت سنتے ہیں کہ اللہ نور السموات والارض تو یہ سمجھتے ہیں کہ نور حق بھی کوئی چمک دار چیز ہوگی۔ اے صاحبو! چمک اس کے سامنے کیا چیز ہے وہ تو وہ نور ہے کہ چمک بھی ظلمت ہے اس کے سامنے! مگر جہلاء یہی سمجھتے ہیں کہ اللہ کے نور میں بھی چمک ہوتی ہے۔

چنانچہ اس وقت دو قصے بے ساختہ یاد آ گئے۔ ایک تو ہمارے ننھیال ہی کا ہے ہمارے ننھیال میں ایک بزرگ تھے ذاکر شافل۔ یہیں تھا نہ بھون کا واقعہ ہے اس زمانہ میں دیا سلائی نئی نئی چلی تھی۔ بہت سے لوگوں نے تو دیکھی بھی نہ تھی۔ ایک درویشی کا مدعی جاہل شخص کہیں سے آ گیا۔ اس نے ان سے کہا کہ میں تمہیں خدا کا نور دکھا دوں گا یہ مشتاق تھے ہی انہیں باور آ گیا۔ واقعی طلب وہ چیز ہے کہ بہت سے طالب دھوکوں میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جب حقیقت نہ معلوم ہو۔ مقام وعدہ کا ”غوث گڑھ“ قرار پایا کہ وہاں چل کر دکھائیں گے۔

غوث گڑھ ایک چھوٹا سا گاؤں یہاں سے تین کوس کے فاصلہ پر ہے وہاں بستی کے باہر ایک ویران مسجد ہے اس نے کہا کہ اس مسجد میں لے جا کر تمہیں اللہ کا نور دکھائیں گے کیا سب کے سامنے اللہ میاں کو اپنا جلوہ دکھاتے ہوئے نعوذ باللہ شرم آتی تھی۔ کیا نعوذ باللہ ان میں عورتوں کی صفت ہے۔ مگر صاحب! طلب عجیب چیز ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ طلب کے اندر ایک شان حیرت کی ہوتی ہے جب علم پر طلب غالب ہو۔ اسی واسطے یوں دعا کرنی چاہیے کہ حق تعالیٰ طلب اور علم دونوں عطا فرمائے نرے عشق اور نرمی طلب کے اندر عقل مغلوب ہو جاتی ہے۔ بہت لوگ عشق میں کہیں کے کہیں چلے گئے ہیں۔ عقل مغلوب ہونے پر یاد آیا۔

ایک بنیا کی تھالی گم ہو گئی تھی۔ اس نے سب جگہ تو دیکھا ہی مگر گھرے کے اندر بھی دیکھا کسی نے کہا ارے بیوقوف! تھالی اور گھرے کے اندر یہ کیا حماقت ہے تو اس نے جواب دیا کہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ گھرے کے اندر تھالی نہیں جاسکتی مگر احتیاطاً دیکھ لیا۔ تو وہ کیا بات تھی۔ حرص تھی۔ اجی کسی کو عشق دنیا کا کسی کو عشق دین کا۔ اس بنیا پر اس قدر عشق تھالی کا غالب ہوا کہ جہاں ہونا عقل بھی جائز نہیں رکھتی وہاں بھی تلاش کر لیا۔

اس قصہ سے بھی وہی مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ جب طلب کا غلبہ ہوتا ہے تو سمجھ جاتی رہتی ہے اور جب عشق غالب ہوتا ہے تو عقل برباد ہو جاتی ہے لکھے پڑھے آدمی جاہل کے کہنے میں آ گئے

غوث گڑھ پہنچے اس نے کہا کہ پہلے دو رکعت پڑھو پھر کچھ وظیفہ بتا دیا کہ ایسے آنکھیں بند کئے پڑھتے رہنا جس وقت میں کہوں فوراً آنکھ کھول دینا پھر جو دیکھو گے وہ اللہ کا نور ہوگا۔ بیچاروں نے سارے جتن کئے اول دو رکعتیں پڑھیں پھر بیٹھے غریب آنکھیں بند کر کے اور وظیفہ پڑھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد پیچھے سے آواز آئی ”ہوں“۔ انہوں نے جو آنکھ کھولی تو دیکھا کہ تمام مسجد روشن ہے تو ظالم نے کیا شرارت کی تھی کہ پس پشت کھڑے ہو کر ایک دیا سلائی جلا کر ”ہوں“ کر دیا دیکھا کہ تمام مسجد نور سے روشن ہے مگر لکھے پڑھے آدمی تھے وہ یوں کہتے تھے کہ میں نے دیکھا کہ سایہ بھی پڑ رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ تو خدا کا نور ہے۔ اس میں ظلمت کیسی یہ خدا کا نور کیسا ہے جس میں ظلمت کے دفع کرنے کی بھی قوت نہیں۔ مجھے اس پر شبہ ہوا مڑ کر جو دیکھا تو آپ ہاتھ میں جلتی ہوئی دیا سلائی لئے کھڑے ہیں اٹھ کر اور جوتا نکال کر وہ جوتے پہ جوتا۔ پیر صاحب کی خوب ہی مرمت کی۔ کہا نا لائق یہ خدا کا نور ہے جب نجات ہوئی صاحب اس دھوکا باز سے۔

تو غرض وہ کیا بات تھی اس نے نور چمک کا نام سمجھا تھا اسی سے دھوکا دینا چاہا علم بھی کیا کام کی چیز ہے اور زیادہ دھوکا تو جب ہوتا جب اس نور کے ساتھ ظلمت بھی نہ ہوتی چنانچہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

ایک حکایت

اس شعبہ پر ایک حکایت اپنے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یاد آئی۔ مولانا فرماتے تھے کہ ہم نے بچپن میں سنا تھا کہ دیوالی کی رات کو جن بازاروں میں نکلتے ہیں اور ان کی پہچان یہ ہے کہ ان کے سایہ نہیں ہوتا۔ دیوالی کی رات آئی ہم شوق میں اور جنوں میں جنوں کے بازار میں پہنچے دیوالی کے چراغ چل رہے تھے دیکھا کہ مجمع تو بہت ہے مگر کسی کے سایہ نہیں نہ ادھر نہ ادھر بہت سے لوگ ان میں سے ایسے بھی تھے جنہیں اسی دن اول بار دیکھا تھا۔ پہلے سے بالکل جان پہچان ہی نہیں تھی ان پر تو جن ہونے کا گمان ہو سکتا تھا لیکن بہت سے ایسے بھی تھے جن سے جان پہچان تھی ان کے بارہ میں یہ تاویل کر لی کہ ممکن ہے کہ جن انہی کی صورت میں آگئے ہوں جن سے جان پہچان ہے مگر پھر اپنے کو وجود دیکھتے ہیں تو یہاں بھی سایہ نہیں بڑے حیران کہ اے اللہ! اپنا تو علم ہے کہ میں محمد یعقوب ہوں میں کیسے جن ہو سکتا ہوں۔ مولانا ذہین تھے بیحد۔ بچپن کا قصہ ہے مگر ذہانت بچپن ہی سے غضب کی تھی سوچا تو فوراً سمجھ میں آ گیا کہ میاں چاروں طرف تو چراغ ہیں آخر سایہ ہو کدھر۔ یہ وجہ ہے سایہ نہ پڑنے کی جن ون کوئی نہیں۔

تو اس شعبہ باز کو سوچھی نہیں ورنہ وہ بھی کوئی ایسا ہی پکھنڈ کرتا کہ مشتاق زیارت کو اپنا سایہ بھی نظر نہ آتا۔ مگر باطل کے پیر نہیں اللہ تعالیٰ کسی اور طریق سے اس کو رسوا فرما دیتے۔ تو غرض! عوام کا یہ اعتقاد ہے کہ نور چمک کو کہتے ہیں۔

ایک اور شخص تھا ہمارے یہاں کانپور میں آیا تھا۔ اس کی بھی تمنا یہ تھی کہ کس طرح خدا کا نور دیکھ لوں۔ چنانچہ اسی تمنا میں میرے پاس بھی آیا تھا۔ میں نے کہا کہ بھائی خدا کا نور تو خود میں نے بھی نہیں دیکھا۔ پھر میں تمہیں کیا دکھا سکتا ہوں۔ اور میں کیا دیکھتا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی نہیں دیکھا تو تمہاری ہماری تو کیا حقیقت ہے۔ اور انہوں نے تمنا بھی کی لیکن تمنا پر بھی صاف جواب مل گیا۔ کہ لن ترانی اور لن فرمایا یعنی کبھی نہیں نہیں دیکھ سکو گے۔ لیکن یہ تابید بھی موبد نہیں بلکہ مقید ہے اور محدود ہے تابید کی بھی دو قسمیں ہیں۔

ایک دنیا کی تابید اور ایک آخرت کی تابید

آخرت کی تابید تو غیر محدود ہے لیکن دنیا کا جوا ”ابد“ ہے وہ حقیقتاً ابد ہی نہیں کیونکہ ابد تو وہ ہے کہ لا اخر لہ، جس کا اخیر ہی نہ ہو لیکن یہ بھی محاورات میں ابد ہی کہا جاتا ہے۔ اور جس کا طرح ابدیت کے صیغہ سے کبھی مدت محدود مراد ہوتی ہے اسی طرح کبھی مدت محدودہ کے صیغہ سے بھی ابدیت مراد ہوتی ہے جیسے شیطان کے بارہ میں ارشاد ہے ان علیک لعنتی الی یوم الدین (اور بیشک تجھ پر میری لعنت رہے گی قیامت کے دن تک)

مردود ابدی

یہاں الی یوم الدین سے مراد غیر محدود ہے مگر بعض کج فہم لوگ اس کو ابدیت غیر محدود سمجھ کر شیطان کی نجات کے قائل ہو گئے کہ صرف قیامت تک اس پر لعنت رہے گی پھر نہ رہے گی۔ حالانکہ یہ بات نہیں بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مراد تو ہوتی ہے ابدیت غیر محدود لیکن اس کو تعبیر اس طرح کرتے ہیں جیسے کہ تابید محدود کو تعبیر کرتے ہیں اس واسطے کہ ہم لوگوں کی عقول ضعیفہ کی رعایت سے قرآن مجید ہمارے محاورات میں نازل ہوا ہے۔ سو ہم ابدیت غیر محدود کو بھی اسی طرح تعبیر کیا کرتے ہیں کہ قیامت تک یہ بات نہ ہوگی یعنی کبھی نہ ہوگی۔

دوسرے یہ کہ دنیا دار العمل ہے اور اس کی انتہا قیامت ہے۔ پس جب ایک شخص دنیا کے ختم تک ملعون رہا۔ اب دارالجزاء میں ناجی ہونے کا اس کے کب احتمال ہے۔ اس طرح بھی ابدیت

غیر محدود لازم آگئی گو لفظ کو اس پر دال نہ مانا جائے اس واسطے میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید کے سمجھنے کیلئے عربی کی صرف و نحو کے علاوہ محاورات کے علم کی بھی ضرورت ہے۔ محاورات نہ جاننے ہی کی وجہ سے یہ سمجھے کہ الی یوم الدین میں غایت حقیقیہ ہے پس شیطان قیامت تک تو مردود رہے گا بس قیامت میں مرحوم ہو جائے گا نعوذ باللہ! بالکل غلط بلکہ عجب نہیں کفر ہو یہ اعتقاد۔ اسی واسطے کہ شیطان کے مردود ابدی ہونے پر سب کا اجماع بھی ہے اور منصوص بھی ہے اس آیت میں۔

کمثل الشیطن اذ قال للانسان اکفر فلما کفر قال انی بری ءمنک انی اخاف الله رب العلمین فکان عاقبتھما انھما فی النار خال الدین فیھا وذلک جزاء الظلمین۔
(شیطان کی سی مثال ہے کہ اول تو انسان سے کہتا ہے تو کافر ہو جا پھر جب وہ کافر ہو جاتا ہے تو اس وقت (صاف) کہہ دیتا ہے کہ میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں کہ میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں سو آخری انجام ان دونوں کا یہ ہوا کہ دونوں دوزخ میں گئے جہاں ہمیشہ رہیں گے اور ظالموں کی ہی جگہ ہے)

بہر حال یہ ابدیت کبھی ختم نہ ہوگی اور لن ترانی میں اس کا عکس ہے کہ لفظ ابدیت کا ہے مگر مراد امدت محدودہ ہے سو بعض کو اس میں غلط فہمی ہوئی اور اسی غلط فہمی کی وجہ سے معتزلہ اس کے قائل ہو گئے کہ یہاں تابید دائمی مراد ہے۔ آخرت میں بھی رویت نہ ہوگی مگر یہ غلط ہے یہی عقیدہ متواتر المعنی ہے کہ آخرت میں رویت باری تعالیٰ ہوگی اور وہ جب عوام مومنین کو بھی ہوگی۔ تو حضرت علیہ السلام کی شان تو بہت ارفع و اعلیٰ ہے ان کو کیوں نہ ہوگی اسی واسطے یہاں لن ترانی محمول ہے تابید محدود پر نہ کہ تابید دائم پر۔

طلب صادق کا اثر

بہر حال میں نے اس شخص سے کہا کہ یہاں دنیا میں رویت شرعاً محال ہے کہنے لگا میں جانتا ہوں اور یہ میرا عقیدہ ہے مگر کیا کروں شوق ایسا ہے کہ میں اس تمنا سے باز نہیں آسکتا میں تو طلب کروں ہی گا چاہے کامیابی نہ ہو۔ چنانچہ کیفیت اس کی یہ تھی کہ بے انتہا سوزش اور درد اور کرب میں مبتلا تھا۔ رات بھر اس قدر بے چین رہتا تھا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ جانے کتنا زمانہ اسی حالت میں گزر چکا تھا۔ اس کے پاس بیٹھنے سے ایک درد اور سوزش سی محسوس ہوتی تھی۔

پہلے وہ ہندو تھا کبھی کہتا تھا میں مذہب بھی اسی تمنا میں بدل چکا ہوں۔ چنانچہ اسلام کے قبل بھی اسی طلب میں تھا یعنی ہندو ہونے کی حالت میں بھی۔ کہنے لگا میں بڑے بڑے رشیوں،

جو گیوں اور مینوں سے ملا لیکن سب نے جواب دیدیا کہ یہاں تو یہی مالا جپنا ہے۔ بھائی ہم تو تمہیں خدا کا نور نہیں دکھا سکتے البتہ ایک نے وعدہ کیا کہ پریشر کی جوت ہم تمہیں دکھا دیں گے پھر اس نے کیا کیا کہ مغرب اور عشاء کے درمیان مجھے جھونپڑی کے اندر لے جا کر باہر کی طرف اشارہ کیا اور ایک روشنی نظر آئی جو چل رہی تھی۔ اور آہستہ آہستہ آگے کو اچھلتی ہوئی سرک رہی تھی اس نے کہا دیکھ! یہ ہے جوت پریشر کی۔ میں اس کی طرف دوڑا تو اس نے جھٹ میرا ہاتھ پکڑ لیا کہ ہاں! ہاں یہ کیا کرتا ہے ارے یہ پریشر کی جوت ہے جل جائے گا۔ وہ جوت ایسی تھوڑا ہی ہے کہ اس کی کوئی تاب لاسکے۔ میں نے کہا میں تو مرنے ہی کو پھر رہا ہوں۔ اگر پریشر کی جوت میں جل کر مر جاؤں تو اس سے بڑھ کر کیا ہے یہ تو میری عین تمنا ہے۔

غرض وہ تو بوڑھا تھا میں جوان ہاتھ چھڑا کر دوڑتا ہوا جو اس روشنی کے پاس پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کچھو ہے اس کے سر پر بہت سی مٹی جمی ہوئی ہے اور اس مٹی پر ایک چراغ رکھا ہوا ہے جس میں موٹی سی بتی پڑی ہوئی ہے کہتا تھا کہ اول تو میں اس روشنی کو دیکھتے ہی دھوکا میں آ گیا کہ ہوگا نور اللہ میاں کا لیکن جب میں نے اس روشنی کو اچھلتے ہوئے دیکھا تو اس پر مجھے شبہ ہوا واقعی عقل بھی بڑی نعمت ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ نور اچھلتا کیوں ہے آدمی جو شریف ہوتا ہے اس میں بھی وقار ہوتا ہے۔ اچھلتا کو دتا نہیں یہ تو پریشر ہے یہ اچھلتا کو دتا بچوں کی طرح کیوں چلتا ہے۔ اس سے مجھے شبہ ہوا اس لئے میں بھاگا کہ آخر دیکھوں تو یہ ماجرا کیا ہے اس نے مجھے پکڑا بھی مگر میں ہاتھ چھڑا کر بھاگ ہی گیا۔ لوٹ کر اس سے کہا کہ واہ با واجی اچھا پریشر دکھایا وہ ہنسنے لگا کہ بچہ میرے پاس تو یہی ہے کہ جھونپڑی میں رہ اور بس پڑا موج کیا کر۔ یہاں تو بیٹھے کچوری اور بالائی اور مٹھائی لئے جاؤ۔ بس بیٹھو اور لیکن ان کو بھلا ان چیزوں کی کب ہوس تھی یہاں تو طلب ہی اور تھی اور یہ خود بڑا شخص تھا۔ مشہور جوگی تھا۔ ریاضت مجاہدے بہت کیا کرتا تھا۔ اسی دوران میں خدا کے نور کی طلب دل میں پیدا ہو گئی۔

اس نے کہا کہ با واجی! یہ چیزیں مجھے درکار نہیں۔ مجھے تو خود یہ سب حاصل تھا۔ اب میں نے اس کو جو چھوڑا ہے تو اسی طلب کے اندر کہ کسی طرح خدا کو دیکھ لوں اسی طلب کے اندر یہ نیاز مندی اختیار کی ہے۔

مگر صاحبو! طلب عجیب چیز ہے واقعی اگر اس نے خدا کو نہیں دیکھا تو اس طلب کا نتیجہ

اتنا تو ہوا کہ اس وقت خدا کے دیکھنے کے قابل تو ہو گیا یعنی مسلمان تو بنا۔ ہائے ۔
 کششے کہ عشق دارد نہ گذاردت بدیں ساں ☆ بجزازہ گرنیائی بزار خواہی آمد
 (وہ کشش جو عشق اپنے اندر رکھتا ہے اُس کی خاصیت یہ ہے کہ محبوب اگر جنازہ پر نہ آئے
 گا تو مزار پر ضرور آئے گا)

طلب تو وہ چیز ہے کہ مطلوب کو طالب کے دروازہ پر حاضر کر دیتی ہے پھر طالب کو مطلوب
 کے دروازہ پر حاضر کر دینا تو کچھ بھی مشکل نہیں۔

مقام صدیقؑ

یہ وہ مضمون ہے جس سے حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک اعتراض کا جواب دیا تھا
 کیونکر! اس طرح کہ معراج شریف کے قصہ میں کفار حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئے
 اور انہیں اطلاع دی کہ تم نے سنا بھی تمہارے دوست نے ایک اور بھی دعویٰ منکر کیا ہے کہ مجھے آسمان پر
 بلایا گیا تھا۔ مجھے معراج ہوئی ہے میں سب آسمانوں بلکہ عرش تک کی سیر کر آیا ہوں تم نے سنا بھی یہ
 ایک اور نئی بات ہوئی ہے اب تک تو صرف نبوت ہی کا دعویٰ تھا۔ یہ اس سے بڑھ کر ہوئی۔ آپؐ نے
 فرمایا بڑھ کر تو نہیں ہے بلکہ گھٹ کر ہے جب میں اس کی تصدیق کر چکا ہوں کہ آسمان والے یعنی
 فرشتے ان کے پاس آتے ہیں تو اگر یہ آسمان والوں کے پاس پہنچا دیئے گئے تو عجب ہی کیا ہے۔ جس
 کے یہاں بادشاہ آتا ہوا اگر اس کو دربار میں بلا لے تو واللہ کچھ بھی حیرت کی بات نہیں۔ میں جب
 جبریل علیہ السلام کی نسبت جو کہ سدرۃ المنتہی کے بسنے والے ہیں اور عرش جن کا نشیمن ہے یہ تصدیق
 کر چکا ہوں کہ وہ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر حاضر ہوتے ہیں تو اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم جبریل
 علیہ السلام کے نشیمن پر تشریف لے جانے کا دعویٰ فرمائیں تو کیا میں ان کی تکذیب کر دوں گا۔

تم لوگ بیوقوف ہو کہ ایسی موٹی بات میں مجھ کو دھوکہ دینے آئے ہو اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں
 تو مجھے ایمان لانے اور انہیں سچا سمجھنے میں کوئی تاثر نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ جواب ہے جو حضرت ابو بکر صدیق رضی
 اللہ تعالیٰ عنہ نے کفار کے مقابلہ میں پیش کیا تھا۔ غرض عشق میں یہاں تک خاصیت ہے کہ ۔

کششے کہ عشق دارد نہ گذاردت بدیں ساں ☆ بجزازہ گرنیائی بزار خواہی آمد
 (وہ کشش جو عشق اپنے اندر رکھتا ہے اُس کی خاصیت یہ ہے کہ محبوب اگر جنازہ پر نہ آئے
 گا تو مزار پر ضرور آئے گا)

قبر میں زیارت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

اس پر ایک لطیف نکتہ بعض اہل لطائف نے کیا ہے۔ بعضے نکتے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ علوم تو نہیں ہوتے محض نکتے دل خوش کن ہوتے ہیں لیکن اگر متاید ہوں نصوص سے تو ان میں بھی ایک علم کی شان پیدا ہو جاتی ہے دعویٰ تو نہیں کیا جاتا۔ احتمال کا درجہ ہے ایک محمل ہے یہ بھی۔ یہ جو حدیث میں ہے کہ جب مومن دفن کر دیا جاتا ہے تو اس کے پاس فرشتے آ کر تین سوال کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی سوال ہوتا ہے۔

ما تقول فی حق هذا الرجل . یعنی یہ کون بزرگ ہیں۔

وہ کہتا ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو ہمارے پیغمبر ہیں۔ جو ہماری ہدایت کے لئے حق تعالیٰ کے یہاں سے بینات لائے اور آیات لائے یہ ہے مضمون حدیث کا۔ یہاں یہ سوال کیا گیا ہے کہ ہذا محسوس باشارہ حیہ کے لئے ہے وہاں قبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہاں ہوں گے۔ جو ہذا سے پوچھا جائے گا۔

جمہور نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ہر مومن کے ذہن میں اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم حاضر ہوں گے علم ضروری کے طور پر۔ حق تعالیٰ کی تائید سے اس کی یہ صورت ہوگی کہ مومن کے قلب میں اس وقت علم ضروری کے طور پر یہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت پوچھ رہے ہیں۔ یہ جواب بالکل کافی ہے لیکن بعض اہل لطائف اس طرف بھی گئے ہیں۔ یہ تھا تو احتمال کے درجہ میں مگر عشاق نے محقق کر لیا ہے شوق میں۔ اس کا دعویٰ تو نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں تمنا اور شوق کے درجہ میں کیا حرج ہے اگر اس امید سے متلذذ ہو۔

وہ کہتے ہیں کہ یہ کیوں نہ کہہ دیا جائے کہ اس کے اور رسول کے درمیان میں جتنے حجاب ہیں وہ سب اٹھا دیئے جائیں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ نما ہوں گے۔ اب چونکہ یہ شخص مشرف بالزیارت ہے اور پہچانتا ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس لئے فرشتوں کے سوال کا جواب آسانی کے ساتھ دے رہا ہے۔

اور یہ رفع حجاب تو ہے اس میں بھی دو احتمال ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضور اپنی جگہ پر رہیں یہ اپنی جگہ پر رہے اور درمیان کے حجاب انھیں اور یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کرم فرمائیں۔ بعض عشاق شدت شوق میں اس طرف چلے گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود مومن کی قبر میں تشریف لائیں گے۔

بعضے عشاق نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر موت کی تمنا اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے شوق میں کرے تو جائز ہے ہی شوقِ اَلی القاء رسول اللہ بھی تمنا موت کی جائز ہے کچھ حرج نہیں۔

استاذی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت زندہ دل تھے ان پر شوق کی حالت غالب تھی صاحبِ حلال بزرگ تھے اس حدیث کے متعلق کسی طالب علم نے سوال کیا تھا کہ قبر میں جو رسول اللہ کی زیارت مشہور ہے اس کی کیا اصل ہے۔ یہ سن کر مولانا پر حالت طاری ہو گئی اور یہ شعر پڑھلے کششے کہ عشق دارد نہ گذاردت بدیں ساں ☆ بجنازہ گر نیائی بزار خواہی آمد (وہ کشش جو عشق اپنے اندر رکھتا ہے اُس کی خاصیت یہ ہے کہ محبوب اگر جنازہ پر نہ آئے گا تو مزار پر ضرور آئے گا)

اور فرمایا کہ مقتضی تو اس تعلق کا جو ہم کو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اتنی طویل ہوتی کہ آپ ہر امتی کے جنازہ پر خود تشریف لا کر نماز جنازہ پڑھتے مگر خدا کی حکمتیں ہیں آپ کی وفات ہی میں مصلحت تھی۔ خیر! اگر یہ دولت حاصل نہ ہو سکی تو کیا عشق کی خاصیت خالی جاسکتی ہے اگر جنازہ پر نہیں تو مزار ہی پر لا کر کھڑا کر دیا کہ دیکھو یہ وہی محبوب ہیں جن کے شوق اور محبت میں تم نے عمر گنوا دی۔ اور اپنے آپ کو فنا کر دیا۔

مگر یہ سب مشتاقین کے نکات ہیں اور ممکن ہے کہ ان کے گمان کے موافق ان کے اس شوق کو پورا بھی کر دیا جائے کیا عجب ہے کہ گویہ زیارت عام نہ ہو لیکن حق تعالیٰ بعض خاص خاص عشاق کی کشش شوق میں یہ خاصیت محقق کر دیں اور ان کی اس امید کو انا عند ظن عبدی بی کی بناء پر پورا کر دیں تو کچھ بعید نہیں ہے۔

عبدیت کا خاصہ

میں اس کو عرض کر رہا تھا کہ طلب وہ چیز ہے کہ خود مطلوب کو طالب کے دروازہ پر حاضر کر دیتی ہے تو اگر طالب کو مطلوب کے دروازہ پر حاضر کر دے تو کیا تعجب ہے۔ تو اس شخص کی طلب نے اس کو مطلوب کے دروازہ پر تو پہنچا ہی دیا جو اسلام ہے اور جو باب حقیقی ہے رویت باری تعالیٰ کا خیر رویت نہیں ہوئی تو رویت کے قابل تو بنا دیا۔ ہوسناک کے لئے تو یہ کم ہے مگر طالب صادق اور عاشق کے لئے تو یہی بہت کچھ ہے۔

مرا از زلف تو موئے بسندست ☆ ہوس رارہ مدہ بوئے بسندست
 (مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زلف کی خوشبو کافی ہے اس سے زیادہ کی ہوس مجھے نہیں ہے)
 یہ شعر شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر لکھا ہے اللہ اکبر! کیا موقع پر
 لکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بال ایک
 صحابی نے تراشے۔ پھر آپ کے حکم سے وہ سب لوگوں کو تقسیم کئے گئے اس حدیث کے نقل کرنے
 کے بعد شیخ لکھتے ہیں کہ بڑے خوش قسمت تھے وہ لوگ! لیکن ہم بھی بد قسمت نہیں خیر! اگر بال ہم
 تک نہیں پہنچے تو ہم کو یہ بھی کم نہیں کہ اس واقعہ کی خبر تو پہنچ گئی اور اس مقام پر انہوں نے یہ شعر لکھا ہے۔
 مرا از زلف تو موئے بسندست ☆ ہوس رارہ مدہ بوئے بسندست
 (مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زلف کی خوشبو کافی ہے اس سے زیادہ کی ہوس مجھے نہیں ہے)
 واقعی عاشق صادق کی یہی شان ہے جس کو ہر چیز میں چاہے کسی درجہ کی ہو اپنے محبوب ہی
 کا جلوہ نظر آتا ہے کہتے ہیں نا۔

ہرچہ ینم در جہاں غیر تو نیست ☆ یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو
 (جو کچھ جہاں میں دیکھتا ہوں یا تو ہے یا تیری خوشبو ہے)
 ہر درجہ پر قانع ہیں اس واسطے کہ محبوب سے کچھ تو تعلق ہے۔
 ہرچہ ینم در جہاں غیر تو نیست ☆ یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو
 (جو کچھ جہاں میں دیکھتا ہوں یا تو ہے یا تیری خوشبو ہے)
 تو غرض شیخ کہتے ہیں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال ہم تک نہیں پہنچے تو خیر یہی سہی خبر تو پہنچی
 بلا بودے اگر ایں ہم بہ بودے (اگر یہ بھی نہ ہوتا تو بڑی مصیبت ہوتی)
 یعنی اگر محبوب کی حکایتیں بھی ہم تک نہ پہنچتیں تو کیا ہوتا پھر کون سی تسلی تھی عاشق کے لئے۔
 اس سے زیادہ اگر ہو جائے عنایت ہے ورنہ ہمارا حق تو اتنا بھی نہیں یہ نہایت تواضع کی بات ہے۔
 عاشق صادق کی عبدیت لازم ہے اور عبدیت کا خاصہ ہے کہ بلند پروازی نہیں رہتی جو کچھ بھی عطا
 ہو جائے اپنی حیثیت سے زیادہ سمجھتا ہے وہ بزبان حال یا بزبان قال یہ کہتا ہے۔
 ادائے حق محبت عنایت سے زاوست ☆ وگرنہ عاشق مسکین بہ ہیج خرسندست
 (ادائے حق محبت بھی حق تعالیٰ کی عطا اور توفیق سے ہے وگرنہ عاشق مسکین کس بات سے

خوش ہے یعنی اس کی توفیق سے)

عاشق مسکین کو تھوڑا سا بھی مل جائے تو وہ اس میں بھی راضی ہے اور یہ مشرب الحمد للہ ہم نے اپنی آنکھوں سے ایک زندہ بزرگ کا دیکھ لیا اور نہ کتابوں ہی میں پڑھے ہوتے تو یہ سمجھتے کہ لوگوں کی لطافتیں ہیں، ذہانتیں ہیں، تو جیہیں ہیں اپنے بزرگوں کے اقوال کی۔ حضرت حاجی صاحب کے دیکھنے کے بعد اب کوئی شک نہیں رہا۔ حضرت کا بھی بالکل یہی مشرب تھا۔

وگر نہ عاشق مسکین نہ بیچ خر سندست (وگر نہ عاشق مسکین کس بات سے خوش ہے)

میں کہتا ہوں جس کا نام عبدیت ہے بڑی مشکل ہے۔ سب حالات کا حصول آسان ہے۔ عبدیت ہی کا حاصل کرنا مشکل ہے۔ حضرتؒ میں بفضلہ عبدیت کامل عطا فرمائی گئی تھی۔ گویا عبدیت اس زمانہ میں حضرت ہی کا حصہ ہے۔ ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ حضرتؒ کوئی ایسی ترکیب ارشاد فرمائیں کہ جس سے زیارت جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حاصل ہو جائے۔ فرمایا آہا۔ آپ کا بڑا حوصلہ ہے کہ آپ کا ذہن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت تک پہنچتا ہے۔ آپ کی نظر بہت دور پہنچی، واللہ! ہم تو اپنے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گنبد شریف کی زیارت کے قابل بھی نہیں سمجھتے۔ اگر وہی نصیب ہو جائے تو بسا غنیمت ہے۔ اس سے آگے تو ہمارا ذہن بھی نہیں جاتا۔ آپ بڑے لوگ ہیں کہ آپ کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تمنا ہے۔

اللہ اکبر! کیا ٹھکانا ہے عبدیت کا۔ اور یہی ہے وہ حالت جس کو حضرت حافظ فرماتے ہیں بخدا کہ رشک آید ز دو چشم روشن خود ☆ کہ نظر در بغ باشد بہ چیں لطیف رائے (بخدا مجھے تو اپنی دونوں آنکھوں پر رشک آتا ہے اور دل رکتا ہے کہ ان نظروں سے محبوب کو دیکھوں)

قسم کھاتے ہیں کہ میراجی اس سے بھی جھجکتا ہے اور رکتا ہے کہ محبوب کو ان نظروں سے دیکھوں

عشاق کی شان

دیکھئے عاشق اس سے بھی جھجکتا ہے کہ محبوب کو آنکھ اٹھا کر دیکھے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ تو بے عقلوں کا مذاق ہے۔ صحابہؓ سے زیادہ تو کوئی عقلمند نہ تھا۔

ایک صحابیؓ سے کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک پوچھا تو آپؐ کہتے ہیں کہ ارے یہاں دیکھا تھا کس نے نظر بھر کر جو بیان کر دوں بیٹھ کر کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حلیہ تھا۔ ہمت

ہی نظر بھر کر دیکھنے کی کبھی نہ ہوئی۔

ایک کافر رئیس کی شہادت ملاحظہ ہو جو حدیبیہ میں صحابہؓ کی حالت دیکھ کر اپنی قوم کے پاس گیا تھا۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا حالت ہے اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس نے بہت سے واقعات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ادب و عظمت کے بیان کر کے مختصر ایہ حالت بیان کر دی کہ

لا یحدون النظر الیہ۔ یعنی گھور کر نہیں دیکھ سکتے

اور گھورنا کسے کہتے ہیں نظر بھر کر دیکھنے کو۔ غرض کسی کی ہمت نہیں تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر بھر کر دیکھ لے۔ بس! یہ حالت تھی صحابہؓ کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً صحابہؓ نظر بھر کر نہیں دیکھتے تھے۔ اور یہ تو ہمت کس کی ہو سکتی تھی کہ نظر سے نظر ملا کر دیکھے۔ تو عشاق کی شان یہ ہوا کرتی ہے کہ تھوڑے سے پر بھی راضی ہو جاتے ہیں وہی شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ کا مذاق ہے۔

مرا از زلف تو موئے بند ست ☆ ہوس را رہ مدہ بوئے بند ست

(مجھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زلف کی خوشبو کافی ہے اس سے زیادہ کی ہوس نہ ہونی چاہیے)

تو میں کہتا ہوں کہ رویت نہ ہو رویت کی قابلیت ہی عطا ہو جائے گوئی الحال رویت حاصل نہیں لیکن وعدہ تو ہے گواہ رہی سہی۔ وہ بھی کافی ہے ایک عاشق کہتا ہے۔

اگرچہ دور افتادم بدیں امید خرسندم ☆ کہ شاید دست من بار در جاتان من گیرد

(اگرچہ دور پڑا ہوں لیکن اس امید پر خوش ہوں کہ شاید ہمارا محبوب حقیقی ازراہ کرم ہمارا ہاتھ دوسری بار پکڑ کر اپنی بارگاہ کی طرف جذب فرمائے)

امید بھی صرف اتنی کہ شاید ایسا ہو جائے اور واقعی خرسندی امید پر بھی ہوتی ہے ولو کان توہماً یہاں تک کہ اشعب طماع کی حکایت ہے۔ یہ معمولی شخص نہیں ہیں۔ بڑے معتبر علماء میں سے گزرے ہیں مگر بے چارے مجبور تھے۔ طمع کے ہاتھوں ان کی طمع کی بہت سی حکایتیں مشہور ہیں۔ چنانچہ ایک بار انہیں بہت سے لڑکے چھیڑ چھاڑ رہے تھے۔ جو آدمی کسی بات میں مشہور ہو جاتا ہے۔ قاعدہ ہے کہ لوگ اسے چڑایا کرتے ہیں۔ انہوں نے لونڈوں سے کہا کہ میاں فلاں جگہ کھانا بٹ رہا ہے یوں ہی جھوٹ موٹ کہہ دیا اپنا پیچھا چھڑایا۔ لونڈے دوڑ کر اس طرف کو بھپٹے۔ انہیں دوڑے ہوئے جاتا دیکھ کر آپ کیا دل میں کہتے ہیں کہ اجی شاید بٹ ہی رہا ہو اور خود بھی پیچھے پیچھے دوڑنے لگے۔

حضرت ہم ان پر توہنتے ہیں لیکن ہم سب بتلا ہیں ایسے ہی عدم تدبر میں۔ ان کی طمع تو سب کو معلوم تھی ہمارا عام تدبیر کسی کو معلوم نہیں۔ ہمارے دھوکا کا کسی کا پتہ نہیں وہ کیا عدم تدبر ہے اور ہم کیوں کر دھوکا میں آ جاتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ہم اول تو لوگوں کو اپنے جھوٹے حالات اور وضع سے اپنا معتقد بناتے ہیں جب لوگ معتقد ہو جاتے ہیں تو اب ان کے اعتقاد سے خود ہی استدلال کرتے ہیں کہ ہم کچھ تو ضرور ہوں گے جب تو لوگ معتقد ہیں ہمارے۔ اگر ہم کچھ نہ ہوتے تو کیا سارے کے سارے بے وقوف ہی ہیں اگر ہم واقع میں کچھ نہ ہوتے تو اتنے سارے لوگ ہمارے کیوں معتقد ہو جاتے۔ معلوم ہوتا ہے ہم ضرور کچھ ہو گئے اور یہ خبر نہیں احق الناس کو کہ ہمیں نے تو دھوکا دیکر لوگوں کو اپنا معتقد بنایا ہے۔ اگر ہم کوئی ترکیب نہ کرتے اور پھر بھی لوگوں کا ہمارے ساتھ اعتقاد ہوتا اس میں تو احتمال ہو بھی سکتا تھا لیکن یہاں ہم ہی نے تو ترکیبیں کر کے لوگوں کو غلطیوں میں اور تلبیس میں ڈالا۔ ہم ہی نے تو سارا کارخانہ اور منصوبہ گانٹھا کہ کسی طرح لوگوں کو معتقد بنانا چاہیے اور جب لوگ معتقد ہو گئے تو اب ہم اس منصوبے کو بھول گئے۔ اور اب خود ہمارا اپنا اعتقاد ان کا اعتقاد ہے۔

ہم ان کے اعتقاد پر بنا کرتے ہیں اپنے اعتقاد کی تو گویا ہمارا اعتقاد بواسطہ ان کے اعتقاد کے ہے اور ان کا اعتقاد بواسطہ ہماری تلبیس کے ہے تو گویا ہمارا اعتقاد ہماری ہی تلبیس پر مبنی ہے۔ گویا ہم اپنی ہی تلبیس سے اپنے معتقد ہیں تو ہم اشعب طماع پر کیا ہنتے ہیں ہم خود ایسی ہی بے ہودگیوں میں مبتلا ہیں۔

یہ تو محض تفریع اور تسمیم فائدہ کے لئے عرض کیا گیا باقی میرا اصل مقصود اس حکایت کے نقل کرنے

سے یہ ہے کہ طلب اور محبت وہ چیز ہے کہ امید موہوم پر بھی طالب سرور رہتا ہے اسی واسطے کہا گیا ہے۔

اگر چہ دور افتاد بدیں امید خرسندم ☆ کہ شاید دست من بار در گرجانان من گیرد

(اگر چہ دور پڑا ہوں لیکن اس امید پر خوش ہوں کہ شاید ہمارا محبوب حقیقی ازراہ کرم ہمارا

ہاتھ دوسری بار پکڑ کر اپنی بارگاہ کی طرف جذب فرمائے)

تو غرض یہ مذاق ہے عاشق کا کہ تھوڑا سا بھی اگر مل جائے تب بھی اسے کافی ہے۔ کہتے ہیں نا۔

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

کہیں یہ سنا تھا کہ ہمارا ذکر محبوب کی محفل میں ہو رہا تھا تو بس اسی پر خوش ہو گئے کہ خیر اگر ہم

اس محفل میں نہیں تھے تو ہمارا ذکر تو تھا۔ بس اسی پر بے چارہ خوش ہے کہ میرا ذکر تو اس محفل میں ہے۔

مشہور ہے نا کہ ایک دیہاتی عورت اپنے شوہر پر عاشق تھی لیکن وہ اس کی طرف التفات ہی نہ

کرتا تھا۔ ایک دفعہ شوہر گاجریں کھا رہا تھا۔ پیندی کاٹ کاٹ کر پھینکتا جاتا تھا کھاتے کھاتے آپ کو جو جوش ہوا تو بیوی کے پیندی کھینچ کر ماری منہ پر زور سے۔ اور وہ اس کی آنکھ پر جا کر لگی۔ اب آنکھ بند بھی اور آنکھ میں درد بھی لیکن اسی حالت میں اس نے ڈومنی یا نانن کو بلایا اور اپنے باپ کے گھریہ کہلا کر بھیجا کہ کھائی تھی گا جرماری تھی پیندی۔ اماں سے کہیو کہ کچھ ساگ بھوڑ نے لگا ہے اب آگئے ہیں بھلے دن۔ چھیڑ چھاڑ تو شروع ہو گئی ہے۔ میرے گا جری پیندی تو ماری۔ اگر نہ مارتے تو میں کیا کر لیتی۔

تو یہ کیا عاشق ہے۔ اگر عاشق ہے تو محبوب کے دربار میں اپنا بڑا درجہ ہرگز نہ چاہے گا۔ اور عاشق کو تو شرم آتی ہے درجے مانگتے ہوئے کیونکہ وہ اپنی حقیقت خوب جانتا ہے کہ میں ہوں کیا۔ اس واسطے میں کہتا ہوں کہ یہ بھی ایک گونہ رویت ہی ہے کہ رویت کی قابلیت ہو جائے۔ اگر حقیقی رویت نہیں ہے تو حکمی تو ضرور ہے۔

مساوات اسلامی کا سبق

اس نو مسلم نے اپنا قصبہ شوق رویت اور اسی شوق میں اسلام لانے کا جو مجھ سے بیان کیا تو مجھے شبہ ہوا کہ جب اس کی طلب کسی جگہ پوری نہ ہوگی تو عجب نہیں کہ یہ اسلام کو چھوڑ کر عیسائی ہو جائے۔ کہیں کوئی پادری صاحب کہنے لگیں کہ میں دکھلا دوں گا۔ تمہیں خدا کا نور۔ پھر وہ بھی کوئی دھوکا دے اور سائنس والوں کا دھوکا شاید سمجھ میں بھی نہ آئے میں نے صاف کہہ دیا کہ بھائی تمہارا کیا اعتبار۔ مجھے قومی شبہ ہوا ہے کہ کہیں تم اسلام ترک نہ کر دو کیونکہ تمہارا مقصود تو یہ ہے کہ میں خدا کو دیکھ لوں۔

جب تمہیں خدا نہ دکھائی دے گا تو پھر تم اسلام کو بھی چھوڑ سکتے ہو جیسے کہ ہندوؤں کے مذہب کو چھوڑ کر اسی تمنا میں مسلمان ہو گئے ہو کہنے لگے جی نہیں۔ اب اسلام کو نہیں چھوڑوں گا چاہے کامیاب ہوں یا نہ ہوں۔ بالکل گنوار اور لٹھ تھا لیکن اس نے ایسے علوم و معارف بیان کئے کہ میں دنگ رہ گیا۔

چنانچہ جب میں نے کہا کہ ہمیں کیسے اطمینان ہو کہ تم اسلام نہ چھوڑو گے اس نے کہا کہ اسلام میں میں نے ایک ایسی خاصیت پائی ہے کہ نہ کسی مذہب میں تھی نہ ہو میں نے پوچھا وہ کون سی خاصیت ہے کہا اس مذہب میں تو حید ایسی کامل ہے کہ کسی مذہب میں نہیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ ابھی سے کیا جانے کہ تو حید کیا چیز ہے میں نے پوچھا مثلاً۔ کہا دیکھئے یہ کیا تو حید نہیں ہے کہ ایک شخص بھنگی ہے یا پتھر ہے وہ مسلمان ہو گیا تو آج تمام مسلمان اس کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں اور اس کو اپنے ساتھ بٹھلا کر کھلاتے ہیں ورنہ ساری قومیں ایسے شخص کو اپنے سے گھٹا ہوا

اور ذلیل سمجھتے ہیں یہ اور بات ہے کہ شادی بیاہ نہ کریں۔ یہ تو اپنی اپنی مصلحت ہے باقی حقیر کوئی نہیں سمجھتا یہ توحید ہی کا اثر ہے کیا اچھی بات کہی اور استدلال بھی کیسے کھلے ہوئے واقعہ سے کیا اللہ کے بندے اب بھی ایسے موجود ہیں جو مساوات کرتے ہیں اگر طوعاً نہیں تو کرہاً سہی۔

ایک حکایت اپنی کرہا کی اور ایک حکایت دوسرے کی طوعاً کی سناتا ہوں مجھے تو یہ حکایت پیش آئی کہ میں ایک دفعہ کالپی گیا۔ وہاں ایک شخص تھا نہایت صاف ستھرا، اچلے کپڑے پہنے ہوئے ہوئے جامع مسجد میں نماز کو آیا۔ اس کے گاؤں والوں سے معلوم ہوا کہ یہ پہلے بھنگی تھا اب مسلمان ہو گیا ہے لیکن وہاں کے چودھری ساتھ کھانا پلانا تو درکنار اس کے ہاتھ کا برتن بھی نہیں لیتے تھے۔ وہاں کا جلسہ تھا اس میں وہ بھی موجود تھا۔ اور وہاں کے رئیس بھی سب جمع تھے۔

بعض لوگوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں اس موقع پر ان لوگوں کو سمجھا دوں کہ ایسا پرہیز نہ کیا کریں۔ اس کی سخت دل شکنی ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ فرے سمجھانے سے کچھ کام نہ نکلے گا۔ سمجھانے سے تو سب اس وقت ہاں ہاں کہہ دیں گے پھر بعد کو کون پروا کرتا ہے میں نے کہا ایک بدھنے میں پانی منگا و جب پانی آ گیا تو میں نے اس نو مسلم سے کہا کہ پیو ٹونٹی سے منہ لگا کر۔ اس نے پیا پھر بدھنا اس کے ہاتھ سے لے کر میں نے بھی ٹونٹی ہی سے منہ لگا کر اس کے بچے ہوئے پانی میں سے پیا۔ پھر میں نے سب سے کہا کہ پیو۔ حضرت سوامان لینے کے کسی سے کوئی عذر نہ بن پڑا۔ سب نے جیسے تیسے پیا۔ پھر میں نے کہا کہ دیکھو بھائی اب اس سے پرہیز نہ کرنا۔ کہنے لگے اجی بس! اب منہ ہی کیا رہا پرہیز کرنے کا۔ تم نے ترکیب ہی ایسی کی کہ ہمارا سارا دھرم ہی لے لیا۔ اب اطمینان رکھو اب ہم اسے اپنے ساتھ کھلائیں پلائیں گے اب اس سے پرہیز ہی کیا رہ گیا جب اس کا جھوٹا پانی ہی تم نے پلوادیا۔ خیر سب کو بڑی خوشی ہوئی لیکن پیتے وقت جھجکتے سب تھے لیکن چونکہ میں خود پی چکا تھا اس لئے کسی کی ہمت نہ پڑی کہ انکار کر دے اور سچی بات یہ ہے کہ میں بھی، یاد ہے مجھے۔ پی تو گیا لیکن اندر سے جی رکھتا تھا۔ اللہ معاف کرے اور کچھ اس کے ساتھ ہی نہیں بلکہ کسی کو جھوٹا پانی یا جھوٹا کھانا ہو مجھ سے نہیں کھایا پیا جاتا۔ سخت رکاوٹ ہوتی ہے اگر کبر اس کا سبب ہے تو اللہ معاف کرے اور اگر ضعف طبیعت ہے تو معذور ہے یا کوئی معتقد یہ کہہ لے کر لطافت و نظافت ہے۔ نفس کی شرارت تو دیکھئے خود ہی ایک خوب صورت عنوان بھی بتا دیا۔ کسی بزرگ کے سامنے کا بچا ہوا بھی مجھ سے نہیں کھایا پیا جاتا۔ میں کیا کروں طبیعت متلاتی ہے اسی لئے

میں خود جو کھانا کھاتا ہوں تو بالالتزام اسی طرح کھاتا ہوں کہ دیکھنے والے کبھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ کسی کے سامنے کا کھانا ہوا ہے۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بس اتنا ہی نکالا گیا ہے۔

اس قدر صاف کر کر کے اور ترتیب کے ساتھ کھاتا ہوں کہ کسی کو دیکھ کر نفرت نہیں ہو سکتی۔ میں اور بھی لوگوں کو کھاتے ہوئے دیکھتا ہوں کہ چاروں طرف آلودہ کر دیتے ہیں جس کو دیکھ کر گھن آنے لگتی ہے اور پانی میں یہ وہم ہوتا ہے کہ یہاں منہ لگا ہوگا یہاں تھوک لگا ہوگا۔ بس مجھ سے تو کسی کا نہ جھوٹا پانی پیا جائے نہ جھوٹا کھانا کھایا جائے۔

ہاں کسی کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لینے سے نفرت نہیں ہوتی۔ اب میں اپنی اس طبیعت کو کیسے بدل دوں۔ میں نے تو کبھی بزرگوں کا بھی جھوٹا کھانا نہیں کھایا نہ کبھی جھوٹا پانی پیا الا نادراً۔ مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کی برکت سے محروم نہیں رکھا ان کے ہاں سچی چیزیں ہی اتنی تھیں کہ ان کی برکت سے ہی کافی ہو گئی جھوٹی چیزوں کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ بس سچی ہی چیزیں حصول برکت کے لئے کافی تھیں۔

خیر یہ تو نکتہ شاعرانہ ہے۔ شاعروں کی خاطر سے بیان کر دیا ہے ورنہ دراصل بزرگوں کے یہاں کوئی چیز ایسی نہیں جس کو جھوٹا کہہ سکیں اور جس کو جھوٹا کہتے ہیں وہ بھی سچی ہی چیز ہے اس میں بھی سچ مچ برکت ہے۔ تو غرض یہ حکایت تو کرنا کی تھی جو مجھ کو پیش آئی اور اس پر بھی حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ گو طبعاً کراہت ہوئی مگر الحمد للہ عقلاً اس کو نہایت خوشی کے ساتھ گوارا کیا۔ یہ بھی حق تعالیٰ ہی کی توفیق تھی۔

حق پرستی

اب دوسری حکایت طوعاً کی عرض کرتا ہوں۔ مولوی جمال الدین صاحب بھوپال میں مدار المہام تھے گویا وزیر ریاست تھے۔ وزارت اس وقت تو ضابطہ ہی کی رہ گئی ہے۔ اس زمانہ میں تو واقعی سلطنت تھی۔ کیونکہ پہلے اتنے ضابطے نہ تھے اور پھر خود ایک بڑی رئیس نے ان سے نکاح بھی کر لیا تھا۔ غرض ان کا بہت بڑا مرتبہ تھا مگر تھے بڑے حق پرست۔ یہاں تک کہ وہ رئیس بوجہ انتظامات ریاست کے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ ایک دفعہ مسجد میں نماز پڑھنے گئے مولوی جمال الدین عالم تو تھے ہی۔ نماز پڑھانے کے لئے لوگوں نے آگے کھڑا کر دیا۔

اتفاق سے ایک ولایتی مولوی صاحب بھی موجود تھے انہوں نے ہاتھ پکڑ کر پیچھے ہٹا دیا کہ تم

نماز نہیں پڑھا سکتے۔ تم اس قابل نہیں اور کوئی پڑھائے مگر مجال کس کی تھی کہ وزیر صاحب کے سامنے اور کوئی پڑھانے کے لئے بڑھے بالخصوص ایسے موقع پر۔ جب کوئی نہ بڑھا تو وہ آپ خود جا کر مصلے پر کھڑے ہو گئے کہ ہم پڑھائیں گے اور یہ کہا کہ تمہاری بیوی پردہ نہیں کرتی۔ اور تم اس کو گوارا کرتے ہو۔ لہذا تم دیوث ہو اور دیوث کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ یہ فقہ کا مسئلہ ہے یہ کہا اور اللہ اکبر! وزیر صاحب جماعت میں شریک رہے۔ نماز پڑھ کر بھی کچھ نہیں بولے بلکہ وہیں سے سیدھے پہنچے رئیسہ کے پاس۔ وہ اس وقت اجلاس میں تھیں آپ نے بے دھڑک سب کے سامنے علی الاعلان اس کو مخاطب کر کے کہا کہ تمہارے پردہ نہ کرنے کی وجہ سے میں بدنام ہوا۔ لوگ مجھے دیوث کہتے ہیں اور میرے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ تم نے مجھے بھی ذلیل کیا۔ یا تو وعدہ کرو کہ میں پردہ میں بیٹھوں گی نہیں تو تین طلاق۔

حق پرستی اور ہمت تو دیکھئے برسر اجلاس یہ کہہ دیا۔ گویا سارا ملک ہاتھ سے دے دینا گوارا کر لیا۔ مگر اول تو حکومت پھر بڑھیا۔ تو مولوی جمال الدین ایسے حق پرست تھے۔

اسلام دوستی

ایک بار ان کے یہاں کوئی تقریب تھی یا جلسہ تھا جس میں کھانا کھلایا جا رہا تھا۔ باوجود اتنے اقتدار کے ان میں تو وضع اس درجہ تھی کہ کھانا خود رکھ رہے تھے۔ اسی دوران میں ایک بھنگی آیا اور اس نے کہا میاں سلام! میاں میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں مجھے مسلمان کرلو۔ مدارالمہام صاحب نے سب کام چھوڑ چھاڑ اسے بٹھلایا اور مسلمان کر لیا۔ پھر خدمت گار سے کہا کہ اسے حمام میں لے جا کر غسل کراؤ اور ہمارا جوڑا پہنا کر یہاں لاؤ۔ حیرت سب کو ہوئی مگر اسی وقت جوڑا پہنا کر حاضر کر دیا گیا۔ حکم دیا کہ اسے بٹھلاؤ دسترخوان پر۔ دسترخوان پر بڑے بڑے لوگ تھے۔ بڑے بڑے خاں اور بیگ سبھی کھاتے تھے بس لوگوں کی ناکیں چڑھ گئیں۔ منشی جی نے کہا۔ وہ تھے تو مولوی مگر منشی مشہور تھے۔ کہا آپ صاحبان منقبض نہ ہوں یہ شخص آپ کے ساتھ نہیں کھائے گا۔ اس کے ساتھ میں کھاؤں گا کیونکہ یہ اسی وقت مسلمان ہوا ہے اس وقت اس کے ذمہ ایک بھی گناہ نہیں۔ بالکل پاک اور صاف۔ یہ اس وقت ایسا پاک اور صاف ہے کہ یہاں ایک شخص بھی اتنا پاک صاف نہیں۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر میں کھاؤں گا۔ ہر ایک کو کہاں یہ دولت نصیب ہو سکتی ہے۔ یہ دولت تو میں نے اپنے لئے مخصوص کر رکھی ہے تمہاری قسمت کہاں کہ ایسے شخص کے ساتھ کھانے کا شرف

حاصل کر سکو میں تم کو اطمینان دلاتا ہوں کہ میں اسے تمہارے ساتھ کھانے کے لئے نہیں بٹھاؤں گا۔ میں خود اس کے ساتھ بیٹھ کر کھاؤں گا۔ تم مت گھبراؤ۔ الگ کھاؤ میں اپنے برتن میں اس کو شریک کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر کھانا منگوایا اور کہا آؤ بھائی! ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھاؤ۔ اب وہ بچے کہ میں مدارالمہام صاحب کے ساتھ بیٹھ کر کیسے کھالوں مگر انہوں نے زبردستی بٹھالیا کہ بھائی! تم اب بھنگی کہاں رہے تم تو اب ہمارے بھائی ہو گئے۔ غرض ایک برتن میں دونوں نے کھانا کھایا۔

واللہ! حکایت تو یہ بڑی مزیدار ہے مگر ذرا عمل کر کے دیکھئے کیسی بدمزہ ہے مگر صرف اولاً بدمزہ ہے اور عمل کے بعد تو واللہ وہ حلاوت ہے کہ بیان میں نہیں آسکتی مگر صاحب اولاً تو پورا جہاد اور بڑا سخت مجاہدہ ہے۔ یہ انہیں کا حوصلہ تھا ورنہ ایسے شخص کے ساتھ تو بہت ہی برابر تاؤ کرتے ہیں۔

تکبر کی صورت

یہ حالت تکبر کی ہے کہ اسے خطاب بھی کرتے ہیں تو ان الفاظ سے اے او بھنگی کے۔ ایک عبدالکریم تھا جو ہمارے ہاں مسلمان ہو گیا تھا اس کو لوگ بھنگی کا کر کے پکارتے تھے۔ بعد مسلمان ہو جانے کے بھی لوگ ایسوں کو بھنگی کا اور چمار کا کہنا نہیں چھوڑتے۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ مگر خیر یہ بھی غنیمت ہے کہ ”کا“ بڑھا دیا۔ بھنگی اور چمار نہ کہہ دیا۔ بھنگی اور چمار کا ہی کہا کیونکہ آخر اس کا باپ تو بھنگی ہی تھا مگر یہ زیادہ خوشی کی بات اس لئے نہیں کہ محاورہ میں یہ اضافت مضاف مضاف الہیہ میں تغایر کے لئے نہیں آتی بلکہ تحسین کلام کے لئے بطور زائد کے لائی جاتی ہے جیسے ”را“ ہے تو اضافت کے لئے موضوع مگر اکثر تحسین کلام کیلئے زائد بولا جاتا ہے اور یہ کیونکر معلوم ہوا۔

یوں معلوم ہوا کہ یہیں تھا نہ بھون میں ایک سید تھے مگر تھے بیچارے غریب! انہوں نے اپنے یہاں ایک بہلی کر لی تھی۔ غریب آدمی بے چارے کرایہ پر بسر اوقات کرتے تھے۔ شریف آدمی، ذات کے سید۔ مگر اللہ بچا، مقلی بھی عجب چیز ہے سب کچھ کرا لیتی ہے وہ کہنے لگے کہ میں ایک گاؤں میں اپنی بہلی کرایہ پر لے گیا وہاں رات کو ٹھہرانا پڑا۔ اول تو سب سے زیادہ ذلیل جگہ مجھے ٹھہرایا۔ مجھے اس قدر پیچ و تاب کہ بس! کھا جاؤں کچوں کو۔ مگر کہا کچھ نہیں۔ کیونکہ یہ ظاہر کرتے ہوئے بھی شرم آئی کہ میں سید ہوں بس اندر ہی اندر لونٹ کر رہ گیا۔ اتنے میں مکان والے کے لڑکے نے آواز دی کہ او بہلبان کے! بھس لے لے۔ کہنے لگے کہ میں جلا ہوا تو بیٹھا ہی تھا۔ یہ سن کر بس آگ ہی تو لگ گئی۔ میں نے کہ اے گدھے! یہ تو نے کیا کہا کہ بہلبان کے! ارے اگر ہم

بہلی چلانے لگے ہیں تو کیا ہمارے باوا بھی بہلبان ہو گئے۔ بھس لے لے، بھس لے لے۔ جا ہم بھس نہیں لیتے تیری بھی ایسی تیری اور تیرے بھس کی بھی ایسی تیری۔ کہنے لگے میں نے اسی وقت قسم خدا کی کھالی کہ گھر پہنچتے ہی چھوڑ دوں گا اس کبخت پیشہ کو۔ چنانچہ آتے ہی بہلی اور بیل بچ ڈالے۔

تو میر صاحب کا ذہن خواہ مخواہ اس طرف گیا کہ یہاں اضافہ مقصود ہے واقع میں اس لڑکے سے پوچھو اس کا مطلب یہ نہ تھا اہل البیت اور نبی ہما فیہ کے ”کا“ لفظ تو برائے بیت ہی تھا۔ جیسے ایک میاں جی سکندر نامہ پڑھا رہے تھے جب یہ شعر آیا۔ بزرگا بزرگی وہاں یکسم

تو اس کا مطلب اس طرح بیان کیا۔ بزرگا یہی بزرگا۔ بزرگی یہی بزرگی۔ دہا کے معنی لغت میں دیکھ کر بتائیں۔ یکسم برائے بیت ہے آگے چل بھائی۔ تو غرض کا جو ہے یہ برائے بیت ہے لوگ اتنا حقیر سمجھتے ہیں کہ ان کا مقصود اس پکارنے سے کہ او بھنگی کے یہی ہے کہ او بھنگی۔ یعنی تو ایسی ذلیل قوم سے ہے اور صاحب اب بھی ایسے متکبر لوگ موجود ہیں۔

اپنے ایک عزیز ہی کا نہایت افسوسناک واقعہ ہے وہ ایک دوسرے قصبہ کے رہنے والے۔ ہمارا یہ قصبہ بڑا متکبر مشہور ہے مگر جہاں تک میں دیکھتا ہوں۔ یہاں تکبر اتنا نہیں البتہ تیزی ہے۔ اور قصبہ میں بہت تکبر ہے۔ چنانچہ یہاں سے ایک قصبہ میں جہاں وہ عزیز رہتے ہیں ہمارا ایک طالب علم کسی اپنے کام کو گیا وہ نو مسلم ہے۔ وہ چمار کا لڑکا تھا۔ مسلمان ہو گیا ہے۔ وہاں جا کر اس عزیز کو معلوم ہوا کہ یہ پہلے چمار تھا پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ کہا قرآن مجید! یہ سن کر انہوں نے اسے بہت گالیاں دیں اور کہا خبردار! ابے چمار کے جو تو نے قرآن پڑھا۔ تو اور قرآن کا پڑھنا۔ ابے کہیں تو پٹے گا تو نہیں۔

تو یہ انہوں نے جناب نصیحت کی۔ بھلا کتنی دلیری اور گستاخی کی بات ہے میں نے کہا خدا تعالیٰ کافر کو چاہیں تو مومن کر دیں اور مومن کو چاہیں تو نعوذ باللہ کافر کر دیں اس کی قدرت سے ڈرنا چاہیے۔

قدرت کا کرشمہ

اس کی وہ قدرت ہے۔

کعبہ میں پیدا کرے زندیق کو ☆ لاوے بتخانہ سے وہ صدیق کو یہ گلزار ابراہیم کا شعر ہے یہاں صدیق سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ”انہ کان صدیقاً نبیا“ (بیشک وہ سراپا صدق نبی تھے) وہ بت خانہ سے کعبہ میں آئے بت خانہ کیا؟ آذر کی آغوش! یا کسی بت خانہ میں پیدا ہوئے ہوں یا پرورش پائی ہو۔ مجھے

تاریخ کی تحقیق نہیں۔ مگر آذر کا آغوش بت خانہ تو تھا ہی۔ بلکہ اس کے سامنے بت خانہ کی بھی کیا حقیقت تھی۔ سینکڑوں بت خانے اس آغوش اور اس بازو ہی سے تو وجود میں آ گئے۔ بت خانہ تو کیا چیز ہے وہ تو بت گر تھا مگر خدا تعالیٰ کی وہ قدرت ہے کہ اس بت خانہ میں صدیق کو پیدا کر دیا۔

کعبہ میں پیدا کرے زندیق کو

کعبہ سے مراد مکہ ہے شعراء وغیرہ سارے شہر کو کعبہ کہہ دیتے ہیں کیونکہ کعبہ ہی کی وجہ سے تو وہ شہر ہوا ہے اور زندیق سے مراد ابو جہل ہے یعنی مکہ میں ابو جہل جیسے کافر اکفر کو پیدا کر دیا۔

اس کو فرماتے ہیں۔ حضرت حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ۔

حسن زبصرہ بلال از جش صہیب از روم ☆ ز خاک مکہ ابو جہل ایں چہ بوالعجی ست
حضرت حسن بصریؒ کو بصرہ سے اور حضرت بلالؓ کو جش سے اور حضرت صہیبؓ رومیؒ کو روم سے

جذب فرمایا اور خاک مکہ فکریہ سے ابو جہل پیدا ہو یہ کس قدر عجیب قدرت ہے اور عجیب تصوف ہے کیا ملیا میٹ کیا ہے تکبر کو۔ فرماتے ہیں کہ جش میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو پیدا کر دیا۔ یہاں گمان بھی نہ تھا کہ ایسا بڑا شخص پیدا ہوگا کسی کو خبر نہ تھی کہ یہاں بلالؓ پیدا ہوں گے جو محبوب اور مقبول ہوں گے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ ایسے کہ جو خدا کے محبوب ہیں اور ان کا اتنا بڑا درجہ ہوگا کہ ان کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم یوں فرمائیں گے کہ اے بلالؓ! تم کون سا عمل کرتے ہو کہ جب میں شب معراج میں سیر کرتا ہوا جنت میں پہنچا تو میں نے اپنے آگے آگے تمہاری جوتیوں کی کھسکھاہٹ سنی۔

اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نعوذ باللہ حضرت بلالؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بڑھ گئے۔ نہیں! بلکہ آگے آگے جو جارہے تھے خادم کی حیثیت سے جارہے تھے صورتاً آگے تھے معنی آگے نہ تھے جیسے ارجاع الضعیر قبل الذکر ہوتا ہے کہ وہاں گو مرجع موخر ہے ذکر لیکن رتبہ مقدم ہے تو بھائی نحو میں تائید بھی اس کی موجود ہے اور دنیا میں بھی تو بہت سے امراء ایسے ہوتے ہیں جن کے آگے آگے خادم چلتے ہیں۔ اسی طرح حضرت بلالؓ جنت میں گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے آگے چل رہے تھے مگر تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم۔ لیکن یہ رتبہ کیا کچھ کم ہے کہ خادم کی وہ قسم بنے جو مخدوم کے آگے آگے چلتی ہے۔

تو بھلا یہ کسی کو خبر تھی کہ حبشہ میں دو کالے کلوٹے لوگوں کے درمیان ایک اس درجہ کا شخص پیدا ہو جائے گا اور کس کو خبر تھی کہ حسن بصریؒ بصرہ میں اور صہیبؓ رومیؒ جیسے بزرگ دارالنصاری

میں پیدا ہوں گے۔ بھلا کوئی سمجھ سکتا تھا کہ

حسنؒ زبصرہ بلالؓ از حبش صہیبؓ از روم ☆ ز خاک مکہ ابو جہلؓ ایں چہ بوالعجبی ست
(حضرت حسنؒ بصریؒ کو بصرہ سے اور حضرت بلالؓ کو حبش سے اور حضرت صہیبؒ رومیؒ کو
روم سے جذب فرمایا اور خاک مکہ مکرمہ سے ابو جہلؓ پیدا ہو یہ کس قدر عجیب قدرت ہے
اور عجیب تصرف ہے)

حسنؒ تو بصرہ میں پیدا ہوں اور بلالؓ حبش میں اور صہیبؒ روم میں اور مکہ کی خاک میں کون
پیدا ہوا ابو جہلؓ! ہاں تو حضرت خدا سے ڈرنا چاہیے۔ اپنے ایمان پر کبھی مغرور نہ ہونا چاہیے اور کسی
کو حقیر نہ سمجھنا چاہیے۔ غافل مرو کہ مرکب مردان مرد را
ہائے خوب ہی تعلیم ہے۔

غافل مرو کہ مرکب مردان مرد را ☆ در سنگلاخ بادیہ پیا بریدہ اند
(غفلت سے مت چل کہ حق تعالیٰ کے راستے کے شیران طریق بڑے بڑے مجاہدات
سے سلوک کو طے کیا ہے) اور

نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش ☆ ناگہ بیک خروش بہ منزل رسیدہ اند
(اس راہ میں نا امید مت ہوتا کہ بہت سے رندان بادہ خوار یعنی گناہگار ایک آہ اور ایک
نالہ سے منزل کو بطریق جذب طے کر لیتے ہیں)

خدا کا مقابلہ

واقعی ”رندان بادہ نوش ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند“ یہ ہوا بھی ہے۔ منشی محمد جان مارہرہ
کے جوکانپور میں رہتے تھے خود مجھ سے ایک حکایت بیان کرتے تھے کہ مارہرہ میں ایک آزاد مشرب
شخص تھا۔ کوئی عیب دنیا کا نہ تھا جو اس میں موجود نہ ہو۔ لوگ اس کی شرارتوں پر جب اسے نصیحتیں
کرتے کہ بھائی خدا سے ڈرو تو وہ یہی کہہ دیتا کہ میاں تمہیں کیا۔ ہم جانیں اور ہمارے اللہ میاں
گویا ناز تھا اس کو حق تعالیٰ کی رحمت پر۔ بس حضرت لوگ تو سمجھاتے سمجھاتے مایوس ہو گئے کہ اب
اس کی اصلاح نہ ہوگی لیکن ایک دن دفعتاً اس کے منہ سے یہ نکلا کہ خدا جانے میرا حال کیا ہوگا بس یہ
کہتے ہی اس پر ایک حالت طاری ہو گئی۔ خدا جانے میرا کیا حال ہوگا۔ یہ تو بولا پھر بولنا بھی چھٹا۔
کھانا پینا بھی چھٹا۔ عیش آرام بھی چھٹا۔ بس نماز کے وقت تو نماز پڑھ لیتا۔ پھر سوار ورنے کے اسے

اور کوئی کام نہ تھا۔ اس کے رونے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کلیجہ باہر نکل پڑے گا۔ ہر چند لوگ تسلی دیتے تھے مگر کسی طرح صبر ہی نہ آتا تھا۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں تیسرے دن انتقال کیا۔ کوئی شک کر سکتا ہے اس شخص کے شہید ہونے میں تو اب دیکھئے یہ ٹھیک ہے یا نہیں۔

نومید ہم مباحث کہ رندان بادہ نوش ☆ ناگہ بیک خروش بہ منزل رسیدہ اند
(اس راہ میں ناامید مت ہوتا کہ بہت سے رندان بادہ خوار یعنی گناہگار ایک آہ اور ایک نالہ سے منزل کو بطریق جذب طے کر لیتے ہیں)

تو کبھی کسی کو حقیر نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ بھنگی ہے، یہ چمار ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔
ہج کافر را بخواری منگرید ☆ کہ مسلمان بودنش باشد امید
(کسی کافر کو ذلت کی نظر سے مت دیکھنا کیونکہ ابھی ممکن ہے کہ وہ کسی وقت میں اسلام قبول کر کے حسن خاتمہ سے مشرف ہو جائے)

کسی کافر کو بھی ذلیل نہ سمجھنا چاہیے کہ شاید مسلمان ہو جائے نہ کہ مسلمان ہونے کے بعد بھی ذلیل سمجھا جائے کہ یہ تو نعوذ باللہ! خدا کا مقابلہ ہے۔ خدا جانے آئندہ کیا ہونے والا ہے اور ہماری قسمت میں کیا ہونے والا ہے۔ اور ہماری قسمت میں کیا لکھا ہے۔

توان منشی جمال الدین کی حکایت میں نے بیان کی تھی اس نو مسلم کے اس قول پر کہ اسلام میں توحید بہت کامل ہے تو اس نے مجھ سے یہ کہا کہ چونکہ مسلمانوں کی خاصیت توحید ہے اس لئے اب میں ان سے جدا نہ ہوں گا۔ اب میں اسلام کو نہ چھوڑوں گا خیر! اس سے مجھے تسلی ہوئی۔

نور کے آثار

اس پر یہ حکایت یاد آگئی تھی کہ لوگ ”نور“ چمک کو سمجھتے ہیں۔ حالانکہ نور کہتے ہیں اس کو جو ظاہر لفظ و مظہر لغیرہ ہو یعنی جو خود بھی ظاہر ہو اور دوسرے کو بھی ظاہر کر دے۔ بس حقیقت یہ ہے نور کی۔ اب اللہ نور السموات کی تفسیر میں استعارہ کی تاویل کی حاجت ہی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ سموت اور ارض کو ظاہر بھی کر رہا ہے اور ان کے واسطے سے خود بھی ظاہر ہے بہر حال نور اس کو کہتے ہیں جو خود بھی ظاہر ہو اور دوسرے کو بھی ظاہر کرے۔

تو اب وہ شبہ نہیں رہا کہ ہم نے تو نماز پڑھی تھی کوئی نور نہیں پیدا ہوا۔ ہم تو روزہ رکھتے ہیں کوئی نورانیت قلب میں محسوس نہیں ہوتی۔ طاعت میں کوئی نور نظر نہیں آتا۔ اب یہ شبہ رفع ہو گیا

کیونکہ نور چمک دمک کا نام نہیں ہے۔ بلکہ نور وہ ہے جس کی میں نے ماہیت عرض کی کہ ظاہر لفسہ و مظہر لغیرہ۔ خیر عوام کیا سمجھیں اس کو لیکن اس کی علامتیں اور آثار ہیں جن سے وہ نور کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ اگر آگ دکھائی نہیں دیتی تو دھواں تو دکھائی دیتا ہے۔ دھوئیں سے تو پہچان سکتے ہیں کہ آگ موجود ہے آثار کیا ہیں اس نور کے؟

ترمذی کی حدیث ہے اس آیت کی تفسیر میں فمن یرد اللہ ان یرہد یہ یشرح صدرہ للاسلام کہ جب شرح صدر ہوتا ہے تو نور قلب میں داخل ہوتا ہے کسی نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وما علامۃ نور کے داخل ہونے کی کیا علامت ہے فرمایا التجانی عن دار الغرور والاناۃ الی دار الخلود۔ دنیا سے تعلق کا کم ہو جانا اور متوجہ ہو جانا آخرت کی طرف۔ یہ علامت ہے نور قلب کی۔ تو بھائی اس علامت سے ہی سمجھ لو کہ طاعت میں نور ہے یا نہیں۔ تو طاعت میں مشغول ہونے سے یہ علامتیں پاؤ گے اور معصیت کے بعد اس کے خلاف پاؤ گے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ معصیت میں ظلمت ہے اور طاعت میں نور ہے۔ اس طرح نور و ظلمت ہونا طاعت کا اور معصیت کا تم پر منکشف ہو گا اور اگر منکشف نہ ہو تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ کبھی خالص طاعت کو اختیار کر کے دیکھا نہیں امتحان ہی کے طور پر چند روز خالص طاعت میں گزار لو۔ پھر معصیت کے بعد جو کیفیت ہو اس کو یاد رکھ لو۔ خود فرق معلوم ہو جائے گا۔ وہی آیت صادق آئیگی جو میں نے پڑھی تھی هل یستوی الظلمت - ظلمات اور نور کہیں مساوی ہو سکتے ہیں۔

ذات الانوار

اب یہاں سے معلوم ہو گیا کہ رمضان المبارک کا وہ مہینہ ہے جو مجمع النور ہے اس واسطے کہ اس مہینہ میں قرآن مجید نازل ہوا جس کی شان یہ ہے کہ ہدی ہے، بینات ہے اور فرقان ہے اور ان میں سے ہر ایک صفت دلالت کرتی ہے قرآن مجید کے نور ہونے پر۔ فرقان ہونا بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کیونکہ فرق بین الحق والباطل انکشاف پر ہے۔ اور انکشاف نور سے ہوتا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔ اور ایک ہدی کا مادہ ہے وہ بھی دلالت کر رہا ہے قرآن مجید کے نور ہونے پر۔ کیونکہ رستہ اسی چیز سے نظر آتا ہے جس کی شان ہو ظاہر لفسہ و مظہر لغیرہ۔ اس کو تو ہر شخص جانتا ہے ادھر بینات ہے جس کے معنی ہیں دلائل و اضمحلات۔ اس کا موضع ہونا یہ بھی کاشف ہوتا ہے

جو مرادف ہے نور کا۔ تو قرآن مجید کی سب صفتیں ایسی ہیں جن سے اس کا نور ہونا ثابت ہوتا ہے۔
تو حاصل اس آیت کا یہ ہوا کہ رمضان المبارک ایسا مہینہ ہے جس میں ایسی نورانی چیز آئی۔
تو گویا پرانوار ہے یہ مہینہ اور ذات الانوار ہے یہ مہینہ۔ اور جب ذات الانوار ہے تو اس کا رافع
الظلمات ہونا لازم ہے۔

اب رافع ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو رافع ہونا ہے تکوینی اور ایک رافع ہونا ہے
تشریعی۔ سورفع تکوین تو باختیار عبد نہیں اس لئے تکوینا تو خود رافع بنایا کہ اس کو مجمع الفضا ئل بنایا
اسباب ظلمت کو اس میں مفقود کیا۔ چنانچہ شیاطین بھی اس میں قید ہو جاتے ہیں اور رافع تشریعی
باختیار عبد ہے۔ اس لئے اس پر آگے تفریعاً فرمایا فمن شهد منكم الشهر (پس تم میں سے جو
شخص اس مہینہ کو پالے) یعنی جب ایسا مہینہ ہے تو اس کو ظلمات کے رفع کا آلہ تم بھی بناؤ۔ اس
طرح سے کہ اس میں خاص عبادت کرو یعنی روزہ رکھو اور اس کے انوار کو آلہ بناؤ رفع ظلمات کا۔
جس کی صورت یہ ہے کہ اطاعت اختیار کرو۔

حاصل یہ کہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک لائین رکھی ہو بڑی مسجد میں اور یہ کہا جائے کہ اس
سے کام لو۔ اور جہاں جہاں ظلمتیں ہوں وہاں لے کر جاؤ تاکہ وہ رفع ہوں یہ تھوڑا ہی ہے کہ رکھی رکھی
ساری دنیا کی ظلمات کے رفع کے لئے وہ کافی ہو جائے اسی طرح تم کو بھی یہ مہینہ کیا ملا ہے گویا ایک
لائین عطا ہوئی ہے مگر اس کو محل ظلمت میں لے بھی تو جاؤ۔ اگر کہیں نہ لے جاؤ تو بیٹھے بیٹھے ظلمت کیسے
رفع ہو جائے گی۔ یوں چاہیے وہ نور ایسا ہی قوی ہو جس سے ظلمتیں بلا استعمال بھی رفع ہو سکتی ہوں مگر
حق تعالیٰ نے شعاعوں کے پہنچنے کی حد تک پردے قصد ایسے رکھے ہیں جن سے نور بدوں تصرف کے
نہیں پہنچتا۔ تاکہ مکلف کا مکلف ہونا بھی تو معلوم ہو ورنہ اگر اس مہینہ میں اعمال ظلمانیہ پر بھی قدرت
نہ ہوتی اور طاعات بالاضطرار صادر ہوتیں۔ بخلاف فرشتوں کے تو یہ بھی رفع تکوین میں داخل ہو جاتا
ہے اور اس صورت میں مکلف کا کیا کمال تھا اور اس کو کیا برکت حاصل ہوتی۔

انسان کی فرشتوں پر فضیلت

یہی ظہور کمالات و عطا برکات اس کی وجہ ہے کہ انسان کو مکلف طاعات کا بتایا کہ ان شاء
افعل وان شاء لم يفعل کہ ان کا اختیار مشابہ اضطرار کے ہے وہ ترک طاعات پر قادر نہیں۔
انسان کو ان پر خاص شرف دینا تھا۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنا چاہا تو ملائکہ نے عرض کیا کہ وہ تو کھائیں گے بھی پیئیں گے بھی فاجعل لهم الدنيا ولدن الآخرة۔ ان کے حصہ میں دنیا کر دیجئے ہمارے حصہ میں آخرت۔ ارشاد ہوا کہ ہرگز نہیں۔ بھلا جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے اور جس کو صرف کن کہہ کر پیدا کیا ہے دونوں کو برابر کر دوں یعنی تم کو کہ صرف کن کہہ کر پیدا کیا ہے اور انسان کو جن کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے کیسے برابر کر دوں۔ اب رہا یہ کہ دونوں ہاتھوں سے پیدا کرنے کے کیا معنی ہیں۔ سو اس کا حقیقی علم تو حق تعالیٰ ہی کو ہے باقی حاصل مطلب یہ ہے کہ انسان کو خاص توجہ اور عنایت اور اعتنا کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یعنی خلاصہ ارشاد کا یہ ہے کہ ان کی نوع بلحاظ مجموعہ کے ملائکہ کی نوع سے بڑھی ہوئی ہے۔ یہ نہیں کہ ہر فرد ہر فرد سے افضل ہے یہاں سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ انسان ملائکہ سے بھی افضل ہے ولو باعتبار بعض الافراد۔ اور کیا یہ بات فضیلت ظاہر کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ فرشتوں کو تو انسان کی خدمت سپرد کی گئی لیکن اس کو ان کی کوئی خدمت سپرد نہیں کی گئی۔ یہ کیا تھوڑی بات ہے کہ سارے کام انسان کے ملائکہ کے سپرد ہیں۔ یہاں تک کہ خود ان کی خدمت بھی اور ان کی چیزوں کی خدمت بھی۔ ان کی جس گھاس کو تیل کھاتے ہیں اس کی بھی۔ کیونکہ قوت نامیہ سے کام لینے والے وہ ملائکہ ہیں جو مہر برات ہیں ارض و سموات کے۔ یہاں تک کہ نطفہ میں بھی ملائکہ ہی تصرف کرتے ہیں۔ جس وقت نطفہ قرار دیا۔ اسی وقت ایک فرشتہ فوراً متعین کر دیا گیا پہلے اس نے علقہ بنایا پھر عرض کیا اب کیا کروں۔ پھر مضغہ بنایا پھر عرض کیا اب کیا کروں غرض اخیر تک برابر فرشتہ تصرفات کرتا رہتا ہے۔

اطباء سمجھتے ہیں کہ قوت مولدہ کام کرتی ہے چلو بیٹھو بھی۔ قوت بیچاری کام کیا کر سکتی ہے۔ جب تک کوئی قوت سے کام لینے والا نہ ہو۔ یہ صاحب حکماء کہلاتے ہیں! یہ حکماء ہیں؟ حقاء ہیں کہ طبیعت کو عذیمۃ الشعور بھی مانتے ہیں اور ایسے افعال بدیعہ کو بھی اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ جب بہت لتاڑ پڑی کہ بھلا کوئی عذیمۃ الشعور ایسے افعال بھی کر سکتا ہے تو اخیر میں ذرا متاخرین کو ڈھیلا ہونا پڑا اور کہنا پڑا کہ ضعیفۃ الشعور ہے۔ مگر پھر بھی اعتراض باقی ہے۔ یعنی ان کے قول کا حاصل تو یہ ہوا کہ طبیعت بے عقل تو نہیں کم عقل ہے لیکن وہ اعتراض تو پھر بھی باقی ہے کہ کم عقل سے ایسے افعال بدیعہ کیسے صادر ہو سکتے ہیں بلکہ اب اعتراض اور قوی ہو گیا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بے عقل کا تصرف تو ایک نوع احد پر چلتا رہتا ہے۔ جیسے مشین کہ ایک مرتبہ گھما دینے سے کام کرتی

رہتی ہے تو جو عدیم الشعور ہے وہ کام کو اتنا نہ بگاڑے گا لیکن جو کم شعور ہے وہ بہت بگاڑے گا مشین سے کام اتنا نہیں بگڑتا جتنا انسانی ہے۔

سو واقعی ان حکماء نے یہ کیا حماقت کی بات کہی۔ بس سیدھی بات یہ ہے کہ مسلمان ہو جاؤ اور اس کے قابل ہو جاؤ کہ اللہ میاں فرشتوں سے یہ سب کام لیتے ہیں۔ پھر کوئی اشکال ہی باقی نہیں رہتا۔ ان حکماء نے اس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں کہ کہیں پناہ نہیں ملتی۔ ہر جگہ اعتراض بخلاف اہل حق کے جو قائل ہیں خدا کے قادر مطلق اور مختار مطلق ہونے کے ان پر کوئی اشکال ہی نہیں واقع ہوتا۔ البتہ حکماء کی طرف سے ان پر اخیر سوال یہ ہے جس پر ان کو بڑا ناز ہے کہ اختیار تو قدیم ہے پھر خاص وقت میں احد المقدورین کو ترجیح دینا ترجیح بلا مرجح ہے۔ جواب یہ ہے کہ مرجح ارادہ ہے۔ اس پر سوال کیا گیا ہے کہ کسی خاص وقت میں ارادہ کیوں مرجح ہوا؟ جواب یہ ہے کہ ارادہ کی حقیقت ہی یہ ہے کہ ترجیح احد المقدورین من شاء جب یہ ترجیح اس کا ذاتی ہے خواہ یوں کہے کہ اس کا لازم ہے اور ذات اور ذاتی کے درمیان اسی طرح ملزوم و لازم کے درمیان تحلیل جعل کا محال ہے اس لئے اس ترجیح کی علت کا سوال ہی لغو ہے۔ بس بند ہو گیا ناطقہ۔ ایک اسلام نے ساری اشکالات کو حل کر دیا۔ اور وہ اصولاً و قریباً ہر طرح سے بے غبار رہ گیا۔

انسان کی حیثیت

بہر حال تسخیر ملائکہ سے انسان کا کتنا بڑا شرف ثابت ہوا البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ شرف اسی وقت تک ہے جب تک حق تعالیٰ سے اس کو تعلق ہے دیکھو! ہمارے یہاں کوئی مہمان آتا ہے تو اپنے بیٹوں سے اس کی خدمت کراتے ہیں۔ حالانکہ بیٹا نسبت میں اس شخص سے زیادہ قریب ہوتا ہے مگر مہمان ہونے کی وجہ سے وہ بیٹے سے زیادہ معزز ہے لیکن اسی وقت تک معزز ہے جب تک وہ مہمان ہونے کے تعلق کو قائم رکھے ورنہ اگر اپنی کسی حرکت سے اس تعلق کو منقطع کر دیا تو پھر اسی بیٹے کے ہاتھوں جس کو خدمت کرنے کا حکم تھا جو تیاں بھی لگوائی جاتی ہیں۔

چنانچہ کانپور میں ایک شخص نے چند صلحاء کی دعوت کی تھی۔ میزبان کے لڑکے نے سب کے ہاتھ دھلائے ان میں سے ایک صاحب جو مدعیان صلاح میں سے تھے آزاد سے تھے انہوں نے اس قدر نالائق حرکت کی کہ اس لڑکے کے رخسار پر محبت نفسانیہ سے ہاتھ پھیرا۔ صاحب مکان نے دیکھ لیا۔ فوراً خدمت گار کو حکم دیا کہ ان سب نالائقوں کو کان سے پکڑ کر باہر نکال دو۔ ایک نالائق کی وجہ سے کبھی بے چارے نکالے

گئے۔ لو صاحب یا تو مہمان تھے بیٹا خدمت کر رہا تھا یا نوکروں سے کان پکڑوا کر نکالے گئے۔
تو حق تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں اپنا مہمان کر کے بھیجا۔ اور فرشتوں کو اس کے کام میں
لگا دیا۔ بقول ذوق

دنیا میں ہے جو کچھ وہ سب انسانوں کیلئے ہے ☆ آراستہ یہ گھر اسی مہمان کے لئے ہے
لیکن یہ خدمت اور مہمانداری اسی وقت تک ہے جب تک ہم مہمانی کے اہل ہیں
اور اگر مہمانی کے خلاف ذرا کوئی حرکت کی تو کان پکڑ کر نکال دیئے جائیں گے اتنا فرق ہے کہ وہاں
اسی وقت ذلیل کر کے نکال دیئے جاتے ہیں یہاں ایک میعاد مقرر ہے دسترخوان کے لئے۔ اس
میعاد تک۔ گو ہم سے کیسی ہی نالائق حرکتیں سرزد ہوں ہم مہمان ہی قرار دیئے جاتے ہیں جیسے بعضے
کریم النفس ہوتے ہیں کہ جب کسی نے دسترخوان پر کھانا شروع کر دیا تو کریم النفس میزبان اس کی
نالائقیوں پر چشم پوشی کرتا ہے اور صبر کرتا ہے کہ اب میں کیسے اس کھاتے ہوئے کو اٹھا دوں لیکن جب
میعاد ختم ہو گئی۔ اور گھر سے ہو گئے باہر پھر وہ جوتے پہ جوتا۔ انہیں کے ہاتھوں ذلیل کرائے جائیں
گے جن سے کہ اب خدمت کرائی جا رہی ہے یعنی ملائکہ سے۔ بہر حال یہ ثابت ہوا کہ انسان کا کمال
زیادہ تر اسی پر مبنی ہے کہ اس سے اضطراباً کام نہیں لیا جاتا۔ وہ اپنے اختیار سے مجاہدہ کرتا ہے۔

ماہ رمضان کی عبادات

اس لئے رمضان کو اس کے لئے اضطراباً رفع ظلمات اعمالیہ نہیں بنایا گیا۔ بلکہ اس کو خود حکم
ہوا ہے ان ظلمات کو رفع اس کو تم خود بناؤ۔ یعنی اپنے اختیار سے مجاہدہ کر کے رمضان کو پر انوار
بناؤ۔ اس طرح سے ان انوار کو کل ظلمات میں پہنچاؤ اپنے عمل کے ذریعہ سے۔ اس لئے فرمایا فمن
شهد منکم الشهر فلیصمه، تو اس طرح یہ آیت دلالت کرتی ہے حقوق رمضان کے وجوب
پر۔ جیسے کہ میں نے تقریر بیان کی بعد مقدمات کے۔

اس مہینہ پر علاوہ صوم کے اور بھی چند عبادتیں مشروع ہیں۔ ان میں سے ہر عبادت کی حقیقت
میں غور کرنے سے میرا یہ دعویٰ ثابت ہو جائیگا کہ واقع میں یہ مہینہ محل انوار ہے چنانچہ مجموعہ میں سے۔

۱۔ ایک عبادت ہے اس کے اندر روزہ کی جو آیت میں صریح مذکور ہے۔

۲۔ ایک عبادت ہے اس کے اندر تراویح کی جس کی طرف ذکر قرآن سے اشارہ ہے

۳۔ ایک عبادت ہے اس کے اندر اعتکاف کی جس کا ذکر بعد میں ہے۔

- ۴۔ ایک عبادت ہے اس کے اندر احیاء لیلیٰ قدر کی جس کا ذکر دوسری آیتوں میں ہے۔
 ۵۔ ایک عبادت ہے اس کے اندر کثرت تلاوت قرآن مجید کی۔ اس کی طرف بھی ذکر قرآن ہی میں اشارہ ہے۔

یہ گویا اس وقت پانچ عبادتیں ذہن میں حاضر ہیں۔ اب ہر ایک کی حقیقت میں اور ذات میں غور کرنے سے جو میں نے دعویٰ کیا ہے اس کی تائید ہوگی سب کو تھوڑا تھوڑا بیان کرتا ہوں۔

کثرت تلاوت

چنانچہ ایک عبادت ہے تلاوت قرآن مجید کیونکہ حق جل علاہ کے ارشاد سے رمضان شریف کا محل نزول قرآن ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس سے مناسبت تلاوت قرآن مجید کی رمضان شریف کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے باقی خاص رمضان المبارک میں تلاوت کی کثرت کی حدیث قولی یا فعلی میں میری نظر سے نہیں گزری۔ لیکن میری نظر وسیع نہیں ممکن ہے کوئی روایت ہو جو میری نظر سے نہ گزری ہو لیکن ایک سنت اس وقت میرے ذہن میں ہے اس سے استدلال کرنا کافی ہوگا۔

وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال رمضان المبارک کے مہینہ میں حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن مجید کا دور فرمایا کرتے تھے۔ اور جس سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال فرمایا۔ اس رمضان میں جبریل علیہ السلام نے دوبارہ دور کرایا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے قرب وفات پر استدلال فرمایا یعنی معلوم ہوتا ہے میرے لئے اگلا رمضان آنے والا نہیں ہے۔ میں اس وقت تک زندہ نہیں رہوں گا۔ اسی لئے دو دفعہ دور کرایا گیا تاکہ اگلے رمضان کا دور بھی اسی رمضان میں ہو جائے۔

اب یہ ظاہر بات ہے کہ یہ دور جو ہر سال رمضان المبارک میں ہوا کرتا تھا غیر تراتح میں ہوتا تھا۔ لہذا اس سنت سے اور دوسرے اس حدیث سے کہ رمضان شریف میں اور دنوں سے زیادہ آپ اجتہاد فرماتے تھے۔ اور تلاوت ہمیشہ مطلوب ہے تو رمضان میں زیادہ مطلوب ہوگی۔ ان دونوں سے مدعا ثابت ہو سکتا ہے۔

غرض اس سے معلوم ہوا کہ ایک عبادت رمضان المبارک کی مطلوب عبادات میں سے تلاوت قرآن مجید بھی ہے اور قرآن مجید کا نور ہوتا ہدی للناس و بینات من الہدی والفرقان میں بیان فرمایا دیا ہے یہی دلیل کافی ہے اس عبادت کے نور ہونے کی۔

ایک جزو رمضان المبارک کی عبادات کا روزہ ہے جس کو اس آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ فمن

شهد منکم الشهر فلیصمه . (تم میں سے جو شخص اس مہینہ کو پالے اسے چاہئے کہ روزہ رکھے)

ترک معصیت

اب رہا روزہ کا نور ہونا۔ سو غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ روزہ کس طرح سے نور ہے تو روزہ کی حقیقت دیکھنی چاہیے کہ کیا ہے حقیقت یہی ہے لذات کا ترک کر دینا، شہوات کا ترک کر دینا۔ تو لذات کے ترک سے اور شہوات کے ترک سے خود مشاہدہ ہو سکتا ہے کہ قلب کے درمیان ایک کیفیت نور کی اور انشراح کی پیدا ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ معاصی میں دو درجے ہیں۔ ایک تقاضا اور ایک اس تقاضے پر عمل۔ اور بالفعل اور عمل کا ظلمت ہونا معلوم ہی ہے۔ باقی تقاضا گو وہ بالفعل ظلمت نہیں مگر بالقوہ ظلمت ضرور ہے اور بالقوہ شرط ہے بالفعل کی اور شرط کا فوت مستلزم ہے فوت مشروط کو۔ اور روزہ سے تقاضے میں کمی آتی ہے تو فعل میں بھی کمی آئیگی تو دونوں درجے ظلمت کے اس سے منفی ہو گئے۔ پھر نور ہونے میں کیا شبہ رہا۔ روزہ اس طرح نور ہوا۔

لیکن یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ قوت کے مرتفع و منفی ہونے کے معنی اصطلاح میں ضعیف ہو جانے کے ہیں نہ کہ بالکل معدوم ہو جانا۔ اور یہ بہت کام کی بات ہے جس کے نہ جاننے کی وجہ سے بہت غلطیاں واقع ہو رہی ہیں۔ چنانچہ عموماً! اس وقت کے صوفیاء ترک لذات کی نسبت اور ترک تعلقات کی نسبت یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے قطع کا حکم ہے۔ حالانکہ یہ الفاظ اصطلاحی ہیں۔ ان کو لغت پر محمول نہ کرنا چاہیے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ لذات کو بالکل فنا کر دینا چاہیے اور اخلاق ذمیمہ بالکل معدوم ہو جانے چاہئیں۔ تو اس غلطی میں پڑنے سے یہ ضرر ہوتا ہے کہ بعد مجاہدہ کے جب دیکھتے ہیں کہ نفس میں ان چیزوں کا پھر تقاضا ہونے لگا ہے تو مایوس ہو جاتے ہیں کہ ہمارا سارا مجاہدہ ہی برباد گیا۔

اور مایوس ہونے سے یہ ضرر ہوتا ہے کہ پہلے جو تھوڑی بہت مجاہدہ کی توفیق تھی اس کو بھی ترک کر بیٹھتے ہیں جب اس کو ترک کر دیتے ہیں تو اس کی وجہ سے جو مواد خبیثہ میں اضمحلال ہو گیا تھا۔ وہ جاتا رہتا ہے اور پھر اس مواد خبیثہ میں جوش و خروش پیدا ہو کر معاصی کا صدور ہونے لگتا ہے۔ دیکھئے کتنا ضرر ہوا اگر اسی اصطلاح کے نہ جاننے سے تو قوت کے مرتفع ہونے کے معنی قوت میں اضمحلال ہو جانے کے ہیں۔ جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب مکرر سمجھئے کہ روزہ میں خاصیت ہے اضمحلال داعیہ شہوت کی جس کا نام تھا قوت۔ جب قوت کا درجہ ضعیف ہو گیا تو فعلیت کا درجہ بدرجہ اولیٰ ضعیف ہو جائے گا اور معاصی سے احتراز آسان ہوگا اور طاعت کی توفیق ہوگی۔ جب معاصی سے

احتراز ہوگا جو سب ظلمت ہیں اور طاعت کی توفیق ہوگی۔ تو ظاہر بات ہے نور پیدا ہو ہی گا۔ اس اعتبار سے روزہ بھی نور ہوا۔

ایک عبادت تھی تراویح۔ اس کا نور ہونا بھی ظاہر ہے۔ اول تو خود حدیث میں ہے الصلوٰۃ نور^۱ دوسرے نور ہونا اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے نور کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ظلمت کو رفع کرتا ہے۔ اسی طرح نماز مرتفع کرتی ہے منکرات اور شہوات کو جیسا کہ ارشاد ہے: ان الصلوٰۃ تنہی عن الفحشاء والمنکر (بیشک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے) اور منکرات و شہوات کا ظلمت ہونا ظاہر ہے۔ غرض تراویح کا نور ہونا اس طرح سے معلوم ہوا۔

جامع جمیع عبادات

ایک عبادت اعتکاف ہے۔ اس کی حقیقت ہے خلوت اور خلوت میں جو نور پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر بات ہے کوئی شک و شبہ نہیں۔

ایک عبادت احیاء لیلیٰ قدر رمضان ہے۔ یہ احیاء تو سب راتوں میں عبادت ہے لیکن خود لیلیٰ قدر کی عبادت کی فضیلت قرآن مجید میں مذکور ہے۔ لیلة القدر خیر من الف شهر ، تنزل الملائكة والروح فیہا باذن ربہم۔ (شب قدر ایک ہزار مہینہ کی عبادت) سے بہتر ہے اس میں فرشتے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ کے حکم سے اترتے ہیں) ملائکہ اہل نور ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ نور والوں کی صحبت سے نور پیدا ہوتا ہے۔ اہل اصطلاح کی صحبت سے صلاح کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ اہل فسق کی صحبت سے فسق کا مادہ پیدا ہوتا ہے اہل ظلمت کی صحبت میں ظلمت ہوتی ہے۔ اہل نور کی صحبت میں نور ہوتا ہے۔ یہ خاصیت خاص ہے شب قدر کے ساتھ۔

خلاصہ یہ کہ رمضان کیا ہوا مجمع انوار ہوا۔ یوں تو سب طاعات انوار ہیں۔ مگر یہ خاصیت رمضان المبارک ہی میں ہے کہ تمام انوار اس میں جمع ہو گئے ہیں پھر اس میں جو عبادت بھی ہے اپنی کامل ہیئت کے ساتھ ہے۔ بخلاف دوسری عبادات جامعہ کے جن میں یہ بات نہیں۔

مثلاً اہل لطائف نے نماز کو جامع جمیع عبادات کہا ہے۔ اس طرح کہ نماز کے اندر نماز تو ہے ہی۔ تلاوت قرآن مجید بھی ہے۔ کھانا پینا بھی نماز کے اندر ممنوع ہے وہ گویا روزہ کے معنی ہوئے

۱۔ الصحيح لمسلم کتاب الطہارۃ باب: ۱، رقم: ۱۰۰، سنن الترمذی: ۳۵۱۷، سنن النسائی کتاب الزکوٰۃ باب: ۱، سنن ابن ماجہ: ۲۸۰، ۲۸۱

نمازی متوجہ ہوتا ہے خانہ کعبہ کی طرف، وہ گویا حج کے معنی ہوئے۔ کسی سے بولتا چالتا نہیں اور مسجد کے اندر ہی رہتا ہے۔ تو گویا نماز میں معنی اعتکاف کے بھی ہوئے۔ کچھ نہ کچھ خرچ بھی کرنا پڑتا ہے مثلاً کپڑا ہی بنایا جائے، خریدی گویا معنی زکوٰۃ اور انفاق کے بھی نماز کے اندر پائے گئے۔ تو اس طرح سے بعض عبادات کے غیر رمضان میں بھی جامع الانوار ہیں۔ مگر اتنا فرق ہے کہ نماز کے اندر تو اور عبادات کے صرف معنی ہی پائے جاتے ہیں۔ اور رمضان المبارک میں ہر عبادت اپنے کامل ہیئت پر موجود ہے چنانچہ نماز کے اندر جو روزہ کی صفت پائی جاتی ہے وہ صرف ایک ساعت کے اعتبار سے ہے اور ایک ساعت کا روزہ اس کی صورت اصلی کے اعتبار سے کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح اعتکاف بخلاف رمضان المبارک کے کہ اس میں جتنی چیزیں ہیں سب مستقل طور پر موجود ہیں۔ صوم ہے وہ مستقل قرآن مجید کی تلاوت ہے وہ مستقل اعتکاف ہے وہ مستقل، لیالی قدر کی بیداری ہے وہ مستقل۔ یہ سب مستقل ہیں۔ یہ خاصیت کسی زمانہ میں یا کسی طاعت میں نہیں ہے۔ ایسی جامعیت ہے اس کے اندر۔ اس سے آپ قدر کر سکتے ہیں کہ رمضان شریف کیا چیز ہے جب یہ ایسی چیز ہے تو جو اس کے حقوق ہیں ان کو ادا کرنا ضروری ہوا۔ وہ حقوق کیا ہیں؟

روزہ کے متعلق معاصی

ایک تو وہ حقوق ہیں جو مشترک ہیں تمام طاعات رمضان میں اور ایک حق ہے خاص خاص طاعات کے متعلق معاصی کا ترک کرنا۔ مثلاً روزہ کے متعلق اور معاصی ہیں نماز کے متعلق اور معاصی ہیں یہاں نماز سے مراد وہ نماز ہے جو خاص ہے جس کو تراویح کہتے ہیں جو نماز عام ہے وہ مراد نہیں ہے۔ غرض ہر ایک کے متعلق جدا معاصی ہے مثلاً روزہ کے متعلق جو معاصی ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ قسم جس سے روزہ کی حقیقت میں فرق آجائے یعنی عدم امساک عن مفطرات الصوم یا جو ان آدمی نے جس کو اندیشہ جماع کے ارتکاب کا ہو مس اور تقبیل نے احتراز نہ کیا۔ یہ بھی اس ہی کے ساتھ حکماء ملحق ہے۔

اور ایک وہ قسم جن سے روزہ کی حقیقت میں تو فرق نہیں آتا لیکن کمال میں نخل ہیں جیسے بری نگاہ سے کسی کو دیکھنا، کسی کی غیبت کرنا یا کوئی ناجائز کام ہاتھ سے کرنا یا پاؤں سے ناجائز موقع کی طرف چلنا۔ شطرنج، گنجفہ کھیلنا، گانا بجانا یا سننا یا ناچ دیکھنا وغیرہ وغیرہ اور سب سے بڑھ کر افح اور اشبع یہ ہے کہ روزہ ہی نہ رکھے۔

چنانچہ پارسال رمضان گرمی میں آیا تھا۔ اب ہر سال دس دس دن مقدم ہوتا چلا جائیگا یعنی اس سے پہلا رمضان پورے جون میں تھا۔ مگر بہترے لوگوں نے جوئیں ہی ماریں پھٹکر۔ اب کارمضان جون کے مہینہ سے دس دن پہلے شروع ہو جائے گا یعنی ۲۰ مئی سے۔ اگلے سال ان شاء اللہ اور دس دن پہلے شروع ہوگا۔ پھر ان شاء اللہ کلیم مئی سے ہوگا۔ پھر اپریل میں پڑے گا۔

غرض! اب ہر سال سردی ہی کی طرف ہٹا چلا جائے گا۔ پھر سردی کے زمانے میں ہونے لگے گا۔ اور ہر چند یہ زمانہ گرمی کا ہے جس میں اب کے سال رمضان المبارک آرہے ہیں مگر اب تک تو بفضلہ تعالیٰ گرمی پڑی نہیں۔ بہت ڈر رہے تھے کہ خدا خیر کرے اب کے رمضان میں بڑی گرمی ہوگی۔ مگر خبر بھی ہے خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت سے گرمی کو سردی سے بدل دیا۔ فاو لثک یبدل اللہ سیئات حسنات (تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عطا فرمائے گا) کا نمونہ ہو گیا اور یہ عجیب بات ہے کہ یہ مہینے سب گرمی کے ہیں۔ اپریل، مئی، جون۔ اپنے مہینوں کے نام اسلئے نہیں لئے کہ وہ مختلف موسموں میں واقع ہوتے ہیں اس لئے غیروں کے مہینوں کے نام لئے ہیں کہ حساب آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ تو یہ اپریل اور مئی اور جون سخت گرمی کے مہینے ہیں مگر چند سال سے میں دیکھتا ہوں کہ گرمی بھی بہت دنوں میں شروع ہوتی ہے۔ یعنی ضابطہ سے جو زمانہ گرمی شروع ہو جانے کا ہے اس وقت بھی سردی ہوتی ہے۔

غرض گرمی کا زمانہ شروع ہو جانے کے بعد بھی بہت دنوں تک سردی ہی رہتی ہے اب بھی راتوں کو دیکھئے ٹھنڈ ہوتی ہے۔ دن کو بھی اور صبح شام کو بھی۔ ایسی گرمی پریشانی کی نہیں ہوتی اب جب مئی سے کھسک کر اپریل کے اخیر عشرہ میں رمضان شروع ہوں گے تو اور سردی ہوگی۔ پھر ۱۱ اپریل کو اور سردی میں ہوں گے پھر کلیم اپریل کو اور سردی میں ہوں گے پھر مارچ میں آجائیں گے تو اور سردی ہوگی۔

غرض اب اپنے دل سے ڈر نکال دو کیونکہ سردی ہی کی طرف جارہے ہیں اور جب تک گرمی میں ہیں گرمی سے بھی نہ ڈرنا چاہیے کیونکہ وہ گرمی بھی اب رفتہ رفتہ سردی ہوتی جاتی ہے جیسا کہ مشاہدہ کر لیا۔ اور میرا خیال ہے کہ عجب نہیں کچھ زمانہ کے بعد گرمی ہی بالکل جاتی رہے۔

اتلاف حق

مجھے خیال اس لئے ہوا کہ میں نے اپنے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے متعلق ایک پیشین گوئی سنی ہے وہ پیشین گوئی یا تو کشف ہے یا فراست ہے کیونکہ

مولانا کا دماغ بہت صحیح تھا۔ بزرگوں کے جدا جدا حالات ہیں مولانا کو کشف سے بہت مناسبت تھی۔ گو کشف ہونا کوئی ایسے زیادہ کمال کی بات نہیں لیکن صاحب فراست بھی غضب کے تھے۔ ایسے عالی دماغ اور صحیح المزاج تھے کہ میں نے معتذر ذریعہ سے سنا ہے کہ پہلے یہ کیفیت تھی (بعد کو یہ کیفیت کم ہو گئی تھی کیونکہ ایک بار گھوڑے پر سے گر گئے تھے جس سے دماغ پر صدمہ پہنچا تھا) کہ کوئی ایک دفعہ بھی چادر اوڑھ کر دے دیتا تھا تو اسے سونگھ کر بتا دیتے تھے کہ یہ مرد نے اوڑھا ہے یا عورت نے۔ اس قدر صحیح دماغ تھا ان کے صاحبزادہ مولوی حکیم معین الدین صاحب موجود ہیں۔ انہوں نے عجیب غریب حکایتیں مولانا کی صحت دماغ کی سنائی تھیں۔

اب اس پیشین گوئی کو یا تو کشف کہئے یا فراست سمجھئے۔ میں کم سن تھا یعنی اٹھارہ انیس برس کی عمر تھی۔ اس وقت حضرت نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ بھائی چند روز میں ہندوستان بھی کشمیر ہو جائے گا۔ حالانکہ اس زمانہ میں بڑی سخت گرمی پڑتی تھی مگر ممکن ہے مولانا کو خفیف فرق محسوس ہو چلا ہو۔ صاحب چند سال تک تو کچھ فرق معلوم نہ ہوا۔ البتہ مولانا کی وہ بات یاد رہی۔ پھر تو میں بھی تھوڑا بہت فرق محسوس کرنے لگا۔ اور اب تو بہت ہی فرق ہو گیا ہے جو سخت گرمی کا زمانہ ہونا چاہیے اس میں بھی سردی ہوتی ہے۔ اس واسطے میں کہتا ہوں کہ ڈرو مت جب گرمی میں سردی ہے تو سردی میں سردا ہوگا یعنی بہت قوی سردی ہوگی۔

سردا جو میں نے اس وقت کہا اس پر یاد آ گیا ایک قصہ لطیف۔ یہاں تھا نہ بھون میں کسی کے سامنے کسی نے نقل کیا کہ پورب میں دہی کو مذکر بولتے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ یہاں تو بولتے ہیں مثلاً دہی میٹھی ہے لکھنؤ میں بولتے ہیں دہی میٹھا ہے۔ تو آپ سن کر بولے کہ پورب میں کیا دہی کو دہا کہتے ہیں۔

ایک اس سے بڑھ کر ہوئی۔ میرے ایک عزیز ایک بڑے عاقل صاحب سے یہ حکایت بیان کرنا چاہتے تھے انہوں نے اس طرح تمہیدا اٹھائی کہ بعضے ایسے بیوقوف ہوتے ہیں کہ پوری بات تو سنتے نہیں بے سوچے سمجھے خواہ مخواہ بیچ میں ٹانگ اڑا کر ناحق دوسروں کے سامنے ذلیل اور شرمندہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے وطن کا واقعہ ہے ایک صاحب نے ایسی ہی حماقت کی تھی۔

وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص ایک صاحب کے سامنے یہ بیان کر رہے تھے کہ پورب میں دہی کو مذکر بولتے ہیں۔ یہاں تک پہنچتے پائے تھے کہ وہ مخاطب صاحب بڑے بوجھ بھکڑ بن کر بولے کہ کیا دہا بولتے ہیں۔ اب وہ عزیز چپ کے آگے کیا کہوں۔ انہوں نے تو اب کچھ کہنے کی گنجائش ہی

نہ رکھی۔ انہوں نے کہا کہ آپ بیچ میں چپ کیوں ہو گئے پورا واقعہ تو سنائیے پھر کیا ہوا؟ عزیز نے کہا کہ اب اس حکایت کا مزہ ہی نہ رہا۔ میں اب آپ سے کیا کہوں کہ کیا ہوا۔ یہی ہوا جو اس وقت ہوا کہ انہوں نے بھی یہی کہا کہ کیا دہا بولتے ہیں۔ پھر تو وہ صاحب اس قدر شرمندہ ہوئے جس کی حد نہیں کہ ناحق میں نے بیچ میں بول کر اپنی حماقت ظاہر کی۔

اسلئے میں نے یہ حکایت بیان کی کہ وہ دہی کا مذکر دہا سمجھا۔ اسی طرح میں نے سردی کا مذکر سردا بولا۔ تو سردا پر یہ حکایت یاد آگئی تھی۔ غرض ڈرو مت کہ اب کے رمضان گرمی میں آرہے ہیں۔ اطمینان رکھو ان شاء اللہ بہت آسان رہیں گے۔ اور ابھی معلوم ہو گیا کہ نصف شعبان کو جو روزہ اب کے رکھا تھا وہ بھی کچھ معلوم نہیں ہوا۔ آپ ان شاء اللہ تعالیٰ دیکھ لیجئے گا کہ بہت ہی آسانی کے ساتھ روزہ گزریں گے۔ (چنانچہ بفضلہ بہ برکت قول حضرت اب تک نوروز سے نہایت سہولت کے ساتھ ہو چکے ہیں کیونکہ خلاف موسم بجائے گرمی کے اچھی خاصی سردی پڑ رہی ہے بالخصوص بوجہ بارش ہو جانے کے اتنی سردی بڑھ گئی ہے کہ تراویح میں اور نماز فجر میں چادر کی حاجت ہوتی ہے اور دن بھر برابر رہتا ہے امید ہے کہ ختم رمضان تک ان شاء اللہ یہی کیفیت رہے گی)۔

اور یوں کوئی عہدی کہے کہ چاہے سردی ہو یا گرمی ہمیں تو روزہ میں تکلیف ہی ہوتی ہے تو اس کا کوئی علاج ہی نہیں کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ روزہ ہی فرض نہ ہوتا۔ اور میں اور شکایت کرتا ہوں کہ جو یوں کہتے ہیں کہ گرمی کی وجہ سے روزہ نہیں رکھا جاتا تو اگر گرمی سبب ہوتا روزہ نہ رکھنے کا تو جس وقت غلبہ ہوتا۔ گرمی کا اسی وقت کھاتے پیتے۔ میرا معمول ہے کہ میں بعد نماز فجر منزل پڑھتا ہوں جنگل کو نکل جاتا ہوں۔ میں نے پارسال رمضان میں دیکھا کہ صبح کا وقت ہے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور ایک صاحب بیٹھے تربوز اڑا رہے ہیں۔ بھلا فرمائیے یہ کون سا وقت تھا تربوز کھانے کا۔ کیا اس وقت گرمی ستا رہی تھی۔ کیا اس وقت پیاس کا غلبہ تھا؟ کچھ نہیں شرارت ہے۔ بد معاشی ہے۔ غرض یہ روزہ رکھنا تو پورا اتلاف حق ہے خلاصہ یہ کہ روزے کے تو یہ حقوق ہیں۔

نماز تراویح

دوسری عبادت ہے تراویح۔ اس کی ایسی گت بناتے ہیں کہ خدا کی پناہ! اتنی بڑی نعمت اور سمجھتے ہیں کہ لو اب کم بختی آئی۔ بیس رکعتیں پڑھنی پڑیں گی۔ کوئی حد ہے اور جو کوئی حافظ ہوئے ذرا مجبور پھر تو گویا قیامت کا سامنا ہے اول تو ایسے حافظ کو کوئی تجویز ہی نہیں کرتا۔ اور اگر کر بھی لیا تو جلدی

پڑھنے کی فرمائش کر کر کے اسے ایسا تنگ کرتے ہیں کہ آئندہ کے لئے وہ توبہ کر لیتا ہے کہ انہیں تواب کبھی سناؤں گا نہیں۔ یعنی یوں چاہتے ہیں کہ صرف اٹھک بیٹھک ہو اور بیس پوری ہو جائیں۔

کانپور میں بے چارے ایک حافظ تھے جو ذرا رکوع سجدہ اطمینان کے ساتھ ادا کرتے تھے اور قومہ میں بھی کچھ دیر لگاتے تھے۔ حافظ عبد اللہ مرحوم مہتمم جامع مسجد نے خود سنا کہ لوگ بعد تراویح کے اس مسجد سے نکلتے ہوئے یوں کہہ رہے ہیں۔ ارے میاں تراویح کیا ہیں قید خانہ ہے۔ بس جا کر پھنس جاتے ہیں۔ رکوع میں گئے تو رکوع ہی میں ہیں۔ سجدہ میں چلے گئے تواب سر ہی نہیں اٹھتا۔ التحیات پڑھنے بیٹھے تواب کسی طرح سلام ہی نہیں پھیرتے۔ جان مصیبت میں آ جاتی ہے۔

غرض یوں چاہتے ہیں مقتدی کہ امام بس التحیات ہی پڑھ کر سلام پھیر دیا کرے اور اس کو بہت پسند کرتے ہیں۔ جو حافظ ریل ہو اور ریل بھی کون سی مال گاڑی نہیں، پنجر نہیں، ڈاک نہیں، اپیشل ہو اور اب اللہ بھلا کرے ایجاد کر نیوالوں کا ریل سے بھی بڑھ کر ہوائی جہاز چل گئے ہیں۔

اب تو لوگ یہ چاہیں گے کہ حافظ جہاز ہوں لیکن لوگ ابھی ہوائی جہازوں پر سوار نہیں ہوئے ورنہ ان شاء اللہ اس کی تمنا بھی کرنے لگیں گے۔ ایک حافظ تھے نابینا۔ مر گئے ہیں بے چارے۔ ان کے تیز پڑھنے کا حال کچھ نہ پوچھو بس گن گن گن گن شکور ابن بن بن بن بن غفوراً۔ شکوراً، غفوراً کے سوا کچھ خبر نہیں کہ کیا الفاظ منہ سے نکل رہے ہیں اور یہ پتہ تو کیا چل سکتا کون سا رکوع پڑھ رہے ہیں یا کون سا پارہ ہے بس اندھا دھند آندھی کی طرح اڑے چلے جاتے تھے مگر مقتدی ان سے ایسے خوش! کہ سبحان اللہ! کیا ہلکی پھلکی تراویح پڑھاتے ہیں۔ اور میں تمہیں اس سے بھی زیادہ ہلکی پھلکی کی ترکیب بتا دوں۔ وہ یہ کہ بالکل نہ پڑھو۔ تو میں نے ترکیب ایسی بنا دی ہے کہ اس سے زیادہ ہلکی پھلکی تراویح ممکن ہی نہیں کیونکہ ہلکی پھلکی ہونے کے بھی مراتب ہیں جیسے جلدی کے مراتب ہیں جلدی کی حکایت سنئے۔

ایک نائی کو کسی اس کے جھان نے کوئی ضروری خط دیا کہ فلاں شخص کو جا کر دے آ۔ وہ خط اس سے کہیں کھو گیا۔ تھا بڑا چالاک۔ شریر نے کیا حرکت کی کہ ایک سادہ کاغذ لے کر اور اسے ایک سادہ ہی لفافہ میں بند کر کے بس مکتوب الیہ کے پاس پہنچ گئے اور اسے دے کر کہا کہ میاں نے یہ لفافہ آپ کے نام بھیجا ہے اس نے کہا اور اس پر کچھ پتہ تو لکھا ہی نہیں ہے نائی نے کہا حضور جلدی بہت تھی پتہ لکھنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ خیر تو کھول کر دیکھا تو اندر بھی ایک سادہ کاغذ رکھا ہوا ملا جس پر کوئی تحریر نہ تھی۔ الٹ

کر دیکھا کہ شاید دوسری طرف لکھا ہو۔ مگر ادھر بھی کورنا نظر آیا۔ اب تو بڑے چکرائے۔ پوچھا میاں کچھ کہو تو آخر یہ معمہ کیا ہے کہ نہ باہر کچھ لکھا ہے نہ اندر۔ یہ خط ہی کیا ہوا۔ اس نے کہا حضور میں نے تو عرض کیا بہت جلدی تھی کچھ لکھ ہی نہ سکے۔ پوچھا کچھ زبانی کہہ دیا ہے۔ کہا حضور کہاں بہت ہی جلدی تھی۔ زبانی کہنے کی بھی فرصت نہیں ہوئی تو یہ سوا مسخرہ پن کے کیا ہوا۔ یہ کوئی جلدی تھی۔

خیر تو تمثیلی حکایت ہے جلدی کی۔ ایک حکایت دیکھی ہوئی بھی ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک ملازم تھا عبداللہ۔ بڑا ہی بے وقوف تھا (پھر مزاحاً فرمایا) اور لوگ بھی اس نام کے اس وقت موجود ہیں ان میں سے کوئی مراد نہیں کہیں کسی کو شبہ ہو۔ وہ تو بے چارے مر بھی گئے۔ یہاں جتنے اس نام کے ہیں وہ تو ماشاء اللہ زندہ ہیں (جلسہ وعظ میں ایک نوجوان صاحب اسی نام کے موجود تھے۔ جو حضرت کے پر جوش خدام میں سے ہیں۔ انہیں کی طرف حضرت کا اشارہ تھا۔ انہوں نے اپنی عقلمندی کا اس طرح ثبوت دیا کہ بھرے مجمع میں آپ پکار کر فرماتے ہیں کہ نہیں میں بھی ایسا ہی ہوں پھر بعد کو بہت پچھتائے کہ واقعی مجھ سے حماقت ہوئی کیونکہ بہر صورت یہ حرکت آداب مجلس کے خلاف تھی)۔

دنیا میں بعضے بڑے ہی کم عقل آدمی ہوتے ہیں۔ ایک دن آپ گھر کی طرف سے دوڑے ہوئے آئے اور کہا کہ اجی مولانا گھر میں سے یوں کہا ہے کوئی کام تھا جلدی کا۔ وہ گھر میں سے کہلا کر بھیجا تھا کہ جلدی جا کر کہہ آ۔ آپ دوڑے ہوئے پہنچے اور کہا مولانا یوں کہا ہے، مولانا نے جب پوچھا کیا کہا ہے تو آپ کیا فرماتے ہیں کہ اجی! میں تو بھول گیا ہوں۔ یعنی دوڑنے کی طرف توجہ زیادہ تھی۔ اہتمام یہ تھا کہ جلدی جا کر خبر دوں۔ اس اہتمام میں دوسری طرف توجہ رہی نہیں اور اس خبر کو بھول گئے جو پہنچانی تھی۔

ہمارے یہاں بھی ایک طالب علم تھے عید و شاہ! مر گئے بے چارے۔ میں نے ایک دن بلا کر ان سے کہا کہ تم حافظ ظریف احمد کو جانتے ہو اس نے کہا جی ہاں جانتا ہوں۔ میں نے کہا وہاں جاؤ۔ آگے میں کہتا ہی کہ وہاں جا کر یہ کرو۔ لیکن کون انتظار کرتا ہے۔ بس یہ سنتے ہی کہ وہاں جاؤ آپ چل دیئے۔ میں نے واپس بلا کر پوچھا کہ تم چل کہاں دیئے کہا حافظ ظریف کے یہاں میں نے پوچھا وہاں جا کر کیا کرو گے۔ کہا بس چلا جاؤں گا جو حکم ہوا تھا کروں گا وہ عجب چیز تھے صاحب۔ تو جیسے ایک۔ جلدی کا یہ بھی ہے اسی درجہ ایک درجہ ہلکے پھلکے رہنے کا یہ بھی ہے کہ تراویح

پڑھے یہ نہیں بالکل۔ چنانچہ بعض ایسا بھی کرتے ہیں۔ ارے بندے خدا کے جب نام کیا تراویح کا۔ اور ایک گھنٹہ کی مشقت اٹھائی تو پاؤ گھنٹہ کی مشقت اور سہی۔ اور زیادہ وقت تو اٹھتے بیٹھنے میں لگتا ہے۔ اچھی طرح ادا کر کے پڑھنے میں اور گھسیٹ کر پڑھنے میں آزما کر اور گھڑی لے کر دیکھ لو۔ دس پندرہ منٹ سے زیادہ تفاوت نہیں نکلے گا۔

پھر افسوس ہے صرف دس پندرہ منٹ کے لئے قرآن کو بگاڑ کر پڑھا جائے اور تراویح کو خراب کیا جائے۔ پھر تراویح سے فارغ ہو کر کوئی کام بھی تو نہیں۔ محض باتیں کرنے کے سوا افسوس کی بات ہے کہ تراویح کو تو یوں خراب کر دیا اور کھانے کو نہ خراب کرو۔ بلکہ رمضان میں تو اور مہینوں سے زیادہ لذیذ کھانے کا اہتمام کرتے ہو کہ بھنا ہوا گوشت بھی ہو، چٹنی کیلئے اپجور بھی ہو، وہی بڑے بھی ہوں، پھلکیاں بھی ہوں، گھونگھنیاں بھی ہوں۔ شربت بھی ہو وغیرہ وغیرہ۔ پھر شرم نہیں آتی کہ غذائے جسمانی تو اوزوں سے اچھی ہو اور غذائے روحانی کو خراب کر کے کھاؤ۔ سبحان اللہ! کیا اچھا فیصلہ ہے۔

اور نماز کی تحسین میں یہ بھی داخل ہے کہ اذان وقت سے پہلے نہ ہو۔ بعض مسجدوں میں رمضان میں یہ بھی ہوتا ہے کہ عشاء کی اذان وقت سے پہلے دے دیتے ہیں۔ بس ملاں جی نے کھانا کھایا اور اللہ اکبر پکار دیا۔ بلکہ بعض مسجدوں میں تو وقت سے پہلے نماز بھی شروع کر دیتے ہیں زیادہ اہتمام اس کو ہوتا ہے کہ تراویح سے جلدی فارغ ہو کر لیٹ جائیں۔ اور لیٹنے کو یوں جی چاہتا ہے کہ پانی پیتے ہیں بے حد۔ یہ سخت غلطی ہے یعنی طباً بھی مضر ہے۔ ذرا پیاس کو روک کر پانی پیئیں تو تراویح بھی بشارت سے ہوں اور قرآن بھی اچھی طرح سن سکیں۔ ہمت والوں نے تو یہاں تک کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ۶۱ قرآن شریف ہر رمضان میں ختم کرتے تھے۔ ایک ختم تو روزانہ دن کو کرتے اور ایک رات کو اور ایک وہ جو ہمیشہ تراویح میں پڑھنے کا معمول تھا۔

غرض اس ایک مہینہ میں اسنہ قرآن شریف پڑھتے تھے تو دیکھو ایک اللہ کے بندے وہ بھی تو تھے۔ غرض تراویح کہ جو مخصوص عبادت رمضان المبارک کی ہے اس کے وہ حقوق ہیں جو میں نے عرض کئے کہ ٹھیک وقت پر بھی ہوں، رکوع سجود بھی اچھی طرح ہو، تشہد بھی اچھی طرح ہو جلدی مت کرو تلاوت جو اس میں کی جائے وہ بھی اچھی طرح ہو۔

عبادت تلاوت قرآن

ایک عبادت رمضان المبارک کی تلاوت قرآن ہے اس کے حقوق میں سے یہ ہے کہ تصحیح کے

ساتھ پڑھا جائے لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ اول تو اس کا اہتمام ہی نہیں ہے۔ تصحیح کا طریقہ ہی نہیں سیکھتے اور اگر طریقہ بھی سیکھ لیا تو اس پر عمل نہیں کرتے اور اگر عمل کرتے ہیں تو یا ران طریقت پریشان کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے بھائی اچھی قرأت سیکھی۔ قرآن پڑھتے ہو یا جھینکتے ہو۔ کوئی کہتا ہے قرآن پڑھتے ہو یا گاتے ہو۔ کوئی کہتا ہے یہ الفاظ کو توڑ مروڑ کر کیوں ادا کرتے ہو بس فر فر پڑھتے چلے جاؤ۔ نہیں معلوم یہ فر فر کیا صیغہ ہے کیا فتر ہے جو ماضی ہے اور جس کا مقصد فرار ہے بمعنی بھاگنے کے۔ محاورات میں تطابق بہت ہوتا ہے۔ اردو میں فر فر اسی کو کہتے ہیں جہاں بھاگتا ہوا پڑھا جاتا ہو۔

ایک ہمارے دوست ہیں حکیم صاحب انہوں نے تراویح میں قرآن سنانا چاہا مگر پڑھتے تھے صحیح۔ چنانچہ ولا الضالین کو جو صحیح مخرج سے ادا کیا مقتدی بگڑ گئے کہ ہم ان کے پیچھے تراویح نہ پڑھیں گے۔ چنانچہ ان بے چاروں کو وہاں سے جدا ہونا پڑا۔ اب یہ مصیبت ہے کہ کوئی تصحیح کے ساتھ پڑھے تو لوگ پڑھنے نہیں دیتے ایک مخلوق پریشان کرنے لگتی ہے یعنی بعضوں نے تو یہ سنا نسخہ یاد کر رکھا ہے کہ ولا الضالین کو ولا الظالمین پڑھتے ہیں سمجھتے ہیں کہ آخر یہ ظ اور ض باہم متشابہ ہیں گو یاد دونوں الصفات ہیں پھر دونوں میں مغایرت کیسی۔ اسی طرح دوسروں نے یہ سنا نسخہ یاد کر لیا ہے کہ ولا الضالین کو۔۔۔ والدالین پڑھتے ہیں اور داورض کے لئے ض کو ذرا موٹا سا پڑھ دیا اور جہاں دال ہے وہاں باریک سا پڑھ دیا۔

اس موٹے باریک پر مجھے وہی حکایت یاد آتی ہے کہ لکھنؤ میں تھے ایک مولوی صاحب معقولی جو امامت بھی کرتے تھے۔ وہاں ایک مولوی مہدی تھی وہ بیان کرتے تھے کہ ان معقولی مولوی صاحب کی یہ عادت تھی کہ قریب قریب ہر جہری نماز کے اندر پہلی رکعت میں تو تبت اور دوسری رکعت میں قل ہو اللہ پڑھتے تھے اور وہ تھے تو مولوی مگر قرآن پڑھتے تھے بہت غلط۔ صاحب بعضے تو بہت ہی غلط پڑھتے ہیں یعنی اکثر اہل علم کو بھی تصحیح کی جانب التفات نہیں۔

بریلی میں ایک صاحب من الجنة والناس کی بجائے من الجنات والنس پڑھتے تھے۔ آپ نے یہاں کا الف وہاں جا لگایا۔ یعنی والناس میں جو الف ہے اس کو گرا کر من الجنة میں بڑھادیا۔ ایسا ناس کیا۔ بس ان سے یہی کہنا چاہیے کہ ام یہ جنہ۔

عالموں نے بھی تو ایسا ہی ناس کیا ہے انکا معمول ہے کہ اگر کسی کا ناس کرنا ہو تو سورہ ناس اس طرح پڑھنے کو بتلاتے ہیں۔ قل اعوذ برب الناس ناس ناس ملک الناس ناس ناس الہ الناس ناس ناس۔

غرض ناس کے لفظ کو ہر جگہ ۳ دفعہ پڑھنے کو کہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے قرآن شریف اردو میں ہے کہ یہاں ناس کے وہی معنی ہیں جو اردو میں ناس کے ہوتے ہیں جیسے کہتے ہیں کہ فلا نے کا ناس جائے یعنی ستیا ناس ہو لا حول ولا قوۃ۔

تو بعض لوگ قرآن شریف کی اس طرح گت بناتے ہیں جیسے کسی بڑھیا نے باز کی گشت بنائی تھی۔ تو اسی طرح وہ نہ نو کے معقولی مولوی صاحب بھی ابی لہب کے بجائے ابی لہب پڑھتے تھے۔ مولوی مہدی کہنے لگے کہ سنتے سنتے میرے کان پک گئے کہ جب دیکھو تب تب ابی لہب و تب کہنے لگے کہ میں نے ایک روز جا کر خلوت میں کہا کہ مولانا آپ کی اتنی بڑی تو شان ہے اور شہرت ہے۔ اور آپ کلام مجید غلط پڑھتے ہیں۔ یہ آپ کی شان کے خلاف ہے کہا کیا غلط پڑھتا ہوں۔ انہوں نے کہا آپ ابی لہب پڑھتے ہیں اور یہ غلط ہے انہوں نے کہا اور کیا پڑھوں کہا یوں پڑھا کیجئے ابی لہب۔ ادب کی وجہ سے ذرا پست آواز سے بتایا۔ یہ سن کر مولوی صاحب کیا فرماتے ہیں اچھا آہستہ سے پڑھا کروں پکار کر نہ پڑھا کروں۔ سبحان اللہ! کیا خوب مطلب سمجھے۔ یہ مولوی ہیں آج کل کے۔ انہوں نے تو خود ادا کر کے ابی لہب کا صحیح تلفظ بتانا چاہا تھا۔ اور آہستہ سے اس لئے بتایا کہ بے ادبی نہ ہو آپ یہ تو سمجھے نہیں کہ بجائے حاء حطی کے ہاء ہوز پڑھنے کو کہہ رہے ہیں اور سمجھے تو یہ سمجھے کہ شاید میں بہت بلند آواز سے پڑھا کرتا ہوں آہستہ سے پڑھنے کی ہدایت کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا واہ حضرت خوب سمجھے جب انہوں نے کھول کر کہا کہ بھائی ابو لہب میں حا حطی نہیں ہے ہاء ہوز پڑھا کرو تب کہیں ان کی سمجھ میں آیا۔ یہ مولوی آدمی ہیں صاحب جو اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے۔

آج کل مولوی ہونا کیا مشکل ہے ایک آدھ کتاب صرف نحو کی پڑھ لی۔ کچھ قرآن حدیث کا ترجمہ دیکھ لیا۔ بس مولوی بن گئے۔ چنانچہ ہمیں ایک ایسے ہی مولوی صاحب اب کے سفر میں ملے کنڈا ایک مقام ہے ضلع اعظم گڑھ میں۔ وہاں میرے ایک دوست ہیں تحصیلدار۔ میں ان کا بلایا ہوا وہاں گیا تھا۔ ایک صاحب جو مولوی صاحب کہلاتے تھے ملنے آئے جو سب کچھ گزارتے تھے یعنی تہجد گزار اور شاید مال گزار بھی ہوں یعنی امیر بھی ہوں۔ عمر بھی بہت تھی مگر عمر بھر کسی نے ان کو خرابی قرآن مجید کے ترجمہ دیکھنے کی نہ بتائی تھی۔ حالانکہ بعضوں کے لئے ترجمہ دیکھنا حرام ہے اب لوگ ہمیں متعصب کہتے ہیں متشدد کہتے ہیں مگر ہم کیسے اجازت دیدیں۔ کیا ان تجربوں پر خاک ڈال دیں اور ایک تجربہ نہیں بہت تجربے ہیں ایک تجربہ مجھے اس وقت یاد آ گیا۔ ہاں تو ان

صاحب نے پہلے یہ آیت پڑھی یا ایہا الذین امنوا لاتقولوا راعنا (اے ایمان والو تم لوگ (لفظ) راعنا مت کہا کرو اور انظرنا کہہ دیا کرو) اور اس کا ترجمہ پڑھا کہ اے ایمان والو! ”راعنا“ مت کہو۔ پھر آپ کیا کہتے ہیں کہ تلاوت کرتے وقت کیا راعنا کا لفظ چھوڑ دینا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مت کہو ”راعنا“۔ تو اس آیت کا یہ مطلب آپ سمجھے۔ مجھے اس قدر حیرت ہوئی کہ جس کی انتہا نہیں کیونکہ اس سے پہلے ایسا عجیب مطلب میں نے کبھی نہ سنا تھا میں نے کہا کہ جاؤ ہم نہیں بتاتے کہ کیا مطلب ہے۔ بس مطلب یہ ہے کہ خبردار جو تم نے کبھی ترجمہ دیکھ کر قرآن مجید پڑھا۔ بس ساری تلاوت کرتے رہو اور تم راعنا بھی پڑھتے رہو باقی جو مطلب ہے اس آیت کا اسے تم جیسے کوڑھ مغزوں کے سامنے کیا بیان کیا جائے اندھوں کے آگے رووے اپنی آنکھیں کھو دوے۔ بس خبردار جو کبھی ترجمہ دیکھا۔

تو حضرت وہ جاہل سمجھا تھا کہ ابی لہب جو چپکے سے کہا تھا تو یہ مطلب ہے کہ آہستہ پڑھا کرو۔ انہوں نے کہا مولوی صاحب ڈوب جاؤ۔ کیا خوب مطلب سمجھے۔

تصحیح مخارج کی اہمیت

تو حضرت یہ حالت ہو رہی ہے فہم کی اور بے توجہی کی جیسے چھوٹی کو موٹا کر کے پڑھ دیا تو بڑی طرح ہو گئی ایسے ہی بعض حروف کو سمجھتے ہیں کہ اگر باریک کر کے پڑھ دیا۔ تو دال ہو گئی اور اگر موٹا کر کے پڑھ دیا تو ضاد ہو گیا بس اس پر قناعت کر رکھی ہے۔

غرض اول تو تصحیح مخارج کی طلب ہی نہیں اور اگر طلب بھی ہوئی کسی کو تو یہ نہیں کہ مشق کریں۔ بلکہ علماء سے تحقیق کرنے بیٹھ جائیں کہ ولا الضالین کو ولا الظالین پڑھنا چاہیے یا ولا الدالین۔ امداد الفتاویٰ میں کوئی فتویٰ اس قدر مکرر نہ ہوگا جس قدر کہ یہ مسئلہ ہر شخص یہی ضالین والین کا سوال کرتا ہے۔ حالانکہ ض کثرت سے کلام مجید میں موجود ہے مثلاً والضحیٰ میں ہے بحث جب ہوگی تو ولا الضالین ہی میں۔ غرض اس قسم کی فضول تحقیق تو ہر شخص کرتا ہے مگر یہ توفیق کسی کو نہیں ہوتی کہ مشق کرے کیونکہ یہ فن تو مشق ہی سے آتا ہے نری تحقیق علمی سے کہیں کچھ حاصل ہوتا ہے۔

ایک قاری صاحب سے کسی نے پوچھا کہ ض کی صفت کیا ہے۔ کہا میاں اگر میں نے صفت بیان بھی کر دی تو اس سے کیا ہوتا ہے ض کی ہیئت اور کیفیت جو ہے وہ نرے بیان سے کس طرح ظاہر ہو جائیگی جب تک کہ اس کو ادا کر کے بھی نہ بتایا جائے پھر یہ شعر پڑھا نہایت برکت سے۔

گر مصور صورت آں دلستان خواہد کشید ☆ لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید
(اگر مصور نے اس محبوب کی تصویر بنا بھی لی مگر اس بات سے حیران ہوں کہ اسکے ناز ادا
کی کس طرح تصویر بنائے گا)

سبحان اللہ! وہ جو ایک آن ہے اور ادا ہے وہ صفات مخارج کے بیان کر دینے سے کیسے معلوم
ہوگی۔ وہ جو ایک لوح ہے وہ کیسے معلوم ہوگا۔ وہ تو سماع سے متعلق ہے۔

اب کسی نے توجہ کر کے خیر مشق بھی کر لی تو اب وہ نشانہ ملامت ہے سب کا۔ مولانا فتح
محمد صاحب اور بی تشریف لے گئے تھے۔ فرماتے تھے کہ میں نے جواول بار فجر کی نماز پڑھائی
تو بس قیامت ارے ہی رہ گئی۔ میں نے سورہ قیامت پڑھی۔ یہ خبر نہ تھی کہ قیامت نازل ہو جائے
گی۔ سلام پھیرتے ہی ایک صاحب نے اعتراض جڑا کہ وجوہ یومئذ ناضرة الی ربھا
ناظرة۔ میں آپ نے دونوں جگہ ظ پڑھی ہے۔ مولانا نے ہر چند فرمایا کہ نہیں بھائی میں نے ایک
جگہ ظ پڑھی ہے۔ ایک جگہ ض۔ مگر وہ نہیں مانا۔ مولانا حیران کہ اب اسے سمجھائیں کیسے۔ سمجھے
تو وہ جو فن تجوید جانتا ہو۔ مگر مولانا نے ایک عجیب طریقہ سے اسے سمجھایا فرمایا کہ اچھا اب یہ
بتاؤ کہ میں نے دونوں جگہ ایک سا پڑھا تھا یا کچھ فرق تھا۔ کہا تھا تو فرق۔ خیر وہ ہٹ دھرم نہیں
تھا۔ ورنہ اس کا بھی انکار کر دیتا۔ فرمایا بس اتنا ہی فرق ہے ض اور ظ ہیں۔

اور صاحب پڑھے لکھے لوگ بھی تو کثرت سے اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ اور اس قدر اس
پر جمود ہے کہ اگر کوئی اتباع کرنا چاہے تو اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ پھر جب اہل علم جو مصلح ہیں
ان کی یہ حالت ہے تو عوام کو کیا کہا جائے۔

غرض پرستی

اسی لئے حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اے عزیز! صحت کی کیا امید رکھ سکتے ہو۔
جب تمہارے طبیب ہی بیمار ہیں سچ ہی ہے واللہ بہ استثناء بعض خود اطباء ہی بیمار ہیں۔ یہ میں نہیں کہتا
کہ مولوی زنا کرتے ہیں یا شراب پیتے ہیں لاحول ولا قوۃ۔ مگر ایک علت ہے وہ میں بھی اپنے
اندر پاتا ہوں۔ اس سے میں خود بھی بری نہیں وہ علت کیا ہے؟ غرض پرستی اور غرض پرستی وہ چیز ہے کہ۔

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد ☆ صد حجاب از دل بہ سوئے دیدہ شد

چوں دہد قاضی بہ دل رشوت قرار ☆ کے شناسد ظالم از مظلوم زار

(جب غرض آئی ہنر پوشیدہ ہوا اور سینکڑوں پروہ دل کی طرف سے آنکھوں پر آ جاتا ہے
جب قاضی خود فیصلہ کے وقت رشوت سے دل خوش کر رہا ہو تو ظالم اور مظلوم کی پہچان کس
طرح ممکن ہو سکتی ہے)

یہ غرض وہ چیز ہے کہ جب حاکم دل میں یہ ٹھان لے کہ فلاں سے ایک ہزار روپیہ لوں گا پھر
روداد مقدمہ کی اس کی آنکھوں میں الٹی ہی نظر آئیگی۔ کے شاسند ظالم از مظلوم زار
پھر وہ یہ نہیں دیکھے گا کہ کون ظالم ہے اور کون مظلوم ہے۔ اس غرض نے ہم کو تباہ کر رکھا ہے۔
وہ غرض مال ہے، جاہ ہے، شہرت اعتقاد ہے۔ بس اس نے ناس کر دیا۔ الامن شاء اللہ منهم۔
بس یہ ڈرتے ہیں کہ اگر حق کا اتباع کریں گے تو آمدنی کم ہو جائے گی۔ معتقد کم ہو جائیں گے۔
میں کہتا ہوں کہ اس حالت میں وہ ہمارے کیا معتقد ہیں خود اپنے معتقد ہوئے۔ جانچ تو یہی ہے کہ
ہم اتباع حق کا کریں۔ پھر دیکھیں کہ کون ہمارے معتقد رہتے ہیں کون نہیں وہ تو علماء سے یہ پوچھتے
ہیں کہ چہ می فرمایند علماء دین وریں مسئلہ۔ اور یہ اٹنے ان سے پوچھتے ہیں کہ چہ می فرمایند جہلاء دنیا
کہ ضاد باید خواند یا دوا و اندریں مسئلہ اندریں فتویٰ۔ جب دیکھا کہ ولا الضالین کے صحیح پڑھنے سے
جہلاء ناراض ہوتے ہیں اور بد اعتقاد ہوئے جاتے ہیں بس غلط ہی پڑھنا شروع کر دیا۔

اب دیکھئے علماء دین نے اپنے فتویٰ سے رجوع کر لیا۔ میں کہتا ہوں فتویٰ بھی نہ ہو غیرت
اور شرافت کے بھی تو خلاف ہے کہ عوام سے ڈر کر حق کے اتباع کو چھوڑا جائے حق کے مقابلے میں عوام
کو جوتی پر مارنا چاہیے یہ خوب سمجھ لیجئے گا کہ حق کا اتباع اسی کو نصیب ہو سکتا ہے جس کی یہ شان ہو
لا یخافون لومة لائم (ملامت کرنیوالوں کی ملامت سے نہیں ڈرتے) ا جی! خدا سے کام ہے مخلوق
کو جھاڑو مارے۔ بس آزاد ہو کر رہے۔ بزرگوں کو تو یہاں تک آزادی حاصل تھی اور یہی ہونی چاہیے۔
خلق میگوید کہ خسرو بت پرستی می کند ☆ آ رہے آ رہے می کند با خلق و عالم کار نیست
مخلوق اگر کہے کہ تم بت پرستی کرتے ہو تو جو آزاد نہیں ہیں وہ تو اس قول کی تردید کریں گے کہ
نہیں صاحب میں بت پرستی نہیں کرتا۔ میرے ایسے عقیدے نہیں ہیں اب بیٹھ کر لٹو پٹو کرو جاہلوں
کی۔ اور جو آزاد ہیں وہ کسی کے کہنے کی کچھ پروا نہ کریں گے۔ بلکہ صاف کہہ دیں گے۔

آ رہے آ رہے می کند با خلق و عالم کار نیست

(ہاں ہاں میں کرتا ہوں مخلوق اور دنیا سے کوئی کام نہیں ہے)

ہاں ہم بت پرستی کرتے ہیں جاؤ کرلو ہمارا کیا کرتے ہو۔ کسی کے باپ کے غلام ہیں نوکر ہیں جوڈریں کسی نے کوئی تنخواہ مقرر کر رکھی ہے کہ خواہ مخواہ وہیں جاؤ ہم بت پرست ہی سہی سب کے سب چھوڑ دو ہمیں۔ اور حضرت میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ حق میں وہ اثر ہے کہ اگر کوئی شخص حق کو قبول کر کے استغناء برتے اور یہ کہہ دے۔

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو ☆ دارو گیر و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست (جس کا دل چاہے آئے جس کا دل چاہے نہ آئے، ہمارے پاس کوئی دربان تو نہیں ہے) تو بڑے بڑے سرکش اس کے دروازے پر ناک رگڑیں گے مگر دل کے اندر دغدغہ نہ ہو کہ سب چھوڑ دیں گے تو ہائے کیا ہو گا لاحول ولاقوۃ! مخلوق سے ڈر کر حق کو چھوڑ دینا نہایت ہی اوجھی بات ہے اور خصوص آمدنی کے لئے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

حیف باشد دل دانا کہ مشوش باشد

دلش مند کا قلب روٹیوں کے لئے مشوش ہو! افسوس کی بات ہے اس کا تو یہ مشرب ہونا چاہیے۔ موحّد چہ برپائے ریزی سرش ☆ چہ فولاد ہندی نہی برسرش امید و ہراسش نباشد زکس ☆ ہمیں ست بنیاد توحید و بس (موحّد کے پاؤں پر اگر سونے کا ڈھیر لگا دیا جائے یا اس کے سر پر تلواریں رکھ دو، ان کو تو نہ کسی سے امید ہوتی ہے نہ کسی سے خوف ہوتا ہے اور یہی توحید کی بنیاد ہے)

اور حضرت یہ تو ایک خاص مسئلہ کے متعلق گفتگو تھی۔ ایسے ہی تمام احکام اور اعمال میں ماہرین کو چاہیے کہ مستقل رہیں۔ جہلاء کی مرضی کے حق کے خلاف کبھی اتباع نہ کریں اگر سب ایسا کرنے لگیں تو جہلاء کا کبھی حوصلہ نہ بڑھے۔ اور جہلاء کو بھی چاہیے کہ ان سے اپنے مرض کے اتباع کے منتظر نہ رہیں۔ تو اے عوام اس مولوی کو چھوڑو جو تم سے ڈر کر تمہارا ہم خیال ہو گیا ہے۔ وہ تو معلوم ہوتا ہے ٹٹو ہے بھاڑے کا۔ اور میرے کہنے کی بھی حاجت نہیں وہ تمہاری نظر سے خود ہی گر جائے گا۔

یہ تو ان عوام کا ذکر تھا جو علماء سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر ان سے اپنے مذاق کے اتباع کا انتظار کرتے ہیں اور علماء ان سے ڈر کر ان کی مرضی کا اتباع کرتے ہیں۔

اتباع کی ضرورت

بعض عوام وہ ہیں کہ علماء سے تعلق ہی نہیں رکھتے۔ یہ لوگ کتابیں اور ترجمے دیکھ کر اپنے آپ

کو علماء سے مستغنی سمجھنے لگے ہیں کہ بدول ماہر کے بتائے ان تک کسی کی نظر پہنچ ہی نہیں سکتی۔ اسی واسطے ہر امر میں شیخ اور ماہر کے اتباع کی حاجت ہے کیونکہ ایک چیز بظاہر خیر محض نظر آتی ہے لیکن ماہر اس سے منع کر دیتا ہے کیوں؟ اس لیے کہ وہ مفہمی ہے الی الشراور اس شریک غیر ماہر کی نظر فی الحال پہنچنے سے قاصر ہے۔

پرسوں کا ہی واقعہ ہے ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ ایک استفتاء میرے پاس آیا وہ مثال ایک مسئلہ کی تحقیق کے ضمن میں مجھے پیش آئی۔ وہ مسئلہ تو خیر سب کو معلوم ہی ہے لیکن مجھے اس کی مثال عرض کرنا ہے کہ ہر فن میں بہت سی باریک باتیں ایسی ہوتی ہے جنہیں ماہر ہی سمجھتا ہے غیر ماہر نہیں سمجھ سکتا۔ چنانچہ جو بات میں عرض کروں گا وہ اس سے پہلے شاید کسی کے ذہن میں بھی نہ آئی ہوگی۔

ایک شخص نے استفتاء کیا کہ میرے گھر میں کچھ ایسا سلسلہ ہے کہ جب رمضان المبارک کا مہینہ قریب آتا ہے تو بچہ پیدا ہو جاتا ہے اور روزے دودھ، چلہ چھٹی میں قضا ہو جاتے ہیں پھر سال بھر تک ضعیف رہتی ہے۔ پھر وہی بچہ۔ غرض قضا روزوں کے رکھنے کی نوبت ہی نہیں آنے پاتی۔ اب کیا کرے جب قضا روزے نہیں رکھ سکتی تو کیا فدیہ دیدے۔

میرے ذہن میں یہ آیا کہ مسئلہ تو یہ ہے کہ جب تک امید رہے عود قوت اور عود صحت کی روزہ ہی رکھے فدیہ نہ دے۔ خیر یہ مسئلہ تو ہے ہی۔ مگر میرے جی میں یوں آیا کہ یوں لکھ دوں کہ بالفعل چاہے فدیہ بھی دیدے لیکن اگر کبھی صحت اور قوت عود کر آئے تو اس فدیہ کو کافی نہ سمجھے بلکہ ان روزوں کی قضا بھی کرے۔ یہ آیا ذہن میں۔ میں نے اپنے نزدیک اس میں یہ احتیاط سمجھی کہ اگر صحت اور قوت نے عود نہ کیا تو یہ فدیہ ہی دینا کافی ہو جائے گا اور سال کے سال دیتے رہنے میں سہولت رہے گی ورنہ بہت سا جمع ہو گیا تو شاید پھر نہ دے سکے اس میں دونوں رعایتیں ہو جائیں گی کہ نفع تو بہت اور نقصان کچھ نہیں۔ نفع تو یہ کہ اگر صحت اور قوت نے عود نہ کیا تو تھوڑا تھوڑا کر کے دینے میں فدیہ آسانی کے ساتھ ادا ہو جائے گا ورنہ جمع ہو کر کثیر رقم ہو جائے گی جس کا ادا کرنا بھی دشوار ہوگا اور اگر صحت اور قوت نے عود کیا تو روزے رکھ لیے جائیں گے اور وہ فدیہ جو دیا جا چکا ہے تطوع ہو جائیگا۔ وہ گویا نفل خیرات ہو جائے گی جس کا ثواب الگ ملے گا۔ بس قریب تھا کہ یہی لکھ دوں لیکن اللہ تعالیٰ نے سنبھالا۔ دست گیری فرمائی۔ معاشرہ صدر ہوا کہ حالت عوام کی یہ ہے کہ فدیہ کو بدل سمجھتے ہیں روزہ کا۔ اگر فدیہ دیدیا تو پھر بے فکر ہو جائیں گے اور قلب میں تقاضا قضاے

صوم کا پیدائہ ہوگا کہیں گے کہ فدیہ تو دے ہی چکے ہیں لہذا مجھے یہ لکھنا پڑا کہ جائز نہیں فدیہ دینا جب تک صحت و قوت سے ناامید ہی نہ ہو جائے تو دیکھئے یہاں فدیہ ظاہراً اہل علم کے نزدیک بھی فخر ہے لیکن کتنے بڑے شریف کو مستلزم تھا۔ تو میں نے یہ واقعہ مثال کے طور پر پیش کیا۔

بہر حال عوام کی خواہ کوئی قسم ہو سب کے ذمہ حق یہ ہے کہ اپنے کو علماء کا تابع بنادیں نہ ان سے موافقت کی توقع رکھیں نہ ان سے مستغنی ہوں اور نہ کسی حال میں ان سے مزاحمت کریں۔ پس ان کا ادب یہ ہے کہ وہ مزاحمت نہ کریں اور تمہارا ادب یہ ہے کہ اگر وہ مزاحمت کریں تو تم متاثر نہ ہو۔ تم تو نائب ہو۔ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے۔

تھوڑی دیر کے لئے وجدان کی طرف نظر کر کے دیکھو! اگر جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی عوام مزاحمت کرتے۔ تو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کی خاطر سے موافقت کر لیتے۔ پھر یا تو نائب ہونے کی حیثیت سے تم بھی وہی کرو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے ورنہ نیابت کا کام چھوڑ دو۔

یا مکن باپیل باناں دوستی ☆ یا بنا کن خانہ برانداز پیل
(یا تو فیلبان سے دوستی مت کرنا یا پھر اس کے لئے دروازہ بہت بڑا بناؤ تا کہ وہ مع ہاتھی کے داخل ہو) واقعی ۔
یا مکن باپیل باناں دوستی ☆ یا بنا کن خانہ برانداز پیل
یا مکش برچہ نیل عاشقی ☆ یا فرد شو جامہ تقویٰ بہ نیل
(یا تو فیلبان سے دوستی مت کرنا یا پھر اس کے لئے دروازہ بہت بڑا بناؤ تا کہ وہ مع ہاتھی کے داخل ہو.... یا تو اپنے چہرہ پر عاشقوں کی ملامت نہ لگایا پھر جامہ تقویٰ کو دریا ئے عشق میں تر کر دو یعنی زاہد خشک کے بجائے عاشق حق بنو)

تو اس پر یہ سب گفتگو بڑھ گئی تھی کہ ماہرین سے مزاحمت کرتے ہیں غیر ماہرین، سوائے ماہرین! تم ان کی مزاحمت کی کچھ پروا نہ کرو۔ حق بات پر عمل کرو اللہ پر توکل کر کے یہ سب کلام دو اوضا پر بڑھ گیا تھا۔ تو غرض تلاوت قرآن مجید میں تو یہ کوتاہیاں ہیں۔

بعض کوتاہیاں قرآن مجید کے متعلق اور قسم کی ہیں۔ چنانچہ بعضے لوگ قرآن مجید کو بے وضو چھوتے ہیں یہ بھی حرام ہے۔ بعضے رحل قرآن یا کتاب پر رکھ دیتے ہیں یہ اکثر میں دیکھتا ہوں طالب علموں کو کہ اس کی کچھ پروا ہی نہیں کرتے۔ فقہاء نے تو یہاں تک ادب ملحوظ رکھا ہے کہ

روٹیوں پر برتن رکھنے کی بھی ممانعت کی ہے کہتے ہیں کہ روٹی کے اوپر برتن رکھنا نہیں چاہیے کیونکہ یہ رزق کی بے ادبی ہے جب روٹی کا یہ ادب ہے تو قرآن مجید کا تو بہت ہی بڑا ادب چاہیے۔

اعتکاف کی حقیقت

اب رہ گیا اعتکاف۔ سو اس کی روح ہے خلوت اور خلوت کی حقیقت ہے ترک تعلقات۔ خود نفس رمضان میں مقتضی موجود ہے ترک تعلقات کا۔ لیکن ترک تعلقات کے بھی معنی سمجھ لیجئے ترک سے مراد تغلیل ہے یعنی جو تعلق غیر ضروری ہو یعنی جس کا ترک مضر نہ ہو اس تعلق کو ترک کر دے۔ چاہے وہ ضرر دنیا کا ہو چاہے آخرت کا اور جو تعلق ضروری ہو اس کو ترک نہ کرے کیونکہ جو تعلق ایسا ہے وہ مضر نہیں۔ مثلاً اپنے کمانے کھانے کے لئے دنیا میں مشغول ہونا اور اپنی ہی دنیا کا تعلق نہیں بلکہ جو تعلق دوسرے کی دنیا کا بھی ہو جس کا نفقہ اس کے ذمے واجب ہے وہ تعلق بھی مضر نہیں۔

میں نے بارہا کہا ہے اور اب پھر بانگ دہل کے ساتھ ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص کنجڑا ہو اور وہ صبح سے شام تک پکارتا ہے۔ لے لو کدو لے لو ترکاری یا کوئی پھیری والا دن بھر لے لو سوئی اور لے لو دھاگا کہتا پھرے اس کے قلب کے اندر ذرہ برابر ظلمت پیدا نہ ہوگی۔ اتنے بڑے اور لمبے چوڑے کلام اور اتنی صداؤں اور نداؤں سے بھی اس کو مطلق ضرر نہ ہوگا۔

اور ایک شخص ہے جس کو بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بالکل فارغ بیٹھا ہے وہ کسی سے صرف اتنا نہ پوچھ لے کہ تمہیں خبر ہے زید کہاں ہے جب کہ زید سے اس کو کچھ تعلق نہ ہو یا بلا ضرورت یہ دریافت کر لے کہ زید کب آئے گا میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو اس سے ظلمت پیدا ہوگی وہ اس سے نہیں ہوگی۔ اب اس سے زیادہ میں کیا دلیل پیش کر سکتا ہوں کہ قسم کھا رہا ہوں۔ اگر یقین نہ ہو خود تمیز پیدا کر کے دیکھ لو۔ واللہ! آنکھوں سے نظر آ جائیگا کہ قلب کا ناس ہو گیا۔ ظلمت نے احاطہ کر لیا۔ نورانیت برباد ہو گئی۔ انشراح غارت ہو گیا۔ وہ جو ایک تعلق مع اللہ پیدا ہو گیا تھا اس کے درمیان ایک حجاب قائم ہو گیا۔ اس واسطے کہ من حسن اسلام المرء ترک ما لا یعنیہ۔ جب ترک ما لا یعنیہ حسن اسلام ہے تو ما لا یعنیہ ضرور مخل اسلام ہوگا۔ اس شخص کے ایک فضول جملہ نے اسلام کی رونق کو۔ اسلام کی زینت کو۔ اسلام کے نور کو برباد کر دیا۔ تو وجہ کیا کہ اس شخص کو ضرورت نہ تھی اور اس کنجڑے کو ضرورت تھی کہ لے لو کدو، لے لو ترکاری۔

بس اب اس میں فرق یہ ہے کہ زاہدان خشک تو ضروریات کو ترک کرتے ہیں اور محققین صوفیاء غیر ضروریات کو۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ایک صاحب وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ اب ان سے کوئی ضروری بات پوچھنا چاہتا ہے تو ہوں ہوں کرتے ہیں۔ چاروں طرف اشارے کرتے ہیں۔ سر ہلاتے ہیں۔ ہاتھ چلاتے ہیں۔ آنکھوں سے گھورتے ہیں۔ اب چاہے کوئی سرا سمجھے یا نہ سمجھے یا جو چاہے سمجھ لے مگر بولنے کے نہیں۔ کیونکہ جس نے عمل بتایا ہے اس نے درمیان میں بولنے سے منع کر دیا ہے۔ ارے الو۔ ضرورت کے موقع پر نماز تک میں تو بولنا جائز ہے گو نماز باطل ہو جائیگی۔ بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہے یہ تیرا وظیفہ کہاں کا نکلا ہے جو نماز سے بھی بڑھ گیا۔ حماقت اور جہالت اور کچھ نہیں۔

ضرورت فقہ

حضرت یہاں سے ثابت ہوتی ہے ضرورت فقہ۔ حضرت جرتج ایک عابد تھے امم سابقہ کے۔ ان کا قصہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے نقل فرمایا ہے کہ وہ کسی صومعہ میں رہ کر عبادت کیا کرتے تھے ایک دن ان کی ماں آئی اور صومعہ سے باہر پکارنے لگی۔ ارے جرتج! ارے جرتج! جرتج ان بزرگ کا نام تھا۔ وہ اس وقت نفلیں پڑھ رہے تھے۔ بیچارے بڑے گھبرائے کہ اللہ کیا کروں کیا نہ کروں۔ ادھر تو ماں ہے اگر جواب نہیں دیتا تو ماں کی دل شکنی ہوتی ہے اور ماں کا دل توڑنا گناہ ہے ادھر نماز ہے اگر بولتا ہوں تو نماز جاتی ہے اور نماز کا توڑنا بھی گناہ ہے۔ بیچارے فقیہ نہ تھے ورنہ پریشان نہ ہوتے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے لو کان فقیہا لاجاب امہ!

بالآخر ان کی سمجھ میں یہی آیا کہ ماں کا حق اللہ کے برابر نہیں ہو سکتا۔ ماں کا دل توڑنا اتنا برا نہیں جتنا خدا کی نماز کا توڑنا لہذا وہ نہ بولے اور نماز میں مشغول رہے۔ جب دیر تک کوئی جواب نہ ملا تو ماں غصہ میں یہ بدو عادی کر چلی گئی کہ اللہ! جیسا یہ میرے پکارنے سے نہیں بولا اور مجھے پریشان کیا کہ میں تو اتنی دور سے اس کے دیکھنے کے اشتیاق سے آئی تھی اور اس نے میری بات بھی نہ پوچھی اسی طرح تو اسے پریشان کجیو! اور یہ بدو عادی کہ اے اللہ! اسے موت نہ آئے جب تک کہ یہ رنڈیوں کا منہ نہ دیکھ لے۔

بھلی مانس نے کو سا بھی تو غضب کا۔ آخر تجربہ کار تھی۔ سمجھتی تھی کہ تقدس ہی کی وجہ سے اس نے مجھ سے بے رخی کی ہے۔ خدا کرے تقدس ہی اس کا ملیا میٹ ہو جس پر اسے بڑا ناز ہے۔

بس حضرت! چونکہ ماں کا حق تھا اس وقت واقع میں کہ نماز میں بھی بولتا۔ بس اس کی دعا قبول

ہوگئی۔ وہاں ایک عورت تھی۔ قریب کے گاؤں میں رہتی تھی اور دیہاتن تھی آوارہ ہوگئی تھی۔ اس کے ایک بچہ پیدا ہوا حرام کا۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ کس کا ہے؟ اس نے سمجھا کہ اگر اور کسی کا نام لیتی ہوں تو جھگڑا بڑھتا ہے پوچھ گچھ، لاگواہ لاؤ، شہادت دو، یہ وہ سو بکھیرے۔ ایسے کا نام کیوں نہ لے دوں جو کوئی جھگڑا ہی نہ پھیلے۔ جو سب سے الگ تھلگ رہتا ہوا اور جس کا کوئی حامی اور مددگار ہی نہ ہوتا کہ جلدی سے معاملہ دب دیا جائے زیادہ فضیحتی نہ ہو۔ بس جناب اس گدھی نے کیا کیا بے چارے جرتج کا نام لے دیا۔ بس لوگ نام سنتے ہی بھڑک اٹھے کہ افوہ! اس کے یہ کرتوت۔

لوگوں کی یہ عادت تو ہے ہی کہ بلا تحقیق روایات کو معتبر سمجھ لیتے ہیں چنانچہ اب بھی دیکھ لیجئے۔ بالخصوص اس معاملہ میں تو تحقیق جانتے ہی نہیں۔ بس جناب لوگ اس عورت کو لے کر اس بیچارے عابد کے اوپر جا چڑھے کہ توڑ ڈالو اس کی عبادت خانہ۔ اس نے ہمیں اتنے دنوں دھوکے میں رکھا۔ خلوت خانہ توڑ پھوڑ زبردستی اس کو نکالا اور کہنے لگے کیوں نالائق تیری یہ حرکتیں۔ تجھے ہم سمجھتے تھے کہ بڑا عابد ہے بڑا زاہد ہے۔ تیرے یہ اعمال وہ سمجھ گیا کہ ماں کی بددعا قبول ہوگئی۔ یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔

مگر حضرت! آخر مقبول بندہ تھا۔ بس فضل الہی کے ناز پر، کیونکہ اس طریق میں اگر کوئی گرتا بھی ہے تو اپنے درجہ سے تب بھی بالکل نہیں گر جاتا۔ گو بادشاہ بادشاہی سے معزول ہو کر وزارت پر آجائے مگر وہ ناز اور وہ دماغ شاہی کا پھر بھی رہتا ہے۔ لڑکے سے پوچھا بتلا رے تیرا باپ کون ہے؟ اس نے کہا فلا نا چرواہا ہے جو جنگل میں فلاں جگہ رہتا ہے اب تو لوگ بڑے معتقد ہوئے اور بڑے گھبرائے۔ قدم چومنے لگے کہ للہ حضور ہماری خطا معاف فرمادیں۔ لائیے ہم آپ کا عبادت خانہ سونے کا بنادیں، چاندی کا بنادیں انہوں نے کہا بھائی میرا تو وہی گوندی کا جھونپڑا اچھا ہے۔ مجھے سونے چاندی کا مکان نہیں چاہیے مجھے تو اپنے اسی جھونپڑے میں پڑا رہنے دو۔

اس کو فرما کر حضور فرماتے ہیں لو مکان فقیہا لاجاب امہ! اگر وہ فقیہ ہوتا تو اپنی ماں کو جواب دیتا۔ اور نماز کو توڑ دیتا۔ اب یہ کہ آیا یہ حکم عام ہے خواہ فرض نماز ہو یا نفل یا خاص ہے نفل ہی کے ساتھ۔ اس کا فقہا نے فیصلہ کیا ہے جیسا اس واقعہ میں ایک غیر فقیہ سے یہ حرکت صادر ہوئی ہے۔ ایسے ہی اس حدیث کو سن کر اگر کوئی غیر فقیہ ہر جگہ بولنے لگے پڑ پڑ خواہ فرض نماز ہو یا نفل تو یہ کام فقہاء کا تھا کہ انہوں نے اس کو طے کر دیا کہ یہ حکم خاص ہے نوافل کے ساتھ۔

لہ لم أجد الحديث في "موسوعة أطراف الحديث النبوي الشريف"

اس شرط سے کہ ماں باپ کو خبر نہ ہو کہ یہ نماز پڑھ رہا ہے۔ فرض نماز کے دوران میں اگر ماں بھی بولے تو جواب نہ دے۔ ہاں اضطراری احوال اس سے مستثنیٰ ہیں۔ جیسے کوئی اندھا کنوئیں میں گرتا ہو سبحان اللہ! مجھے تو فقہاء کی قوت اجتہاد یہ اور ملکہ استنباط پر یہ شعر آ جاتے ہیں۔ واقعی حضرت دنیا کی سمجھ اور ہے دین کی اور ہے۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند ☆ نہ ہر کہ آئینہ۔ دارد سکندری داند
ہزار نکتہ باریک ترومواں جاست ☆ نہ ہر کہ سر برتر اشد قلندری داند
(جس نے اپنا چہرہ روشن کیا، حسن کا نکھار کیا، ضروری نہیں کہ وہ دلبری بھی جانتا ہوں اور جو شخص آئینہ رکھتا ہے ضروری نہیں کہ وہ سکندری یعنی آداب شاہی بھی جانتا ہو.... ہزار نکتہ بال سے زیادہ باریک ہے اس راہ میں پر سر کے منڈانے والے کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قلندری بھی جانتا ہو)

حقیقت میں یہ تھوڑا ہی ہے کہ کتابیں پڑھ لیں اور فقیہ ہو گئے۔ کتابیں پڑھنے سے کیا ہوتا ہے۔

وعظ و فتویٰ کے اہل

فقیہ وہ شخص ہے جس میں خداداد ملکہ اجتہاد کا ہو۔ جو شخص ایک مسئلہ بھی نہ جانتا ہو وہ فقیہ ہو سکتا ہے اور جو شخص ایک لاکھ مسئلے جانتا ہو وہ فقیہ نہیں ہو سکتا۔ تفقہ اور چیز ہے اور ضبط جزئیات اور چیز ہے اور یہی وجہ ہے کہ علماء نے فیصلہ کر دیا ہے اور علماء نے کیا فیصلہ کیا ہے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ وعظ کہنے کا اہل ہر شخص نہیں ہے کیونکہ ہر منصب کا وہی اہل ہو سکتا ہے جو اس منصب کے شرائط کا جامع ہو۔ یہ تھوڑا ہی ہے کہ ایک آدھ کتاب دیکھی اور واعظ بن گئے (اور جا کر منبر سنبھال لیا۔ حضرت اس منبری کا حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ منصب منصب نبوت ہے جو انبیاء علیہم السلام کے سچے وارث ہیں وہی اس کے اہل ہیں)۔

عبدالرحمن خاں صاحب مرحوم مالک مطبع نظامی کے مطبع میں ایک ایسے ہی صاحب کا خط آیا لکھا تھا کہ میرے پاس شرح وقایہ اردو کی تو ہے اس سے فتویٰ لکھ لیتا ہوں۔ یہ شرح وقایہ کی خرابی ہے اور فلانی کتاب فلاں فن کی ہے۔ جس کی وجہ سے لوگوں کو بہت فیض پہنچ رہا ہے مگر ہاں لوگ ایک فیض سے محروم ہیں یعنی طب سے۔ اب اس کو بھی جاری کرنا چاہتا ہوں کئی فیض جاری تھے ایک یہ بھی جاری کرنا چاہتے تھے۔ لکھا تھا کہ طب احسانی اردو کی بھیج دو تا کہ یہ فیض بھی جاری کر دوں۔

اب یہ تھوڑا ہی ہے کہ کتاب دیکھی اور وعظ کہنے لگے کتاب دیکھی اور نسخہ لکھنے لگے اس واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمادیا ہے لایقص الامیر او مامور او مختار یعنی وعظ تین شخص کہتے ہیں۔ ایک حاکم، دوسرے وہ جو مامور ہو یعنی جس کو حاکم اسلام نے اس کام کیلئے مقرر کیا ہو یا اہل حل و عقد نے جو حاکم کو بھی حاکم بناتے ہیں۔ یہ اہل علم کے سمجھنے کی بات ہے کہ اہل حل و عقد اصل ہیں اور حاکم ان کا نائب ہے یعنی جو اہل الرائے ہوں مثلاً علماء مشائخ کیونکہ یہی دین کے سمجھ دار لوگ ہیں۔ وہ جس کو وعظ کہنے کی اجازت دیدیں یا ان کا نائب جو امیر المؤمنین ہے وہ کسی کو مامور کر دے۔ تو یا خود حاکم یا جس کو حاکم یا ایسے علماء متفق ہو کر مامور کر دیں وہی وعظ کہہ سکتا ہے۔ تیسرا اگر کہے تو وہ متکبر ہے معلوم ہوتا ہے دنیا کا طالب ہے۔ چاہتا ہے کہ کچھ روپیہ کوئی رقم ہاتھ آجائے۔ اسے جائز نہیں وعظ کہنا۔

اسی طرح فتویٰ لکھنا ہر شخص کا کام نہیں چاہے کتابیں بھی ختم ہو چکی ہوں۔ ہاں اپنے بزرگوں کے سامنے کسی نے یہ کام کیا ہو اور ان بزرگوں نے پسند بھی کیا ہو اس کو البتہ جائز ہے۔ یوں پھر بھی کوئی لغزش یا غلطی ہو جائے کبھی کبھار وہ اور بات ہے وہ بشریت ہے۔ تو یہ شخص ہے اہل فتویٰ لکھنے کا۔ جیسے مطب کرنے کا وہی اہل ہوتا ہے جس نے کسی ماہر اور تجربہ کار طبیب کے مطب میں نسخے لکھ لکھ کر مریضوں کا علاج کیا ہو اور اس کے علاج کو اس طبیب نے پسند کیا ہو۔ اس کے نسخے جواب دکھلائے جاتے ہیں طبیبوں کو تو اگر کوئی معاند نہ ہوگا تو وہ کہے گا کہ باقاعدہ نسخہ ہے۔

کتاب اور صحبت کا اثر اور فرق

تو جناب محض کتابوں میں کیا رکھا ہے نری کتاب بنی کا تو یہ اثر ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ میں ایک مولوی صاحب عظیم آباد پٹنہ کے حج کو آئے تھے۔ ان کے پاس ایک کتاب تھی جس میں حجاج کے لئے ہدایات تھیں اسے دیکھ دیکھ کر سارے کام کرتے تھے وہاں ایک شخص تھا جعفر آفندی۔ آگرہ کا رہنے والا تھا۔ اسے ہندوستانیوں سے بہت محبت تھی۔ جس ہندوستانی سے بہت محبت تھی جس ہندوستانی کو دیکھتا اس سے ملتا۔ چنانچہ ان مولوی صاحب سے بھی ملا۔ علیک سلیک کی۔ مولوی صاحب نے اس کتاب میں کہیں یہ لکھا دیکھا تھا کہ فرامانگنے والوں سے بچے رہنا۔ بہت لوگ جبہ قہ پہنے ہوئے پھرتے ہیں مگر ہوتے ہیں سائل۔ بڑے بڑے شاندار لوگ گداگری کا پیشہ کرتے

ہیں مولوی صاحب کو بدگمانی ہوئی کہ یہ بھی کوئی سائل معلوم ہوتا ہے۔ ضرور کچھ مانگے گا۔ آپ نے بہت بے رخی سے پوچھا کچھ کہنا ہے یہ شخص جعفر بڑا مسخرہ تھا سمجھ گیا کہ انہوں نے مجھے سائل سمجھا۔ ہاتھ جوڑ کر عرض کیا حضور کچھ عنایت ہو جائے۔ بہت حاجت مند ہوں بہت غریب ہوں۔ حضور چار وقت کا فاقہ ہو چکا ہے۔ مولوی صاحب نے ڈانٹ کر کہا بے حیا، بے شرم! ایسا عمدہ لباس اور اتنا لمبا چونہ پہن کر بھیک مانگتے شرم نہیں آتی۔ کہتا ہے چار وقت کے فاقہ سے ہوں جھوٹا کہیں کا۔ دور ہو یہاں سے، بے حیا کہیں کا۔ غرض خوب ہی ڈانٹا۔ مگر اس نے برا نہیں مانا اور چلا گیا۔ بڑا ہی خوش مزاج تھا۔ مولوی صاحب بڑے خوش کہ کسی اچھی کتاب ہے۔ کیسے موقعوں پر کام دیتی ہے۔ بڑے مسرور کہ کیا موقع پر کتاب کام آئی۔ سبحان اللہ!

ایک دفعہ مولوی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے۔ جعفر آفندی جو وہاں ہو کر گزرے تو میں ان کی تعظیم کے لئے کھڑا ہو گیا۔ اب تو مولوی صاحب بڑے پریشان کہ یہ تو کوئی بڑا شخص معلوم ہوتا ہے وہ آکر میرے پاس بیٹھ گئے کہنے لگے صاحب مجھے ان مولوی صاحب سے بڑی شکایت ہے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ مجھے چار وقت کا فاقہ ہے۔ اس وقت ان کی جیب میں روپے بھی بول رہے تھے اگر یہ چار آنے مجھے دیدیتے تو ان کا کیا بگڑ جاتا۔ مجھے ان سے بڑی شکایت ہے۔ مولوی صاحب بے چارے ذلت کے مارے دے جاویں۔ شرم کے مارے کئے جاویں کہنے لگے للہ! معاف فرما دیجئے میں نے سخت گستاخی کی۔ میں نے پہچانا نہیں تھا۔ واللہ میں نے آپ کو سائل سمجھا تھا۔ وہ بولے کہ مولوی صاحب یہ تو بتائیے آپ نے مجھے سائل کیسے سمجھ لیا۔ آخر آپ نے کیا علامت مجھ میں سائل ہونے کی دیکھی کہا صاحب! میں نے کتاب میں پڑھا تھا کہ بڑے بڑے شاعر لوگ مکہ میں بھیک مانگتے ہیں۔ وہ بولے! مولوی صاحب! کچھ عقل سے بھی تو کام لیا ہوتا۔ صاحب نری کتاب کے بھروسے تو نہیں رہنا چاہیے کہا کتاب میں بھی دیکھتا تھا اور صاحب سچ بچ بڑے بڑے عبا اور قبا والے یہاں پر بھیک مانگتے ہوئے خود بھی دیکھ لئے تھے۔ انہوں نے پوچھا مولوی صاحب! یہ تو بتاؤ تم نے جن کو بھیک مانگتے دیکھا وہ عمامہ والے تھے یا کسی ترکی ٹوپی والے کو بھی کہیں بھیک مانگتے ہوئے تم نے دیکھا کہا۔ ہاں صاحب واقعی سب عمامہ والے ہی تھے ترکی ٹوپی والا تو ان بھیک مانگنے والوں میں کوئی نہیں تھا۔ جعفر نے کہا کہ میں تو ترکی ٹوپی پہنے تھا۔ سو بتلائیے کتاب میں یہ کہاں لکھا تھا کہ صرف عمامہ والے ہی بھیک مانگتے ہیں۔ ترکی ٹوپی والے

نہیں مانگتے۔ تو صاحب! نری کتاب سے فن حاصل کرنے کا تو یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ بھائی کتاب تو اعانت کے لئے ہوتی ہے۔ اہل مہارت کی صحبت کے بغیر بخدا اور بخدا اور بخدا جس کو فن کا حاصل ہونا کہتے ہیں۔ ہرگز میسر نہیں ہو سکتا چاہے جتنی کتابیں پڑھ چکا ہو۔ اور اگر کچھ بھی نہ پڑھا ہو لیکن اہل مہارت کی صحبت اٹھاتے ہوئے ہو تو فن کا حصول ممکن ہے بلکہ کثرت واقع ہے۔ آخر حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں کیا بات تھی کہ بعد کے بڑے بڑے عارف اور عالم ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے۔ کیا وہ سب کے سب لکھے پڑھے تھے بہت کم ایسے تھے جو اصطلاحی عالم ہوں۔ ورنہ زیادہ تر تو امی محض ہی تھے چنانچہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

نحن امة امیة لا نكتب ولا نحسب (مسند احمد ۲: ۱۲۲)

”ہم لوگ تو ایک امی جماعت ہیں نہ ہم حساب جانیں نہ کتاب جانیں۔“

دیکھئے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم فخر کرتے ہیں اپنی امت کی امیت پر، تو گویا اس امت کی خاص فضیلت امی ہونا ہے۔ پھر باوجود امی ہونے کے صحابہ جو بینظیر تھے کہ نہ ابوحنیفہؒ ان کے برابر، نہ اویس قرنیؒ ان کے برابر، نہ جنیدؒ ان کے برابر، نہ کوئی غوثؒ ان کے برابر، نہ کوئی قطبؒ ان کے برابر۔ تو وہ کیا چیز تھے اور وہ کیا دولت تھی جس نے ان کو سب سے بڑھا دیا تھا۔ بس یہ دولت تھی۔

جمال ہم نشین درمن اثر کرد

گلے خوشبوئے درحمام روزے ☆ رسید از دست محبوبے بدستم

بدو گفتم کہ مشکى يا عبیرے ☆ کہ از بوئے دلاویز تو مستم

بگفتا من گل ناچیز بودم ☆ ولیکن مدتے با گل نشستم

جمال ہم نشین درمن اثر کرد

وگر نہ من ہاں خاکم کہ ہستم

(میرے ہم نشین پھول نے میرے اندر اثر ڈال دیا حمام خانہ کی خوشبو وار مٹی ایک دن

میرے محبوب کے ہاتھ سے مجھے ملی میں نے کہا کہ تو مشک ہے یا عبیر ہے کہ تیری خوشبو

سے میں مست ہو رہا ہوں کہا کہ میں ایک ناچیز مٹی ہوں لیکن کچھ مدت تک پھول کی

صحبت میں رہی ہوں، میرے ہم نشین پھول نے میرے اندر اپنا اثر ڈال دیا ورنہ میں تو

وہی خاک ہوں جو پہلے تھی)

بس یہ تھی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے پاس دولت۔ کسی کی طویل صحبت تھی کسی کی کم۔ مگر کمال سے کوئی بھی خالی نہیں رہا۔ البتہ اکملیت کے مراتب میں تفاوت تھا۔ چاہے زبان حاصل کی ہو یا نہ کی ہو۔ کمال تو ہر شخص نے حاصل کر لیا تھا۔ زبان اور چیز ہے کمال اور چیز ہے۔ اب کتابیں تو بہت سی پڑھ لیتے ہیں لیکن اہل مہارت کی صحبت میں رہنے کا بالکل اہتمام نہیں جہاں تم نے کتابیں پڑھی تھیں اگر کسی مربی کی صحبت میں اٹھائے ہوتے تو اپنے کو کبھی اہل مہارت میں سے نہ سمجھتے بھائی تم تو پہلے مربی بنو پھر مربی بننا چند روز کے لئے اپنے آپ کو کسی مربی کی سپردگی میں دیدو۔ وہ تمہیں تاؤ دے دیکر مربی بنائے گا۔ جب خوب گھل جاؤ گے اور مربی بنانے والے بھی تصدیق کر دیں گے کہ ہاں اب مربی بن گئے تب مربی بنو گے۔ تمہارا خود ہی یہ سمجھ لینا کہ ہم اب مربی ہو گئے ہرگز کافی نہیں کیونکہ اے مربی! تیرے پاس کوئی ایسی مہک اور کوئی ایسا معیار نہیں جس سے تو یہ جانچ لے کہ میں مربی ہو گیا۔ جب تیرے پاس کوئی مہک اور معیار نہیں تو تو اپنی ذات کو بلا آلہ کے دیکھے گا تو تو اپنے نفس کو دیکھے گا اپنے نفس ہی سے، جو ناقص ہے اور مربی تیرے نفس کو دیکھے گا اپنے نفس سے اور وہ ہے کامل۔ لہذا اس کی جانچ معتبر ہوگی اور تیری جانچ ہرگز معتبر نہ ہوگی کیونکہ اس کے پاس تو آلہ شناخت ہے اور تیرے پاس کوئی آلہ شناخت ہے نہیں۔

جیسے کوئی سب کا مربی بنا کر رکھے تو خود سبب یہ جانچ نہیں کر سکتا کہ میں مربی ہو گیا ہوں یا نہیں۔ اس کے کیا دانت ہیں جو کچل کر بتا دے گا۔ البتہ جو مربی بنا بیولا ہے اس کے دانت ہیں جو کچل کر بتا دے گا وہ دانت تلے دبا کر فوراً بتا دے گا کہ ہاں ہو گیا تو تم کو ابھی کسی نے دانت تلے یا پیر تلے دبا یا نہیں کہیں سرنہ گئے ہو کہیں کچے نہ پڑ گئے ہو۔ غرض اصل چیز تو حقیقت کمال ہے مگر زعم کمال اور دعویٰ کمال نے اسے خراب کر رکھا ہے۔

خود بینی کے مضرات

فرخ آباد میں ایک واعظ صاحب مدعی کمال کے ملے مجھ سے بیعت کی درخواست کی۔ میں نے کہا میرے یہاں بیعت کی چند شرطیں ہیں ان میں سے ایک شرط تمہارے لئے یہ ہے کہ وعظ کہنا چھوڑ دو کیونکہ تم عالم نہیں ہو کہنے لگے صاحب! میں تو بہت ہی احتیاط کے ساتھ مضامین بیان کرتا ہوں مجھے اجازت دیدی جائے میں نے کہا اگر احتیاط سے بھی بیان کرتے ہو تب بھی تمہارے نفس کا علاج یہی ہے کہ تم وعظ کہنا چھوڑ دو۔ پھر بھی بے حد اصرار کیا کہ مجھے تو اجازت ہی

دیدو۔ میں نے کہا اچھا مجھے ابھی اس میں بھی شک ہے کہ تم احتیاط کے ساتھ بیان کرتے ہو گے۔ کہنے لگے میں تو آپ ہی کی کتابیں یا حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں دیکھا کرتا ہوں۔ بس انہی کتابوں کے مضامین میرے بیان میں ہوتے ہیں۔ میں نے کہا ممکن ہے تم ارتباط میں کچھ گڑبڑ کرتے ہو یا سلسلہ ممکن ہے غلط ملاتے ہو یا ایسے عنوان سے ان مضامین کو نقل کرتے ہو کہ سننے والوں کو غلط فہمی ہوتی ہو۔ اس لئے اگر تمہارا ایسا ہی اصرار ہے وعظ کہنے کی اجازت دے دینے پر تو یہ کرو کہ مجھے پہلے ایک اپنا وعظ نمونہ کے طور پر سنا دو تا کہ میں یہ تو اندازہ کر لوں کہ تم کہاں تک احتیاط برتتے ہو۔ حضرت انہیں اپنے اوپر یہاں تک عقیدہ اور دلیراٹنے کہ اس پر راضی ہو گئے اور جھٹ وعظ کہنے بیٹھ گئے کہ اچھا سن لیں۔

اول ہی میں آپ نے ایک قصہ نقل کیا کہ ایک دن چاروں صحابہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے یہاں جمع ہو گئے۔ حضرت علیؓ دعوت کے واسطے ہدیہ کے طور پر گھر میں سے شہدائے اس شہد میں ایک بال پڑا ہوا تھا۔ چاروں صحابہ نے ایک دوسرے سے کہا کہ یہ جو بال ہے اس کی کوئی مثال سوچو یہ کس چیز کی مثال ہے چنانچہ کسی نے کچھ مثال دی کسی نے کچھ مثال پیش کی اب مجھے کو یاد نہیں کہ یہ کس نے مثال دی۔ غلط مضامین کیا یاد رہتے۔ کسی نے کہا مومن کی فلاں حالت کے مشابہ ہے کسی نے کہا فلاں حالت کے مشابہ ہے۔

میں نے کہا جب وعظ ختم کر چکے کہ اچھا یہ تو بتاؤ یہ قصہ جو تم نے نقل کیا وہ کون سی کتاب میں ہے۔ میری کتاب میں ہے یا مولانا محمد قاسم صاحب کی کتاب میں ہے کہنے لگے یہ تو یاد نہیں رہا کہ کس کتاب میں ہے مگر ہاں دیکھا ہے کہیں۔ میں نے کہا یہ آپ کی احتیاط ہے کہ ایسا مہمل قصہ جو کسی اہل حق کی کتاب میں نہیں ہے اس کو بیان کر دیا۔ اب تو سمجھ گئے کہ تم کو وعظ کہنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ مگر حضرت انہوں نے نہیں مانا برابر وعظ کہتے ہیں۔ یہ تو گوارا کر لیا کہ مجھ سے تعلق نہیں رکھا اور یہ گوارا نہ ہو سکا کہ وعظ کہنا چھوڑ دیں۔

اب کیا علاج ایسے جہل مرکب کا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جہل وہ چیز ہے کہ اگر کسی کو اپنے جہل کی خبر ہو جائے تو میں اس کو علماء میں شمار کرتا ہوں یعنی اول درجہ علم کا اپنے جہل پر مطلع ہو جانا ہے۔ جیسے صحت کا اول درجہ مرض کی اطلاع ہے موٹا مسئلہ عقل کا ہے کہ جس کو اپنے مرض کی اطلاع نہ ہوگی وہ علاج ہی نہیں کریگا۔

خدا تعالیٰ بچائے یہ خود بینی ایسی بری چیز ہے کہ حضرت حافظ اس کو کفر سے تعبیر کر رہے ہیں اور واقعی یہ ہے ہی ایسی بری چیز۔ فرماتے ہیں۔

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست ☆ کفرست دریں مذہب خود بینی و خود رائی
(عشق و محبت کے راستے میں اپنی فکر اپنی رائے نہیں چلتی یہاں تو بس محبوب کی چلتی ہے۔ اس مذہب میں خود بینی و خود رائی کفر ہے یعنی نہایت ہی قبیح ہے)

تو دیکھا آپ نے یہ آفت نازل ہو رہی ہے حق جل علاہ صاف فرما رہے ہیں۔ ہل
یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون۔ کہیں عالم اور جاہل بھی برابر ہو سکتے ہیں۔ اب اس
وقت عوام الناس نے ایک عجیب و غریب مستی اور شورش برپا کر رکھی ہے اور علماء کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ
بھی شریک ہوں۔ خیر! عوام الناس پر تو حیرت نہیں مگر حیرت ہے علماء پر جو ان سے مغلوب ہو کر ان
کے تابع ہو گئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ عوام الناس کے دبانے سے اور ان سے دب کر جو علماء تابع
ہو گئے ہیں کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی کچھ قدر ہے وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ علماء دل سے ہمارے موافق
نہیں ہیں۔ ہم سے دب کر ہمارے تابع ہو گئے ہیں۔ اگر یہی حال ہے تو پھر اور کسی بات میں تابع
بنائیں گے پھر اور کسی میں۔ خلاصہ یہ کہ ان کے مرید ہو جاؤ کس قدر شرم کی بات ہے۔ کاریگر یعنی
مادیات اور حیات تک کا کاریگر بھی جو اپنے کام میں ماہر ہو اس سے کوئی خلاف قاعدہ کام تو لے لو۔

ہمارے یہاں تعمیر کا کام جاری ہے۔ ایک معمار نے ایک کام کو ایک طریقہ سے بنانا چاہا
مگر ہم غلط سمجھے۔ ہم نے دوسرا انداز تجویز کیا کہ نہیں اس طرح بناؤ۔ اس نے کہا صاحب یوں نہیں
بن سکتا۔ ہم نے کہا تمہیں اس سے کیا بحث! جس طرح ہم کہہ رہے ہیں اسی طرح بنا دو۔ ایک
دوسرا معمار تھا اس نے بھی کہا کہ ارے جس طرح مالک کہیں اسی طرح بنا دے تجھے کیا۔ بس جناب
ہم سے تو بے چارہ بول نہ سکا اس پر بہت تیز ہوا اور کھڑا ہو گیا۔ کہ تو بڑا کاریگر ہے آ تو ہی
بنا جو قیامت تک بھی بن سکے۔ نہایت تیز لہجہ میں اس نے کہا حالانکہ یہ تھوڑا ہی تھا کہ بن ہی نہ سکتا۔
بن تو جاتا اس طرح بھی جس طرح ہم لوگ کہہ رہے تھے مگر بے کینڈے بننا اسے اس تصور سے بھی
شرم آئی کہ جو دیکھے گا پاگل کہے گا بنانے والے کو۔ گو برا کہنے والے متعین نہ ہوں۔ پھر بھی اہل کمال
کو غیرت آتی ہے کہ اس کے ہاتھ سے ایسا کام ہو جس کو دیکھ کر لوگ کہیں کہ یہ کسی اناڑی کا کام ہے۔
غرض جب اس نے پوری تقریر کی تب ہمیں اپنی تجویز کی غلطی معلوم ہوئی کہ واقعی ہی ٹھیک

کہتا تھا۔ ہم نے کہا بے وقوف! تو نے پہلے ہی پوری بات کیوں نہ کہہ دی تھی۔
تو میں کہتا ہوں کہ معماروں کو تو اتنی غیرت ہو اور مولویوں کو اتنی غیرت بھی نہ ہو بس وہ
کیا غرض نے ساری خرابی ڈال رکھی ہے۔

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد ☆ صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد
(جب عرض دل میں آئی، ہنر پوشیدہ ہوا، سینکڑوں پردے حق بنی سے مانع ہو جاتے ہیں
جو دل سے نکال کر آنکھوں پر چھا جاتے ہیں)

آداب ماہ رمضان

اعتکاف کے تعلق سے یہ تقریر شروع ہوئی تھی۔ غرض خلوت اور ترک تعلقات کی حقیقت
محققین ہی جانتے ہیں۔ غیر محققین کو ان کا اتباع کرنا چاہیے۔ اسی طرح ہر فن میں جو محققین ہیں وہ
عوام کو اپنا تابع بنائیں خود ان کے تابع ہرگز نہ بنیں۔ اگر اس عزم میں پختگی ہوگی تو عوام خود ان کے
سامنے گردن جھکا دیں گے۔ اور ان کا اتباع کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اگر نہ کریں گے
تو تمہیں کیا لست علیہم بمصیطر۔

ایک عبادت احیاء لیلیٰ قدر ہے۔ اس احیاء کا موجب نورانیت ہونا مشہور و معلوم ہے
خلاصہ یہ کہ رمضان المبارک کے حقوق کو جو کہ مجمع الانوار ہے پورا ادا کرو اور خلاصہ ان حقوق کا کیا
ٹھہرا کہ جو احکام واجبہ ہیں ان کی پوری پابندی کرو اور جو امور منکر اور مکروہ ہیں خواہ صنعائے ہوں
یا کبائر ہوں بالکل چھوڑ دو۔ خواہ فضائل میں کمی رہے مضائقہ نہیں۔

غرض رمضان المبارک کی اصل عبادت تو روزہ و تراویح اور ان کی تنزیہ ہے اور کثرت
تلاوت و اعتکاف و شب بیداری اس کے تعلقات۔ ان سب کی اصل یعنی اصل الاصول وہ احکام
واجبہ کی پابندی اور امور منکر و مکروہ سے اجتناب ہے اس سے آگے اپنی اپنی ہمت ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے مہمان کے سامنے جو چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ ان میں اصل چیز
تو گوشت روٹی ہے باقی مربہ، اچار، چٹنی یہ زینت ہیں دسترخوان کی اور معین بھی ہیں ہضم غذا میں
اور لطف افزا ہیں اور کھانوں کی۔ اگر کوئی شخص اپنے مہمان کے سامنے یہ زائد چیزیں تو رکھ دے مثلاً
چٹنی بھی کئی قسم کی۔ اچار بھی طرح طرح کے رکھ دے۔ مربے بھی مگر ان کے سوا اور کچھ نہیں۔ نہ خشک
ہے نہ روٹی ہے، نہ گوشت ہے، جو اصلی غذا ہے اب وہ مہمان کیا کہے گا یہی کہے گا کہ کیا کھاؤں۔

مرہ کھاؤں، اچار کھاؤں، کھانے کی چیز تو ایک بھی نہیں۔ یہ تو سب لگانے کی چیزیں ہیں۔
 اگر اسی طرح تم نے اپنا رمضان اس حالت میں حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیا کہ اس میں
 اصل چیز تو ہے نہیں۔ مگر زوائد ہیں تو وہ کیا قبول ہوگا۔ اور اگر تمہارے پاس اصل چیز تو ہے مگر
 زوائد نہیں، یعنی اگر دن بھر بری نگاہ سے، غیبت سے اور جتنے گناہ ہیں سب سے بچے رہو۔ اپنی
 آمدنی حلال رکھو۔ پھر چاہے رات کو اچھی طرح پڑ کر سو رہو۔ تہجد بھی نہ پڑھو۔ وظیفے بھی نہ پڑھو۔
 مگر یہ کہ گناہ کے پاس نہ پھٹکو۔ تو تمہارا رمضان بخدا اس شخص سے اچھا ہے کہ تہجد بھی ہے، چاشت
 بھی ہے، وظیفے بھی ہیں۔ تلاوت بھی ہے سب کچھ ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی کر رہا ہے کہ غیبتیں بھی
 کر رہا ہے، برائی بھی کر رہا ہے عورتوں کو بھی تک رہا ہے لہو و لعب میں بھی مبتلا ہے لڑنا جھگڑنا بھی
 ہے بغض و حسد بھی ہے اس سے تمہارا رمضان ہزار درجہ اچھا ہے۔

اگر ہمت نہ ہو بہت سے سیپارے ختم نہ کرو۔ سوؤ خوب پڑ پڑ کر۔ بس فرض، سنت نمازیں
 تو اٹھ کر پڑھ لیا کرو۔ باقی آرام سے مہینہ بھر گزارو۔ مگر خدا کے واسطے گناہ کوئی نہ کرو تو یہ اچھا ہے
 اور اگر ہمت ہو تو گناہ کو بھی چھوڑ دو اور طاعات کو بھی لو۔ یہ تو پھر سبحان اللہ نور علیٰ نور ہے۔ اور یہ مہینہ
 قابل تو اسی کے ہے کہ اس میں ایسا ہی کیا جائے یعنی واجبات و فضائل سب کو جمع کیا جائے۔
 حدیث میں ہے کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجود من الريح المرسلۃ۔
 یعنی رمضان شریف آتے ہی اس قدر طاعت میں مشغول ہوتے تھے جیسے ہوا چھوٹ نکلتی ہے کہ
 اڑی چلی جاتی ہے سلامت کے ساتھ۔

غرض رمضان کا جو مہینہ ہے اصل میں ترک دنیا کے واسطے ہے گیارہ مہینے خوب عیش و آرام
 میں گزارے ہیں ایک مہینہ تو پندہ خدا تھوڑی بہت مشقت اٹھا لو جیسے مولانا فرماتے ہیں۔
 خواب را بگذار امشب اے پسر ☆ یک شبے در کوئے بے خواباں گذر
 (ایک رات خواب کو اے پدر ترک کر دے اور کسی اللہ کے عاشق کے پاس ایک رات
 گزار دے پھر دیکھ ان بے خوابوں کی گلی میں کیا لطف ہے جو رشک، ہفت اقلیم ہے)
 گیارہ مارہ تو سب کچھ کام کئے ایک مہینہ خدا کے کام میں رہ لو گے تو کونسا ایسا بڑا حرج
 ہو جائے گا۔ پھر وہ بھی اس طرح کہ اسی میں صحت کی رعایت رکھی گئی ہے۔ غرض یہ مہینہ تو خاص

ہو جائے عبادت کے لئے۔ اور اخیر درجہ یہ کہ اگر عبادت نہ ہو سکے تو گناہوں کو تو چھوڑ داتا تو کرو۔ یہ مقصود تھا میرا جس کو میں بیان کر چکا۔ اور مضامین بھی ذہن میں ہیں مگر وقت بہت ہو چکا ہے اگر موقع ہو تو میں یا اور احباب ان شاء اللہ تعالیٰ رمضان المبارک کے جمعوں میں عرض کرتے رہیں گے۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو ہمت اور توفیق دیں اعمال صالحہ کی اور ناپسندیدہ اعمال اور منکرات سے بچنے کی۔ اور ایک بات اور عرض کرنے سے رہ گئی کہ رمضان کے دن آنے سے پہلے آپس میں مل جل لو۔ اور دلوں سے رنجشوں کو دور کر لو کیونکہ معاصی سے روزہ کا اثر اور نور جاتا تو نہیں رہتا مگر بہت مضحک ہو جاتا ہے۔

(اب ”دعا کیجئے“ سے یہاں تک کی تقریر ہاتھ اٹھائے ہوئے فرماتے رہے)

غالباً بعد ختم دعا یا دوران دعا ہی میں فرمایا کہ چونکہ اس بیان میں انوار رمضان کا ذکر ہے اس لئے اس کا نام ”رمضان فی رمضان“ مناسب معلوم ہوتا ہے رمضان جمع ہے رمیض کی جس کے معنی ہیں چمک دمک کذا فی القاموس۔ ثم بحمد اللہ الذی بنعمته تتم الصلحت۔

الحمد للہ ثم الحمد للہ! کہ بہ برکت دعا تو جہات حضرت اقدس اس وعظ کی تبلیغ ۲۵ شعبان المعظم ۱۳۳۸ھ یوم شنبہ بوقت چاشت شروع ہو کر آج پندرہ دن کی مدت میں ۱۱ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ یوم یکشنبہ عین اذان ظہر کے وقت حق تعالیٰ نے اس ناکارہ کے ہاتھوں پوری کرا دی حق تعالیٰ اس کو مقبول اور نافع عطا فرمائیں۔ اور صاحب وعظ کو مدت مدید تک اسی طرح فیض گستر رکھیں آمین بحرۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وازواجہ جمعین۔

احکام العشر الاخیرہ

ماہ رمضان کے عشرہ اخیرہ کے متعلق یہ وعظ ۲۱ رمضان ۱۳۲۹ھ
 بروز جمعہ جامع مسجد تھانہ بھون میں نماز جمعہ سے نماز عصر تک بیٹھ
 کر فرمایا حاضرین کی تعداد ۱۰۰ تھی۔
 مولوی سعید احمد صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ
وَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا
مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ
لَا شَرِيكَ لَهُ وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ صَلَّى
اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ. آمَنَّا بَعْدَ قَاعُوذٍ
بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ. بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ.

شهر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ہدی للناس وبینات من الہدی
والفرقان . (البقرہ: ۱۸۵)

ترجمہ: ماہ رمضان ہے جس میں قرآن مجید بھیجا گیا ہے جس کا (ایک) وصف یہ ہے کہ
لوگوں کے لئے (ذریعہ) ہدایت ہے اور (دوسرا وصف) واضح الدلالہ ہے منجملہ ان کتب
کے جو (ذریعہ) ہدایت بھی ہیں اور حق و باطل میں فیصلہ کرنیوالی (بھی) ہیں

فضیلت ماہ رمضان

یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے اس آیت میں خدائے تعالیٰ نے رمضان کی ایک فضیلت کا بیان فرمایا
ہے۔ گزشتہ جمعہ میں رمضان کے ضروری آداب و حقوق کا بیان ہو چکا ہے۔ آج رمضان کے ایک
خاص جزو یعنی عشرہ اخیرہ کے متعلق بیان کرنا مقصود ہے۔ اس آیت سے بظاہر عشرہ اخیرہ کے مضمون
کو کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا لیکن غور کیا جائے تو عشرہ اخیرہ سے اس آیت کا تعلق معلوم ہو جائے گا۔
خدا تعالیٰ نے اس آیت میں رمضان کی جو فضیلت بیان کی ہے اسی فضیلت میں غور کرنے سے
معلوم ہو جائے گا کہ وہ فضیلت عشرہ اخیرہ کے لئے بدرجہ اولیٰ قائم ثابت ہے۔

فرماتے ہیں کہ ماہ رمضان ایسا مہینہ ہے جس میں ہم نے قرآن نازل کیا ایسا اور ایسا ہے۔ سو اس آیت سے اس قدر معلوم ہوا کہ قرآن کا نزول ماہ رمضان میں ہوا لیکن ظاہر ہے کہ رمضان تیس دن کے زمانہ کا نام ہے اور اس آیت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس طویل زمانہ کے کس جزو میں نزول ہوا ہے لیکن اگر ہم اس کے ساتھ دوسری آیت کو بھی ملا لیں تو دونوں کے مجموعہ سے تعین وقت بھی ہم کو معلوم ہو جائیگی۔ سو دوسری آیت میں فرماتے ہیں: انا انزلہ فی لیلة القدر۔ (بے شک قرآن کو ہم نے شب قدر میں اتارا ہے) پس ان دونوں آیتوں کے دیکھنے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ قرآن مجید کے نزول ماہ رمضان کی شب قدر میں ہوا۔

رہا یہ شبہ کہ ممکن ہے شب قدر رمضان میں نہ ہو تو اس صورت میں دوسری آیت کا ضم مفید نہ ہوگا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو شب قدر کا رمضان میں ہونا حدیث میں موجود ہے۔ اس سے قطع نظر اگر ہم ذرا فہم سے کام لیں تو ان دونوں آیتوں سے ہی معلوم ہو جائے گا کہ شب قدر رمضان میں ہی ہے۔

نزول قرآن کریم

اس لئے کہ کلام مجید کا نزول دو طرح ہوا ہے۔ ایک نزول تدریجی جو کہ ۲۳ برس میں حسب ضرورت نازل ہوتا رہا۔ اور جس کا ثبوت علاوہ کتب سیر کے خود کلام مجید سے ہوتا ہے۔ لولا انزل علیہ القرآن جملة واحدة كذلك لنثبت به فؤادک ورتلناه ترتیلا۔ یہ آیت مشرکین نصاریٰ کے اس اعتراض پر نازل ہوئی تھی کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں تو ان کو کوئی کتاب پوری کی پوری دفعۃً آسمان سے کیوں نہیں دی گئی۔ جس طرح موسیٰ علیہا السلام کو دی گئی تھی۔ خدا تعالیٰ ان کفار کے اعتراض کا جواب ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ كذلك لنثبت به فؤادک جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے کلام مجید کو بتدریج ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس لئے نازل کیا ہے کہ اس تدریج کے ذریعہ سے آپ کے دل کی تشبیت اور اس کا محفوظ کر لینا اور سمجھ لینا آسان ہو جائے۔

واقعی غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس قدر تشبیت فواد اور ضبط و فہم بتدریج نازل کرنے میں ہو سکتا ہے نزول دفعی میں نہیں ہو سکتا۔ دفعۃً نازل کرنے میں احکام جزئیات کا سمجھنا امت کے لئے اس لئے دشوار ہوگا کہ جب دفعۃً نازل کیا جائے گا تو یقیناً اس کے احکام امور کلیہ ہوں گے اور ان پر جزئیات کو منطبق کرنا پڑے گا۔ سو جب تک کہ نبی زندہ ہیں اس وقت تک سوال کرنے سے

بآسانی تعلیم ہو جائیگی لیکن نبی کی وفات کے بعد چونکہ ان کا منطبق کرنا محض امت کے اجتہاد پر رہ جائے گا۔ اس لئے بہت سی غلطیوں کا ہونا ممکن ہے جیسا کہ نصاریٰ اور یہود سے ہوئیں۔

اس تفاوت کی ایسی مثال ہے کہ ایک مریض کسی طبیب کے پاس آئے اور اپنی حالت بیان کر کے حکیم سے کہے کہ میں آپ کے پاس تو رہ نہیں سکتا۔ نہ میں وقتاً فوقتاً آ کر آپ کو اپنی حالت کی اطلاع کر سکتا ہوں۔ آپ میری حالت کے مناسب کئی نسخے مجھے لکھ دیجئے۔ جوں جوں میری حالت متغیر ہوتی جائے اور مرض میں کمی یا بیشی ہو میں اس کے مناسب نسخوں کو بدل کر استعمال کرتا جاؤں۔ پس اس صورت میں اگرچہ طبیب کتنا ہی ماہر ہو۔ اور کتنے ہی غور و خوض سے نسخوں کی تجویز کرے لیکن اس مریض کی حالت اس مریض کے برابر بہتر نہیں ہو سکتی جو کہ روزانہ طبیب کے پاس آتا ہے، اپنی حالت بیان کرتا ہے پچھلا نسخہ دکھاتا ہے اور روزانہ اس میں تغیر و تبدل کی بیشی کرا لے جاتا ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ پہلی صورت میں تمام تغیرات کے لئے طبیب نے نسخہ جات لکھ دیئے لیکن تغیرات کی تعیین اور ان کا فہم یہ محض مریض کی رائے پر رہا جو کہ رائے العللیل ہونے کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہے۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ زیادتی صفرا کی ہو اور وہ سودا کا ہیجان سمجھ جائے اور چستی سنبھالنے کی ہو اور وہ مرض کی کمی سمجھ جائے۔

اس سے واضح ہو گیا ہوگا کہ جس قدر عام اور تمام فائدہ جزئی حالت کے دیکھنے اور حسب ضرورت تغیر تبدل کرنے میں ہے۔ امور کلیہ سمجھا دینے میں اس قدر فائدہ نہیں۔ اس میں بہت سی غلطیاں ممکن ہیں۔ بس خدا کا ہم پر بڑا فضل ہے کہ اس نے کلام مجید جزء جزء نازل فرمایا کہ علماء امت نے اس کو اچھی طرح سمجھا۔ اس کے اسباب نزول پر پوری نظر کی اور اس کو اپنے ذہن میں لے لیا۔

سابقہ کتب کا نزول

یہاں بظاہر دو شبہات ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ جب تدریجی نزول میں اس قدر فائدہ اور دفعی نزول میں اس قدر نقصان کا احتمال ہے تو خدا نے قرآن سے پہلی کتب کو دفعۃً کیوں نازل فرمایا۔ جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ مصلحت اور فرق غلط ہے یا امم سابقہ کے مصالح کی رعایت نہیں کی گئی۔

اس کا جواب تو یہ ہے کہ شرائع سابقہ چونکہ چند روزہ تھیں اور اس زمانہ کے اکثر ایام میں ان کے نبی یا ان کے خاص اصحاب ان میں موجود رہتے تھے جن سے تمام جزئیات حل ہو جاتی تھیں۔

اس لئے کتب سابقہ کا دفعہ نازل ہونا ان لوگوں کے لئے مضرت نہیں ہوا۔

دوسرا شبہ یہ ہے کہ یا وجود قرآن کے تذریجاً نازل ہونے کے فہم قرآن میں غلطیاں اب بھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ اختلاف مجتہدین سے صاف معلوم ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس اختلاف اور خطا میں اور امم سابقہ کے اختلاف اور غلطیوں میں بڑا فرق ہے۔ ان سے زیادہ اور مضرت غلطیاں ہوئی تھیں اور اس امت سے ایسی غلطیاں نہیں ہوئیں۔ وجہ یہ کہ اسباب نزول نصوص کی تفسیر ہے جس کو تعین مراد میں خاص دخل ہے اور ظاہر ہے کہ تعین مراد کے بعد کے غلطی خفیف ہوگی اور عدم تعین مراد کی صورت میں عظیم ہوگی۔

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بلا تعین مراد ان لوگوں پر احکام کیسے متوجہ ہوئے۔ بات یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے بیان سے تعین ہو جاتی تھیں۔ سواول تو انہوں نے اس کی حفاظت نہیں کی۔ دوسرے یہ کہ بیان بھی مواقع سوال ہی میں ہوتا ہے اور سوال کا ہر جگہ اذن تھا۔ مگر قلت توجہ سے ان لوگوں کو اس کی نوبت بھی کم آئی اور اس امت میں جو تعین مراد کے بعد اختلاف پیش آیا۔ اس میں حکمت تھی توسیع مسالک کی۔ پس وہ رحمت ہوا۔ پس دونوں میں فرق ظاہر ہو گیا۔

یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ مقصود یہ ہے کہ کلام اللہ کا نزول دو طرح کا ہے۔ ایک نزول تو یہ ہے جس کا تذریجی کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس آیت شہر رمضان الذی میں یہ نزول مراد نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ صرف رمضان یالیلۃ القدر میں نہیں ہوا۔ بلکہ ۲۳ برس میں ہوا۔

عالم غیب کی وسعت

اور دوسرا وہ نزول ہے جو کہ دفعہ ہوا اور اس آیت میں بھی مراد ہے اور یہ نزول اس عالم دنیا میں نہیں ہوا جس میں کہ نزول تذریجی ہوا ہے۔ بلکہ یہ نزول عالم غیب میں ہوا ہے یعنی لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر اور یہ دونوں اس عالم کے جز ہیں۔ اور اس کے ذی اجزاء ہونے کو بعید نہ سمجھا جائے اس میں اس قدر وسعت ہے کہ یہ عالم دنیا اس سے وہ نسبت رکھتا ہے جو سوئی پر لگا ہوا ایک قطرہ سمندر سے رکھتا ہے یعنی یہ عالم دنیا اس کے سامنے مثل ایک قطرہ کے ہے اور وہ اس کے اعتبار سے مثل سمندر کے ہے۔

اہل کشف نے لکھا ہے کہ دونوں عالموں میں وہی نسبت ہے جو کہ رحم مادر اور عالم دنیا میں ہے بچہ اول رحم مادر میں رہتا ہے اور اس کے لئے وہ ایک عالم ہوتا ہے اور اس سے اس قدر مانوس ہوتا ہے اگر شاید وہاں سے اس کی رائے لے کر عالم دنیا میں لایا جائے تو وہ کبھی گوارا نہ کرے اور مچل

جائے۔ لیکن اگر اس کو کسی طرح وہاں سے نکال لیا جائے جیسا کہ اس طرح لایا جاتا ہے اور عالم دنیا میں وہ یہاں کی رونق، چہل پہل یہاں کی آبادی اور معمورہ دنیا کو دیکھے تو عالم رحم اس کو بالکل بیچ اور عدم معلوم ہونے لگے۔ اسی طرح اہل دنیا جو کہ اس عالم میں محبوس اور اسیر ہیں۔ جنہوں نے آنکھ کھولنے کے وقت سے آنکھ بند کرنے تک اس کے سوا اور کسی عالم کو دیکھا ہی نہیں جب ان کو اس عالم کے چھوڑ دینے اور دوسرے عالم میں چلنے کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ سخت پریشان ہوتے ہیں ان کا دل مضطرب ہوتا ہے اور وہ کسی طرح اس عالم کی جدائی کو گوارا نہیں کرتے۔ ہاں وہ لوگ جن کو خدا تعالیٰ نے عیناً یا ذوقاً علم مکاشفہ دیا ہے اور وہ اس عالم کو مشاہدہ کر چکے ہیں تو ان کو اس کی جدائی کا نہ قلق ہوتا ہے نہ وہ اس سے گھبراتے ہیں بلکہ وہ اس عالم سے انتقال کے متمنی اور آرزو مند رہتے ہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ پہلے لوگوں کے مقابلہ میں یہ لوگ زیادہ مقبول اور صاحب کمال ہیں۔ اس واسطے کہ ان کی فضیلت یا تواشتیاق کی وجہ سے ہو سکتی ہے یا کشف کی وجہ سے تواشتیاق کی وجہ سے تو اس لئے یہ صاحب فضیلت نہیں کہ جب عالم غیب اور اس کے نعم و لذائذ کو دیکھ چکے ہیں پھر اس کی طرف رغبت کرنا اور اس کا مشاق ہونا کیا کمال کی بات ہے خوشمنا بنانچہ کو جو شخص بھی دیکھے گا اس کی سیر کا متمنی ہوگا۔

کشف اور بزرگی

اور کشف کی وجہ سے اس لئے صاحب فضیلت نہیں کہ کشف دلیل بزرگی اور مقبولیت کی نہیں۔ اس کی بناءً محض مجاہدہ اور کثرت ریاضت پر ہے اکثر ہنود کو بھی ہونے لگتا ہے اور مرنے کے بعد تو سب ہی کو ہوگا۔ البتہ اہل کشف کو اس اعتبار سے ضرور فضیلت ہے کہ دنیا میں رہ کر جو ذوق ان کو حاصل ہے دوسروں کو نہیں اور کشف کی حقیقت معلوم ہو جانے سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ بعض ناواقف لوگ جو کشف کے درپے ہوتے ہیں اور اس کو بڑی چیز سمجھتے ہیں یہ ان کی غلطی ہے۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کشف نہ ہونے کی صورت میں اگر عمل ہو تو وہ زیادہ کمال کی بات ہے۔ چنانچہ خداوند جل و علا جائے مدح فرماتے ہیں۔ الذین یؤمنون بالغیب (جو لوگ غیبت پر ایمان لاتے ہیں)

حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا ای الخلق اعجبہم ایماناً۔ یعنی تمام خلق میں سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا الملائکۃ یا رسول اللہ! الخ، یعنی فرشتوں کا ایمان سب سے زیادہ عجیب ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ ان کے ایمان نہ لانے کی کیا وجہ ہوتی جب کہ ہر وقت کلام و احکام سے مشرف ہوتے ہیں۔ صحابہؓ نے کہا کہ پھر انبیاء علیہم السلام کا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بھلا وہ کیوں ایمان نہ لاتے۔ ہر وقت تو ان پر وحی نازل ہوتی ہے صحابہؓ نے کہا کہ پھر ہمارا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کیوں ایمان نہ لاتے۔ ہر وقت مجھے دیکھتے ہو۔ مجھ سے سنتے ہو آخر صحابہؓ نے عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پھر کون لوگ ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ لوگ جو میرے بعد آئیں گے جنہوں نے نہ مجھ کو دیکھا ہوگا نہ نزول قرآن کی کیفیت دیکھی ہوگی۔ محض چند لکھے ہوئے کاغذ دیکھ کر ایمان لائیں گے۔ ان کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔

مقصود اس سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ مکاشفہ کی نسبت عدم مکاشفہ کی حالت زیادہ افضل اور اسلم ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مطلقاً غیر مکاشفین مکاشفین سے افضل ہیں۔ اگر اہل کشف میں اور فضائل بھی ہوں جیسے انبیاء علیہم السلام تو وہ افضل ہوں گے اور اعجب ہونا دوسری بات ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو عالم غیب منکشف نہیں ہوا وہ لوگ اس دنیا کو چھوڑتے وقت گھبراتے اور مضطرب ہوتے ہیں۔ جالینوس کے متعلق مشہور ہے کہ جب مرنے لگا تو یہ تمنا کرتا تھا کہ میری قبر میں ایک سوراخ رہے کہ دنیا کی ہوا آتی رہے لیکن غیر مکاشفین اگر اہل ایمان کامل ہیں تو گوان کو طبعاً اس عالم کو چھوڑنا گراں گزرے اور وہ موت سے گھبرائیں جیسا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کلنا بکرم الموت۔ مگر مرنے کے بعد جب اس عالم کی سیر کریں گے اور اس کو دیکھیں گے اور اس کی وسعت آنکھوں کے سامنے ہوگی تو ان کی وہی حالت ہوگی جو کہ رحم مادر سے نکل کر اور عالم دنیا دیکھ کر بچے کی حالت ہوتی ہے کہ وہ اس کو بھول جاتا ہے اور عالم دنیا کے سامنے اپنے اس پہلے عالم کو چھوٹا بلکہ لاشے محض سمجھنے لگتا ہے حکیم سنائی اسی کی نسبت فرماتے ہیں۔

آسمانہا ست در ولایت جاں ☆ کار فرمائے آسمان جہاں

درہ روح پست وبالاہست ☆ کوہ ہائے بلند و صحرا ہست

(روح کے ملک میں بہت سے آسمان ہیں جو اس دنیا کے آسمانوں کو چلانے والے ہیں)

روح کے راستے میں گڑھے بھی ہیں اور ٹیلے بھی اور بہت سے اونچے پہاڑ اور جنگلات ہیں)

لیلة القدر

غرض! وہ عالم جب ذی اجزاء ہے اور یہ ذی نزول اسی عالم کے ایک جز سے دوسرے جز میں ہوا

ہے اور اسی کی نسبت کلام مجید میں ایک جگہ شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن (رمضان المبارک وہ ہے جس میں قرآن حکیم نازل کیا گیا) فرمایا اور دوسری جگہ انا انزلنہ فی لیلة القدر (بے شک ہم نے اس کو شب قدر میں اتارا ہے) فرمایا اور مراد دونوں مقام میں نزول دفعی ہے جیسا اوپر معلوم ہوا۔

تو ثابت ہوا کہ لیلة القدر رمضان میں ہے کیونکہ اگر لیلة القدر غیر رمضان میں ہو تو کلام مجید کی آیتوں میں تعارض لازم آئے گا کہ ایک آیت سے دفعی نزول رمضان میں اور ایک جگہ غیر رمضان میں ثابت ہوگا جو کہ محال ہے اور حدیثوں سے بھی شب قدر کا عشرہ اخیرہ میں ہونا معلوم ہوتا ہے پس جب شب قدر میں نزول ہوا تو عشرہ اخیرہ میں نزول ثابت ہو گیا۔ اور یہی مناسبت ہے۔ اس آیت کو عشرہ اخیرہ کے ساتھ اور رمضان کی فضیلت کے ساتھ عشرہ اخیرہ کی فضیلت بھی اس آیت سے ثابت ہوگئی اور فضیلت بھی بہت بڑی کہ اس میں قرآن کا نزول ہوا ہے کیونکہ قرآن مجید ایک عظیم الشان چیز ہے اس لئے جس زمانہ میں وہ نازل ہوگا وہ زمانہ بھی ضرور مبارک اور مشرف ہوگا اور اس فضیلت کی قدر کوئی عاشق کے دل سے پوچھے کہ جس زمانہ میں ان کو محبوب کے خط کی زیارت ہوتی ہے وہ زمانہ ان کے نزدیک کس قدر معزز و مشرف ہوتا ہے۔ قرآن شریف بھی کلام خداوندی ہے اور خدا تعالیٰ محبوب حقیقی ہیں۔ پس وہ زمانہ کہ جس میں محبوب حقیقی کا کلام نازل ہو۔ کیوں مبارک اور مشرف نہ ہوگا۔ مظروف کے ظرف سے ظرف کو بھی ضرور مشرف ہوا کرتا ہے چنانچہ مولانا روم فرماتے ہیں۔

گفت معشوقے بعاشق کائے فنا ☆ تو بغربت دیدہ بس شہر ہا
پس کد امی شہراز انہا خوشترست ☆ گفت آل شہرے کہ دروے دلبرست
(ایک معشوق نے اپنے عاشق سے کہا تو نے اپنے سفر میں بہت سے شہر دیکھے تو ان میں سے کون سا شہر بہتر ہے۔ عاشق نے جواب دیا کہ وہی شہر سب سے بہتر ہے جس میں معشوق موجود ہے)
دیکھو اگر کسی عاشق کو کنوئیں کے اندر وصال حبیب ہو تو وہ اس کنوئیں کو چمن سے بھی نہ سمجھے گا
اس کے دل میں اس کنوئیں کی عظمت ایک پھولوں سے بھرے چمن سے بھی زیادہ ہوگی اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس زمانہ کو بھی شرف ہے اکثر وہ کسی مظروف ہی کی شرف کی وجہ سے ہے۔
جمعہ کی فضیلت

یہی وجہ ہے کہ جمعہ کا دن اور ایام سے افضل ہے کیوں کہ اس دن میں ایک ایسا مظروف

موجود ہے جو کہ دوسرے ایام میں نہیں اکثر لوگ جمعہ کی فضیلت پر اعتراض کیا کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ کیا وجہ جمعرات کو وہ فضیلت کیوں حاصل نہیں جو جمعہ کو حاصل ہے۔ وہی ۱۲ گھنٹہ اس میں ہیں وہی ۱۲ گھنٹہ اس میں ہیں۔ وہی ایک دن جمعرات میں ہے وہی ایک دن جمعہ میں ہے۔ حالانکہ یہ اعتراض بالکل ہی لغو ہے کیونکہ اشتراک فی الساعات اور تشابہ فی الظاہر سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو ایک کی حالت ہو وہی دوسرے کی بھی ہو۔ کیا اگر کسی شخص کی بہن اور بیوی بالکل ہم شکل ہوں اور سامان زینت میں بھی دونوں برابر ہوں تو کیا ان میں حلال و حرام کے فرق ہونے کو خلاف عقل کہا جائے گا اور کیا یہ شخص دونوں سے برابر برتاؤ کریگا اور کیا اس شخص کے دل میں دونوں کی محبت ایک قسم کی ہوگی اور جو علاقہ کشش بیوی کے ساتھ ہے وہ بہن کے یا ماں کے ساتھ بھی ہو جائیگا۔ یہ ضرور ہے کہ محبت ماں اور بہن سے ہوگی لیکن کیا دونوں محبتوں میں فرق عظیم نہ ہوگا ضرور ہوگا۔ بہن اور ماں بھی محبوب ہیں اور بیوی بھی محبوب ہے لیکن دونوں کی محبت الگ الگ ہے کبھی کسی شخص کو نہیں دیکھا گیا کہ وہ بیوی کی طرح ماں کو بھی پیار کرے یا اس کو بغل میں لینے کی خواہش کرتا ہو۔ بلکہ طبعاً اس قسم کے خیالات سے اس قدر نفرت ہوتی ہے کہ اگر خواب میں اپنی ماں کے ساتھ صحبت کرتے دیکھ لیتا ہے تو بیدار ہو کر بے حد پریشان ہوتا ہے اور اپنے کو لعنت ملامت کرتا ہے حالانکہ تعبیر اس خواب کی بری نہیں۔

تعبیر یہ ہے کہ ایسا شخص متواضع اور منکسر المزاج ہوگا کیونکہ خواب میں معافی اپنے مناسب صورتیں اختیار کرتے اور اس میں متمثل ہوتے ہیں اس قسم کے خواب میں ماں سے مراد زمین ہوتی ہے باعتبار اپنی صفت خاکساری اور صحبت سے مراد تلبیس۔ پس یہ اشارہ ہوتا ہے کہ اس شخص کو صفت خاکساری سے تلبیس اور تعلق ہوگا۔ ایک بزرگ سے کسی نے یہی خواب بیان کیا انہوں نے یہی تعبیر دی۔ اگر کسی جاہل سے ایسا خواب بیان کیا جائے معلوم نہیں کیا تعبیر دے۔

اسی وجہ سے حدیث میں وارد ہوتا ہے لا تحدث الالبیاء وحبیباً۔ یعنی جاہل آدمی سے اپنا خواب بیان نہ کرو۔ بلکہ کسی عقل مند یا دوست سے بیان کرو کیونکہ عقل مند تم کو واقعی تعبیر سمجھ کر بتلا دے گا۔ اور تمہارا دوست اگر نہ بھی جانتا ہوگا تو خاموش ہو رہے گا گڑبڑ نہ بتلائے گا۔ بخلاف اجنبی بے وقوف یا دشمن کے کہ وہ خدا جانے کیا بتلا دے۔

مولانا فضل الرحمن صاحب نے ایک بار یہ مقولہ نقل فرمایا۔

تا آنکہ مادر خوب جفت نہ شود ☆ و برادر خود را نہ کشد عارف نہ شود

(جب تک اپنی ماں سے جفتی نہ ہو اور چھوٹا بھائی پیدا نہ ہو اس وقت تک عارف نہیں ہوتا)

کسی نے کہا کہ مضرت جزا دل تو میں نے بھی دیکھا ہے دوسرا جزا البتہ نہیں دیکھا۔ فرمایا بس اتنی ہی تو کسر ہے مراد جزا ثانی سے نفس کا مغلوب ہو جانا ہے۔ پس باوجود اس کے کہ اس قسم کے خواب کی تعبیر ایسی حسن ہے لیکن اگر کوئی ایسا خواب دیکھتا ہے تو بہت پریشان اور تنگدل ہوتا ہے اور بیداری میں تو کیا پوچھنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ماں کے ساتھ جو محبت ہے وہ دوسری نوع کی ہے اور بیوی کے ساتھ جو محبت ہے وہ دوسری قسم کی ہے دونوں محبتیں یکساں نہیں۔ اور یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگی کہ احادیث محبت میں جو بظاہر اختلاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک سے حضرت عائشہؓ کا سب سے زیادہ محبوب ہونا معلوم ہوتا ہے۔ دوسری سے حضرت ابو بکرؓ کا۔ تیسری سے حضرت فاطمہؓ کا واقع میں ان میں تعارض اور اختلاف کچھ نہیں۔ سب حدیثیں مختلف درجات محبت کے اعتبار سے صحیح ہیں کیونکہ جس حدیث سے حضرت عائشہؓ کا زیادہ محبوب ہونا معلوم ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ازواج مطہرات میں وہ سب سے زیادہ محبوب ہیں اور جس حدیث سے حضرت ابو بکرؓ صدیقؓ کا زیادہ محبوب ہونا معلوم ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب و احباب میں سب سے زیادہ محبوب تھے۔

الغرض! اشتراک فی الساعات من کل الوجہ کو موجب نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کہ ایک میں دوسرے پر فضیلت بالذات ہو بالخصوص جب کہ ازدیاد برکت کی کوئی دوسری وجہ بھی موجود ہو جو حاصل ہے فضیلت لغیرہ کا۔ جیسا ہم نے بیان کیا کہ ظرف کا شرف مظروف کے شرف سے ہوتا ہے اور اس کی تفصیل یوں سمجھنی چاہیے کہ وہ مظروف جس کی وجہ سے ظرف کو شرف ہوا ہے یا تو خداوند جل و علا کا کوئی فعل ہوگا۔ یا بندے کا کوئی فعل ہوگا۔ پس اگر خدا تعالیٰ کا فعل ہے تو چونکہ افعال خداوندی میں بعض نافع ہیں اور بعض انفع۔ اس لئے اس تفاوت کی وجہ سے ان ازمۃ میں بھی تفاوت ہوگا۔ جن میں یہ افعال پائے جائیں۔ مثلاً توریت کا نازل کرنا بھی فعل خداوندی ہے اور وہ بھی نافع ہے اور قرآن کا نازل کرنا بھی فعل خداوندی ہے مگر یہ بوجہ انفعیت قرآن کے انفع ہے پس زمانہ نزول تورات اور زمانہ نزول قرآن میں اسی درجہ کا تفاوت ہوگا جو کہ تنزیل قرآن اور تنزیل تورات میں

ہے۔ اور اگر وہ فعل بندہ کا ہے تو اس میں بھی یہی حالت ہے کیونکہ فعل عبد یا عبادت ہے یا معصیت ہے اور ہر ایک میں نافع و نفع و ضارم ضرر موجود ہیں۔ پس جس طرح کا فعل جس زمانہ میں ہوگا۔ اسی طرح کی صفت زمانہ کے لئے ثابت ہوگی۔ اگر کسی نافع عبادت کا صدور ہوا تو زمانہ میں اس قسم کی برکت آئے اور کسی نفع عبادت کا صدور ہوا تو زمانہ میں اس قسم کی برکت حاصل ہوگی۔

علیٰ ہذا اگر کسی خفیف گناہ کا صدور ہوا تو زمانہ صدور اس کے لئے برا زمانہ ہے اور اگر کسی بڑی معصیت کا صدور ہوا تو زمانہ صدور اس کے لئے بہت برا زمانہ ہے خلاصہ یہ ہے کہ آثار کا تفاوت اول اعمال کے لئے ثابت ہوتا ہے اس کے بعد اور اس کے واسطے سے زمانہ کے لئے۔ پس چونکہ رمضان میں قرآن کا نزول ہوا اور وہ مشرف و معظم ہے۔ اس کے شرف کی وجہ سے زمانہ نزول یعنی رمضان بھی ضرور مشرف ہوگا۔

تلاوت کی اہمیت

صاحبو! کیا مجازی محبوب کی گفتگو اور خط ملنے کا وقت تو پیارا اور عزیز ہو اور محبوب حقیقی کے کلام نازل ہونے کا وقت مشرف و ممتاز نہ ہو قطع نظر اس کے کہ خدا کا کلام ہے اور اس کو انتساب ایک ذات عظیم کے ساتھ ہے۔

یہ بھی دیکھو کہ اس آفتاب کے نور نے تمہارے قلوب کو کیا روشنی بخشی ہے اور تم کو کس ضغطہ کی حالت سے نکالا ہے تمہارے اعتبار سے کیا نافع ہوا ہے ورنہ اگر اس کلام الہی کو صرف حق تعالیٰ سے ہی تعلق رہتا۔ تم سے تعلق نہ ہوتا تو تم اس سے کیسے مستفید ہوتے۔ غور کرو اگر آفتاب دنیا چند روز تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہو جائے اور تم اس زمانہ میں بیمار بھی ہو۔ یا مثلاً ایک ماہ تک لگاتار بارش رہے اور گھڑی بھر کو بادل نہ ہٹے تو تمہاری کیا حالت ہوگی۔

آخر یہ اس قدر پریشانی کیوں ہے محض اس وجہ سے کہ خدا نے تم کو ایک نور دیا تھا جو برائے چندے تم سے لے لیا گیا ہے۔ اور پھر خدا کا فضل دیکھو کہ نور بھی کس چیز سے دیا جو کہ تم سے لاکھوں کو دور مگر اس کی شعاعیں ہیں کہ تم کو منور کر رہی ہیں اور تم طرح طرح کے فائدے اس سے حاصل کر رہے ہو۔ اور اگر شعاعیں نہ ہوتیں تو گو نور آفتاب کے ساتھ پھر بھی تعلق ہوتا۔ مگر چونکہ تم تک نہ پہنچتا۔ اس لئے تم اس کے فیض سے محروم رہتے۔ اسی طرح کلام اللہ صفت قدیم ہے کہ وہ مثل آفتاب کے ہے اور اس کے لئے کچھ شعاعیں ہیں جو تم پر فائض ہو رہی ہیں جن کو کلام لفظی کہا جاتا ہے۔

صاحبو! اگر آفتاب ہوتا اور یہ شعاعیں نہ ہوتیں تو ہم اسکے فیض سے کس طرح فیض یاب ہوتے۔ علیٰ ہذا کلام نفسی کیلئے کلام لفظی کی شعاعیں نہ ہوتیں تو اس صفت کی فیضان سے کس طرح فیض حاصل کرتے اور چونکہ کلام اللہ کو خدا تعالیٰ کے ساتھ یہ خاص تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ کلام مجید کی تلاوت سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ خواہ سمجھ کر پڑھا جائے یا بے سمجھے پڑھا جائے برخلاف دوسرے اعمال لسانیہ مثل دعا و ذکر کے کہ اگر ان کو بے سمجھے کر دو تو اس درجہ معتد بہ محبوب نہیں مگر قرآن ہر طرح مقبول ہے۔

چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ کی حکایت ہے کہ انہوں نے حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ آپ کے قرب کا سب سے بڑا ذریعہ کیا ہے۔ ارشاد ہوا قرأت قرآن یعنی قرآن پڑھنا۔ امام صاحب نے عرض کیا بفہم او بلا فہم یعنی سمجھ کر یا بلا سمجھے۔ ارشاد ہوا بفہم او بلا فہم یعنی کسی طرح ہو۔ اور کچھ مدار اس کا خواب ہی پر نہیں بلکہ حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ ہر حرف پر دس دس نیکیاں ملتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ حروف صرف الفاظ ہیں۔ ان کی تلاوت بلا فہم پر بھی تلاوت صادق آتا ہے۔ معلوم ہوا کہ بلا فہم بھی قبول تام ہے گو فہم پر اتم ہوتا ہے۔

اس تقریر سے آج کل کے روشن خیالوں کی غلطی بھی ظاہر ہو گئی ہوگی۔ اکثر حضرات یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ جب کلام اللہ کو سمجھا نہیں جاتا تو اس کے پڑھنے سے کیا فائدہ سو! ان کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ کلام مجید کا بے سمجھے پڑھنا بھی پورا فائدہ رکھتا ہے کیونکہ تلاوت قرآن میں صرف ایک یہی فائدہ نہیں کہ ہم اس کے معنی کو سمجھیں بلکہ ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے پڑھنے سے ہم سے خدا تعالیٰ راضی ہوں جیسا بیان ہوا۔

حال و قال کا فرق

یہ بات عقل اور عادات کے موافق بھی ہے۔ دیکھو قاعدہ ہے کہ اگر مصنف کسی کو اپنی کوئی کتاب پڑھتے دیکھے تو اگرچہ اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شخص بے سمجھے پڑھ رہا ہے لیکن محض اس وجہ سے کہ اس نے ہمارے کلام پر توجہ کی اور اس کی قدر کی۔ مصنف کو پڑھنے والے سے ضرور محبت ہو جائے گی اور دل میں اس کی قدر ہوگی۔

حضرت مرشدنا حاجی امداد اللہ صاحب فرماتے تھے کہ میں ایک بار دہلی بازار میں جاتا تھا۔ ایک دکان پر ایک مجمع دیکھا کہ اس کے درمیان میں ایک شخص رسالہ دردنامہ غمناک نہایت شوق سے پڑھ

رہا تھا۔ کوئی عاشق مزاج معلوم ہوتا تھا۔ حضرت صاحبؒ بھی اس مجمع میں کھڑے سن رہے تھے اور طبعاً خوش ہو رہے تھے کہ میرا کلام پڑھ رہا ہے اس شخص کو گو خبر نہ تھی مگر مصنف پاس تھے اور خوش تھے۔ اسی طرح ایک بار پانی پت تشریف لے جاتے تھے۔ راہ میں ایک شخص کو دیکھا کہ وہ یہ رسالہ پڑھتا جاتا تھا۔ اور یہ رسالہ درد نامہ غمناک اگرچہ شاعری کے اعتبار سے اعلیٰ پایہ کا رسالہ نہیں ہے لیکن چونکہ درد دل سے نکلا ہے اس لئے نہایت اثر رکھتا ہے واقعی ازدل خیز درد دل ریز۔ غالب کے زمانہ کا واقعہ مشہور ہے کہ آشفۃ کے اس شعر پر۔

حال آشفۃ چہ دانی بے خبر ☆ در خیال زلف عنبر بوئے تو
(بے خبر شخص آشفۃ کے حال کو کیا جان سکتا ہے وہ تو عنبر جیسی خوشبو والی زلف کے خیال میں مست ہے)
آشفۃ کے استاد نے جب یہ اصلاح دی۔

حال آشفۃ پریشان تر شدہ ☆ در خیال زلف عنبر بوئے تو
(تیری عنبر جیسی خوشبو والی زلف کے خیال میں پریشان شخص کی حالت اور بہت زیادہ پریشان ہو گئی ہے)

غالب کو دونوں شعر پہنچے تو سن کر کہنے لگا کہ استاد صاحب قال ہے اور شاگرد صاحب حال ہے۔ واقعی جب دل سے کوئی کلام نکلتا ہے اور دل میں درد ہوتا ہے تو پھس پھسا کلام بھی وہ مزادے جاتا ہے کہ ہزار چست بندشیں وہ مزا نہیں دیتیں۔ مولانا روم اپنے اس شعر میں اسی درد دل اور استغراق کو ظاہر فرما کر قافیہ وغیرہ پر اعتراض کر نیوالوں سے عذر فرما رہے ہیں۔

قافیہ اندیشم و دل دار من ☆ گویدم مندیش جز دیدار من
(میں شعر کے لئے قافیہ سوچنے لگتا ہوں تو میرا معشوق مجھ سے کہتا ہے کہ تو سوائے میرے دیدار کے کسی اور چیز کی طرف خیال مت کر)

جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر مجھ سے کسی مقام پر شاعرانہ فروگزاشت ہو گئی تو وہ قابل گرفت نہیں ہے کیونکہ شاعرانہ نکات پر نظر رکھنا توجہ الی الشعر پر موقوف ہے اور یہاں دیدار یار سے اتنی فرصت کہاں کہ ان فضول دھندوں میں وقت ضائع کریں۔

نسبت انعکاسی

صاحبو! اس تقریر میں غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ

والتسلیم کو ملکہ شاعری نہ دینے کی ایک یہ بھی وجہ تھی۔ بھلا غیرت خداوندی کیوں کر جائز رکھتے کہ ان کا محبوب و محبت اس کی طرف سے التفات ہٹا کر دوسری چیز پر مملکت ہو۔

یہی بھید ہے کہ اکثر محققین صوفیائے مریدوں پر متعارف توجہ دینے کے طریق کو بالکل ترک فرما دیا۔ وجہ یہی ہے کہ اس طریق توجہ میں مریدوں کے اندر کسی کیفیت کے القاء کے لئے اس قدر استغراق کرنا شرط تصرف ہے کہ بجز اس مقید القاء کے کسی طرف التفات نہ ہو اور تمام تر خیالات سے بالکل خالی ہو جائے۔ حتیٰ کہ واقعی اس وقت حق تعالیٰ کی طرف بھی توجہ کم ہو جاتی ہے۔ سو اس قدر توجہ مستغرق خاص اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ ان کو غیرت آتی ہے اور ان پر سخت گراں گزرتا ہے کہ یہ شخص خدا سے بالکل غائب ہو جائے۔

فرمایا کہ ایک ضرر شیخ کو توجہ متعارف میں یہ ہوتا ہے کہ اپنے تصرفات دیکھ کر چند روز میں عجب پیدا ہو جاتا ہے۔

دوسرا یہ ضرر ہوتا ہے کہ اس متعارف طریق توجہ سے شہرت ہو جاتی ہے۔ اور جس شہرت کے اسباب مقدور الترتک ہوں وہ اکثر مضر ہوتی ہے۔

تیسرا یہ ضرر ہوتا ہے کہ شیخ اگر ضعیف القوی ہو تو بیمار پڑ جاتا ہے۔

یہ تین ضرر شیخ کو ہوتے ہیں اور مرید کو یہ ضرر ہوتا ہے کہ وہ شیخ پر اتکا کر لیتا ہے اور خود کچھ نہیں کرتا۔ اس لئے اس کی نسبت محض انعکاسی ہوتی ہے اکتسابی نہیں ہوتی اور نسبت انعکاسی کو قیام نہیں ہوتا۔ اگر کسی کو شبہ ہو کہ یہ توجہ تو خود حدیث سے ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت جبریل علیہ السلام کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ غطنی فبلغ منی الجہد سو اس کے دو جواب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس غط کو توجہ کہنا محض بے دلیل ہے اس کا حاصل صرف الصاق بالصدر مع شدت ہے نہ کہ توجہ متعارف اور اگر تسلیم بھی کیا جائے تو ممکن ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام کو بوجہ قوت ملکی توجہ میں اس قدر استغراق کی ضرورت نہ ہوئی ہو جو توجہ الی الحق کو مانع ہو۔ وذاک لایضر (اور یہ مضر نہیں)

اگر کہا جائے کہ ممکن ہے کہ منفعل کی تفاوت استعداد سے کسی وقت کمال استغراق کی ضرورت نہ ہو۔ تو جواب یہ ہے کہ فاعل کو ہر صورت میں کمال استغراق کی ضرورت ہوگی البتہ تفاوت استعداد سے منفعل میں فرق ہوگا کہ تام الاستعداد بسہولت اور جلد متاثر ہوگا اور ناقص الاستعداد بدیر متاثر ہوگا۔

فیض رسائی کی صورتیں

ہاں دو صورتیں فیض رسائی کی اور ہیں۔ ایک تو ان کے اختیار سے بھی خارج ہے وہ یہ کہ ان کی ذات بابرکات کے فیوض برکات سے کہ ان کو اس طرف التفات بھی نہیں عالم مستفیض ہوتا ہے جس طرح بارش کہ اس کے برسنے پر قابل حصہ زمین میں قوت نمود پیدا ہو ہی جاتی ہے خواہ بارش چاہے یا نہ چاہے۔ یا آفتاب کہ اس کے طلوع کے وقت جو چیز اس کے مقابل ہوگی ضرور منور ہوگی دوسری اختیاری ہے جیسے مریدین کے لئے دعا کرنا ان کی حال کی نگرانی کرنا شفقت سے نصیحت کرنا اس کو بھی توجہ بالمعنی اللغوی کہا جاتا ہے مگر اصطلاحی توجہ بمعنی تصرف نہیں۔ سو اس کا کچھ مضائقہ نہیں بلکہ مسنون ہے کیونکہ طریق توجہ کے ترک کا سبب محض یہ تھا کہ اس میں ذات باری تعالیٰ سے غیبت ہے اور چونکہ اس دوسرے طریق میں ترک التفات الی اللہ نہیں۔ بلکہ زیادت التفات الی اللہ ہے اس لئے یہ مذموم نہیں بلکہ مطلوب ہے اور گو اس وقت توجہ الی الخلق بھی ہوتی ہے مگر وہ توجہ صارف عن التوجہ الی الخلق نہیں ہے۔ بلکہ دعا کی تو حقیقت ہی توجہ الی الخالق ہے گو نفع سببی اور یہ نفع بھی خاص مرضی حق ہے اور نگرانی و نصیحت و تعلم وغیرہ میں بھی اعتدال توجہ الی الخلق غیر مانع عن الحق ہے اور وہ بھی باذن الخالق ہے تو ہے انہماک فی الخلق وغیب عن الحق نہیں ہے۔

حاصل یہ ہے کہ توجہ کی قسمیں ہیں ایک وہ کہ جس میں خدا تعالیٰ سے غیبت ہے دوسرے وہ کہ اس میں احداث التفات الی الخلق ہو۔ پہلی قسم کملا کے ہاں متروک ہے دوسری قسم مطلوب و محمود ہے۔ البتہ پہلی قسم کی توجہ سے اگر اپنے تصرف اور بزرگی کا اظہار مقصود نہ ہو بلکہ محض افادہ خلق مقصود ہو تو وہ جائز ضرور ہے۔ گو کملاء نے اس کو ایک باریک وجہ سے چھوڑ دیا۔ اور اگر اس سے اپنے تصرف کا اظہار یا زیادت جاہ مقصود ہو تو مذموم ہے۔ پس اس کا وہی مرتبہ ہے جو غلام پہلوان اور رنجیت سنگھ کی کشتی کا۔ جس درجہ میں یہ کشتی محمود و مذموم ہے بالکل اسی وجہ میں یہ توجہ بھی ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ توجہ مروج فی نفسہ کوئی مطلوب و محبوب چیز نہیں ہے لیکن اگر اس کی غایت محمود ہو تو اس میں بالعرض مطلوبیت کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ جس طرح ورزش! کہ اگر اس سے غرض محض اظہار قوت و صولت ہے تو لغو ہے اور اگر اعانت مخلوق اس کی غرض ہے تو محمود ہے پس یہ توجہ ایک مرتبہ میں تو طاعت ہے لیکن اس سے زیادہ درجہ میں وہ توجہ ہے جو کہ انبیاء اپنے اصحاب اور امت پر فرماتے تھے۔ یہی انبیاء کا طریق توجہ ہے جس کا کالمیلین نے اختیار کیا ہے کہ اس میں وہ

خطرہ نہیں ہے جو کہ مروج طریق میں ہے اور وہ توجہ ہے خلق کی طرف جو کہ سالک کے لئے نہایت مضر ہے۔ حتیٰ کہ ابتداء میں مطلق افادہ کے ارادہ سے بھی توجہ کرنا مضر ہوا ہے۔

منصب ہدایت

ایک بزرگ کی حکایت مشہور ہے کہ اپنے ایک مرید کو مدت تک ذکر و شغل بتلاتے رہے اور اس میں تغیر و تبدل بھی کرتے رہے لیکن مرید کو کچھ نفع نہ ہوا۔ آخر مدت کے بعد اس سے یہ پوچھا کہ تم یہ ذکر و شغل کس نیت سے کرتے ہو اس نے کہا کہ حضرت یہی نیت ہے اگر کسی قابل ہو جاؤں گا تو دوسروں کو نفع پہنچاؤں گا۔ شیخ نے کہا تو بہ کر دینے شرک ہے کہ ابھی سے بڑے بننے کا خیال ہے اور خلق مقصود بال نظر ہے جب اس نے اس خیال سے توبہ کی فوراً فائدہ محسوس ہوا۔ گویا افادہ کی غرض سے بھی جو کہ بظاہر محمود ہے خلق کی طرف توجہ کرنا ابتداء سلوک میں مضر ہوتا ہے۔

اس حکایت سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ شیخ کامل کبھی مایوس نہیں ہوتا نہ مرید کو مایوس کرتا ہے۔ جیسا یہ شیخ مدت تک تغیر اور تبدل کرتے رہے اور نفع نہ ہونے سے جواب نہیں دیا۔ بلکہ اسی کاوش میں رہے حتیٰ کہ مرض اور اس کا علاج نکال ہی لیا۔ وہ صیب حاذق کی طرح کسی نہ کسی نئی ادھیڑ بن میں برابر لگا ہی رہتا ہے برخلاف ظاہری اور ناقص پیروں کے وہ ایسے موقع پر گھبرا جاتے ہیں اور دوسرے کو بھی مایوس کر دیتے ہیں اسی پر حافظ شیرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ۔
بندہ پیر خرا با تم کہ لطفش دائم ست ☆ زانکہ لطف شیخ وزاہد گاہ ہست و گاہ نیست
(میں میکدہ کے مالک کا غلام ہوں کہ اسکی ہمیشہ مہربانی رہتی ہے جبکہ ناقص شیخ اور پابندی

شریعت زاہد خشک کی مہربانی کبھی کبھی رہتی ہے)

مصرع ثانی میں شیخ سے مراد شیخ ناقص ہے بکلہ اگر کشف سے بھی کسی کی شقاوت ظاہر ہو جائے تب بھی مایوس نہیں ہوتے بلکہ دعا تبدیل بالسعادۃ کی کرتے ہو۔ البتہ اگر کسی نبی کو وحی سے کسی کا ختم علی الکفر معلوم ہو جائے تو اس وقت مایوس ہونا وہ خدا ہی کے حکم سے ہے۔

نیز اسی حکایت سے یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ ہر شخص منصب ہدایت کی لیاقت نہیں رکھتا۔ بہت سے نام کے ایسے ہادی ہیں کہ جن کی غرض ہدایت سے محض طلب جاہ ہے اسی لئے حدیث میں ارشاد ہے۔ لا یقص الا امیر او مامور او مختار۔^۱

۱۔ مسند احمد ۲/۱۸۳:۴، ۲۳۳:۶، ۲۳:۲۷، ۲۹، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۳۱، ۲۳۰، کنز العمال: ۱۵۰۲۹

یعنی وعظ کہنے کی ہمت وہی کریگا کہ یا تو خود امیر المومنین ہے یا امیر المومنین کی طرف سے مامور ہے یا متکبر اور نفس پرور ہے۔

اس لئے کہ جب ہدایت عامہ کا کام امیر المومنین کی ذمہ داری میں ہے تو اس کو وہ خود کریگا یا خود نہ کریگا تو کسی کو اس خدمت پر مامور کریگا۔ پس جو شخص نہ یہ ہے نہ وہ ہے اور پھر بھی ایسا کرتا ہے تو معلوم ہوا کہ آپ بھی خواہ مخواہ اپنے کو پانچوں سواروں میں گنتے ہیں۔

لیکن اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب بغیر امیر یا مامور ہوئے وعظ کہنا محال ہونے کی علامت ہے تو آج کل کے تمام وعاظ میں سے تو ایک شخص بھی امیر یا مامور نہیں تو یہ کیا یہ سب کے سب تیسری شق میں داخل ہیں۔

جواب یہ ہے کہ فقہ کا یہ مسئلہ ہے کہ جس جگہ حاکم نہ ہو وہاں اگر متقی پرہیزگار راہل الرائے مسلمان کسی ایک شخص کو کوئی منصب دیدیں تو وہ سب مل کر امیر کے قائم مقام سمجھے جائیں گے اور ان کا اعطا امیر ہی کا اعطا ہوگا کیونکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اعطاء مناصب کا اختیار جو امام کو ہے وہ بھی درحقیقت اہل اسلام ہی کو ہے اور امام بحیثیت ان کا نائب ہونے کے ان کا کام کرتا ہے کیونکہ امام کا امام ہونا تو خود اہل اسلام کے اتفاق پر ہے پس اگر وہ موجود نہ ہو تو خود ان کا فعل جائز ضرور ہوگا۔

جیسے جمعہ کی نماز کے لئے انتخاب امام کا کہ اگر امیر موجود نہ ہو اور مسلمان مل کر کسی کو منتخب کر لیں تو وہ امام صحیح ہو جاتا ہے یا ناظر وقف کو امام کی عدم موجودگی میں اہل اسلام کے انتخاب سے کسی خاص شخص کو عہدہ نظارت وقف دیا جاسکتا ہے۔ پس جب دیندار فہیم مسلمانوں نے مل کر ایک شخص کو وعظ و نصیحت کے لئے انتخاب کر لیا ہو خواہ قولاً یا حالاً تو ایسے شخص کو وعظ کہنا جائز ہے۔ باقی بدوں اہل دیں اور اہل عقل کے انتخاب کے جو لوگ اس کام کو کر رہے ہیں اور اہل نہیں ہیں تو وہ وعظ کے رنگ میں گمراہی پھیلا رہے ہیں۔ ضروری مسائل تک سے ان کو واقفیت نہیں ہوتی اور وعظ کہنے کی جرأت کر بیٹھتے ہیں۔

سہارنپور میں ایک جاہل دیہاتی نے آکر وعظ کہا۔ انداز یہ کہ آپ نے قبل از نماز پوچھا کہ یہاں آواج (وعظ) تو نہیں ہوتی۔ معلوم ہوا کہ نہیں۔ پس نماز کے بعد پکار مارا کہ ساہو! (صاحبو!) آواج ہوگی۔ سنتیں پڑھ کر وعظ کہنے بیٹھے۔ اعوذ بسم اللہ غلط سلسلہ پڑھ کر بیٹھیں کی تلاوت شروع کی۔ آیتیں الٹی سیدھی پڑھ کر ترجمہ شروع کیا۔ خوبصورت ہوا اے محمد! اے محمد! اے محمد!

اگر تجھ کو پیدائے کرتا نہ زمین پیدا کرتا نہ آسمان نہ عرش نہ کرسی وغیرہ وغیرہ۔ پھر فرماتے ہیں بھائیو! تھکے ماندہ ہیں۔ اس واسطے آدھی آواج اب ہوئی آدھی پھر ہوگی۔ کوئی نابینا ذی علم اس مجلس میں موجود تھے انہوں نے واعظ صاحب کو اپنے پاس بلا کر بٹھلایا اور پوچھا کہ آپ کی تحصیل کہاں تک ہے؟ فرماتے ہیں کہ ہماری تحصیل (تحصیل) ہے ہارپڑ۔ بس ایسے واعظ رہ گئے ہیں۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ گولغو ہیں اور اپنی اور دوسروں کی تضييع اوقات کرتے ہیں مگر پھر بھی ان بیچاروں سے اس قدر نقصان نہیں ہوتا اور اتنی گمراہی نہیں پھیلتی جتنی وہ لوگ پھیلاتے ہیں کہ آب و تاب کی تقریریں مشق کیے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے الفاظ یاد ہیں۔ صوفیاء کی اصطلاحات ازبر ہیں۔ حافظہ کا دیوان پیش نظر ہے۔ زبان ہے کہ آب رواں کی طرح بہتی چلی جاتی ہے لیکن واقفیت اور حقیقت دیکھو تو محض ہیچ! یہی لوگ ہیں کہ ان سے امت کے اکثر افراد تباہ ہوئے اور ہو رہے ہیں کسی نے خوب کہا ہے۔

حرف درویشاں بدزد و مردووں ☆ تابہ پیش جاہلاں خواند فسوں
(درویشوں کی باتیں چوروں اور کمینہ نولیوں کے سامنے ایسی ہیں جیسے جاہلوں کے سامنے
عملیات کا پڑھنا)

اہلیت ارشاد

یہی لوگ ہیں جن کو حدیث میں اومخال کے لفظ سے یاد فرمایا گیا ہے۔ غرض اس حدیث سے یہ بات صاف معلوم ہوگئی کہ وعظ طاعت ہے۔ لیکن اگر اس میں نیت خراب ہو تو وہی گناہ ہو جاتا ہے صوفیاء نے اسی راز کو سمجھ کر ابتداء سلوک میں وعظ گوئی سے بالکل منع فرمایا ہے کہ قبل اصلاح نفس اس میں اغراض فاسدہ غالب ہوتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ہر شخص اہلیت ارشاد کی نہیں رکھتا۔ سوئخ ہونا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔

دیکھو! محقق شیخ کی وہ شان ہوا کرتی ہے جو اوپر کی حکایت میں مذکور ہوئی کہ کس دقیق مرض کو مرید کے سمجھ لیا جس کی نیت ذکر و شغل سے بڑا بننا اور خلق کو محظوظ نظر بنانا تھا۔ پس اس طرح توجہ اگرچہ طاعت ہو لیکن وہ کاملین کے لئے طاعت نہیں۔ کیونکہ اس میں مخلوق کی طرف کامل توجہ لازمی اور ان کے حق میں غیر اللہ کی طرف التفات کرنا سخت گناہ ہے۔

بہر چہ از دوست دامائی چہ کفر اں حرف چہ ایماں

بہر چہ از یار دور رفتی چہ زشت آں نقش و چہ زیبا
(جب تجھ کو دوست سے دور رہنا ہے تو پھر کفر و ایمان برابر
ہے جب یار سے دور پڑا پھر چاہے اچھا نقشہ ہو یا برا)

تصور شیخ

خلاصہ یہ کہ نقش توجہ اگر چہ زیبا ہو لیکن جب کہ اس نے خدا سے ہٹا دیا تو یقیناً زشت ہے۔
اسی طرح تصور شیخ کا شغل بھی محققین نے اکثروں کو بتلانا بالکل ترک کر دیا ہے۔ سبب یہی ہے کہ
تصور شیخ میں مرید کی پوری توجہ شیخ کی طرف ہوتی ہے۔ ذات باری کی طرف بالکل التفات نہیں
ہوتا اور یہ غیبت کا ملین کے ہاں جرم ہے خوب کہا ہے۔

یک چشم زدن غافل از اں شاہ نباشی ☆ شاید کہ نگاہے کند و آگاہ نباشی
(اس بادشاہ سے ایک پلک جھپکنے کے برابر بھی غافل نہ رہنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ وہ متوجہ ہو
اور تجھے خبر نہ ہو)

ممکن ہو کہ جب وقت یہ شخص پیر کے تصور میں مصروف ہے وہی وقت ادھر کی طرف کی توجہ
کے نافع ہونے کا ہو۔ اسی کے جرم ہونے کو کہا گیا ہے۔

ہر آں کو غافل از حق یک زماں ست ☆ در آں دم کافر است اما نہاں ست
(جو تھوڑی دیر کے لئے ہی حق تعالیٰ سے غافل ہے اتنی دیر کے لئے کافر ہے اگرچہ ظاہر نہیں ہے)
کفر سے مراد فقہی کفر نہیں اصطلاحی کفر ہے اسی لئے اس سے کا ملین کی طبیعت اچھلتی ہے
اور ان کو سخت وحشت ہوتی ہے۔ اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے اوجھڑی کہ اس کو حلال
تو ضرور کہیں گے اگر غلاظت سے صاف ہو لیکن ایک لطیف المزاج آدمی سے پوچھو کہ اس کے
خیال سے بھی وحشت ہوتی ہے۔

اور صابو! اصل تو یہ ہے کہ جب ایک دل میں دو خیال نہیں آسکتے۔ ایک نیام میں
دو تلواریں نہیں رہ سکتیں پھر کیوں کر کہا جائے کہ جو توجہ کہ اس میں خدا تعالیٰ کا خیال ضعیف اور مخلوق
کا خیال غالب ہو۔ پھر اس کو قصد پیدا کیا جائے، وہ مطلوب ہوگی۔

حضرت ابراہیم ادھمؒ کا واقعہ مشہور ہے کہ جب بیٹے سے جوش محمد کے نام سے مشہور ہیں
ملے اور مسرت کا جوش غالب ہوا تو ندا آئی کہ۔

حب حق ہودل میں یا حب پسر ☆ جمع ان دونوں کو تو ہرگز نہ کر
آخر وہ حجاب بھی مرتفع ہو گیا اور ان کا انتقال ہو گیا۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بیٹے سے بالکل ہی محبت نہ کرے جس قدر اس کا حق شرعی
ہے وہ جب حق پر غالب نہ ہو عین سنت ہے۔ پس شیخ سے بھی ایسی محبت نہ ہونی چاہیے جو کہ خدا
کو بالکل بھلا دے جیسا کہ آجکل جاہل فرقوں میں متعارف ہے۔ اسی طرح بیوی بچوں سے وہ
محبت نہ ہو کہ خدا تعالیٰ کی طرف توجہ نہ رہے۔

لا تلہکم اموالکم ولا اولادکم عن ذکر اللہ

(تم کو تمہارے مال اور اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پائیں)

الطاف خداوندی کے قربان جائیے یہ حکم نہیں فرمایا کہ اولاد سے بالکل محبت نہ کرو کیونکہ
جانتے ہیں کہ محبت اولاد طبعی ہے۔ امتثال ہونہ سکے گا اس لئے یوں فرماتے ہیں کہ اس قدر ان کے
درپے نہ ہو کہ خدا کو بھول ہی جاؤ۔

ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ پیدا ہو تو اس قدر مذموم ٹھہری اور جو غرض توجہ کی ہے وہ ضروری۔ پس اگر
توجہ ترک کریں تو امر ضروری کا ترک لازم آتا ہے اور توجہ اختیار کریں تو امر مذموم کا اختیار لازم آتا ہے
سو اس کا جواب یہ ہے کہ توجہ سے جو غرض ہے اس کا حصول توجہ ہی میں منحصر نہیں۔ کیونکہ اگر اس
کا حصول اسی میں منحصر ہوتا تو انبیاء علیہم السلام اسی طریق کو اختیار فرماتے۔ جب انہوں نے ایسا
نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ اسی طریق میں اس کا انحصار نہیں ہے بلکہ دوسرا طریق بھی موجود ہے یعنی
تعلیم و ارشاد شفقت و دعا اور یہ طریق ایسا ہے کہ جس میں نہ کوئی خطرہ ہے نہ کوئی اندیشہ۔
بات کہیں کی کہیں جا پڑی جو رسالہ درد نامہ غمناک کی نوعیت شعر یہ کے سلسلہ میں بڑھ گئی۔

ثواب قرأت قرآن

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر مصنف کے سامنے اس کے کلام کو بے سمجھے بھی کوئی شخص محبت اور
ذوق و شوق سے پڑھے تو اس کو اچھا معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ
مرقدہ نے اس شخص کو رسالہ درد نامہ غمناک پڑھتے سنا تو آپ بہت خوش ہوئے اسی طرح کلام
خداوندی کو جب ہم پڑھیں گے تو خدا تعالیٰ سنیں گے کیونکہ خدا سے تو کوئی چیز غائب ہی نہیں۔

ما یکون من نجوی ثلثة الا هو رابعهم ولا خمسة الا هو سادسهم

(کوئی سرگوشی تین آدمیوں کی ایسی نہیں ہوتی جس میں چوتھا وہ (یعنی اللہ) نہ ہو اور نہ پانچ کی (سرگوشی) ہوتی ہے جس میں چھٹا وہ نہ ہو)

اور ماتکون فی شان وما تفلوا منه من قرآن ولا تعملون من عمل الا
کنا علیکم شهودا اذ تفیضون فیہ اور ما یعزب عن ربک من مثقال
ذرة فی الارض ولا فی السماء الخ

(اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم خواہ کسی حال میں ہوں اور منجملہ ان احوال کے آپ کہیں سے
قرآن پڑھتے ہوں اور اسی طرح اور (لوگ بھی جتنے ہوں) تم جو کام کرتے ہو ہم کو سب
خبر رہتی ہے جب تم اس کام کو کرنا شروع کرتے ہو اور آپ کے رب کے علم سے کوئی چیز
ذرا برابر بھی غائب نہیں نہ زمین میں اور نہ آسمان میں)

کہ خدا سے کوئی چیز بھی آسمان اور زمین کی اوجھل نہیں ہو سکتی۔ تو خدا تعالیٰ ضرور خوش ہوں گے
اور متوجہ ہوں گے۔ حدیث میں ہے کہ خدا تعالیٰ کسی طاعت پر اتنا متوجہ نہیں ہوتے جتنا قرأت قرآن
پر متوجہ ہوتے ہیں۔ شاید کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ اس وقت سب لوگ سمجھ کر ہی پڑھتے تھے اس لیے اس
وقت کی حالت پر یہ ارشاد ہوا ہے اس سے نہیں معلوم ہوتا کہ اگر بے سمجھے پڑھے تب بھی توجہ ہوگی۔
سو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن شریف صرف عرب ہی کے لئے نہیں نازل کیا گیا۔ اور ساری
دنیا کی زبان عربی ہی نہیں اور حدیث بشارت میں عرب کی تخصیص نہیں فرمائی گئی۔ اس کے علاوہ
حدیث میں موجود ہے کہ ایک مرتبہ سات آٹھ آدمی تلاوت قرآن شریف کر رہے تھے۔ ان میں کچھ
عربی تھے اور کچھ عجمی تھے۔ جن سے اچھی طرح پڑھتے بھی نہ بنتا تھا۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ
وسلم تشریف لائے اور سن کر ارشاد فرمایا کہ اقرؤا فکل حسن۔ معلوم ہوا کہ کچھ لوگ پورے طور پر
قادر نہ تھے۔ پس جب حضورؐ نے سب کو حسن فرمایا تو معلوم ہوا کہ حسن ہونے کے لئے بالکل عرب
کے موافق ہو جانا ضرور نہیں بلکہ کچھ کوتاہی بھی رہے جب بھی فضیلت حاصل ہے اور لفظی اور معنوی
کوتاہی میں کوئی معتد بہ تفاوت نہیں۔ یہ تو حدیث تھی اور لیجئے کشف سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔
چنانچہ احمد بن حنبلؒ کی حکایت پہلے مذکور ہوئی کہ انہوں نے حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا
اور عرض کیا کہ سب سے زیادہ کون سی طاعت سے آپ خوش ہوتے ہیں۔ وہاں سے ارشاد ہوا کہ
قرآن پڑھنے سے۔

امام احمدؒ نے پوچھا کہ سمجھ کر پڑھنے سے یا بلا سمجھے بھی ارشاد ہوا لفہم او بغیر فہم۔ پس معلوم ہوا کہ قرآن شریف خواہ کسی طرح پڑھا جائے۔ وہ ضرور مفید ہے خواہ سمجھ کر ہو یا بلا سمجھے ہو اور اس کے پڑھنے سے خدا ہم سے ضرور خوش ہو نکلے یعنی ہم کو ثواب و انعام و اکرام ہوگا۔ کیونکہ خدا کی خوشی کے یہ معنی نہیں جو ہماری تمہاری خوشی کے معنی ہیں کہ ایک بات جی کے موافق ہوئی طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ جس کی حقیقت انفعال ہے۔ خداوند جل و علا طبیعت اور انفعال سے بالکل پاک ہے اس پر صفات کا اطلاق غایات کے اعتبار صحت سے ہوتا ہے۔ مبادی کے اعتبار سے نہیں ہوتا۔

بہر حال قرآن کی تلاوت میں آپ نے سنا کہ کیا اجر عظیم ہے۔ افسوس ہے کہ اس اجر عظیم کو چھوڑ کر ہوا ہوس کے بندوں نے کلام اللہ کو جو کہ رضائے خداوندی کا ذریعہ تھا۔ دنیا طلبی کا ذریعہ بنا لیا ہے کہ روپیہ لیکر اور مقرر کر کے قرآن سناتے ہیں۔ یہ صریح دین فروشی ہے۔

اجرت تعلیم

لیکن تعلیم قرآن کو اس پر قیاس نہ کیا جائے کیونکہ تعلیم قرآن پر تنخواہ لینا جائز ہے۔ اور اس جواز کے حنفیہ کے ہاں دو طریق ہیں۔ ایک تو یہ کہ امام شافعیؒ نے جائز کہا ہے۔ اور حنفیہ نے بوجہ ضرورت کے اس پر فتویٰ دیا ہے۔ لیکن یہ طریق بالکل کمزور ہے۔ ہم کو کیا ضرورت ہے کہ ابو حنفیہؒ کی تقلید کا التزام کر کے بلا وجہ امام شافعیؒ کے مذہب پر عمل کریں۔

دوسرا طریق یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ خود حنفیہ کا قاعدہ ہے کہ محبوس کا نفقہ من لہ المجلس پر ہوتا ہے۔ پس جب یہ شخص خدمت دین میں محبوس ہے اس کا نفقہ تمام اہل اسلام پر واجب ہے۔ اسی طرح جو شخص کسی قسم کی خدمت دیدیہ میں مشغول ہو سب کا یہی حکم ہے بعض مسلمانوں کا دے دینا بطور فرض کفایہ کے سبکو سبکدوش کر دے گا۔

رہا یہ شبہ کہ اگر یہ بحیثیت نفقہ کے دیا جاتا ہے تو تنخواہیں کیوں مقرر کی جاتی ہیں۔ کیونکہ نفقہ بقدر کفایت ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فی نقبہ تو یہی حکم ہے مگر اس میں ہمیشہ جھگڑے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ عامل کہتا ہے کہ اب کے مہینہ میں میرے پچاس روپے خرچ ہوئے۔ دوسرے کہتے کہ بیس ہی ہوئے۔ جب روزانہ جھگڑے رہا کرتے تو سلسلہ تعلیم چند روز میں درہم برہم ہو جاتا۔ اس عارض کے لئے انتظاما تعین کی بھی اجازت ہوگی۔ جیسا کہ آب کے طاہر رہنے کے لئے اصل

میں کثیر ہونا شرط ہے۔ لیکن نظم عوام کے لئے اس کی وہ دردہ کے ساتھ تقلید کر دی گئی۔ یہ تقریر بالکل اصول حنفیہ کے موافق ہے۔

البتہ یہ تقریر ہر معلم کے لئے نہ چل سکے گی۔ بلکہ وہاں ہی چلے گی جو اپنے کو خادم دین سمجھ کر کام کر رہے ہیں۔ اس کا معیار یہ ہے کہ اگر موجودہ تنخواہ میں کام چل رہا ہو اور دفعۃً ترقی کی خبر آئے اور بجز ترقی کے اور کوئی مصلحت تعلق سابق کے قطع کرنے کی نہ ہو۔ پس اگر وہ شخص تعلق ترک کر کے چلا جائے تب تو سمجھنا چاہیے کہ طلب دنیا اس شخص کا اصلی مقصود ہے اور اگر ترک تعلق نہ کرے تو سمجھنا چاہیے کہ مقصود اصلی خلق اللہ کو دینی نفع پہنچانا ہے۔ معاوضہ اصل مذکور پر لیتا ہے ایک کے لئے جزاء جس نہ ہوگا اور ایک کے لئے جزاء جس سمجھا جائے گا۔ غرض اجرت تعلیم اس عدم جواز میں داخل نہیں۔

اجرت امامت

البتہ تراویح میں قرآن سنانے کا جو مروج قاعدہ اکثر مقام پر ہے وہ اس میں ضرور داخل ہوگا۔ حافظ رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ نے خوب فرمایا ہے ۔

دام تزویر یکن چوں دگر اس قرآن را

اور اسی طرح مردوں پر قرآن پڑھ کر دام لینے کا حال ہے کہ قرآن فروشی ہے اور ان کا قیاس تعلیم پر اسلئے نہیں ہو سکتا کہ تعلیم شعائر میں سے ہے اس خدمت کیلئے محبوس ہونا موجب جزاء ہے اور تراویح کا ختم اور ایصال ثواب یہ شعائر سے نہیں اگرچہ طاعت ہے۔ البتہ خود تراویح یا پنجگانہ نماز کی باجماعت یہ شعائر سے ہے اس کے لئے اگر مفت کا امام نہ ملے تو اجرت ٹھہرانا درست ہے۔

اس تمام تقریر سے قرآن شریف کا مشرف و معظم ہونا ثابت ہو گیا۔ پس جب ایسی معظم چیز رمضان میں نازل ہوگی تو رمضان شریف کیوں معظم و مشرف نہ ہوگا۔ قرآن کی تعریف میں ایک بزرگ فرماتے ہیں ۔

چیت قرآن اے کلام حق شناس ☆ رونمائے رب ناس آمد بہ ناس

حرف حرف راست در بر معنی ☆ معنی در معنی در معنی

(اے حق بات کے سمجھنے والے تو سمجھتا بھی ہے کہ قرآن کیا چیز ہے انسانوں کے پاس

انسانوں کے رب کی شان دکھانے والا ہے)

دیدار خداوندی

رونما اس واسطے کہ خدائے تعالیٰ کو دنیا میں بلا واسطہ تو دیکھ نہیں سکتے۔ پس کلام اللہ کو پڑھنا

گویا دیدار خداوندی سے محفوظ ہونا ہے۔

اس موقع پر ایک حکایت یاد آئی۔ اس سے اس کی پوری حقیقت ظاہر ہوگی ایک مرتبہ ایران کے بادشاہ کے خیال میں اتفاقاً ایک مصرع یاد آ گیا۔

دراہلق کے کم دیدہ موجود (دُراہلق کسی نے بہت ہی کم دیکھا ہوگا)

مصرع کہہ کر بڑی خوشی ہوئی۔ لیکن دوسرا مصرع تیار نہ کر سکے۔ شعراء کو جمع کیا اور مصرع لگانے کی فرمائش کی۔ کسی سے مصرع نہ لگ سکا کیونکہ ایک مہمل مضمون ہے آخر سب کو زنداں کی دھمکی دی۔ ان لوگوں نے پریشان ہو کر ہندوستان میں عالمگیر کے پاس خط لکھا کہ تمہارے یہاں بڑے بڑے شاعر ہیں کسی سے مصرع کہلا کر ہماری جان بچاؤ۔ چنانچہ شعراء کو وہ مصرع دیا گیا۔ لیکن مضمون ایسا بے تکا تھا کہ کسی کی کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا۔ شدہ شدہ زیب النساء متخلص بہ مخفی کو بھی اس کی خبر پہنچی اس نے بھی غور کیا لیکن مصرع نہ لگ سکا۔

اتفاقاً ایک روز مسند پر بیٹھی آنکھوں میں سرمہ ڈال رہی تھی۔ آئینہ سامنے تھا کہ سرمہ کی تیزی سے آنکھ سے ایک آنسو گرا۔ اس کی ہیئت دیکھ کر فوراً دوسرا مصرع اس کے ذہن میں آ گیا۔

مگر اشک ہوا سرمہ آلود (مگر معشوق نے جب سرمہ ڈال رکھا ہو تو سرمہ ملا ہوا آنسو)

چنانچہ عالمگیر کو خبر ہوئی اور شعر پورا کر کے ایران بھیجا گیا۔ جب بادشاہ نے مصرع سنا اس کے اور تمام شعراء کے دل میں اس شاعر کی بڑی قدر ہوئی اور شاہ ایران نے عالمگیر کو لکھا کہ اس شاعر کو ہمارے پاس بھیج دو۔ عالمگیر کو جب اس پیغام کی خبر پہنچی تو بہت زچ بیچ ہوا کہ اگر شاعر کو ظاہر کرتا ہوں تب بھی مشکل ہے اور انکار کرتا ہوں تو بھی مشکل ہے آخر اس نے زیب النساء سے کہا کہ تمہاری شاعری کا یہ نتیجہ ہوا۔ زیب النساء نے کہا کہ تم اس کے جواب میں میری طرف سے یہ لکھ دو کہ۔

درخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل ☆ ہر کہ دیدن میل دارد درخن بیند مرا

(میں اپنے کلام میں اس طرح مخفی اور پوشیدہ ہوں جس طرح پھول کی خوشبو پھول کے

پتہ میں چھپی ہوتی ہے جو شخص تجھ کو دیکھنا چاہتا ہے وہ مجھے میرے کلام ہی میں دیکھ لے)

چنانچہ یہ لکھ کر بھیج دیا گیا۔ معلوم ہوا کہ مستورات سے ہے پس اس طرح ہمارا مطلوب حقیقی جس کے دیدار کے ہم متمنی ہیں۔ بوجہ اس کے کہ ہم اس کے دیدار کی تاب نہیں لاسکتے اور ہم اس کو دیکھ نہیں سکتے گویا یہ فرما رہے ہیں کہ۔

درختن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل ☆ ہر کہ دیدن میل دارد درختن بینہ مرا
(میں اپنے کلام میں اس طرح مخفی اور پوشیدہ ہوں جس طرح پھول کی خوشبو پھول کے
پتہ میں چھپی ہوتی ہے جو شخص تجھ کو دیکھنا چاہتا ہے وہ مجھے میرے کلام ہی میں دیکھ لے)
اور وہ خن یہی کلام اللہ ہے جس کی شان یہ ہے کہ۔

معنی در معنی در معنی (معنی کے اندر معنی پھر معنی)

جس قدر زیادہ پڑھتے جاؤ اسی قدر زیادہ علوم منکشف ہوتے جائیں گے۔ چنانچہ حدیث
میں ہے لا تقفی عجانۃ اور پھر لطف یہ کہ جاہلوں کو بھی لطف آتا ہے اور عالم کو بھی مزا آتا ہے
۔ صاحب ظاہر بھی جان کھوتا ہے اور صاحب باطن بھی قربان ہوتا ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد ☆ برنگ اصحاب صورت را بوار باب معنی را
(اس کے حسن کے عالم کی بہار دل کو اور روح کو تازہ رکھتی ہے اسکی رنگت سے صورت کو پسند
کرنے والے خوش ہوتے ہیں اور اس کی خوشبو سے معنی کو پسند کر نیوالے خوش ہوتے ہیں)

حظ تلاوت قرآن

اسی حدیث میں ہے لا یخلق من کثرة الرد واقع میں مشاہدہ ہوتا ہے کہ کتنا ہی سنو جی
نہیں بھرتا نیا مزہ آتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ سارا لطف خوش آوازی کی وجہ سے ہوتا ہوگا تو ہم کہیں
گے کہ آخر وہ لطف اور وہ ربودگی جو قرآن پڑھنے سے ہوتی ہے شعر پڑھنے سے کیوں نہیں ہوتی۔
اس میں وہ مزا کیوں نہیں حاصل ہوتا۔ اور اگر کسی کو اس میں زیادہ مزا آتا ہو تو وہ ابھی قابل خطاب
ہی نہیں۔ اس کو چاہیے کہ صحت ادراک و سلامت حال پیدا کرنے کی کوشش کرے پھر موازنہ
کرے۔ صاحبو! قرآن تو قرآن ہے۔ کبھی اگر مکہ میں جا کر وہاں کی تکبیر نماز میں سنو جو ایک جزو
ہے قرآن کا تو معلوم ہو کہ کیا چیز ہے۔ سچ مچ اس وقت وہ تکبیر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ذبح کے
وقت کی تکبیر کہ دل میں چھری نکلی چلی جاتی ہے لیکن اگر کسی کو مزہ نہ آئے وہ تلاوت ترک نہ کرے
جیسا بعض لوگ کہتے ہیں کہ صاحب ہم تو اس وقت قرآن شریف پڑھیں گے کہ جب ہم کو مزہ
آنے لگے مگر یہ خیال بالکل ہی لغو ہے۔

اس کی تو ایسی مثال ہے کہ کسی شخص سے کہا جائے کہ تم مقویات کھاپی کر جلدی سے بالغ

لہلم أجد الحديث فی "موسوعة أطراف الحديث النبوی الشریف"

ہو جاؤ تا کہ تم کو سن بلوغ کے لطف حاصل ہو جائیں اور وہ جواب میں یوں کہے کہ صاحب پہلے سن بلوغ کی لذت کو میں دیکھ لوں کیسی ہوتی ہے۔ تب اس کی تدبیر کروں گا۔ فرمائیے کہ اس احمق کو کس طرح وہ لذت دکھلا دی جائے اور سو اس کے اور کیا جواب اس کو دیا جائے گا کہ جب تم بالغ ہو جاؤ گے خود تم کو معلوم ہوں گے۔ اس کے سوا کوئی تدبیر اس کے حصول کی نہیں۔

اسی طرح ان نابالغ پیروں کو یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اس لذت کے حاصل کرنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ ہمت کر کے پڑھنے لگو۔ چند روز میں جب تمہارا قلب عالم طفلی سے نکل کر سن بلوغ میں پہنچے گا خود بخود اس کو یہ لذت حاصل ہوگی البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ خاص بلوغ اس وقت حاصل ہوگا کہ تلاوت و دیگر اعمال میں ہوائے نفسانی کا دخل نہ ہو بلکہ مطلقاً اس ہوائے نفسانی کا اتباع چھوڑ دو اور اطاعت خدا و رسول میں سرگرم ہو جاؤ کہ طریقت کا بلوغ یہی ہے۔

خلق اطفالند جز مت خدا ☆ نیست بالغ جزرہیدہ ازہوا
(سوائے اس شخص کے جو قوم کی محبت میں مست ہے ساری مخلوق نابالغ ہے سوائے اس شخص کے جس نے خواہشات نفسانی کو چھوڑ دیا ہے کوئی بھی نابالغ کہلانے کا مستحق نہیں ہے)

ترغیب ذکر اللہ

بعینہ یہی غلطی اہل سلوک کو ہوتی ہے کہ وہ ابتداء میں یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو ذکر میں لذت آنے لگے اور جب لذت حاصل نہیں ہوتی تو پریشان ہوتے ہیں اور بعض اوقات ذکر کو چھوڑ دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ سخت غلطی ہے کیونکہ ذکر میں لذت آنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں کہ ذکر کی زیادتی کرے جس قدر ذکر زیادہ ہوگا قلب زیادہ منقاد ہوگا۔ دوسرے خیالات کمزور پڑیں گے۔ ذکر میں خود بخود لذت حاصل ہوگی۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ فن شاعری میں جو ملکہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک شعر سن لیا اور طبیعت تلملا گئی۔ ایک عمدہ بات کان میں پڑی کہ چہرہ کھل گیا۔ آخر یہ بات کب پیدا ہوتی ہے اور کیونکر پیدا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک مدت کے بعد اور کثرت مشق سے ہوتی ہے اور ابتداء سے ہرگز یہ حالت نہیں ہوتی۔ بلکہ اول اول تو محض مشقت ہوتی ہے۔

دیکھئے بچہ کو مکتب میں بٹھلاتے ہیں۔ سبق فارسی کا پڑھاتے ہیں مارتے ہیں پکڑ بلاتے ہیں۔ اسی طرح جب سلسلہ جاری رکھا جاتا ہے اس کو زبان دانی و سخن فہمی کا ایسا سلیقہ پیدا ہو جاتا ہے کہ کلام

لطف سن کر کیسا کچھ محفوظ ہوتا ہے۔ پس کیا کسی شخص نے محض اس وجہ سے کہ ہم کو غالب اور مومن کا سا وجد کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ شاعری کی مشق چھوڑ دی ہے یا کسی شاگرد نے اپنے استاد سے یہ فرمائش کی ہے کہ میں اس وقت شاعری کروں گا کہ جب آپ کی طرح مجھے شعر میں لطف آنے لگے گا۔ صاحبو! کیا قرآن شریف کی تلاوت اتنی بھی ضروری اور مرغوب نہیں جتنی فارسی اور شاعری کی تحصیل۔ صاحبو! جس طرح اس مثال میں ظاہری کیفیات میں ایک وقت وہ تھا کہ نہ تھیں اور اب ایک وقت وہ ہے کہ علیٰ وجہ الکمال ہیں اسی طرح باطنی کیفیات بھی گو اس وقت حاصل نہیں لیکن اگر کام کیے جاؤ گے تو ایک وہ وقت بھی ضرور آئے گا کہ سب حاصل ہو جائیں گی ارشاد ہوتا ہے۔

کذلک کنتم من قبل فمن الله علیکم۔

اندریں راہ می تراش وی خراش ☆ تادمے آخردے فارغ مباحش
تادم آخر دم آخربود ☆ کہ عنایت باتو صاحب سربود
(اس راستہ میں آخردم تک تراش و خراش (محنت و مشقت) ہے فارغ مت رہ تا کہ تیرا
آخری سانس آخر وقت تک شاید اللہ کی مہربانی سے کارآمد ہو جائے)
اس قسم کے مواقع پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ یہ پڑھا کرتے تھے۔
یابم اورایانہ یابم جستجوئے می کنم ☆ حاصل آیدیانہ آید آرزوئے می کنم
(میں اس کو پاسکوں یا نہ پاسکوں اس کی جستجو کرتا رہوں گا حاصل ہو یا نہ ہو اس کی تمنا کرتا
رہوں گا)

جو کچھ بھی ہو تم کام کئے جاؤ۔ تمہارا کام محض طلب ہے کیونکہ تمہارے اختیار میں وہی ہے۔
ثمرہ کا ملنا نہ ملنا یہ ان کا کام ہے تم اس کے درپے نہ ہو۔
فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب ☆ کہ حیف باشد ازوغیر او تمنائے
(جدائی اور ملاقات کی پرواہ نہ کر، معشوق کی خوشنودی ڈھونڈھ کہ اس سے اس کے سوائے
دوسری چیز طلب کرنا قابل افسوس ہے۔)
ایک دوسرے بزرگ اس سے بڑھ کر فرماتے ہیں۔

ارید وصالہ ویرید ہجری ☆ فاترک مارید لما یرید
(میں اس کا وصال چاہتا ہوں اور وہ میری جدائی چاہتا ہے پس میں اس کے ارادہ کو اپنے

ارادہ پر قربان کرتا ہوں اور چھوڑتا ہوں)

اور صاحبو! اگر یہ نہ کہا جائے تو کیا خدا سے بدلہ لینا ہے اگر وہ ہمارا کام نہیں کرتے تو ہم اس کا کام کیوں کریں۔ غور کریں اگر ایک مردار بازاری عورت سے تعلق ہو جاتا ہے تو قلب پر کیا کیا صدمے گزرتے ہیں۔ کس کس انداز سے وہ امتحان اور آزمائش کرتی ہے۔ کتنا موقع بموقع ستاتی ہے لیکن آتش محبت مشتعل ہی ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ اس کے امتحانات یا غمزہ دونوں سے گھبرا کر اس کو چھوڑ دیں۔ تو کیا ذات باری جل مجدہ کی محبت اور عظمت مسلمان کے دل میں اتنی بھی نہ ہو جتنی ایک بازاری عورت کی۔ حیف ہے ہم پر اور ہمارے اس اسلام پر۔

عشق مولے کہ کم از لیلے بود ☆ گوئے گشتن بہر او اولے بود
(کیا مولیٰ کا عاشق لیلیٰ سے بھی کم درجہ میں ہو سکتا ہے گلی کو چوں میں اس کے لئے گشت کرنا تو اور بھی زیادہ بہتر بات ہے)

ایک عارف کا واقعہ لکھا ہے کہ ان کو ایک روز یہ آواز آئی کہ کتنی ہی عبادت کرو کچھ قبول نہیں۔ اس آواز کو ان کے ایک مرید نے بھی سنا۔ دوسرا دن ہوا تو وہ بزرگ پھر عبادت کے لئے اٹھے پھر وہی آواز آئی۔ جب کئی مرتبہ ایسا ہوا تو مرید نے کہا کہ آپ بھی عجیب آدمی ہیں ادھر کوئی پوچھتا بھی نہیں اور آپ ہیں کہ خواہ مخواہ گرے جاتے ہیں جب قبول ہی نہیں تو محنت سے کیا فائدہ۔ ان بزرگ نے جواب میں فرمایا۔

توانی ازاں دل پروا ختن ☆ کہ دانی کہ بے او تو اں ساختن

(کہ بھائی چھوڑ تو دوں لیکن یہ تو بتلا دو کہ چھوڑ کر کس کے در پہ جا پڑوں)

کہ بھائی چھوڑ تو دوں لیکن یہ تو بتلا دو کہ چھوڑ کر کس در پر جا پڑوں۔ اس جواب پر رحمت باری کو جوش ہوا اور آواز آئی کہ۔

قبول است گرچہ ہنر نیست ☆ کہ جز ما پنا ہے دگر نیست

(اگرچہ تمہاری عبادت کسی ڈھنگ کی نہیں لیکن خیر ہمارے سوا کوئی دوسری پناہ گاہ نہیں تو

تمہاری یہ بے ڈھنگے پن کی عبادت قبول کر لی گئیں)

کہ اگرچہ تمہاری عبادت تو کسی ڈھنگ کی نہیں لیکن خیر! جب ہمارے سوا تمہارے کوئی نہیں ہے تو تم کو بھی ہم ہی لے لیں گے۔ صاحبو! طالبین کی یہ حالت ہونی چاہیے کہ۔

طلب گار باید صبور و حمول ☆ کہ نشیدہ ام کیما گر مسلول
(کسی چیز کے طلب کرنے والے کو صبر اور برداشت کرنا چاہیے میں نے کسی کیما گر کو
مایوس اور آبدیدہ ہوتے نہیں دیکھا)

طلب الہی کی ترغیب

افسوس ہے کہ طلب خدا طلب کیما کے بھی برابر نہ ہو کہ اس میں تو انسان سالہا سال
گنوا دے مال و متاع غارت کر دے چھین و آرام کو خیر باد کہہ دے اور طلب خدا میں کچھ بھی نہ
ہو سکے۔ طالب کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ ۔

بر انداز برائے دلے بارہا ☆ خورد از برائے گلے خارہا
(اپنے دل کو بار بار اس کے راستہ پر چلا پھول حاصل کرنے کے لئے تو بہت سے کاتھوں کی
تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے) اور اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ۔

خوشا وقت شورید گاں غمش ☆ اگر ریش بیند و گرم ہمیش
گدایانے از پاد شاہی نفور ☆ بامیدش اندر گدائی صبور
دمادم شراب الم درکشند ☆ اگر تلخ بیند دم درکشند
(اس کے غم میں مبتلا رہنے والوں کے لئے بہت ہی خوش نصیبی ہے چاہے کوئی زخم لگے یا
زخم کا مرہم ملے اس کے فقیر باد شاہی سے نفرت کرتے ہیں اس کی مہربانی کی امید میں
گدائی ہی پر صبر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے مشتاق عشق کے غم کی شراب پیتے رہتے ہیں
اگر کسی قسم کی تلخی بھی دیکھتے ہیں تو خاموش رہتے ہیں)

اور جو شخص صرف مرہم کا طالب ہو وہ طالب نہیں ہے۔ وہ بیچارے تو بجائے حصول کے
امید پر ہی نظر لگائے بیٹھے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کے شعر میں ہے ۔
بامیدش اندر گدائی صبور (اس کی امید پر گدائی پر بھی صبر کرنے والے ہیں)
ایک طالب کا قول ہے ۔

اگر چہ دور افتادم بایں امید خور سندم ☆ کہ شاید دست من بارد گر جانان من گیرد
(اگر چہ میں دور پڑا ہوا ہوں مگر اس امید پر خوش ہوں کہ شاید میرا معشوق پھر دوسری بار
میرا ہاتھ پکڑ لے)

طالب وہی ہے کہ اگر ہزار اس کو کہا جائے تو دوزخی ہے تو مایوس نہ ہو اور دس ہزار مرتبہ کہا جائے کہ تو جنتی ہے تو کامل اور ست نہ بنے اس کے طلب کی یہ حالت رہے۔

اے برادر! بے نہایت درگمی است ☆ ہر کہ بروے می روی بروے مایست
(اے بھائی اس کے دربار کی کوئی انتہا نہیں کہ کسی جگہ پہنچ کر کوئی یہ کہہ دے کہ میں منزل پر پہنچ چکا ہوں، اگر تو کسی منزل پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے اوپر دوسری منزل ہے)

ایک شخص کی نسبت لکھا ہے کہ اس کو روزانہ یہ آواز آتی کہ تو کافر ہو کر مرے گا جب ایک مدت تک یہ آواز آئی تو شیخ سے ذکر کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ میاں یہ دشنام محبت ہے۔ مایوس نہ ہو جانا۔ محبوبوں کی عادت ہے کہ محبت کو چھیڑا کرتے ہیں۔ خوب کہا ہے۔

بدم گفتی و خور سدم عفاک اللہ نکو گفتی ☆ جواب تلخ می زبید لب لعل شکر خارا
(تو نے مجھے برا کہا اور میں خوش ہوں اللہ تجھ کو معاف کرے تو نے ٹھیک کہا ہے، میٹھے میٹھے سرخ ہونٹوں سے کڑا جواب بھی اچھا معلوم ہوتا ہے)

اور یہ ایک قسم کا امتحان ہے لیکن یہ ساری باتیں اس وقت برداشت ہوتی ہیں کہ دل میں خدا کی محبت پوری پوری ہو۔ پس اس کی کوشش کرو اور اس طریق کے دو امر ہیں۔ ذکر کی کثرت اور اہل اللہ کی صحبت، ان کے پاس آنا جانا۔ اس سے تدریجاً ماسوائے اللہ سب تمہارے دل سے نکلنے شروع ہو جائیں گے اور یہ حالت ہوگی۔

عشق آں شعلہ است کہ چوں برفروخت ☆ ہر چہ جز معشوق باشد جملہ سوخت
(عشق آگ کا ایسا شعلہ ہے کہ جب وہ بھڑک اٹھتا ہے تو معشوق کے سوائے جو کچھ ہوتا ہے سب کو جلا دیتا ہے) اور۔

تیغ لا در قتل غیر حق براند ☆ ورنہ آخر کہ بعد لا چہ ماند
ماند الا اللہ باقی جملہ رفت ☆ مرحباے عشق شرکت سوز رفت
(لفظ لا کی تلوار سے اللہ کے سوا ہر معبود کو دور کر دے پھر دیکھ اب کیا باقی رہ گیا۔ صرف الا اللہ باقی رہ گیا باقی سب کچھ چلا گیا۔ مبارک ہو اے عشق کہ تو دوسروں کی شرکت کو جلانے والا اور دور کرنے والا ہے)

ترتیب سلوک

اس تقریر سے ترتیب سلوک کی یہ نگلی کہ اول کسی صاحب محبت کو ڈھونڈ کر اس کے پاس جا پڑو

اور اس کی حسب ہدایت کام میں لگ جاؤ۔ ثمرات کے طالب نہ ہو خود بخود ہوں تو خدا کا فضل سمجھو۔ طاعت میں لذت نہ ہو تو اس کو چھوڑومت۔ کثرت سے ذکر کرو۔

اس میں قرآن بھی داخل ہے۔ اگر پڑھتے ہوئے طبیعت اکتانے لگے، تو اسی کی کثرت کرو۔ اگر الفاظ بھی صحیح نہ ہوں تو اپنے امکان بھر کوشش تصحیح کی کرو۔ اگر پوری کامیابی نہ ہو تو دلیکیرمت ہو اسی طرح قبول ہے۔ الفاظ پر تو انہیں سے گرفت ہوگی جو الفاظ درست کر سکتے ہیں اور پھر نہیں کرتے۔ ورنہ زیادہ تردد کیکھ بھال، اور چھان بین دلوں کی ہوگی۔ اگر موٹی زبان کا آدمی غلط پڑھتا ہے لیکن دل سے پڑھتا ہے تو خدا کے نزدیک یہ غلط اس صحیح سے ہزار درجہ بہتر ہے جس کی غرض ریایا اظہار کمال ہو۔

اس موقع پر مجھے ایک شخص کی حکایت یاد آئی۔ ایک شخص مجھ سے تعلق رکھتا تھا مجھ سے کہنے لگا کہ میں کسی فقیر سے طالب ہو جاؤں۔ میں اس پر ناراض ہوا اور سمجھا دیا چند روز کے بعد پھر آیا تو میں اس سے مزاحاً کہنے لگا کہ کیوں کسی فقیر کے طالب بھی ہوئے؟ تو وہ نہایت خلوص اور سادگی سے جواب دیتا ہے کہ بس اب تو تیرا ہی پلہ پکڑ لیا ہے۔ اس کا یہ ”تیرا“ کہنا ہزاروں حضور اور جناب سے زیادہ لذت بخش تھا کیونکہ دل سے تھا۔

اس موقع پر بطور جملہ معترضہ کے ایک اور بات بھی کہہ دینی ضروری ہے کہ جس طرح نرمی علاج ہے گرمی بھی اس سے بڑھ کر علاج ہے اور یہی وجہ ہے بعضے بزرگ درشت مزاج مشہور ہو جاتے ہیں تو خوب سمجھ لو کہ وہ درشت مزاج نہیں۔ بات یہ ہے کہ بعض اوقات اگر ایک بات کو نرمی سے سمجھایا جائے تو دل پر اس کا اتنا اثر نہیں ہوتا اور نہ وہ اتنی مدت تک یاد رہتی ہے جتنا کہ بدرشتی سمجھانے سے کا نقش علی الحجر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس ڈانٹ کا یہ اثر پڑا کہ اس کا یہ تذبذب بالکل دل سے نکل گیا اور آنکھیں کھل گئیں۔ غرض غلط بولنا جو پیارا معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس سے زیادہ پر قدرت نہیں ہوتی۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں راعی کا قصہ مشہور ہے کہ زمین پر بیٹھا ہوا محبت کے جوش میں خدائے تعالیٰ کو خطاب کر کے یہ کلمات کہہ رہا تھا۔

تو کجائی تا شوم من چاکرت ☆ چارقت دوزم کنم شانہ سرت
(تو کہاں ہے کہ میں تیری خدمت کروں تیرے پھٹے ہوئے کپڑے کی دوں اور تیرے سر کے بالوں کو گنگھی کر دوں)

وامثال ذالک! اتفاقاً! حضرت موسیٰ علیہ السلام اس طرف سے گزرے۔ یہ کلمات سن کر فرمایا کہ میاں کس کو کہہ رہے ہیں؟ اس نے کہا کہ خدا سے۔ حضرت موسیٰ نے ڈانٹا اور ڈانٹ کر چلے گئے۔ راعی نے جو یہ سنا تو مارے خوف کے تھرا گیا اور سخت پریشان ہوا۔ اسی وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی کہ اے موسیٰ! تم نے ہمارے بندے کو ہم سے جدا کر دیا۔ اسی حکایت کو مولانا روم فرماتے ہیں۔

زیں نمط بیہودہ می گفت آل شاہا ☆ گفت موسیٰ باکیست اے فلاں
گفت باآں کس کہ مارا آفرید ☆ ایں زمین و چرخ ازو آمد پدید
گفت موسیٰ ہائے خیرہ سرشدے ☆ خود مسلمان ناشدہ کافر شدے
گفت اے موسیٰ دہانم دوختی ☆ وز پشیمانی تو جانم سوختی
وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا ☆ بندہ مارا چرا کردی جدا
تو برائے وصل کردن آمدی ☆ نے برائے فصل کردن آمدی
(اس طریقہ پر وہ چرواہا فضول باتیں کر رہا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا اے شخص تو یہ باتیں کس سے کہہ رہا ہے چرواہے نے کہا کہ میں اس ذات پاک سے بات کر رہا ہوں جس نے ہم کو پیدا کیا ہے اور یہ زمین و آسمان اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہائے افسوس تو برباد ہو گیا تو خود مسلمان نہیں رہا بلکہ کافر ہو گیا۔ چرواہے نے کہا کہ اے موسیٰ علیہ السلام تو نے میرا منہ سی دیا اور شرمندگی سے تو نے میری جان کو جلا دیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ تو نے ہمارے بندے کو ہم سے جدا کیوں کر دیا تو مجھ سے ملاقات کرنے کو آتا ہے یا میرے بندوں کو مجھ سے جدا کرنے کے لئے آتا ہے)

حضرت موسیٰ نے جو یہ سنا تو گھبرا گئے اور جلد ہی آکر چرواہے سے معافی چاہی یہاں چرواہے کی عجب حالت تھی۔ موسیٰ نے جب معافی چاہی تو اس نے یہ جواب دیا کہ اے موسیٰ ایسا تازیانہ لگا ہے کہ میں بڑی دور پہنچ گیا۔

آفرین بردست و بر بازوئے تو (تیرے ہاتھوں اور بازوؤں کو شاباش ہے)
اس جملہ حکایت سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اگر زبان پر بوجہ کم سمجھی اور کم عقلی کے گستاخانہ الفاظ

بھی ہوں لیکن دل محبت سے معمور ہو تو الفاظ پر نظر نہیں ہوتی۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ان فروگزاشتوں کی معافی انہی لوگوں کیلئے ہے کہ جن کو تصحیح پر قدرت نہیں ہے ورنہ اگر قدرت کے باوجود ایسا کرے تو ضرور گنہگار ہوگا۔

تفریط متعلمین

افسوس ہے کہ اس وقت اس امر کی طرف سے ایسی بے توجہی ہے کہ لوگ اس کو بالکل ضروری نہیں سمجھتے۔ اکثر لوگ پوری درسیات ختم کر جاتے ہیں لیکن ان کو قرآن پڑھنے کا سلیقہ نہیں ہوتا۔ سمجھتے ہیں کہ صرف کی کتابوں میں صفات حروف و مخارج پڑھ لئے ہیں اس سے زیادہ اور کیا چاہیے حالانکہ یہ خیال غلط ہے۔ قرآن کا پڑھنا اس وقت تک نہیں آتا جب تک کہ خاص کسی سے اس کو نہ سیکھا جائے۔ نری درسیات سے کچھ نہیں ہوتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم نے مشق نہیں کی تو ہم کو غلط پڑھنا جائز ہونا چاہیے اور ہم کو معذور ہونا چاہیے لیکن یہ عذر ایسا ہے کہ میں نے ایک سپارہ پڑھنے والے طالب علم سے کہا کہ حاجی جی کو بلا لا۔ وہ حافظ جی کو بلا لایا۔ میں نے کہا کہ یہ کیا حماقت ہے؟ کہاں حافظ جی کہاں حاجی جی۔ ان کے تو حروف بھی الگ الگ ہیں۔ تو کہتا ہے جی میں نے مخارج کی مشق نہیں کی۔ تو کیا یہ عذر قبول ہو سکتا ہے؟ تو جیسا یہ شخص اس غلطی سے بچ سکتا ہے اسی طرح جب مشق ممکن ہے تو ایسے اغلاط سے ان کو بچنا ممکن ہے۔

صاحبو! یہ سب بہانے ہیں۔ بات اصلی وہی ہے کہ خدا کی محبت اور اس کا خوف دل سے جاتا رہا ہے۔ اگر آج یہ اشتہار ردے دیا جائے کہ جو شخص مخارج حروف صحیح کر کے سنا دے اس کو فی حرف پانچ روپے ملیں گے تو آج ہی شہر کے شہر قرأت شروع کر دیں اور کچھ نہ کچھ تصحیح کر کے انعام لینے کھڑے ہو جائیں لیکن افسوس ہے کہ خدا کی رضا کیلئے انگ نہیں پیدا ہوتی۔ یہ تو تفریط تھی متعلمین کی۔

افراط معلمین

اب افراط سنئے۔ بعض معلمین و مصلحین کا کہ جن سے بالکل نہ ہو سکے وہ ان کو بھی مجبور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بدوں اس کے قرآن پڑھنا ہی بے فائدہ ہے۔

جیسا مشہور ہے کہ ایک پیر جی صاحب نے ایک دیہاتی سے پوچھا کہ روزہ کی نیت بھی یاد

ہے۔ اس کو چونکہ خاص عبادت یاد نہیں تھی اس لئے اس نے کچھ نہیں بتلائی۔ پیر جی صاحب نے فرمایا کہ بے نیت روزہ نہیں ہوتا۔ دیکھ روزہ کی نیت یوں کیا کر بصوم غد نوبت اس بے چارے نے کا ہے کو کبھی اس قسم کے الفاظ سنے تھے فوراً تو یاد نہ کر سکا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن روزہ نہ رکھا۔ ان ہی بزرگ نے پوچھا تو یہ کہا کہ بلا نیت روزہ نہیں ہوتا اور نیت یاد نہیں ہوتی۔ غرض جو لوگ صحیح پڑھ سکتے ہیں وہ تو صحیح پڑھیں۔ اور جو لوگ اس پر قادر نہیں ان کو جس طرح وہ پڑھ سکیں جائز ہے۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب ہماری آواز چونکہ اچھی نہیں اس لئے ہم نہیں پڑھتے سوائے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ تحسین صورت اس کو نہیں کہتے کہ خوب راگنی سے گا کر پڑھا جائے تحسین صورت کے معنی جیسا بزرگوں سے منقول ہے یہ ہیں کہ سننے والے کو اس کی آواز سن کر یہ معلوم ہو کہ اس کے دل پر کسی با عظمت ہستی کا رعب چھایا ہوا ہے۔

فضیلت عشرہ اخیرہ

بات بہت دور جا پڑی۔ اصل مقصود یہ تھا کہ جب قرآن ایسا شرف و معظم ہے تو جس ماہ میں اس کا یہ نزول دفعی ہوا ہے وہ بھی معظم ہوگا بالخصوص وہ عشرہ خاص ماہ رمضان کا کہ جس میں شب قدر ہے کیونکہ رمضان کو جب قرآن شریف کی وجہ سے شرف حاصل ہوا، تو رمضان کا وہ حصہ خاص جس میں نزول ہوا ہے دوسرے حصوں کی نسبت خاص کر ضرور اشرف ہوگا۔ اس لئے کہ دوسرے حصوں میں شرف اس حصہ کی بدولت آیا ہے۔ پس جب نزول شب قدر میں ہوا ہے اور شب قدر جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے عشرہ اخیرہ میں ہوتی ہے تو عشرہ اخیرہ بقیہ حصہ رمضان سے ضرور افضل ہوا۔ ایک فضیلت تو عشرہ اخیرہ کی اس نزول قرآن سے ہوئی۔

دوسری فضیلت اس کی اس سے ہے کہ اس میں شب قدر ہے جس کی فضیلت کیلئے خدائے تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: وما ادراک ما لیلۃ القدر لیلۃ القدر خیر من الف شہر۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ معلوم ہے کہ شب قدر کیسی چیز ہے شب قدر ہزار مہینے سے بہتر ہے) کیونکہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شب قدر عشرہ اخیرہ کی طاق راتوں میں ہے یعنی ۲۱-۲۳-۲۵-۲۷-۲۹۔ اور بعض حدیثوں میں مطلق عشرہ اخیرہ بھی آیا ہے۔ دونوں کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو ایک حدیث دوسری کی تفسیر ہے اور یا اکثر تو طاق راتوں میں ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی جفت راتوں میں بھی ہو جاتی ہے۔ نیز بعض لوگوں کو جفت راتوں کو بھی ہونا مکشوف ہوا

ہے۔ تو قوی اور تندرست لوگوں کو تو یہ مناسب ہے کہ وہ اس عشرہ کی ہر رات میں اور راتوں سے زیادہ عبادت کریں اور ضعفاء کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ کم از کم طاق راتوں میں ضرور جاگ لیں۔ طاق راتوں میں سے اس وقت ایک رات تو گزر گئی اب صرف چار باقی رہ گئی ہیں۔ اس میں کوشش کر کے کچھ تو ضرور جاگ لیا جائے۔

صاحبو! یہ ایسی برکت اور خیر کی چیز ہے کہ اس سے محروم ہو جانا۔ گویا تمام خیر سے محروم ہو جانا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔ من حرم لیلة القدر فقد حرم الخیر کلہ^۱۔ (جو شخص لیلة القدر (میں عبادت کرنے سے) محروم رہا وہ خیر سے بالکل محروم رہا) لیکن اس میں بعض لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اگر جاگا جائے تو تمام شب جاگا جائے اور اگر تمام شب نہ جاگا جائے تو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ یہ خیال بالکل لغو ہے۔ اگر اکثر حصہ شب میں بھی جاگ لے تب بھی لیلة القدر کی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر ساری رات بھی جاگ لیا جائے تو کیا مشکل ہے۔

صاحبو! رمضان شریف سال بھر کے بعد آتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ پچھلے سال رمضان میں بہت سے لوگ ایسے تھے کہ وہ اس وقت دنیا میں نہیں رہے۔ ہم کو کیا خبر ہے کہ آئندہ رمضان تک کس کس کی باری ہے۔ اس لئے اگر ایسی بڑی نعمت حاصل کرنے کیلئے کوئی ایک دو رات جاگ ہی لیا تو کیا دقت کی بات ہے۔ لیکن خیر! اگر تمام رات کی ہمت نہ ہو تو اکثر حصہ کو تو چھوڑنا ہی نہ چاہیے اور بہتر یہ ہے کہ یہ اکثر حصہ اخیر شب کا تجویز کیا جائے۔ کیونکہ اول تو اس وقت تک معدہ کھانے سے پر نہیں ہوتا۔ دعا میں جی لگتا ہے۔ دوسرے حدیث میں آیا ہے کہ خدائے تعالیٰ اخیر شب میں روزانہ اپنے بندوں کے حال پر رحمت خاص متوجہ فرماتے ہیں اس کے علاوہ اخیر شب میں ویسے بھی سکون ہوتا ہے اور اس میں ہر شب شریک ہے۔

کسی نے خوب کہا ہے من لم یعرف قدر لیلة لم یعرف لیلة القدر۔ اور اس قول کی وجہ یہ ہے کہ لیلة القدر انہی راتوں میں سے کسی رات میں ہوگی تو جو شخص راتوں کی قدر کرے گا وہ لیلة القدر بھی پائے گا۔ جو بے قدری کر کے خواب غفلت میں گزراے گا وہ جب عادت لیلة القدر سے بھی محروم رہے گا کیونکہ جب سال بھر تک برابر شب بیداری کرے گا تو لیلة القدر میں عبادت ضرور ہو جائے گی۔ کہ انہی راتوں میں ایک رات وہ بھی ہے۔

۱۔ لم أجِدَ الحدیث فی "موسوعة اطراف الحدیث النبوی الشریف"

بوستان میں حکایت ہے کہ کسی شہزادہ کا ایک لعل شب کے وقت کسی جگہ گر گیا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ اس مقام کی تمام کنکریاں اٹھا کر جمع کریں۔ اس کا سبب پوچھا تو کہا کہ اگر کنکریاں چھانٹ کر جمع کی جائیں تو ممکن تھا کہ لعل ان میں نہ آتا اور جب ساری کنکریاں اٹھائی گئی ہیں تو لعل ضرور آگیا ہے کسی نے اس جملہ کا ترجمہ خوب کیا ہے۔

اے خواجہ چہ پری از شب قدر نشانی ☆ ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی
(اے میاں تو شب قدر کی نشانی کو کیا پوچھتا ہے ہر رات قدر کے قابل ہے اگر تو اسکی قدر کرے)

شب قدر کی فضیلت

لیکن خیر ایسے باہمت تو اس وقت تک کہاں ہیں کہ وہ اس گوہر بے بہا کی تلاش میں سال بھر شب بیداری کریں مگر رمضان کے عشرہ اخیرہ میں تو ضرور ہی بیدار رہنا اور عبادت کرنا چاہیے کیونکہ ان راتوں میں شب قدر کا ہونا اغلب ہے اور اگر کوئی شخص نہایت ہی کمزور اور کم ہمت ہو تو خیر وہ ستائیسویں رات کو تو ضروری ہی بیدار رہے۔ کہ وہ شب اکثر شب قدر ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر اتفاق سے وہ رات شب قدر نہ بھی ہوئی۔ اور تم نے بہ گمان شب قدر اس میں عبادت کی تو ان شاء اللہ تم کو شب قدر ہی کا ثواب عطا ہوگا۔ اور یہ کوئی گھڑی ہوئی بات نہیں ہے۔ حدیث میں اس کی اصل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ انما الاعمال بالنیات پھر ممکن ہے کہ اس کلیہ سے کسی کی تشفی نہ ہو تو دوسری حدیث موجود ہے۔ حضور ارشاد فرماتے ہیں۔

الصوم يوم تصومون والفطر يوم تفطرون والاضحیٰ يوم تضحون

جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایک شخص نے نہایت کوشش سے رمضان کے چاند کی تحقیق کی اور اس تحقیق کی بناء پر روزے رکھنے شروع کر دیئے پھر ختم رمضان پر عید کے چاند کی اسی طرح چھان بین کی اور اس کی بناء پر عید کر لی اسی طرح عید الاضحیٰ میں بھی کیا اور چند دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ تینوں تحقیق خلاف واقع تھیں تو اس صورت میں دل شکستہ نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ جس دن روزہ رکھا وہی دن عند اللہ باعتبار مقبول روزہ کا تھا۔ اور جس دن عید کی وہی دن عید کا تھا یعنی روزہ اور عید دونوں مقبول ہیں۔ پس اسی طرح میں کہتا ہوں کہ اگر شب قدر کی نیت سے عبادت ہوئی ہے اور اتفاق سے وہ شب قدر نہ ہوئی تو ثواب شب قدر کامل جائے گا۔

صاحبو! اس تقریر کے بعد تو بہت ہی آسان معاملہ ہو گیا۔ اب بھی اگر ہمت نہ کی جائے تو غضب ہے۔ یہ دوسری فضیلت تھی عشرہ اخیرہ کی۔

فضیلت اعتکاف

تیسری فضیلت اس عشرہ میں یہ ہے کہ اس میں اعتکاف مشروع ہے اور ممکن ہے کہ یہ پہلی فضیلت کا تتمہ ہو جیسا کہ بعض نے کہا کہ اعتکاف کو دوسری حکمتوں سے بھی مشروع کہا جائے۔ خیر جو کچھ بھی ہو ہم کو اس سے کیا غرض۔ ہم کو کام کرنا چاہیے۔ احکام کے حکم اور مصالح کی تلاش اور کاوش ہمارا کام نہیں۔ کیونکہ یہ علوم فکر یہ نہیں ہیں کہ سوچنے اور غور کرنے سے سمجھ میں آجائیں گے۔ یہ الہامی علوم ہیں خدا جس کو دے اس لئے جب تک شرح صدر نہ ہو جائے اس وقت تک کسی ایک کو تعین نہ کرنی چاہیے دونوں احتمال ہیں۔ اس اعتکاف میں دو درجے ہیں۔ ایک درجہ کمال کا ہے وہ تو یہ ہے کہ بیس تاریخ کو قبل از مغرب اعتکاف میں بیٹھے اور عید کا چاند دیکھ کر باہر نکلے۔ سو یہ ثواب ممکن نہیں ہے کیونکہ ایک دن گزر گیا۔ اور دوسرا درجہ اس سے کم ہے اور وہ یہ کہ دس دن سے کم ہو لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اگر درجہ کمال حاصل نہ ہو تو ناقص درجہ کے حاصل کرنے سے فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔ اگر اس قدر نہ ہوگی تو کچھ تو ضرور ہو جائے گی۔

صاحبو! اگر دس دن ممکن نہ ہو سکے نو دن سہی۔ اس قدر بھی نہ ہو سکے سات دن سہی۔ غرض جس قدر بھی ہو سکے اور جتنے دن بھی ہو سکے چھوڑنا نہ چاہیے۔

ایک بہت بڑی فضیلت اعتکاف کی یہ ہے کہ معتکف کو ایام اعتکاف میں ہر وقت وہی ثواب ملتا ہے جو کہ نمازی کو نماز میں ملتا ہے دلیل اس کی یہ حدیث ہے۔ لا يزال احدکم فی الصلوۃ ما انتظر الصلوۃ۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر مسجد میں بیٹھ کر نماز کا انتظار کیا جائے تو وقت انتظار میں بھی وہی ثواب ملتا ہے جو کہ وقت ادا الصلوۃ میں ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ معتکف جب ہر وقت مسجد میں رہے گا تو اس کو صلوۃ کا انتظار ضرور رہے گا۔ اگر یہ سودے گا بھی تو اس نیت سے کہ اٹھ کر فلاں نماز پڑھنی ہے۔ کوئی کام بھی کرے گا تو اس نیت کے ساتھ کہ فلاں نماز تک یہ کام ہے۔ غرض اس کا سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا ہر حرکت صلوۃ کے حکم میں لکھی جائے گی۔

اس تقریر کے بعد خیال میں آتا ہے کہ حدیث میں جو آیا ہے المعتکف یعتکف

الذنوب کلھا ویجری له الحسنات کلھا۔ (مختلف تمام گناہوں سے رکا رہتا ہے اور تمام نیکیوں کا اس کو ثواب ملتا ہے) الحسنات میں الف لام عہد کا نہیں جیسا اب تک سمجھا جاتا ہے۔ جس کی بنا تھی کہ اعتکاف میں خاص حسنات کا صدور ہوتا ہے کل حسنات کا صدور خلاف مشاہدہ ہے۔ بلکہ استغراق کا ہو سکتا ہے مطلب یہ ہے کہ مختلف اپنے ایام اعتکاف میں گویا ہر نیکی کر رہا ہے اس کو سب نیکیوں کا ثواب ملتا ہے وجہ اسکی یہ ہے کہ جب انتظار الصلوٰۃ کے حکم میں ہے اور مختلف منتظر صلوٰۃ ہے تو وہ مصلیٰ کے حکم میں ہو اور صلوٰۃ ام العبادت ہے تو اس کا ادا کرنے والا گویا تمام عبادتیں کر رہا ہے پس مختلف بحالت اعتکاف سب عبادتیں ادا کر رہا ہے۔ صاحبو! اس سے زیادہ اور کیا فضیلت ہوگی۔

یہ تقریر تو اس پر مبنی تھی کہ عشرہ اخیرہ میں ایک فضیلت اعتکاف سے ہوئی اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اعتکاف میں جو فضیلت آئی ہے وہ عشرہ اخیرہ کی وجہ سے کہ زمانہ افضل میں عبادت کی زیادہ فضیلت ہوتی ہے لیکن یہ ہم کو کچھ مضرب نہیں کیونکہ کبھی زمانہ میں بالذات ہی فضیلت ہوتی ہے جیسا کبھی بالغیر بوجہ اس کے مظروف کے ہوتی ہے۔ جیسا مشروع میں بیان ہوا بعد حکایت گفت معشوقے بعاشق۔ الخ کے۔ پس غرض خواہ اعتکاف میں عشرہ کی وجہ سے فضیلت ہو یا عشرہ میں اعتکاف کی وجہ سے، دونوں صورتوں میں اعتکاف کی فضیلت ثابت ہے ہم کو اس کا حاصل کرنا ضروری ہے اس کرید کی ضرورت نہیں کسی نے خوب کہا ہے۔

بخت اگر مدد کند و منش آورم بکف ☆ گر بکشد زہ طرب و زکشم زہ شرف
(نصیبہ اگر مدد کرے تو میں اس کے دامن کو اپنے ہاتھ سے پکڑ لوں اگر وہ اپنی طرف کھینچ لے تو بڑی خوشی کا مقام ہے اور اگر میں اسے اپنی طرف کھینچ لوں تو یہ بھی میرے لئے عزت کی بات ہے)

صاحبو! چار دواؤں کا مرکب آپ کے مرض کو مفید ہے آپ کو اسے استعمال کرنا چاہیے۔ اس تفتیش کی ضرورت نہیں کہ اس دوا سے اس میں قوت بڑھی یا اس دوا سے۔ اس میں یہ تفتیش دوسرے کا کام ہے جو اس فن کو من حیث الفن حاصل کرے مریض کا کام صرف استعمال ہے۔
کارکن کاربگذار گفتار ☆ کاندیس راہ کار باید کار
قدم باید اندر طریقت نہ دم ☆ کہ اصلے ندارد دم بے قدم
(کام کرو باتیں کرنے کا کام چھوڑ دو کہ اس راستہ میں صرف کام ہی کام چاہیے، اس راستہ میں کام

کے لئے قدم چاہیے باتیں بنانے کی ضرورت نہیں کہ بغیر عمل باتیں بنانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے) یہ فضیلت تو اس عشرہ کے ساتھ خاص تھی اب ایک اور مضمون عام جو اس عشرہ اخیرہ کے ساتھ بھی چسپاں ہے بیان کیا جاتا ہے۔

فضیلت خدمت والدین

وہ یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہؓ کے مجمع میں فرمایا رَغِمَ اَنْفُهُ رَغِمَ اَنْفُهُ رَغِمَ اَنْفُهُ، صحابہؓ یہ الفاظ سن کر گھبرا گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! کون شخص؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک تو وہ شخص کہ اپنی زندگی میں بوڑھے ماں باپ کو پائے اور ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کرے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بوڑھے کی قید اس لئے بڑھادی کہ اگر ماں باپ خود جوان ہیں تو اول تو وہ اس کے محتاج نہیں ہوں گے جیسے اس کے پیر ہاتھ چلتے ہیں۔ ان کے ہاتھ پیر بھی چلتے ہیں۔ دوسرے ان کی خدمت سے دل بھی نہیں گھبراتا۔ اس لئے اگر ان کی کچھ خدمت بھی کر دی تو کچھ بڑی بات نہیں بخلاف بوڑھے ماں باپ کے کہ وہ اسکے محتاج ہوتے ہیں اور چونکہ اکثر قوی بالکل کمزور ہو جاتے ہیں خود کچھ بھی نہیں کر سکتے اور اکثر کام مرضی کے موافق نہیں ہوتے تو تنگ مزاج بہت ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ایسے ماں باپ کی خدمت کرنا بوجہ ان کی معذوری کے ضروری اور ان کے تنگ مزاجی سے تنگ ہو جانا اور نافرمانی کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ مگر اکثر آدمی تنگ ہونے لگتا ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے زمانہ طفولیت و عالم احتیاج کو بھول جاتا ہے کہ اس وقت والدین نے کیسے کیسے ناز اٹھائے ہیں اگر وہ یاد رہیں تو بڑا نفع ہو۔

ایک بننے کی حکایت مشہور ہے اس نے اپنے بڑھاپے میں ایک مرتبہ اپنے ایک لڑکے سے دریافت کیا کہ بھائی یہ دیوار پر کیا چیز بیٹھی ہے۔ صاحبزادہ اول تو اس سوال پر دل میں بہت خفا ہوئے کہ اس لغو سوال کی آپ کو ضرورت ہی کیا تھی۔ مگر خیر تہذیب سے کام لے کر بتلادیا کہ ابا جان کو اہے۔ بننے نے پھر پوچھا کہ بھائی! یہ دیوار کیا چیز ہے؟ صاحبزادہ نے کہا کہ ابھی تو بتلادیا تھا کہ کو اہے۔ تیسری بار اس نے پھر پوچھا کہ تو صاحبزادہ نے بگڑ کر جواب دیا کہ تمہارا تو دماغ چل گیا ہے چپکے پڑے رہو۔ اس پر بننے نے اپنا بھی کھاتا منگوا یا اور کھول کر دکھلایا کہ صاحبزادہ دیکھو! تم نے ایک سو بار مجھ سے اپنے بچپن میں یہی سوال کیا تھا۔ اور میں نے ہر مرتبہ محبت سے جواب

دیا تھا۔ تم دوہی بار میں گھبرا گئے۔ لیکن شاید کوئی شخص یہ کہے کہ صاحب بوڑھوں کی تنگ مزاج سے ناگواری تو امر طبعی ہے اگر اس پر بھی باز پرس ہے تو سخت مشکل کی بات ہوگی۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ امور طبعیہ پر خدائے تعالیٰ نے کہیں باز پرس نہیں فرمائی۔ باز پرس امور اختیار یہ میں ہے۔ کلام مجید اس شبہ کا خود ازالہ فرما رہا ہے۔ پارہ سبحان الذی میں حقوق والدین کو ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے ربکم اعلم بما فی نفوسکم ان تکونوا اصلحین فانہ کان للا وابین غفوراً۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ والدین کی ہر وقت کی تنگ مزاجیوں سے جو گھبراہٹ تمہارے دلوں میں پیدا ہوگئی ہے یہ تو امر طبعی ہے اگر کوئی خشک کلمہ منہ سے نکل جائے اس میں معذور ہو لیکن خدائے تعالیٰ دل کی نیت کو جانتا ہے اگر دل میں ان کی اطاعت ہے اور غالب تم میں صلاحیت ہے تو ایسی بے اعتنائی سے معذرت کرنے کو بخش دیتا ہے۔

صاحبو! ظاہر نظر میں اس جگہ پر یہ آیت بالکل بے جوڑ معلوم ہوتی ہے لیکن تقریر بالا سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ مضمون بالا سے کس قدر چسپاں ہے۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے کلام اللہ ہونے کی یہ بھی ایک بہت بڑی دلیل ہے کہ اس میں ہر ہر بات کے وہ وہ مخفی پہلو لئے گئے ہیں کہ دوسرے سے مربوط ہیں مگر افسوس ہے لوگ کلام اللہ کو رسمی طور پر پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں اس کے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ایک شخص تو غم انگیز کا محل یہ ہوا۔ دوسرا وہ جس کے سامنے میرا نام آئے اور وہ درود نہ پڑھے۔

ماہ رمضان کی فضیلت

تیسرے وہ شخص کہ رمضان آئے بھی اور گزر بھی گئے اور اس نے اپنی مغفرت نہ کرائی یعنی ایسے عمل اور توبہ نہ کر لی جس سے گناہ معاف ہو جاتے۔ ایک دوسری حدیث میں بھی مغفرت سے رمضان کے تعلق کی نسبت ارشاد ہوتا ہے۔

ہو شهر اولہ رحمة و اوسطہ مغفرة و اخرہ عتق من النيران!

(یہ وہ مہینہ ہے (جس کا پہلا دھا کہ) رحمت دوسرا (دھا کہ) مغفرت اور آخری

(دھا کہ) دوزخ سے آزادی ہے)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رمضان کا مہینہ سراپا رحمت و مغفرت ہے۔ پس اس میں انسان اپنی مغفرت کا سامان کرے اور مغفرت حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ نیک عمل کرے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مغفرت کی تحصیل امر اختیاری ہے چنانچہ خدا تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں:

لہ الترغیب والترہیب للمندری: ۹۵:۲

وسارعوا الی مغفرة من ربکم وجنة عرضها السموات والارض
اعدت للمتقين ، الذين ینفقون

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کی مغفرت اور اس کی جنت کی طرف دوڑو جس کو متقی لوگوں کے واسطے تیار کیا گیا ہے۔ تو جو شخص اس راستے پر چلے اور مقرر شدہ قانون پر عمل کرے گا وہ مغفرت کو حاصل کریگا۔ جو شخص ایسا نہ کرے گا محروم رہیگا۔ پس معلوم ہوا کہ مغفرت کا حاصل کرنا خود ہمارے اختیار میں ہے اور اگر ہم چاہیں اس کو حاصل کر سکتے ہیں کہ متقی بن جائیں۔

بے علم واعظوں کی غلطی

اس موقع پر بے علم واعظوں کی غلطی کا بیان کرنا بہت ضروری ہے کہ واعظوں میں کہا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی ذات بالکل بے پرواہ ذات ہے۔ وہ چاہے تو ایک نکتہ میں بخش دے اور چاہے تو ایک نکتہ میں جہنم بھیج دے اور یہ بات ایسے طور سے کہتے ہیں جس سے لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کے ہاں کوئی مقرر شدہ قانون نہیں۔ بلکہ یوں ہی اناپ شناپ بے تکیے طور پر جو چاہتے ہیں کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے مضامین سننے سے اکثر لوگ بالکل مایوس ہو جاتے ہیں اور عبادت ریاضت سب چھوڑ بیٹھتے ہیں اس لئے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ خدا جانے کس نکتہ پر اچانک پکڑ ہو جائے اور ساری محنت برباد ہی جائے۔

اسی طرح اکثر لوگ خوب جی بھر کر معاصی کا ارتکاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ کے ہاں کوئی مقرر شدہ قانون ہی نہیں ایک نکتہ پر عذاب ثواب کا مدار ہے تو اپنی خواہشات کو کیوں ترک کریں اور خواہ مخواہ کی مصیبت کیوں اختیار کریں ممکن ہے اسی میں سے کوئی نکتہ پسند آجائے کہ اس پر نوازش ہو جائے گویا کارخانہ خداوندی ایناؤنٹر کی سلطنت ہے کہ جہاں سارے کام بے ڈھنگے ہی ہوتے ہیں۔

مشہور ہے کہ چیلہ گروسفر کرتے ہوئے ایک شہر پہنچے نام پوچھا تو ایناؤنٹر معلوم ہوا۔ جس کے معنی ہیں بے اتفاقی کا شہر، اشیاء کا نرخ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اناج سے لے کر گھی دودھ تک ہر چیز سولہ سیر روپیہ کی ملتی ہے۔

یہ سن کر چیلہ تو بہت خوش ہوا کہ خوب گھی دودھ کھا کر فر بہ ہوں گے مگر گرو نے کہا کہ بھائی اس جگہ قیام مناسب نہیں۔ یہ شہر تو بہت ہی بے تکا معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے بڑے میں کچھ امتیاز ہی نہیں۔ مگر چیلہ نے اصرار کیا۔ آخر رہ پڑے۔

چند روز میں میر کرتے کرتے عدالت کی طرف پہنچے دیکھا کہ ایک مقدمہ راجہ صاحب کے

اجلاس میں درپیش ہے اور لوگوں کا ہجوم ہے پوچھنے سے معلوم ہوا کہ کوئی چور مدعی ہے مہاجن مدعا علیہ ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ ہم دونوں چوری کرنے اس کے گھر گئے۔ نقب لگایا۔ میرا رفیق اندر جانے لگا تو دیوار اوپر سے آپڑی مرگیا قصاص چاہتا ہوں۔ مدعا علیہ سے باز پرس ہوئی کہ وہ دیوار ایسی کیوں بنائی گئی۔ اس نے کہا معمار سے پوچھئے بنانے والا وہ ہے۔ وہ بلایا گیا اس نے کہا گارہ دینے والے سے پوچھا جائے۔ اس کو بلایا اس نے کہا کہ سقہ نے پانی ڈال دیا جس سے گارہ پتلا ہو گیا۔ اس کو بلایا اس نے کہا سرکاری ہاتھی جھپٹا ہوا آتا تھا۔ خوف سے پانی زیادہ نکل پڑا۔ فیلبان کو بلایا۔ اس نے کہا ایک عورت آتی تھی پازیب سے پہنے اس کی جھنکار سے ہاتھی دوڑ پڑا۔ عورت کو بلایا۔ اس نے کہا سار نے ایسا ہی باجا ڈال دیا۔ اس کو بلایا وہ کچھ جواب نہ دے سکا۔ حکم ہوا کہ پھانسی دیدی جائے۔ پھانسی کے لئے لے چلے۔ جب اسے پھانسی پر چڑھایا تو پھانسی کا حلقہ اس کے گلے سے بڑا نکلا۔ لوگوں نے آکر راجہ صاحب سے عرض کیا کہ حلقہ اس کے گلے سے بڑا ہے۔

راجہ صاحب نے فرمایا کہ اچھا تو کسی موٹے آدمی کو پھانسی دیدو۔ غرض موٹے آدمی کی تلاش شروع ہوئی۔ اتفاق سے مجمع بھر میں اس چیلے سے زیادہ موٹا کوئی نہ نکلا آخر اسی کو تجویز کیا گیا۔ اب تو چیلہ صاحب بہت گھبرائے اور گرو سے کہا کہ خدا کے لئے بچاؤ۔ اس نے جواب دیا میں نہ کہتا تھا یہاں رہنا اچھا نہیں آخر نتیجہ دیکھا۔

آخر گرو نے یہ تدبیر نکالی کہ پھانسی کے وقت خود بڑھ کر کہا کہ صاحبو! اس کو پھانسی نہ دو، مجھ کو دیدو۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ اس وقت میں نے جوش میں جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس وقت جو شخص پھانسی دیا جائیگا وہ سیدھا بیکنٹھ میں جائیگا۔ راجہ صاحب نے جو یہ سنا تو بڑھ کر فرمایا کہ اچھا جب ایسی بات ہے تو ہم کو پھانسی دیدو تا کہ جنت ہمیں حاصل کر لیں۔ چنانچہ راجہ صاحب کو پھانسی دیدی گئی۔ خس کم جہاں پاک صادق ہوا۔

تو ان نیم واعظوں کے ایسے بہانوں سے یوں سمجھا جاتا ہے کہ گویا نعوذ باللہ کا رخا نہ خداوندی بھی دوسرا پناہ دگر ہے۔

صاحبو! یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کے یہاں ہر کام کا ایک قانون مقرر ہے۔ ثواب کا بھی ایک قانون ہے۔ عذاب کا بھی ایک قانون مقرر ہے ثواب کا کام تو یہی ہے جو اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے وسار عوا الایہ یعنی تقویٰ حاصل کرو اور مغفرت و جنت لے لو۔ تو معلوم ہوا کہ مغفرت و رحمت کا لینا بالکل ہمارے اختیار میں ہے اور نہ اگر اس کو اختیار میں نہ مانا جائے تو سار عوا کے کوئی معنی نہیں ہوں گے کیونکہ تکلیف مالا یطاق محال ہے اور خلاف نص ہے اور یہاں امر ہوا سارعت الی

المغفرت کا تو ضرور وہ تحت الاختیار ہے۔ پس جب رمضان کی رحمت اور مغفرت کا حاصل کرنا ہمارے اختیار میں ہے تو اس کی تحصیل کی کوشش کرو اور اس وعیدِ غمِ اٹھ کے مصداق نہ بنو۔

توبہ کی ترغیب

اگر یہ خوف ہو کہ توبہ ٹوٹ جائیگی اور گناہوں سے باز نہ رہ سکیں گے تو ہمت نہ ہارو۔ کیونکہ پھر توبہ کر لینا۔ دیکھو! اگر ایک کپڑا پھٹ جاتا ہے تو اس کو بالکل پھٹا ہوا نہیں چھوڑتے کہ سینے کے بعد پھر پھٹ جائیگا بلکہ سی کر پھر کام میں لاتے ہیں۔ پس یہی حالت توبہ کی ہے کہ محض اس کے ٹوٹنے کے احتمال سے اس کو ترک نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ اس وقت پھر توبہ کر لینا چاہیے باب توبہ بند نہیں ہوا۔ بلکہ اگر دن میں سو دفعہ بھی توبہ ٹوٹ جائے تو پھر توبہ کر لو۔ مایوس نہ ہو جاؤ خوب کہا ہے۔

بازا باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ ☆ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

ایں درگہ مادر گمہ نومیدی نیست ☆ صدبار اگر توبہ شکستی باز آ

(پھر آؤ پھر آؤ تم جس حالت میں ہو چلے آؤ اگرچہ کافر ہو یا آتش پرست ہو یا بت پرست ہو

چلے آؤ ہمارا یہ دربار نامیدی کا دربار نہیں ہے) (اگر سو مرتبہ توبہ توڑ چکے ہو جب بھی چلے آؤ)

بلکہ اسی ترک توبہ ہی کی وجہ سے ہم کو معاصی پر زیادہ اجرت ہو گئی ہے کیونکہ جو شخص توبہ کرتا رہے گا۔ اس کے دل میں عظمتِ خداوندی کسی نہ کسی درجہ میں ضرور باقی رہے گی۔ یہ بڑا سبب ہے معاصی سے رک جانے کا برخلاف اس شخص کے جو کبھی توبہ نہ کرے گا۔ وہ خدا کو بالکل بھول جائے گا اور جب اس کی عظمت پیش نظر نہ ہوگی تو کچھ بھی اس سے ہو جائے بعید نہیں۔

ختم قرآن پر شیرینی

یہ مضمون اس عشرہ اخیرہ کے متعلق تھا اور ایک بات اس کے متعلق یاد آئی۔ چونکہ بعض لوگوں کو اس کی ضرورت ہوگی اس لئے اس کا بیان کر دینا بھی اس مقام پر مناسب ہے۔ بات اگرچہ بہت پرانی ہے اور بہت دفعہ لوگوں کے سامنے تقریراً و تحریراً پیش ہو چکی ہے مگر چونکہ اکثر لوگوں نے اس کو دل سے بھلا دیا ہوگا۔ اس وقت پھر اعادہ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس عشرہ میں اکثر مساجد میں قرآن شریف ختم ہوگا۔ اس میں اکثر لوگ پڑھنے والوں کو کچھ دیا کرتے ہیں۔ سو یہ لینا چھوڑ دو۔ دوسرے اکثر مساجد میں ختم کے دن شیرینی تقسیم ہوتی ہے اس میں جو گڑ بڑ ہوتی ہے سبھی جانتے ہیں اور ان گڑ بڑوں کی وجہ سے جو شرعی قباحتیں اس میں پیدا ہو جاتی ہیں ان کو بھی متعدد مرتبہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اس وقت ان کے دہرانے کا وقت ہے نہ چنداں ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

صرف اتنا کہا جاتا ہے کہ اس کے مفاسد پر نظر کر کے اس کو بھی چھوڑ دو۔

دیکھو! اس کی بدولت بیچارے بعض غرباء پر سخت بار ہو جاتا ہے۔ اس انتظام کے متعلق بعض غریب جلاہوں نے شکریہ میں یہ کہا کہ ہم بہت ممنون ہیں۔ کیونکہ ہم کو چندہ دینے کی مصیبت سے بچا لیا۔ معلوم ہوا کہ لوگوں پر چندہ لینے سے بار ہوتا ہے بتلائیے یہ کیونکر جائز ہوگا۔ بعض رئیسوں نے مجھ سے کہا کہ آپ غریبوں کو منع کیجئے لیکن امیروں کو منع کرنے کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ یہ خیال بالکل لغو ہے اس لئے کہ اگر امیروں نے چھوڑ دیا تو غریبوں کو چھوڑنا کچھ مشکل نہیں۔

بعض مساجد ایسی بھی ہیں کہ ان میں چندہ سے شیرینی تقسیم نہیں ہوتی لیکن وہاں دوسری خرابیاں ہوتی ہیں مثلاً ریاء و نمود کے لئے تقسیم کرنا۔ عوام الناس اور بچوں کے ہجوم سے مسجد کی بے حرمتی ہونا۔ لڑکوں کا حصہ مانگنے میں بلاوجہ پٹنا۔ غرض اس قسم کی بہت سی خرابیاں ہیں کہ زیرک آدمی ان کو خود سمجھ سکتا ہے۔

ایک مرتبہ بریلی میں قرآن سنانے کا اتفاق ہوا۔ ختم کے روز میرے بھائی نے تقسیم شیرینی کے لئے کہا۔ میں نے منع کیا لیکن انہوں نے کہا کیا مضائقہ ہے ان کا اصرار دیکھ کر میں نے سوچا کہ بہتر یہ ہے کہ ان کو خود ان خرابیوں کا مشاہدہ ہو جائے۔ چنانچہ میں خاموش ہو رہا شب کو شیرینی تقسیم کی گئی۔ اور انہوں نے اپنے اہتمام سے خود تقسیم کی۔ لوگوں کے بے ڈھنگے پن کو دیکھ کر وہ اس قدر پریشان ہوئے کہ بعد تقسیم خود کہا کہ آپ کی رائے بہت صائب تھی۔ واقعی یہ خرافات کبھی نہ کرنے چاہئیں اور اس کا احساس ان کی دانش مندی کی دلیل ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ بعض لوگ باوجود خرابیاں سمجھ جانے کے بعد اپنے خیال سے باز نہیں آتے اور اس کو نہیں چھوڑتے۔

یہ احکام تھے اس عشرہ اخیرہ کے متعلق۔ ان سب کو یاد رکھنا چاہیے اور کوشش کرنا چاہیے کہ ان پر پورے طور پر عمل ہو جائے اور جو لوگ مجمع میں حاضری نہیں ہیں ان کو بھی پہنچا دینا چاہیے اور خدا سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ توفیق عمل عطا فرمائے۔

اللهم تقبل منا امین بحرمة جاہ سید المرسلین.

تطہیر رمضان

اصلاح منکرات رمضان کے متعلق یہ وعظ ۲۱ شعبان ۱۳۱۹ھ
کو محلہ ٹھٹھڑہ میں بیٹھ کر فرمایا جو ۲ گھنٹہ میں ختم ہوا حاضری تخمیناً
۵۰۰ کی تھی۔ حکیم محمد مصطفیٰ بجنوری صاحب نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِیْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْهِ
وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یُّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا
مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ یُّضِلِلْهُ فَلَا هَادِیَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ
لَا شَرِیْكَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ صَلَّى
اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهِ وَاَصْحَابِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ
بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یا ایہا الذین امنوا کتب علیکم الصیام الخ

حسنات و سیئات

بوجہ قرب رمضان شریف مناسب ہے کہ کچھ احکام اس کے بیان کر دیئے جائیں۔ یہ تو معلوم ہے کہ روزہ فرض ہے۔ اس کے تو بیان کی ضرورت نہیں اور ایسے ہی تراویح سنت مؤکدہ ہونے کی وجہ سے ضروری ہے۔ اس کے بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ البتہ ضروری مضمون یہ ہے کہ بعض لوگوں نے اس مہینہ میں کچھ منکرات بڑھادیئے ہیں۔ اور جو اس کی یا تو عدم علم ہے یا قصور علم یا جانتے ہیں مگر احتیاط نہیں کرتے۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ اللہ میاں نے اس مہینہ میں ان چیزوں کو بھی حرام کر دیا جو پہلے حلال تھیں کیا یہ اس بات پر دال نہیں کہ جو چیز ہمیشہ سے حرام ہے اس میں شدت زیادہ ہو جائیگی۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے علت بیان کی روزہ رکھنے کی لعلکم تتقون، روزہ اس واسطے ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔ اب ہر شخص غور کرے کہ قبل رمضان میں اور رمضان میں کچھ فرق اس کی حالت میں ظاہر ہوا۔ اس نے نظر بد کو یا غیبت کو چھوڑ دیا یا نہیں۔ سو کچھ نہیں دونوں حالتیں یکساں ہیں۔ کسی باب میں بھی کمی نہیں ہوئی۔ اب رہا کھانا سو اس کے بھی وقت بدل دیئے مقدار میں کچھ تغیر نہیں

کیا۔ غرض یہ کہ شارع علیہ السلام کا تو مقصود یہ تھا کہ منکرات میں کمی ہو۔ مگر لوگوں نے کچھ بھی نہ کیا۔ اہل تحقیق تو کھانے تک میں بھی کمی کر دیتے ہیں۔ اس مہینہ میں یہ نسبت شعبان کے۔ مگر اس کی مقدار کچھ معین نہیں ہو سکتی ہے۔ جتنا شعبان میں کھاتے تھے اس سے کم کر دیا۔ بعض نے صرف بقدر لایموت کھا کر روزہ رکھا۔ جب ہی تو کچھ اثر پایا۔ ہمیشہ اچھی طرح کھایا ایک مہینہ عبادت ہی کے واسطے سہی۔ حاصل یہ کہ ان لوگوں نے اکل میں بھی کمی کر دی مگر یہ بات مندوب (مستحب) خواص کیلئے ہے یہ ہر شخص سے نہیں ہو سکتا ہے مگر معاصی تو چھوڑو۔ خیر کھانے کے لئے جواز کا مرتبہ تو ہے معاصی کے واسطے تو جواز بھی نہیں۔ ہم برخلاف اس کے دن بھر معاصی میں مشغول رہتے ہیں۔ بلکہ بعضے تو عصیان میں اور زیادہ ہو جاتے ہیں۔

اسی کو دیکھ لیجئے کہ صبح کی نماز اس مہینہ میں اپنے وقت پر ہوتی ہے یا نہیں۔ اس نماز کی تو وقت سے تاخیر کرنے کی عادت ہو گئی ہے بہتیروں کی تو قضا ہوتی ہے۔ اور قضا بھی ہو تو اس قدر تاخیر تو ہوتی ہے جس سے جماعت فوت ہو جائے خوش ہیں۔ کہ ہم نے روزہ رکھ لیا۔ بڑا تعجب ہے کہ نماز کو چھوڑ دیا روزہ کیا کفایت کر سکتا ہے اللہ تعالیٰ نے مغفرت کو اس قدر بڑھا دیا کہ دس ضعف ثواب کا وعدہ فرما دیا اور ہم اس قدر گناہ کرتے ہیں کہ حسنات باوجود اتنے بڑھائے جانے کے بعد بھی سینات کے برابر نہیں ہوتیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ حسنات کی تعداد بڑھی ہوئی رہتی۔ اس کو بھی جانے دیجئے برابر تو رہتی کہ پھر بھی حسنات بموجب مسبق رحمتی علیٰ غضبی (میری رحمت میرے غصہ پر غالب آگئی) کے غالب ہو جاتیں اور جب باوجود اضعافاً مضاعفہ ہونے کے بھی نیکیاں گناہوں کے برابر نہیں ہوئیں بلکہ گناہ بڑھا رہتا ہے تو پھر کیا حشر ہونا ہے۔

اچھا اس کو بھی جانے دیجئے اگر ہمیشہ ہم کو اس پر قادر نہیں کہ معاصی کو گھٹا دیں تو رمضان میں تو ایسا کر لیا جائے۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ عبادت کا اثر اس کے بعد گیارہ مہینہ تک رہتا ہے جو کوئی اس میں کوئی نیکی بحکلف کر لیتا ہے اس کے بعد اس پر باسانی قادر ہو جاتا ہے۔ اور کوئی کسی گناہ سے اس میں اجتناب کر لے تمام سال باسانی اجتناب کر سکتا ہے اور اس مہینہ میں معصیت سے اجتناب کرنا کچھ مشکل نہیں کیونکہ یہ بات ثابت ہے کہ شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں۔ پس جب شیاطین قید ہو گئے معاصی آپ ہی کم ہو جائیں گے۔ محرک کی قید ہو جانے کی وجہ سے۔ اور یہ لازم نہیں آتا کہ معاصی بالکل مفقود ہی ہو جائیں کیونکہ دوسرا محرک یعنی نفس تو باقی ہے اس مہینہ میں

وہ معصیت کرائے گا۔ مگر ہاں کم اثر ہوگا کیونکہ ایک ہی محرک رہ گیا۔ اس میں ایک مہینہ کی مشقت گوارہ کر لی جائے تو کوئی بات نہیں۔ غرض! اس میں ہر عضو کو گناہ سے بچایا جائے۔

زبان کے گناہ

ایک زبان ہی کے بیس گناہ ہیں جیسا کہ امام غزالی نے لکھا ہے کہ ایک ان میں سے کذب ہے جس کو لوگوں نے شیر مادر سمجھ رکھا ہے اور کذب وہ شے ہے کہ کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں اور پھر اس کو مسلمان کیسا خوشگوار سمجھتے ہیں ذرا سا بھی لگاؤ کذب کا ہو جائے بس معصیت ہوگئی۔ یہاں تک کہ ایک صحابیہ رضی اللہ عنہا نے ایک بچے سے بہلانے کے طور پر یوں کہا کہ یہاں آؤ چیز دیں گے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ آجائے تو کیا چیز دو گے۔ انہوں نے دکھایا کہ یہ کھجور ہے میرے ہاتھ میں۔ فرمایا کہ اگر تمہاری نیت میں کچھ نہ ہوتا تو یہ معصیت لکھ لی جاتی۔ حضرت! کذب یہ چیز ہے۔ خیر یہ تو بڑے لوگوں کی باتیں ہیں۔ اگر اس سے احتراز نہ ہو سکے تو کذب مضر سے تو بچنا چاہیے اور پھر روزہ میں۔

دوسرا گناہ زبان کا غیبت ہے لوگ یوں کہا کرتے ہیں کہ میاں ہم تو اس کے منہ پر کہہ دیں۔ منہ پر عیب جوئی کرو گے تو بہت اچھا کرو گے اور پیچھے تو ظاہر ہے جیسا اچھا ہے بلکہ اگر منہ پر برا کہو گے تو بدلا بھی تو پاؤ گے وہ شخص تمہیں برا کہہ لے گا یا اپنے اوپر سے اس الزام کو دفع کرے گا۔ پیچھے برائی کرنا تو دھوکے سے مارنا ہے یاد رکھو! جیسا کہ دوسرے کا مال محترم ہے ایسی ہی بلکہ اس سے زیادہ آبرو ہے چنانچہ جب آبرو پر آنتی ہے تو مال دولت کیا چیز ہے جان تک کی پرواہ نہیں رہتی۔ پھر آبرو ریزی کرنی والا کیسے حق العبد سے بری ہو سکتا ہے مگر غیبت ایسی رائج ہوئی ہے کہ باتوں میں احساس بھی نہیں ہوتا کہ غیبت ہوگئی یا نہیں۔ اس سے بچنے کی ترکیب تو بس یہی ہے کہ کسی کا بھلا یا برا اصلاً ذکر ہی نہ کیا جائے کیونکہ ذکر محمود بھی اگر کیا جائے کسی کا تو شیطان دوسرے کی برائی تک پہنچا دیتا ہے اور کہنے والا سمجھتا ہے کہ میں ایک ذکر محمود کر رہا ہوں اور اس طرح ایک خیر اور ایک شر مل جانے سے وہ خیر بھی کالعدم ہوگئی۔ اور حضرت اپنے ہی کام بہتیرے ہیں پہلے ان کو پورا کیجئے دوسروں کی کیا پڑی۔ علاوہ بریں غیبت تو گناہ بے لذت بھی ہے اور دنیا میں بھی مضر ہے جب دوسرا آدمی نے گا تو عداوت پیدا ہو جائیگی۔ اور پھر کیا ثمرات اس کے ہوں گے۔ اسی طرح زبان کے بہت گناہ ہیں سب سے بچنا ضروری ہے۔

افطار علی الحرام

ان کے علاوہ ایک گناہ جو خاص روزہ کے متعلق ہے افطار علی الحرام ہے۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ اس مہینہ میں حلال کا کھانا بھی ایک وقت میں حرام ہو گیا اور پھر دن بھر تو اسے لوگ چھوڑے رہیں اور شام کو حرام سے افطار کریں۔ اور دراصل بعض لوگوں نے خطبہ میں ڈال دیا ہے۔ یوں کہتے ہیں کہ رزق حلال تو پایا نہیں جاتا سوائے اس کے کہ دریا میں سے مچھلی شکار کر کے کھائی جائے یا سبزی کھا کر یا گھاس چر کر پیٹ بھر لیا جائے اور کچھ قصے اس کے متعلق مشہور کئے ہیں۔

وہ ایک بزرگ کا قصہ بیان کیا کرتے ہیں کہ ان کا بیل لڑتے لڑتے دوسرے کے کھیت میں چلا گیا تو انہوں نے اس کھیت کا غلہ کھانا چھوڑ دیا کہ نہ معلوم دوسرے کے کھیت کی مٹی جو میرے بیل کے کھر میں لگ کر بلا اجازت چلی آئی کون سے دانہ میں شامل ہو گئی ہو۔

اگر یہ قصہ ہوا ہے تو وہ صاحب حال ہے دوسروں کے لئے ان کا فعل حجت نہیں ہو سکتا۔ قصداً اتنا مبالغہ کرنا تقویٰ کا ہیضہ اسی کو کہتے ہیں جب اتنے شبہ کو بھی حرام میں داخل سمجھا جائے گا اور اس سے بچنا ظاہر ہے کہ مشکل ہے تو گمان یہ ہوگا کہ حرام سے بچنا مشکل ہے پس سب حراموں میں مبتلا ہو گئے اور حلال کو بالکل چھوڑ ہی دیا۔

میں کہتا ہوں کیا کنز و ہدایہ بالکل لغو ہی ہیں۔ جب یہی بات ٹھہری کہ حلال کا وجود ہی نہیں تو ناحق اتنا بسط کیا۔ صرف اتنا کافی تھا کہ الحلال لایوجد ہرگز نہیں جس پر کنز و ہدایہ فتویٰ دے دیں۔ وہ حلال ہے میں کہتا ہوں کیا سب علماء حرام خور ہیں۔

ایک بزرگ تھے مولانا مظفر حسین صاحب ان کی یہ حالت تھی کہ اگر کوئی ان کو مال حرام دھوکے سے بھی کھلا دیتا تھا تو قے ہو جایا کرتی تھی۔ اور پھر بھی وہ دونوں وقت کھانا کھاتے تھے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حلال کا وجود دنیا میں ضرور ہے ورنہ وہ کیا کھاتے تھے۔ اگر فرض کیجئے کہ مال حرام ہی کھاتے تھے تو طبیعت کو یہ نفرت نہیں ہو سکتی یا یہ کہ ہمیشہ قے ہی کیا کرتے ہوں گے تو کھانا فضول ہے۔

غرض! دنیا میں حلال بھی ہے حرام بھی ہے جو مسائل دریافت کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے مگر لوگ پوچھتے ہی نہیں اور یہ فساد پیدا کا ہے سے ہوا کہ لوگوں نے پوچھنا چھوڑ دیا۔ جو جی میں آیا کرتے رہے حتیٰ کہ اس کے عادی ہو گئے۔ اب جو کسی نے منع کیا تو اس کا چھوڑنا نہایت دشوار معلوم ہوا۔ بس کہہ دیا کہ میاں یہ لوگ تو خواہ مخواہ بھی حلال کو بھی حرام ہی کہا کرتے ہیں۔ ان کی تو غرض یہی ہے کہ مال نہ بڑھے

اور مسلمانوں کو ترقی نہ ہو۔ بس ہوتے ہوتے یہ ذہن میں جم گیا کہ ان کے یہاں تو سب چیز حرام ہی ہے کہ مال نہ بڑھے اور مسلمانوں کو ترقی نہ ہو۔ بس ہوتے ہوتے یہ ذہن میں جم گیا کہ ان کے یہاں تو سب چیز حرام ہی ہے حلال کا وجود ہی نہیں جو حلال تھا وہ بھی حرام ہی سمجھنے لگے اور اس خوف سے مفتی کے پاس جانا چھوڑ دیا کہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے کس معاملہ کو حرام بتادیں یا حلال بتادیں تو ہماری خاطر سے ہی شاید کہہ دیں اور فی نفسہ حرام ہی ہوگا کیونکہ حلال کا تو وجود ہی نہیں۔

سو یہ خیال بالکل غلط ہے بلکہ جس کو مفتی مباح کہے وہ عند اللہ مباح ہے اس میں کچھ حرج نہیں۔

شیطان کے جال

شیطان کے بہت سے جال ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دوسرے ڈالتا ہے کہ یہ سب حرام ہے۔ پھر بعض لوگ حرام و حلال میں خواہ مخواہ شبہ کر کے حلال کو بھی چھوڑ دیتے ہیں کہ جب اس میں دوسرے ہے تو چھوڑ ہی دو۔ چاہے مفتی کتنا ہی کہے کہ یہ حلال ہے مگر وہ اس کے چھوڑنے ہی کو اولیٰ سمجھتے ہیں۔ نہیں! اس فعل میں کچھ حرج نہیں جو مباح ہے۔ اہل علم سے پوچھ لو کہ کوئی وجہ اس میں اباحت کی بھی ہے یا نہیں۔ جس سے وہ منع کریں۔ اس پر عمل کرنے کے لئے ہمت باندھو اور اگر نفس کم ہمتی ہی کرے تو اس سے یوں کہو کہ یہ جو حکام وقت کے احکام ہیں ان کو کس طرح مانتا ہے اس کو بھی حاکم حقیقی کا حکم سمجھ کر مانو۔ پھر دوسرے لوگ بھی ان شاء اللہ تم سے معارضہ نہ کریں گے۔

میرا ہی خود قصہ ہے کہ کبھی زیور بنواتا تو چونکہ چاندی کے واسطے روپیہ دینے سے ربوا لازم آجاتا ہے۔ اس لئے جب کبھی زیور بنوانے کا اتفاق ہوتا۔ میں چاندی دوسری جگہ سے خرید کر اسے دیدیتا۔ دو ایک مرتبہ تو اس نے کہا کہ روپیہ دیدو پھر تول کر حساب کر دینا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ یہ میرے دین کے خلاف بات ہے۔ بس اس نے اس کو خوشی سے منظور کر لیا۔

تو لوگ سب مان جاتے ہیں۔ آدمی پکا چاہیے اور اللہ میاں کی طرف سے اسباب ویسے ہی پیدا ہو جاتے ہیں۔ خیال کر لیجئے کہ حاکم جب کسی امر شاق کا حکم دیتا ہے تو اس پر مامور کی اعانت بھی کیا کرتا ہے۔ حاصل یہ کہ دل کو مضبوط کرو اور اس پر عزم کر لو کہ ہم کوئی کام بلا پوچھنے نہ کریں گے۔

رزق میں برکت کے معنی

ہاں اس پوچھنے سے بعض صورتیں عدم جواز کی بھی نکلیں گی۔ اور اس میں آمدنی کبھی کم ہو جائے

گی۔ تو خوب سمجھ لو اور تجربہ کر لو کہ اس کم ہی میں برکت ہو جائیگی اور اس کے یہ معنی نہیں کہ کم چیز مقدار میں بڑھ جاتی ہے کہ بازار سے تو ایک من گےہوں لائے اور گھر پر آ کر دو من اترے ممکن تو ایسا بھی ہے۔ ایک صاحب خیر نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ مسجد بنوار ہے ہیں اور ایک تھیلی میں روپے رکھے تھے اور کام شروع کیا۔ جب ضرورت ہوتی اس میں ہی سے ہاتھ ڈال کر نکال لاتے۔ یہاں تک کہ سب کام بن گیا۔ حساب جو لگایا تو جتنا روپیہ تھا اس سے کم نہیں ہوا تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے مگر ہمیشہ ضرور نہیں۔ بلکہ اس کے معنی اور ہیں اور وہی اکثر واقع ہیں۔

وہ یہ کہ یہ مقدار قلیل تمہارے ہی صرف میں آئے بیماری میں خرچ نہ ہو اور ایسے ہی فضول خرچیوں میں مقدمات میں لا طائل (بیکار) تکلفات میں ضائع نہ جائے جو کچھ آئے تمہاری ہی ذات پر صرف ہو۔ چاہے تھوڑا ہو اس سے بہتر ہے کہ زیادہ آئے اور تم پر خرچ نہ ہو۔ اور آخر میں میں کہتا ہوں کہ نہ ہو برکت مگر خود اللہ میاں کی رضا ہی دنیا و مافیہا سے بہتر ہے اللہ میاں ملیں پھر کیا حقیقت ہے کسی چیز کی۔ مال و دولت کے مقابلہ میں کیا اللہ میاں کی کچھ وقعت نہیں سمجھتے ہو۔ حضرت اللہ میاں کی رضا وہ چیز ہے کہ جس کی نسبت ایک بزرگ کہتے ہیں۔

بہاں اے آنکہ جز تو پاک نیست

دنیا کے حکام کی صرف خوشنودی کے واسطے کتنے کتنے سفر اور کیا کیا کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے اور پھر ان کی خوشنودی دیر پا نہیں۔ ذرا سی بات پر بگڑ گئے اور اللہ میاں فرماتے ہیں کہ ہم شکور ہیں خیال کیجئے اس لفظ کو!

ایک بادشاہ کے سامنے کوئی چیز لے جائیے اور وہ اس کی نسبت منظور و عدم منظوری کچھ ظاہر نہ کرے مگر اس میں کوئی عیب نہ نکالے اور خازن کو حکم دیدے کہ رکھ لو۔ تو لے جانے والے کے دماغ آسمان پر پہنچ جائیں گے اور سناٹا پھرے گا کہ بادشاہ نے ہمارا ہدیہ رکھ لیا اور اللہ میاں کے یہاں ہم لوگ اپنے اعمال لے جاتے ہیں اور ذرا ان اعمال کو بھی دیکھ لیجئے کہ وہ کس قابل ہیں۔

ہم اور ہماری نمازیں

ایک نماز ہی کو لے لیجئے۔ اس وقت نظیر کے واسطے کھڑے ہوتے ہیں اللہ میاں سے باتیں کرنے کو اور کرتے ہیں کس سے گاؤں سے۔ یا یوں مثال دیجئے کہ ایک بادشاہ نے محض اپنی عنایت سے اپنے غلام کو دربار میں حاضری کی اجازت دی۔ بلکہ یوں کہئے کہ زبردستی طلب کیا۔

(ہم لوگ ایسے بھلے مانس تو کاہے کو ہیں کہ حاضری کی اجازت سے ہی دربار میں پہنچنے کو نعمت سمجھیں) زبردستی بلائے ہوئے بلکہ پابہ زنجیر ہو کر دربار میں پہنچے اور کام ہم سے کیا ہے کہ بادشاہ کو ان پر رحم آیا ہے اور چاہتا ہے کہ ان سے دربار میں کچھ گفتگو کرے کہ درباریوں اور تمام رعایا میں ان کی عزت ہو جائے اپنا کچھ نفع مقصود نہیں۔

من نہ کردم خلق تا سودے کنم ☆ بلکہ تربرندگان جو دے کنم
(میں نے مخلوق کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ ان سے نفع حاصل کروں بلکہ اس لئے پیدا کیا کہ ان پر جو دو سخاوت کروں) ہائے۔

من نہ کردم خلق تا سودے کنم ☆ بلکہ تا برندگان جو دے کنم
(میں نے مخلوق کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ ان سے نفع حاصل کروں بلکہ اس لئے پیدا کیا کہ ان پر جو دو سخاوت کروں)

اللہ میاں کا کیا نفع ہے ہمارے پیدا کرنے یا عزت دینے سے۔ خیر! ان حضرت نے کیا مکافات کی اس بلانے کی کہ پہنچتے ہی منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے اور کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ مگر بادشاہ تو کم ظرف نہیں ہے۔ اس گستاخی پر نظیر نہیں کرتا اور حکم دیتا ہے اپنے خادموں کو کہ اس بے وقوف کی انگلیاں کانوں سے نکال دو بلکہ ہاتھ باندھ دو کہ پھر انگلیاں کانوں میں نہ دے سکے اور منہ اس کا ہماری طرف کر دو اور جلدی سے کچھ شفقت آمیز کلمات زبان سے فرمانے لگا کہ ایک دفعہ تو اس کے کان میں پڑ جائیں۔

دیکھیں تو معلوم کیسے نہیں ہوتا۔ مگر یہ قسم کھا کر چلے ہیں کہ الٹا ہی کریں گے چٹ سے پھر انگلیاں کانوں کی طرف بڑھائیں مگر ہاتھ بندھے ہوئے تھے جلدی سے اس خوف سے کہ کہیں محبوب کا کلام کان میں پڑ جائے اس جگہ سے بھاگ اصطبل میں گھوڑے کے پاس جا چھپے۔ وہاں آدمی پکڑنے کے لئے پہنچا گدھے کے پاس جا چھپے۔ غرض ایک گھنٹہ بھر یہی کیفیت رہی کہ یہ بھاگا گئے اور بادشاہ کے توکر بلکہ خود بادشاہ۔ اللہ اکبر! ان کے پیچھے پھرا کیا۔ مگر انہوں نے وہی کیا۔ جو شامت اعمال سے ہونا تھا۔

اب فرمائیے کہ یہ شخص کس سزا کا مستحق ہے۔ یا بادشاہ کو اس پر رحم آنا چاہیے یہ تو اس قابل ہے کہ اگر ایک دفعہ بھی یہ حرکت اس نے کی ہے تو توہین بادشاہ کے جرم میں اس کو لے لیا جائے

اور دربار کی حاضری کی کبھی اجازت نہ ہو۔ اب آپ اپنے معاملہ کو اللہ میاں کے ساتھ دیکھ لیجئے کہ ادھر سے تو حاضری کی اجازت ہر وقت یعنی نفل نماز کے لئے اجازت ہے جب چاہو پڑھو (باستثناء تھوڑے سے وقتوں کے) مگر ہمیں تو فنیق نہیں ہوتی کہ اس اجازت کو غنیمت سمجھیں یہاں تک کہ پکڑ کر بلانے کی نوبت پہنچی یعنی فرض نماز کا وقت آیا۔ نہایت کاہلی کے ساتھ گرتے پڑتے پہنچے۔ برا بھلا وضو کیا اور بہ اکراہ نیت نماز کی یعنی سامنے باتیں کرنے کو کھڑے کئے گئے۔ کھڑے ہوتے ہی منہ ایسا پھیرا کہ کچھ خبر نہیں صرف الفاظ زبان پر جاری ہیں دھوکا دینے کے واسطے آداب شاہی بجالا رہے ہیں یعنی سبحانک اللہم (اے اللہ تو ہر عیب سے پاک ہے) پڑھا۔ اللہ میاں نے اس منہ پھیرنے پر نظر نہ کی اور کلام شروع کیا۔ چنانچہ الحمد للہ رب العالمین (سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو سارے جہانوں کے پروردگار ہیں) پر جواب ملنا حدیثوں میں آیا ہے۔ ذرا سی بھٹک کان میں پڑتے ہی ایسے بھاگے کہ سیدھے گھر آ کر دم لیا۔ کبھی بیوی کے پاس، کبھی بچوں کے پاس، کبھی مکان میں۔ کبھی طویلہ میں پھرا کئے۔ مراد اس سے خیالات کی جولانی ہے۔

غرض یہی مسخر اپن کیا کئے یہاں تک کہ بمشکل تمام دربار کی حاضری ختم تک پہنچی یعنی سلام پھیرا۔ بڑی خیر ہوئی۔ بادشاہ کی ہم کلامی سے بچ گئے۔ جانے وہ کاٹ کھاتا یا کیا کرتا تھا (یہ خبر نہیں کہ کیا کرتا اور کیا ہوتا اور یہ کیا پاتے)

سنا! اب ان گستاخوں کی سزا وہی ہونی چاہیے تھی یا نہیں جو مثال میں میں نے عرض کی کہ اگر ایک دفعہ بھی ہم ایسی نماز پڑھتے تو کبھی اللہ میاں کے یہاں ہم کو گھسنے نہ دیا جاتا اور فوراً دربار سے نکلتے ہی گرفتاری اور جس دوام کاروبار جاری ہو جاتا۔ مگر سنئے! کہ اللہ میاں سے کیا رو بکار جاری ہوا و کان سعیکم مشکوراً (اور تمہاری کوشش (جو دنیا میں کرتے تھے) مقبول ہوئی)۔ اس نے دربار میں آ کر اتنی دیر کی مصاحبت کو بہت اچھی طرح انجام دیا۔

مر جانے کی بات ہے اچھی طرح تو جیسے انجام دی وہ ہم بھی خوب جانتے ہیں اور جو وہاں حاضر تھے انہوں نے بھی خوب دیکھا بلکہ حاضرین کے سامنے شرم رکھنے کے واسطے فرماتے ہیں فاولنک یبدل اللہ سیناتہم حسنات (پس ایسے لوگوں کے اللہ تعالیٰ گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیتے ہیں) گویا یہ بے وقوف ہے کتنی ہی گستاخیاں کیں مگر ہم اس آنے کو حاضری ہی میں لکھے لیتے ہیں اور اس کی وہی عزت کی جائے جو باقاعدہ آنے والے کی کی جاتی ہے۔ اب

فرمائیے! کہ اگر ایک مرتبہ ایسا معاملہ بادشاہ کسی کے ساتھ کرے تو کیا دوبارہ اس شخص کی ہمت پڑ سکتی ہے کہ پھر اسی طرح وحشیانہ طریق سے دربار میں جائے ہرگز نہیں۔ بلکہ سر سے پیر تک نجالت کے پسینہ میں غرق ہو جائے گا۔ مگر ہم ایسے احسان فراموش ہیں کہ ایک دو دفعہ کیا معنی سینکڑوں بار بلکہ ہر روز پانچ بار یہی جفا کاری کرتے ہیں۔ مگر ادھر سے مطلق خیال نہیں کیا جاتا۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ ان لنگڑے لو لے اعمال (بلکہ اعمال کیسے کہا جاسکتا ہے بد اعمالیوں) میں بھی کمی اور کوتاہی ہے۔ بلکہ خدا تعالیٰ کے محرمات کی طرف میلان ہے۔

صاحبو! ذرا شرماء اور عمل کرو اور حرام سے بچو۔ خاص کر رمضان کے مہینہ میں یہ منکرات تو روزہ کے ہوئے۔

تراویح کی منکرات

اب ایک عمل اور ہے خاص رمضان کا۔ جیسے دن کا عمل روزہ ہے ایسے رات کا عمل قیام ہے۔ اس میں یوں خط کر دیا کہ تراویح کی بیس رکعت گنتی میں تو پوری کر لیں۔ مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان میں کتنی رکعت پڑھی جاتی ہے یا انجیل پڑھی جاتی ہے یا تو شروع کا حرف سمجھ میں آتا ہے یا رکوع کی تکبیر۔ ایک حافظ کا قصہ ہے کہ قرآن شریف پڑھتے پڑھتے جہاں بھولے وہاں کچھ اپنی تصنیف سے پڑھ دیا بڑی تعریف ہوتی رہی مدتوں کہ ان کو کہیں متشابہ بھی نہیں لگتا لا حول ولا قوۃ الا باللہ! صاحبو! اللہ میاں کو دھوکا مت دو۔ بیس رکعتیں گنا کر ڈاڑھنگ سے بھی تو کرو۔

ایک یہ ظلم ہوتا ہے کہ حافظ مقتدیوں کو بہکاتا ہے اس طرح سے کہ قراۃ کو اتنا طول دیتا ہے کہ کوئی ٹھہر ہی نہ سکے پانچ پانچ سیپارہ ایک ایک رکعت میں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو فرماتے ہیں بشرا ولا تنفرا ویسرا ولا تعسرا خوش خبری سناؤ اور نفرت مت دلاؤ اور آسانی کرو اور تنگی میں مت ڈالو۔

شبینہ کی بدعات و منکرات

ہاں ایسا ہی شوق ہے تو تہجد میں پڑھو جتنا چاہو اور اس میں اور جس کا جی چاہے شریک ہو جائے۔ مگر اس میں بھی امام کے علاوہ تین سے زیادہ جماعت میں نہ ہوں۔ کہ فقہاء نے مکروہ کہا ہے کیونکہ پھر نفل میں فرض کا سا اہتمام ہو جائے گا۔

بعضے لوگ ایک ہی شب میں ختم کرتے ہیں جسے شبینہ کہتے ہیں اس میں تو کئی بدعتیں ہیں۔ غور کر کے دیکھ لیجئے کہ اس میں نیت صرف نمود کی ہوتی ہے کیا امام اور کیا مہتمم اور کیا سامعین۔ امام تو داد ملنے کے امیدوار رہتے ہیں کہ جہاں سلام پھیرا اور لوگوں نے منہ پر تعریف کر دی تو خوش ہو گئے ورنہ پڑھا بھی نہیں جاتا۔ حدیث شریف میں منہ پر تعریف کرنے والے کے لئے حکم ہے کہ اس کے منہ میں خاک جھونک دو۔ اور امام صاحب کے قلب پر بھی اثر ہوتا ہی ہے اور اسی تعریف کرانے کو بعضے امام تو لقمہ بھی نہیں لیتے۔ اسی وجہ سے کہ لوگ کہیں گے کہ اچھایا دہیں اور مہتمم تو سامعین میں شامل نہیں ہوتے۔ چائے پانی سے ہی فرصت ہی نہیں ہوتی۔

میں پوچھتا ہوں کہ شبینہ سے چائے پانی مقصود ہے یا قرأت و سماعت قرآن ایک شے میں البتہ چائے سے مدد مل جاتی ہے سماعت اور قرأت میں۔ مگر جب ذریعہ مقصود میں مخل ہو جائے تو ذریعہ کہاں رہا۔ اور یہ بھی جانے دیجئے مہتمم صاحب کو تو یہ ثابت کرنا منظور ہے کہ ہمارے یہاں فانی مسجد سے اہتمام اچھا رہا۔ بس چائے پانی اچھا رہا مگر اصل شے تو اچھی نہیں رہی۔

رہے سامعین تو انصاف سے کہہ دیجئے کہ وہ قرآن شریف سننے کے لئے آتے یا نماز کے ساتھ دل لگی کرنے کو۔ کچھ کھڑے ہیں کچھ بیٹھے ہیں، کچھ کبھی کھڑے ہو جاتے ہیں کبھی بیٹھ جاتے ہیں۔ کبھی کچھ لوگ بیٹھ بھی نہ سکے تو نیت توڑ کر لیٹے لیٹے سن رہے ہیں اور کریں بھی کیا۔ بیچارے گھنٹوں تک کیسے کھڑے رہ سکتے ہیں اور بعضے جو اپنے اوپر جبر کر کے کھڑے بھی ہیں تو امام کی زلتوں کو چھوڑتے جاتے ہیں۔ وہ خواہ کیسی ہی غلطی کرتا چلا جائے بتلا نہیں سکتے کیونکہ حرج ہوگا اور قرآن شریف ختم سے رہ جائیگا۔ اور بعضے تو یہ غضب کرتے ہیں کہ خارج صلوٰۃ سے لقمہ دیئے جاتے ہیں اس صورت میں اگر امام نے لیا تو نماز سب کی فاسد ہوئی اور نہ لیا تو وہ غلطی اگر مغیر معنی ہیں تو یوں نماز فاسد ہوئی۔ اب ان سامعین کا گھنٹوں سے اپنے اوپر جبر کرنا بالکل ضائع گیا۔ علیحدہ علیحدہ بیٹھ کر سننا اور یہ برابر ہوا۔ اور تکلیف مفت میں ہوئی۔ غرض لقمہ لینے کی صورت میں بھی معصیت ابطال عمل کی لازم آئی۔ اور نہ لینے سے بھی نماز فاسد ہوئی۔ اب سب صورتوں کو ملا کر آپ ہی کہہ دیجئے کہ نماز ہے یا کھیل۔ احکام ظاہری کے لحاظ سے بھی تو نماز صحیح نہ ہوئی خشوع و خضوع کا تو ذکر ہی کیا۔

ایک خرابی شبینہ کی یہ بھی ہے کہ اکثر نفل کی جماعت لازم آتی ہے کیونکہ بعض ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اس کو تراویح کی جماعت میں کرتے ہیں کیونکہ سب مقتدیوں سے نہیں ہو سکتا کہ اول

سے آخر تک شریک رہیں اور اسی کو تراویح رکھیں اس لئے تراویح علیحدہ پڑھ لیتے ہیں پھر نفلوں میں اس کو پڑھتے ہیں اور نفلوں میں نماز مکروہ ہے۔

غرض! بہت سے منکرات اس شبینہ میں لازم آتے ہیں منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ بعض حفاظ اپنا پڑھنے کے بعد مغالطہ دینے آتے ہیں۔ یہاں آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سننے کو آئے ہیں اور یہ بے ادبی نہیں ہے اور ایسے ہی بہت سے بدعات ہیں۔

ہاں اگر شبینہ میں ختم ہی مد نظر ہے (مگر اخلاص کو غور کر لیجئے گا) تو امر حسن ہے۔ اس میں اعلان کی ضرورت نہیں تاکہ ریادہ سمع سے خالی رہے۔ جتنی ہمت ہو قرآن شریف پڑھو۔ امام کو گڑبڑ میں نہ ڈالو۔ اور سب منکرات مذکور سے بچو۔

ایک بدعت رمضان میں یہ ہے کہ نامحرم حفاظ گھروں میں جا کر عورتوں کو محراب سناتے ہیں۔ اس میں چند قباحتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اجنبی مرد کی آواز جب وہ خوش آوازی کا قصد کرے عورت کے لئے ایسی ہے جیسے اجنبی عورت کی آواز مرد کے لئے۔ اور رواج یہی ہے کہ خوش آواز مرد تلاش کئے جاتے ہیں اور حافظ صاحب بھی مردوں کی جماعت میں تو شاید سادہ سادہ ہی پڑھتے ہیں یہاں خوب بنانا کراہا کرتے ہیں۔ سو عورتوں کے لئے جماعت کی ضرورت ہی کیا ہے اپنی اپنی الگ پڑھیں اور کچھ ضرورت محراب سننے کی نہیں ہے۔ اگر حافظ ہیں تو فرادی فرادی اپنی تراویح میں ختم کر لیں اور اگر حافظ نہیں ہیں تو الم تر کیف سے پڑھ لیں اور ناظرہ جتنا ہو سکے پڑھ لیا کریں۔ کیوں روپیہ خرچ کر کے گناہ مول لیا جائے۔

اجرتاً قرآن خوانی

دوسری بدعت اس میں استیجار علی العبادۃ ہے یعنی حافظ صاحب سے اجرت دیکر قرآن شریف پڑھوایا جاتا ہے اور استیجار علی العبادۃ حرام ہے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قبر پر حافظ کو مقرر کرنا جائز نہیں کیونکہ اس میں بھی استیجار علی العبادۃ ہے۔

اس پر بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کیا ہو گیا ہے علماء کو میت کا ثواب ہی بند کر دیا۔ ہم کہتے ہیں اس کا ثواب ہی نہیں پہنچتا پھر بند کیا کر دیا۔ کیونکہ ثواب پہنچنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اول عمل خیر کرنے والے کو ثواب ملتا ہے پھر اس کو اختیار ہے جسے چاہے بخش دے۔ جیسے اپنا مال جسے چاہے دیدے اور یہاں خود کو ہی ثواب نہیں ملتا تو بخشا ہی کیا۔

اگر کوئی کہے کہ قرآن شریف کا پڑھنا ثواب کی بات ہے اور اجرت لینا گناہ۔ تو ایک معصیت اور ایک ثواب ہو گیا تو ثواب پہنچ جائے گا اور گناہ ہمارے ذمہ رہ جائے گا۔ پھر ہم توبہ کر لیں گے تو یہ عمل حسن رہ گیا۔ تو ہم کہیں گے انما الاعمال بالنیات (بیشک اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے) قاری کی نیت دیکھ لیجئے کہ استحصال مال ہے نہ ثواب۔ پھر ثواب کہاں جب اسی کو ثواب نہ ملا تو دوسرے کو کیا بخشے گا۔

لوگ یہاں کہتے ہیں کہ یہ استیجار علی العبادۃ نہیں کیونکہ ہم کوئی مقدار مقرر نہیں کرتے جو ہمارے مقدر میں ہے وہ پہنچتا ہے سبحان اللہ! المعروف کا لمشر وط۔ جو بات مشہور ہوتی ہے اس میں ٹھہرانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر کسی طرح معلوم ہو جائے کہ یہاں کچھ نہ ملے گا وسط رمضان ہی میں حافظ صاحب چھوڑ کر بیٹھ رہیں۔ ثابت یہ ہوا کہ مقصود حافظ کو اجرت ہی ہے ختم سے بحث نہیں۔ اگر کوئی شخص خالی الذہن ہو اور اس جگہ رواج بھی دینے کا نہ ہو تو جو کچھ ہدیہ قبول کیا جائے اس میں کچھ حرج نہیں۔ بلکہ ان کو ان کی ضرورت کے موافق بطور ہدیہ دیدیا کرو اور چونکہ اس طرح سے دینے کی عادت نہیں اسی وجہ سے ان کی نیتوں میں فساد پیدا ہو گئے اگر بلا سوال وحیلہ ان کو دے دیا جایا کرے تو یہ نوبت کا ہے کو آئے۔

ایک طالب علم کا قصہ ہے کہ وہ ایک جگہ پڑھنے گئے کھانا مقرر نہ ہوا۔ اتفاق سے ایک موت ہو گئی۔ اوروں کے لئے تو غمی تھی۔ مگر اس بیچارے کے لئے عید کا دن آ گیا۔ ان کا کھانا چالیس دن کے لئے مقرر ہو گیا غنیمت سمجھا۔ جب چلہ قریب ختم پہنچا تو فکر ہوئی کہ پھر وہی فاقہ آتا ہے۔ اتفاق سے چلہ ختم بھی نہ ہوا تھا۔ کہ ایک اور موت ہو گئی۔ ان کے ایک چلہ کا سامان اور ہو گیا۔

غرض! اسی طرح کئی موٹے موٹے یکے بعد دیگرے لڑھک گئے۔ ان طالب علم کو چاٹ لگ گئی اور ہر وقت انتظار میں رہنے لگے کہ کسی طرح کوئی مرے۔ ایک روز ایک شخص نے کہا یہ طالب علم سارے محلہ کو اسی طرح کھا جائے گا ورنہ اس کا کھانا مقرر کر دو۔ کہیں اس طرح بھی اللہ میاں پہنچا دیتے ہیں۔

غرض! یہ نوبت بد نیتی کی کا ہے سے پہنچی۔ صرف مستحقین کی خبر نہ لینے سے۔ یوں تو کبھی سالن بھی ڈھنگ سے نہ ملے ہاں جمعرات کے دن حلوے آجائیں گے اور جو کوئی جمعرات کی تخصیص سے منع کرے تو برا معلوم ہوگا۔

صاحبو! کیا آٹھ دن کا کھانا ایک دن کھا سکتے ہو۔ طالب علم غریب نے کیا قصور کیا ہے کہ ہفتہ بھر تک توفیق نہ کر آو اور ایک دن اتنا لا کر رکھ دو کہ کھانہ سکے۔ چاہیے کہ ان کی خدمت کر دی جایا کرے تاکہ ان کی نیت نہ بگڑے۔ لوگوں نے اس کو تو بالکل چھوڑ ہی دیا۔ اور سب اس کا یہ ہے کہ خادمان دین کو لوگ حقیر سمجھتے ہیں اس لئے نہ ان کی کچھ وقعت ہے نہ خدمت۔ اور اسی وجہ سے یہ بھی رواج ہو گیا کہ مؤذن وہی ہوتا ہے جو کسی کام کا نہ ہو۔ لوے، لنگڑے، اپانچ جو کسی کام کے نہ رہیں وہ مؤذن بن جاتے ہیں پھر کوئی خبر نہیں لیتا۔ اس وجہ سے نیتیں بگڑ گئیں۔

ایک میت کا چادر کسی نے ایک فقیر کو دیدیا تھا۔ مؤذن کو جو خبر لگی تو فوراً پہنچے کہ واہ صاحب میرا حق اس کو دیدیا۔ خدا خدا کر کے تو یہ دن آتا ہے اس میں بھی ہمارا حق اوروں کو دیدیتے ہو۔

بے شک یہی بات ہے بہت انتظار کے بعد یہ دن نصیب ہوتا ہے مگر اس میں اس کا قصور نہیں ہے۔ بلکہ ایک پورے محلہ کا قصور ہے کیوں یہ نوبت پہنچائی اگر ہم لوگ مقرر کر لیں کہ گیارہ مہینوں میں اپنے کپڑوں کے ساتھ ایک کپڑا ان کو بھی بنادیں اور جہاں آپ کھاتے ہیں کبھی کبھی ان کی بھی دعوت کر دیا کریں اور اپنے خرچ کے روپوں کے ساتھ ان کے لئے بھی کچھ روپیہ نکال دیا کریں۔

غرض! غیر رمضان میں ان کی برابر خبر گیری کرتے رہا کریں۔ پھر رمضان شریف میں ان سے سوال کیا جائے کہ قرآن شریف سنا دیجئے تو کیا نہیں سنا دیں گے ضرور اور بخوشی منظور کر لیں گے۔ اس میں استیجار علی العبادۃ وغیرہ کی کوئی قباحت لازم نہ آئے گی۔

غرض! اجرت پر حافظ سے قرآن شریف پڑھوانا جائز نہیں اور ایسے ہی عورتوں کو گھروں میں سنانا مناسب نہیں۔ میں کہتا ہوں جب عورتوں کو مسجد میں آنے سے روکا گیا ہے تو عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ مقصود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف مباحثت ہے مردوں اور عورتوں میں اور یہاں اختلاط لازم آتا ہے۔ کیا حاجت ہے عورتوں کو قرآن ختم سننے کی۔ جب شارع علیہ السلام ہی کی طرف سے لازم نہیں کیا گیا تو ان کے ذمہ کچھ ضرور نہیں ہے۔ بس الم تر کیف سے پڑھ لیا کریں۔

ایک خرابی اور ہوتی ہے کہ جب ایک جگہ حافظ عورتوں کے سنانے کے لئے مقرر کیا جاتا ہے تو سارے محلہ سے عورتیں آکر جمع ہوتی ہیں اور اس میں خروج بلا ضرورت ہے اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے المرأة عورة عورت چھپانے کی چیز ہے۔

چراغوں کی بدعت

ایک بدعت رمضان شریف میں چراغوں کی کثرت ہے ختم کے روز۔ لوگ یوں کہتے ہیں کہ اس میں شوکت اسلام ہے۔ ہم کہتے ہیں رمضان میں ہی اظہار شوکت اسلام کی ضرورت ہے یا باقی تمام مہینوں میں بھی۔ تو ہمیشہ چراغ بہت سے جلایا کیجئے۔ یا یوں کہئے کہ اور دنوں میں اسلام کے چھپانے کا حکم ہے۔

خوب جان لیجئے کہ شوکت اعمال صالحہ ہی میں ہے۔ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ سنا ہوگا کہ جس وقت شام کو گئے ہیں اور نصاریٰ کے شہر کے پاس پہنچے تو کپڑوں میں پیوند لگے ہوئے تھے اور سواری میں اونٹ تھا۔ اس پر بھی خود سوار نہیں تھے۔ غلام سوار تھا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ یہاں اظہار شوکت کا موقع ہے کم سے کم گھوڑے پر سوار ہو جائیے آپ نے بہت اصرار سے منظور کر لیا جب سوار ہوئے تو گھوڑے نے کودنا، اچھلنا شروع کیا۔ آپ فوراً اتر پڑے کہ اس سے نفس میں عجب پیدا ہوتا ہے (اللہ اکبر!) کیا پاکیزہ نفس حضرات تھے اپنے قلب کا خیال ہر وقت رہتا تھا) اور اظہار شوکت کے جواب میں فرمایا۔ نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام۔ ہم وہ قوم ہیں کہ اسلام سے ہی ہماری عزت ہے۔

چراغوں سے کہیں شوکت ہو سکتی ہے۔ شوکت اسلام تو اسلام ہی سے ہے۔ اسلام کو کامل کرو۔ میں کہتا ہوں ٹول کر دیکھ لو دلوں کو کہ اگر کوئی اور شخص تمہارے سوا مساجد کی زینت کر دے تو تمہیں ویسی خوشی ہوگی۔ جیسی کہ اس بات سے ہوتی کہ ہم نے اپنے خرچ یا اہتمام سے زینت کی ہے غور کر لیجئے کہ نہ ہوگی۔

بس معلوم ہوا کہ صرف اپنا نام جتانے کیلئے ہے۔ ورنہ اظہار شوکت تو دونوں حالت میں برابر تھا۔ پھر ایک صورت میں فرحت کم کیوں ہوئی اور اس سے تو یہ روپیہ باذن مالک اگر موزن کو دے دیا جاتا تو اولیٰ تھا۔ مگر اس کو کیوں دیتے نام کیسے ہوتا کیا یہ اسراف نہیں ہے؟

میں کہتا ہوں اسراف کے معنی ہیں صرف المال بلا غرض محمود۔ اور غرض کئی طرح کی ہوتی ہے اول غرض رفع ضرورت ہے۔ یعنی ہر چیز کو اس مقدار پر اختیار کرنا کہ اس سے کم میں نہ ہو سکے۔

لباس کی اغراض

مثلاً لباس کہ درجہ اول اس کی غرض کار رفع ضرورت ہے۔ یعنی ستر اور یہ غرض ناٹ سے بھی

حاصل ہو سکتی ہے دوسری غرض آرائش ہے۔ یہ لباس میں ناٹ سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ سردی کے موسم میں تھوڑی روئی کے لحاف سے بھی حاصل نہیں ہوتی جب تک کافی روئی نہ ہو شریعت میں اس کی بھی اجازت دی گئی ہے۔ تیسری غرض آرائش ہے اور یہ بھی شریعت میں جائز ہے ان اللہ جمیل و یحب الجمال۔ پس آرائش مباح ہے اور اس میں طبائع مختلف ہوتی ہیں۔

بعضوں کو غرض تو آرائش سے تحدیث بالنعمت یعنی خدا تعالیٰ کی نعمت کا اظہار ہوا کرتی ہے۔ اور یہ محمود ہے اور بعضوں کی غرض آرائش ہے یہ ہوتی ہے کہ محتاج لوگ اس کی وسعت کو دیکھیں اور اپنی حاجت کا سوال کریں (جیسا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے) وہ یہ کہ اللہ میاں کو اچھا معلوم ہوا اور اس سے اچھی کوئی غرض نہیں ہو سکتی۔ دکھایا بھی جائے تو اللہ میاں کو۔ ایک غرض مباح ہے آرائش سے۔ وہ یہ کہ اپنے ہی نفس کو لذت و فرحت ہو۔ اس میں بھی کوئی کچھ حرج نہیں۔ یہ غرض صرف مال کی تو محمود ہیں۔ اور اغراض میں سے ایک غرض مذموم بھی ہے اور وہ ریا و نمائش ہے۔ تو جان لو کہ اول تو نفس ریا ہی جائز نہیں۔ پھر اس کثرت چراغ کے متعلق ایک دوسرا مقدمہ اور قابل نظر ہے۔

وہ یہ کہ معصیت کو معصیت سمجھ کر کرنا اہل ہے اس سے کہ معصیت کو دین سمجھ کر کیا جائے تو چراغ ریا کے لئے جلانے جاتے ہیں اور ریا معصیت ہے پھر یہ لوگ اس کو دین اور ثواب سمجھتے ہیں تو کتنی سخت بات ہوئی یہ قباحتیں ہیں روشنی میں۔

علاوہ بریں اہتمام کرنے والے تو روشنی ہی میں مشغول رہتے ہیں۔ نماز میں ان کا دل نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض اوقات جسمی شرکت بھی نہیں ہوتی۔ اس روز کی تراویح ان کو معاف ہو جاتی ہے کہیں صفوں کے بیچ میں پھرتے ہیں۔ کہیں ایک صف سے دوسری صف میں جاتے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو کوئی گردنوں کو پھلانگے گا اس کو پل کی طرح ڈال دیا جائے گا قیامت کے روز کہ مخلوق اس پر سے ہو کر گزرے گی۔

اتنے احکام کی مخالفت لازم آتی ہے روشنی میں۔ میں کہتا ہوں قرآن شریف اور احادیث کے احکام کیا اس لئے کہ بت پرست اس پر عمل کریں یا نصاریٰ عمل کریں اور مسلمان اپنے ہاتھوں میں لے کر بس فخر ہی کر لیا کریں۔ کچھ بعید نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت میں شکایت

فرمادیں۔ یارب ان قومی اتخذوا هذا القرآن مہجوداً۔ قرآن کو صاف اپنے گھروں میں رکھنا اور زبان سے پڑھنا کافی نہیں بلکہ جو کچھ اس کے اندر ہے اس کو بھی دیکھو اور دل پر اثر ڈالو۔

ختم کی مٹھائی کے منکرات

ایک منکر ختم کے دن شیرینی کا تقسیم کرنا ہے اور اس کا منکر ہونا خلاف ظاہر ہے مگر میں سمجھائے دیتا ہوں۔ یہ مٹھائی اگر ایک شخص کی رقم سے آتی ہے تو اس کا مقصود ریاء و اشتہار و افتخار ہوتا ہے۔ اور اگر چندہ سے ہوتی ہے تو اس کی تحصیل میں جبر سے کام لیا جاتا ہے اور جبر جیسا ایلام بدن سے ہوتا ہے۔ ایسا ہی ایلام قلب سے بھی۔ جب دوسرے کو دبایا شرمایا تو جبر میں کیا شبہ رہا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ اس کا حکم اسی غصب کا سا ہے جو لاٹھی کے زور سے ہو۔ اللہ میاں! اس تھوڑے ہی میں برکت دیتے ہیں جو رضا و خوشی کے ساتھ دیا جائے۔ اس کا خیال بہت ہی کم لوگ کرتے ہیں۔ اکثر مسجدوں کے لئے بھی لوگوں سے محصل کی وجاہت کے ذریعہ سے وصول کرتے ہیں۔ پھر اس میں بھی بعض محض فضول زینت کے لئے جس کی ممانعت آئی ہے اگرچہ اپنے ہی مال سے ہو ہاں! آرائش بالطبع کسی قدر ہو تو مضائقہ نہیں۔ اور اس کی تو کسی درجہ میں ضرورت ہی نہیں کہ لوگوں سے غصب کر کر کے آرائش میں خرچ کیا جائے۔ مسجد چھپر کی بھی ادائے نماز کے لئے کافی ہے بلکہ جو مقصود ہے یعنی خشوع وہ چھپر میں پکی مسجد سے کچھ کم نہیں ادا ہوتا۔ بلکہ اس کے نقش و نگار میں ہی خیال بٹ جاتا ہے اور وہ اس سے محفوظ ہے۔ تو جب اصل مقصود ہی حاصل نہ ہوا تو یہ تزئین کیا کریگی۔

ایسا ہی حال ہے مٹھائی میں کہ اس میں بھی کہیں جبر کہیں تفاخر ہوتا ہے اور اس کا امتحان یوں ہو سکتا ہے کہ اگر وسط صلوٰۃ میں آدمی زیادہ جمع ہو جائیں تو مٹھائی کی فکر پڑ جاتی ہے نمازیوں کو بھی اور مہتممین کو بھی۔ مہتممین کو تو اپنی آبرو کی پڑ جائے اور نمازیوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اب ایک ایک بتا شہ ہی ملے گا۔ خشوع تو کوسوں دور گیا مٹھائی کیا آئی کہ اتنے گناہ چکا لائی۔

علاوہ بریں اکثر عام بے نماز لوگ آتے ہیں اور تعجب نہیں کہ بعض جب بھی ہوں۔ پھر لوگ باتیں کرتے اور مغالطے دیتے ہیں اور لغویات بکتے ہیں۔ غیبتیں کرتے ہیں اور ایک دوسرے کا ظلم سمیٹتے ہیں۔ یہی حال ہے مولود شریف کی مٹھائی کا۔ بعض لوگ اس میں عرب کے فعل سے حجت پکڑتے ہیں میں کہتا ہوں کہ اول تو کسی کا فعل حجت نہیں۔ پھر تم اپنے فعل کو ان کے فعل پر قیاس بھی نہیں

کر سکتے۔ ان کی تو ایسی بے تکلف عادت ہے کہ جب کچھ آدمی رہ جائیں اور مٹھائی ختم ہو جائے کہہ دیتے ہیں خلاص یعنی ہو چکی جس کی ان کو یہاں کی طرح سے آبرو وغیرہ کی فکر نہیں ہوتی جس کو پہنچ گئی پہنچ گئی نہ پہنچے تو کچھ خیال نہیں۔ پس کہاں تمہارا فعل اور کہاں ان کا فعل۔

کارپا کاں راقیاس از خود مکیر ☆ گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر
(نیک لوگوں کے کاموں کو اپنی طرح گمان نہ کرو اگرچہ شیر اور شیر (دودھ) ایک طرح لکھے جاتے ہیں)

میں کہتا ہوں شیرینی کی ایجاد کی وجہ اصل میں اظہار مسرت ہے ”شکر اللہ علیٰ حصول النعمۃ“۔ لیکن مباح میں ایک منکر منضم ہو جائے بلکہ مستحب میں بھی تو اس کا ترک ضروری ہے اور اس سے تو بہتر یہ ہے کہ محتاجوں کو دیدیا جائے۔ جو روپیہ مٹھائی میں صرف ہوتا ہے محتاج کی خبر گیری بالاتفاق امر حسن ہے۔ تمام زمانہ میں کوئی بھی اس کا مخالف نہ ہوگا اور نہ منکرات لازم آئیں گے جو نماز میں مغل تھے۔

شیرینی میں فی نفسہ کچھ حرج نہیں۔ بلکہ حرج اس ہیئت میں ہے۔ بلکہ اس ہیئت کے ساتھ بھی فسادات دور ہو جائیں۔ فساد لازم بھی فساد متعدی بھی اور اس کے لئے پچاس برس سے کم میں کافی نہیں سمجھتا جب کہ اصلاح کا سلسلہ برابر جاری رہے اور اصلاح میں اس وقت یہ کافی نہیں کہ خاص لوگ منکرات سے بچ جائیں۔ کیونکہ عوام اپنے فعل کے لئے اسی کو سند گردانیں گے اور عوام سے جلدی ازالہ منکرات کی توقع نہیں پس اس وقت اصلاح یہ ہے کہ یہ عمل بالکل ہی ترک کر دیا جائے اور پھر اصلاح عقیدہ کا سلسلہ جاری رہے۔ جب عام طور سے عقیدے درست ہو جائیں تب میں بھی اجازت دیدوں گا لیکن اب تو بس ترک ہی کرایا جائے گا۔ غور کر لیجئے اور لا تقر بوا الصلوٰۃ کا قصہ نہ کیجئے۔ جہاں شیرینی کا جواز ہے وہاں ان منکرات کی حرمت بھی ہے اور جب تک دونوں جمع ہیں حرمت ہی کو ترجیح ہوگی۔

یوم عید کی بدعت

منجملہ اور رسوم کے ہمارے قصبات میں ایک یہ رسم ہے کہ عید کے دن سحری کے وقت اذان فجر کا انتظار کرتے ہیں اور اذان کے وقت کہتے ہیں کہ روزہ کھول لو۔ پھر کچھ کھاتے ہیں تو ان کے نزدیک اب تک رمضان ہی باقی تھا۔ شوال کی پہلی رات بھی گزری اور ان کے یہاں ابھی روزہ ہی ہے۔ حدیث شریف میں تو افطر الرؤیۃ ہے اور ان کے یہاں ایک شب اور گزرنا چاہیے۔

کوئی یہ نہ کہے کہ ”افطر الرؤیۃ“ پر تو عمل ہو گیا۔ چاند دیکھ کر افطار کر لیا تھا۔ اب رات میں کھانا نہ کھانا اور اذان کے وقت کھانا اپنا فعل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ انکار اکل یا عدم اکل پر نہیں۔ بلکہ یہاں عقیدہ میں فساد ہے۔ چنانچہ اس کو روزہ کھولنے سے تعبیر اس کی دلیل ہے۔ اور زیادت فی الدین نہیں تو کیا ہے؟ ایسے موقع پر تو بالقصد رسم توڑنے کے لئے فجر سے پہلے ہی کھانا چاہئے۔

بعض کا خیال یوں ہے کہ عقیدہ بدل دو اور درست کر دو لیکن اعمال کے بدلنے میں عام مخالفت ہوتی ہے۔ اگر عمل باقی رہے جو کہ مباح ہے اور عقیدہ درست ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اس لئے کہ ثابت ہوتا ہے تجربہ سے کہ جیسا کہ عقیدہ کو اثر ہے عمل میں ایسا ہی اس کا عکس بھی ہے۔ ایک مدت تک میں اس خیال میں رہا کہ علماء کیوں پیچھے پڑے ہیں نکاح ثانی کے۔ جائز ہی تو ہے کیا کیا نہ کیا نہ کیا۔ پھر سمجھ میں آیا کہ حرج صدر سے نہیں نکلتا مگر عمل کو ایک مدت تک بدل دینے سے۔ اس لئے رسوم میں عمل کی تبدیلی بھی ضروری ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ عید کی شب میں کھانا فرض ہے بلکہ اخراج حرج کے لئے ایسا کرنے سے ضرور ماجر ہوگا۔ اس کی نظیریں حدیث شریف میں موجود ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ منع فرما دیا بعضے روغنی برتنوں میں نبیذ بنانے سے پھر فرماتے ہیں۔ کنت نہیتکم عن الدباء والحنتم فانبذوا فیہا فان الظرف لا یحل شینا ولا یحرم۔ یعنی پہلے میں نے منع کر دیا تھا۔ اب اس میں نبیذ بنایا کرو۔ اور علت ارشاد بیان فرماتے ہیں کہ برتن نہ کسی چیز کو حرام کرتا ہے اور نہ حلال کرتا ہے۔ پھر باوجود اس کے بھی منع فرما دیا تھا۔ صرف وجہ یہ تھی کہ لوگ شراب کے عادی ہیں۔ تھوڑے سے نشہ کو محسوس نہ کر سکیں گے۔ اور ان برتنوں میں پہلے شراب بنائی جاتی تھی۔ اس لئے خمر سے پورا اجتناب نہ کر سکیں گے اور گنہگار ہوں گے۔ پس پورے اجتناب کا طریقہ یہی ہے کہ ان برتنوں میں نبیذ بنانے سے مطلقاً روک دیا جائے۔ جب طبیعتیں خمر سے بالکل نفور ہو جائیں اور ذرا سے نشہ کو پہچاننے لگیں تو پھر اجازت دے دی جائے۔

اسی طرح ان رسوم کی حالت ہے کہ ظاہری اباحت دیکھ کر لوگ ان کو اختیار کرتے ہیں اور ان منکرات کو پہچانتے نہیں جو ان کے ضمن میں ہیں تو اس کے لئے اصلاح کا کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔ سوائے اس کے کہ چند روز اصل عمل ہی کو ترک کر دیں۔ اور یہ بات کہ اصل عمل باقی رہے اور منکرات

عام طور سے دور ہو جائیں سو ہمارے امکان سے تو باہر ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے یہ طریقہ اختیار فرمایا تھا تو ہم کیا ہیں۔ اس کے سوا اور تدبیریں اختیار کرتے پھریں۔ اور جب ایک تدبیر عقلاً بھی مفید معلوم ہوتی ہے اور نقلاً ثابت ہو چکی تو ضرورت ہی کیا ہے کہ اس سے عدول کیا جائے۔

سو یوں کی تخصیص

ایک رسم عید کے دن ایک کھانے کی تعیین کی ہے کہ سوئیاں ہی پکائی جاتی ہیں۔ اس میں ایک مصلحت ہے جس کی وجہ سے اس کو اختیار کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اس کی تیاری میں زیادہ بکھیرے کی ضرورت نہیں اور دن کو عید کا کام کاج ہوتا ہے اور مستحب ہے کہ کچھ کھا کر عید گاہ کو جانا۔ اس لئے سہل الحصول چیز کو اختیار کر لیا۔ بعد ازاں دوست احباب کے یہاں بھیجنے کا رواج ہو گیا۔ اس کی نظیر میں تہادی الی العروس کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ثابت ہوا ہے۔ یوں کہتے ہیں کہ جیسے دولہا کے پاس خوشی کا دن دیکھ کر ہدیہ بھیجنا مستحسن ہے اسی طرح عید کا دن بھی خوشی کا ہے احباب کے پاس کیوں نہ تحفے بھیجے جائیں۔

میں کہتا ہوں کہ مقیس علیہ ہی دیکھ لیجئے کہ ہر چند کہ تہادی الی العروس فی نفسہ موجب زیادتی محبت ہے لیکن واللہ بطریق رسم بھیجنا بغض کو بڑھاتا ہے تجربہ اس پر دال ہے ہاں خلوص کے ساتھ بھیجنے سے محبت بڑھتی ہے جیسا کہ دو دوست آپس میں ہدیہ کبھی کبھی بھیج دیا کریں اور رسم سے تو محبت بڑھتی نہیں۔ محبت اور خلوص کا جو اعلیٰ فرد ہے اسی کو دیکھئے کہ رسم کو دخل دینے سے کیا حقیقت اس کی رہ جاتی ہے اور وہ فرد وہ محبت ہے جو پیر و مرید میں ہوتی ہے کہ ایسی کہیں دو شخصوں میں نہیں پائی جاتی کہ جان سے زیادہ عزیز مرید کے نزدیک شیخ ہوتا ہے اور مال تو کیا چیز ہے اور کبھی کبھی شیخ کی خدمت میں نذر گزارا کرتے ہیں اور اس سے خلوص بڑھ جاتا ہے مگر جب اسی نذر کو رسم قرار دیدیا تو دیکھ لیجئے کہ زمانہ کی پیری مریدی کا کیا حال ہے۔ خلوص تو کیسا جس جگہ پیر صاحب پہنچ گئے مرید اپنے آپ کو چھپانے لگے کہ ایسا نہ ہو کہ چندہ کی فہرست آپہنچے دعائیں مانگنی پڑتی ہیں کسی طرح پیر صاحب جلدی ٹلیں۔ اب فرمائیے کہ فی نفسہ تو شیخ کو ہدیہ دینا موجب محبت تھا یہاں موجب بغض کا ہے سے ہو گیا صرف رسم سے۔

میرے ایک دوست کا قصہ ہے کہ ایک مدت تک انہوں نے حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس خط نہیں بھیجا۔ میں نے ان سے وجہ پوچھی تو کہا میں اس عرصہ میں خالی ہاتھ تھا۔ فکر میں ہوں

کچھ روپیہ کہیں سے مل جائے تو عریضہ لکھوں۔ میں نے کہا اس خیال میں مت پڑو۔ اب تو ضرور بلا ہدیہ خط بھیجو۔ اب دیکھ لیجئے کہ ایک عرصہ تک اس خیال نے ان کو استفادہ سے روک دیا۔ فی نفسہ حسن ہو مگر قید رسم سے قمع آ گیا۔

ایسے ہی عید کے دن کے ہدایہ ہیں۔ اور اگر غور کیجئے گا تو ان ہدایہ کو قرض پائیے گا کیونکہ دیتے وقت یہ ضرور نیت ہوتی ہے کہ اس کے یہاں سے بھی آئے گا اور اگر ایک مرتبہ نہ آئے تو ادھر سے بھی بند ہو جاتا ہے اور ہدیہ کی تعریف میں بلا عوض کی شرط ماخوذ ہے پس یہ ہدیہ بھی نہ رہا۔ پھر قرضدار ہونے سے یا قرضدار کرنے سے کیا فائدہ۔

وعظ کا خلاصہ

حاصل یہ کہ جن اعمال میں فساد ہے ان اعمال سے ہی اجتناب چاہیے۔ ذرا سی خوبی کو دیکھ کر بڑے بڑے منکرات میں پڑ جانا عقل سے بعید ہے۔ اب بیان ختم کرتا ہوں اور اصل مقصود کا خلاصہ پھر مختصر اُعادہ کرتا ہوں کہ روزہ رکھا۔ مگر پیٹ حرام سے بھرا اور دن کو بھی غیبت وغیرہ میں مبتلا رہے تو یہ روزہ کس شمار میں ہے۔

حاصل یہ کہ روزہ کے آداب سیکھو اور عورتوں کو بھی سکھلاؤ۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کم من صائم (الحديث) یعنی بہت سے روزہ رکھنے والے اور قیام اللیل کرنے والے وہ ہیں کہ ان کی بھوک اور پیاس کی طرف اللہ میاں کو کچھ حاجت نہیں۔ اور آداب کے موافق اگر ختم کر لیا تو اس کے حق میں فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشفعان یعنی روزہ و نماز دونوں شفاعت کریں گے۔ پس اس شخص کے ساتھ دو محافظ ہوں گے عذاب سے بچانے کے لئے۔ پھر آپ کہہ سکتے کہ جس کے دو محافظ سرکاری موجود ہوں کیا اس کی نجات نہ ہوگی۔

خدا تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ والسلام

عصم الصنوف

سہولت صوم کے متعلق یہ وعظ اخیر جمعہ ۲۷ رمضان المبارک
 ۱۳۴۵ھ کو مسجد خانقاہ تھانہ بھون میں کرسی پر بیٹھ کر ساڑھے تین
 گھنٹے میں بیان فرمایا۔ حاضری تقریباً ایک ہزار کی تھی۔ مولانا
 ظفر احمد صاحب نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِیْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْهِ
وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا
مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُّضِلِّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ
لَا شَرِيْكَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنْ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ صَلَّى
اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهِ وَاصْحَابِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ

فَاعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ . بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ .

كلو او اشربوا هنيئا بما اسلفتم فى الايام الخالية

ترجمہ: اور حکم ہوگا کھاؤ اور پیو مزے کے ساتھ ان اعمال کے صلہ میں جو تم نے ایام گزشتہ
یعنی قیام زمانہ دنیا میں کئے ہیں۔

نامہ اعمال

یہ ایک آیت ہے سورہ حاقہ کی۔ جس کے محمل مفسرین کے کلام میں مختلف ہیں۔ میں نے
ایک محمل کو اختیار کر لیا ہے جو اس وقت کے اور اس حالت موجودہ کے مناسب ہے۔ اس لئے میں
ایک ہی محمل کو بیان کروں گا اور چونکہ مقصود دوسرے دلائل سے بھی ثابت ہے اس لئے دوسرے
محمل کا احتمال جو کہ طالب علمانہ احتمال ہے۔ مضر نہیں۔ یہ دفع دخل مقدر ہے۔ اب میں آیت کی
تفسیر اسی محمل کے موافق بیان کرتا ہوں۔ جو میں نے اختیار کیا ہے اور اسی سے اس کا مناسب مقام
ہونا بھی معلوم ہو جائیگا۔ اس آیت سے اوپر ذکر ہے نامہ اعمال کا کہ قیامت کے دن کسی کے دائیں
ہاتھ میں نامہ اعمال دیا جائے گا اور کسی کے بائیں ہاتھ میں اور ساتھ ساتھ ہر شخص کا حال بھی مذکور
ہے کہ جس کے دائیں ہاتھ میں نامہ اعمال دیا جائے گا اس کا کیا حال ہوگا اور جس کے بائیں ہاتھ

میں دیا جائیگا اس کا کیا حال ہوگا۔

یہ آیت جو میں نے تلاوت کی ہے ان دونوں کے درمیان میں ہے اور اس کے اوپر اس شخص کا حال ہے۔ جس کے دائیں ہاتھ میں نامہ اعمال دیا جائے گا چنانچہ ارشاد ہے: فاما من اوتی کتابہ بيمينه فيقول هاؤم اقر او کتابہ انی ظننت انی ملق حسابہ۔ یعنی وہ نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیئے جانے کے بعد لوگوں کو بلائے گا کہ آؤ میرا نامہ اعمال پڑھو۔ مجھے تو یقین تھا کہ ایک دن حساب بھی ہونے والا ہے اس قول کے بیان کرنے کے بعد حق تعالیٰ اس کی جزایاں فرماتے ہیں:

فہو فی عیشۃ راضیہ فی جنۃ عالیۃ قطوفہا دانیۃ، کلوا واشربوا

ہنیئاً بما اسلفتم فی الایام الخالیۃ۔

”کہ وہ شخص نہایت چین میں ہوگا۔ بلند جنت میں ہوگا۔ جس کے میوے نزدیک ہیں (یعنی جھکے ہوئے ہیں جن کے توڑنے میں کوئی دشواری نہیں پھر ارشاد ہے کلوا واشربوا الخ کہ ان سے کہا جائے گا کھاؤ پیو بعض اس کے کہ تم نے ایام خالیہ میں کیا ہے۔

چونکہ ایام خالیہ کی تفسیر مختلف ہے اس لئے میں ابھی اس کا ترجمہ نہیں کرتا۔ بلکہ تحقیق بیان کرنے کے بعد ترجمہ کروں گا۔

کھانے پینے کی رعایت

پہلے میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے اکل و شرب (کھانے پینے) کا ذکر مستقل طور پر کیوں کیا۔ حالانکہ فہو فی عیشۃ راضیہ (وہ شخص نہایت چین میں ہوگا) میں یہ بھی داخل ہو چکا تھا تو اس افراد بالذکر کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسان کھانے پینے کا سب سے زیادہ عاشق ہے اور اس کے سوا جتنی مستیاں ہیں وہ سب اسی کے تابع ہیں مثلاً اگر کسی شخص کو جو کسی عورت یا مرد پر عاشق ہو چار پانچ دن کھانے پینے کو نہ دیا جائے پھر اس سے پوچھا جائے کہ بتلاؤ روٹی اور پانی لائیں یا عورت اور مرد کو بلا لیں۔ تو وہ اس وقت روٹی اور پانی ہی کی درخواست کریگا۔ اور عورت اور مرد کے عشق کو بھول جائیگا۔ اسی طرح اور سارے مطلوبات کو دیکھ لیا جائے تو سب کا مدار اسی پر ہے چنانچہ اسی کیلئے نوکری اور ملازمت کی جاتی ہے اور اسی کے لئے تیری میری غلامی کی جاتی ہے بعض دفعہ آدمی اس سے گھبرا کر یوں بھی کہنے لگتا ہے کہ یہ دوزخ کہاں کا لگ گیا۔ مگر پھر بھی اس دوزخ کے بھرنے سے چارہ نہیں۔ ایک وقت بھرنے کے بعد پھر دوسرے وقت کے لئے فکر ہے کہ شام کو اسے کس چیز سے بھرا جائے گا۔

اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمارے جذبات کی کس قدر رعایت فرمائی ہے۔

حق تعالیٰ کی توجہ

واقعی اپنے ساتھ حق تعالیٰ کے برتاؤ کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ کس کرم کے ساتھ تربیت فرماتے ہیں ہمارے اور مربی ہیں اول تو ان میں زیادہ تر وہ ہیں جو اپنی اغراض کو صاحب حاجت کی اغراض پر مقدم رکھتے ہیں۔ البتہ والدین اس سے کس قدر مستثنیٰ ہیں کہ وہ اولاد کے جذبات کی بے غرضانہ رعایت کرتے ہیں۔ گو بعض دفعہ وہ بھی اپنے جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ مگر حق تعالیٰ چونکہ کسی چیز سے مغلوب نہیں ہیں وہ تو بندہ کے ساتھ بالکل اسی کے جذبات کی رعایت سے معاملہ فرماتے ہیں۔

بھلا غور تو کیجئے کجا حق تعالیٰ کجا بندہ۔ ان کی عظمت کا مقتضا تو یہ تھا کہ وہ بندہ کے ساتھ داشتہ داشتہ معاملہ کرتے۔ مگر نہیں وہ نہایت درجہ توجہ فرماتے ہیں حالانکہ عقل تو اس کو بھی تجویز نہیں کر سکتی کہ حق تعالیٰ بندہ کے اوپر کچھ بھی توجہ فرمائیں کیونکہ توجہ ہوتی ہے مناسب سے۔ اور بندہ کو حق تعالیٰ کی ذات و صفات سے کیا نسبت؟ کچھ بھی نہیں۔ اس کو تو اتنی بھی نسبت نہیں کہ حق تعالیٰ کا علم بھی اس کو ہو سکے۔ حالانکہ علم و معرفت تعلق کا ادنیٰ درجہ ہے مگر ہم میں یہ بھی مفقود ہے۔ انسان کو ذات و صفات الہیہ کی کنہ تو کیا معلوم ہوتی ان کا پورا انکشاف بالوجہ بھی نہیں ہوتا۔ جب بندہ کو حق تعالیٰ سے کچھ بھی نسبت نہیں تو بتلائیے توجہ کا داعی کون ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ بس حق تعالیٰ کو بدوں کسی داعی اور سبب ہی کے ہمارے حال پر توجہ ہے۔

من نہ کردم خلق تا سودے کنم ☆ بلکہ تا بر بندگاں جو دے کنم
(میں نے مخلوق کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ ان سے نفع حاصل کروں بلکہ اس لئے پیدا کیا کہ ان پر جو دو کرم کروں)

پھر توجہ بھی معمولی نہیں بلکہ اس درجہ کی توجہ کہ کسی کو بھی اتنی توجہ نہیں اور جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ حتیٰ کہ ماں باپ کی توجہ بھی اس کی نظیر نہیں کیونکہ ماں باپ بالکل مستغنی نہیں۔ ان کو بھی اولاد کی کسی قدر احتیاج ہے اور وہ اولاد کی پرورش میں اپنے بہت سے منافع مد نظر رکھتے ہیں اور حق تعالیٰ بالکل مستغنی ہیں۔ ان کو کسی کی ذرہ برابر بھی احتیاج نہیں۔

اب بتلائیے اگر حق تعالیٰ اپنی شان استغنا کے موافق ہم سے معاملہ فرماتے تو کیا کوئی اس

کا تحمل کر سکتا تھا ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ تو ایسا معاملہ فرماتے ہیں کہ جس میں بالکل بندہ ہی کے جذبات کی رعایت ہوتی ہے۔ تو یہ کس قدر رحمت و کرم ہے کہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ اپنی شان استغناء کے مناسب معاملہ نہیں فرماتے۔ بلکہ بالکل ہمارے جذبات کی رعایت سے معاملہ فرماتے ہیں۔ مگر ہماری یہ حالت ہے کہ اگر کوئی ادنیٰ حاکم ہماری ذرا سی خاطر کر دے اور ہم کو اپنے پاس ہی بٹھلا دے تو اس کا بار بار شکریہ ادا کیا جاتا ہے اور دنیا بھر میں اس کی مدح اور اس پر فخر کرتے پھرتے ہیں۔ مگر حق تعالیٰ کی توجہ اور عنایات کے ساتھ کچھ بھی قدر کا معاملہ نہیں کیا جاتا۔ بلکہ ایسا معاملہ کیا جاتا ہے گویا حق تعالیٰ کچھ ان کا قرضہ ادا کر رہے ہیں۔ بلکہ قرضدار کا بھی شکریہ ادا کر لیا جاتا ہے کہ اس نے ہمارا قرضہ دبایا نہیں جلدی ادا کر دیا۔ یہاں اتنا بھی نہیں۔ صاحبو! یہ حالت بہت افسوسناک ہے اس کا علاج کرنا چاہیے۔

جنت کا کام

حق تعالیٰ نے کلووا واشربوا (کھاؤ اور پیو) فرما کر ہمارے جذبات کی رعایت فرمائی ہے اور غایت درجہ کی رعایت فرمائی ہے ورنہ ان کی شان کا مقتضایہ تھا کہ اکل و شرب کا بالکل ذکر نہ فرماتے کیونکہ حق تعالیٰ خود اس سے منزہ ہیں اور ہمارے افعال میں بھی یہ فعل ادون ہے۔ اسی لئے سب کے سامنے اس کے ارتکاب سے شرم آتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ سب کے سامنے کپڑا پہننے سے شرم نہیں آتی۔ بولنے سے شرم نہیں آتی۔ عطا و اخذ سے شرم نہیں آتی۔ مگر کھانے پینے سے شرم آتی ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑے نقص کا کام ہے۔

اسی لئے حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ و مریم علیہما السلام کی نسبت کانا یا کلان الطعام (وہ دونوں کھانا کھاتے ہیں) فرمایا تغو طان و یبولان (اور وہ دونوں بول و براز کرتے ہیں) نہیں فرمایا کیونکہ اکل و شرب ان کا جدا مجد ہے جو بول و براز کرے گا وہ پہلے کھائے پئے گا بھی ضرور۔ تو اکل و شرب ہی سبب ہے بول و براز کا۔ اس لئے حق تعالیٰ نے سبب کو بیان فرمادیا کہ اس سے مسبب پر خود دلالت ہو جائے گی۔ صریح نہ فرمانا اس وجہ سے ہے کہ قرآن میں تہذیب کی بہت رعایت کی گئی ہے اسی لئے بول و براز کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بلکہ سبب کے ذکر سے اس پر دلالت کر دی گئی۔

اگر کوئی یہ کہے کہ جنت میں تو اکل کو بول و براز سے مفارقت ہوگی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا دعویٰ یہ نہیں کہ اکل بول و براز سے مفارق نہیں۔ بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ بول و براز اکل سے مفارق نہیں۔

دوسرے یہاں گفتگو اکل و شرب فی الدنیا میں ہے اور دنیا میں طرفین سے تلازم ہے اور یہاں عیسیٰ و مریم علیہما السلام کے متعلق دنیا ہی میں اکل طعام کا ذکر ہے۔ پس اس سے بول و براز پر کننا صحیح ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ اگر اس طعام کے بعد بول و براز دنیا میں بھی نہ ہوتا جب بھی اکل و شرب صفات نقص سے ایک تو اس لئے ہے کہ۔

ابرو بادومہ و خورشید و فلک در کارند ☆ تا تو توانی بکف آری و بہ غفلت نہ خوری
(ابرو ہوا چاند و سورج سب کام میں مصروف ہیں تاکہ تو ایک روٹی بھی ہتھیلی پر رکھ کر غفلت سے نہ کھائے)

یعنی اس میں احتیاج سب سے زیادہ ہے سارے عالم کو چکر لگانے کے بعد انسان کی غذا حاصل ہوتی ہے۔ دوسرے جیسا اوپر مذکور ہوا۔ خود شہادت حالیہ اس کے ادون ہونے پر دال ہے کہ انسان اس کو خود حقیر سمجھتا ہے اور دوسروں کے سامنے کھانے پینے سے ایسا شرماتا ہے گویا کوئی عیب کا کام کر رہا ہے۔

ہر عیب کہ سلطان بہ پسند و ہنرست (جس عیب کو بادشاہ بھی پسند کرے وہ عیب ہے) تو ایسی ادنیٰ چیز کا ہماری خاطر سے ذکر فرمانا نہایت ہی شفقت کی دلیل ہے اب اس کا ذکر فرمانے کے بعد ان کے ذکر فرمانے سے اس کے وراثت بھی مبدل بہ شرف ہوئے یعنی جب سرکار نے اس کو پسند فرمالیا اور کھلوا و اشوبوا (کھاؤ اور پیو) فرما دیا تو اب یہ عیب شرف کو پہنچ گیا۔

ہمارے ایک دوست مولوی احمد علی صاحب مرحوم جب کھانا کھانے بیٹھتے تو رفقاء سے کہا کرتے تھے کہ آؤ جنت کا کام کر لو یعنی کھانا کھا لو۔ لوگ پوچھتے کہ حضرت! یہ جنت کا کام ہے یا دنیا کا تو کہتے ہیں کہ میاں دنیا کا کام تو نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا ہے اور کھانا پینا تو جنت ہی کا کام ہے کہ وہاں سوائے اس کے اور کچھ کام نہ ہوگا۔ نہ نماز ہوگی نہ روزہ نہ حج نہ زکوٰۃ۔

تو اب یہ عیب ایسا مقبول ہوا کہ جنت کا کام ہو گیا۔ مگر یہ سب اسی عنایت کا نتیجہ ہے جو حق تعالیٰ کو بندوں کے حال پر ہے کہ وہ ہمارے جذبات کی رعایت فرماتے ہیں اسی لئے اکل و شرب کو باوجود اس کے کہ ہمارے نزدیک بھی عیب کا کام ہے مگر چونکہ ہم اس کے عاشق ہیں اور اس کے بدوں ہم کو چارہ نہیں حق تعالیٰ نے جنت میں بھی رکھا اور قرآن میں بھی اس کا ذکر مستقلاً فرمایا۔ ورنہ اگر وہ اپنی شان کے موافق ہم سے معاملہ فرماتے تو اکل و شرب کا ذکر قرآن میں نہ ہوتا۔

ایام خالیہ

پس ارشاد فرماتے ہیں کہ قیامت میں اصحاب الیمین سے کہا جائے گا کلووا و اشربوا ہنیناً بما اسلفتم فی الایام الخالیہ، (جو تم نے ایام ماضیہ میں کئے تھے) کہ کھاؤ پیو ان اعمال کے عوض میں جو تم نے ایام خالیہ میں کیے ہیں۔ ایام خالیہ کی ایک تفسیر ابن عدی و بیہقی نے وہ نقل کی ہے جو پہلے سے میرے دل میں تھی اور اسی کی بنا پر میں نے اس آیت کو بیان کے لئے اختیار کیا تھا۔ مگر مجھے تلاش تھی کہ اس کی تائید سلف کے کلام سے بھی مل جائے۔ بدوں تائید سلف کے میں قرآن کے ایک لفظ کی تفسیر بھی گوارا نہیں کرتا۔ تفسیر بالرأے سے ڈر لگتا ہے۔ ہاں نکات و لطائف بیان کرنے کا مضائقہ نہیں۔ کیونکہ وہ تفسیر میں داخل نہیں۔ بلکہ امر زائد کی قبیل سے ہیں۔

بہر حال مجھے تلاش تھی کہ ایام خالیہ سے میں نے جو سمجھا ہے اس کی تائید منقول سے مل جائے۔ اول اور تفاسیر دیکھیں جلالین وغیرہ مگر کسی میں اس کی موافقت نہ ملی۔ پھر اخیر میں درمنثور میں تلاش کیا تو اس میں ابن منذر و ابن عدی اور بیہقی کی تخریج سے نقل کیا ہے کہ عبد اللہ بن رفیع نے بما اسلفتم فی الایام الخالیہ (جو تم نے ایام ماضیہ میں کئے تھے) کی تفسیر میں فرمایا ہے:

هو الصوم (وہ روزہ ہے) (قلت وعزاه القمی فی تفسیر الیٰ مجاہد

والکلبی قالوا ہی ایام الصیام قال القمی فیکون الاکل والشرب فی

الجنة بدل الامساک عنهما فی الدنيا ھ (کھانا پینا جنت میں دنیا میں

کھانے پینے سے رکنے کا بدل ہو جائے گا) (ص ۳۲ ج ۲۹)

اگر یہ تائید نہ ملتی تو بڑی فکر ہوتی اور مجھے کوئی دوسری آیت تلاش کرنا پڑتی۔ مگر دل اسی کے بیان کو چاہتا تھا کیونکہ اول ذہن میں یہی آئی تھی اور اس کے متعلق ہی ایک خاص مضمون ذہن میں بھی آ گیا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ تائید مل گئی اور مجھے دوسری آیت تلاش کرنا نہ پڑی۔

اب سنئے کہ مشہور تفسیر تو ایام خالیہ کی ایام ماضیہ ہے اور میرے دل میں یہ بات آئی تھی کہ ایام خالیہ سے مراد وہ ایام ہیں جو طعام و شرب سے خالی تھے یعنی ایام صیام، چنانچہ سلف کے کلام سے بھی اس کی تائید ہو گئی۔ دوسرے عقلی طور پر یہ ظاہر ہے کہ جزا مناسب عمل ہو اور نصوص میں غور کرنے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور صوفیاء نے تو اس کو کشفی طور پر بیان کیا ہے۔ اس قاعدہ سے بھی صوم کا عوض اکل و شرب ہی ہونا چاہیے۔ اب میں مقصود کو بیان کرتا ہوں۔

آسان عبادت

میرا مقصود اس وقت یہ بیان کرنا ہے کہ روزہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے نہایت سہل ہے اور اس آیت میں لفظ خالیہ اس پر دلالت کر رہا ہے کیونکہ ابھی معلوم ہوا کہ اس کی تفسیر خلوعن الطعام ہے اور ظاہر ہے کہ خلوصفت عدمیہ ہے جس سے اس پر دلالت ہو رہی ہے کہ صوم عبادت عدمیہ ہے نہ کہ وجودیہ۔ دوسری عبادات صلوٰۃ و حج و زکوٰۃ و ذکر وغیرہ وجودی اور فعلی ہیں۔ ان میں کچھ کام کرنا پڑتا ہے۔ حج میں تو بہت ہی بڑا کام کرنا پڑتا ہے کہ دور دراز کا سفر ہوتا ہے اور نماز میں ارکان کثیرہ ادا کرنے پڑتے ہیں اور مردوں کو تو مسجد میں بھی جانا پڑتا ہے ورنہ نماز ناقص ہوگی کیونکہ ترک جماعت پر وعید آئی ہے۔

اس پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک غیر مقلد کی عادت تھی کہ وہ گھر سے اپنے کھیت پر جو ذرا دور تھا جاتا تو وہاں پہنچ کر نماز میں قصر کرتا اور گھر پر آ کر پوری نماز پڑھتا۔ کسی نے کہا بندہ خدا تمہارا کھیت تو گھر سے نزدیک ہے مسافت سفر تو نہیں ہے جو تم وہاں قصر کرتے ہو۔ تو اس نے جواب دیا کہ مسافت سفر کی کیا ضرورت ہے۔ قرآن میں تو اذا ضربتم فی الارض (جب تم زمین پر سفر کرو) آیا ہے جس کے معنی سیر فی الارض ہیں اور یہ مفہوم کھیت میں جانے پر بھی صادق ہے۔ ایک خفی عالم نے اس کا خوب جواب دیا۔ کہا پھر تو تم کو ہمیشہ قصر ہی کرنا چاہیے کیونکہ گھر سے مسجد تک آنے پر بھی ”ضرب فی الارض“ (زمین پر چلنا) صادق ہے اس کا غیر مقلد کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

غرض! اور عبادات میں تو کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے کیونکہ ان کی حقیقت وجودی ہے اور روزہ میں کچھ نہیں کرنا پڑتا کیونکہ اس کی حقیقت عدمی ہے کہ اس میں صرف بعض اشیاء کو ترک کرنا ہے۔ مگر یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ مطلق ترک کو عبادت نہ سمجھا جائے اور نہ میرا یہ مقصود ہے بلکہ جس ترک کے ساتھ قصد مطلق ہو جس کو فقہاء کف سے تعبیر کرتے ہیں وہی عبادت ہے اور ترک اصلی جو عدمی محض ہے وہ عبادت نہیں ہے ورنہ ہر ساعت میں ہر شخص بے انتہا حسنات کا قائل ہوگا۔ کیونکہ ہر آن و ہر ساعت میں انسان عمل تو ایک ہی کر سکتا ہے اور اس کے سوا تمام افعال کا تارک ہی ہوتا ہے تو پھر چاہے وزن اعمال کی ضرورت ہی نہ رہے کیونکہ ہر حال میں مومن کے لئے تو غلبہ حسنات ہی ہوا کرے گا اور یہ لازم خلاف نصوص ہے نصوص سے ثابت ہے کہ قیامت کے دن بعض مسلمانوں کے حسنات غالب ہونگے۔ اور بعض کے سینات اور بعض کے حسنات و سینات مساوی ہوں گے۔ اور ترک اصلی کے عبادت ماننے پر ان صورتوں کا تحقق ہی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ صرف ایک

ہی صورت کا تحقق ہوگا کہ سب کے حسنات ہی غالب ہوں۔

سلب قدرت گناہ

دوسرے یہ کہ نصوص سے ہر عمل کے شرعاً معتبر ہونے میں ارادہ و نیت کا شرط ہونا معلوم ہو رہا ہے حدیث میں ہے الاعمال بالنیات (تمام اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے)۔ اس کا مقتضا بھی یہی ہے کہ ترک اصلی عبادت نہ ہو کیونکہ اس میں نیت و ارادہ نہیں ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ترک اصلی نعمت بھی نہیں وہ انعام حق ضرور ہے۔ اس وقت حق تعالیٰ نے ہم کو ہزاروں گناہوں سے بچا رکھا ہے گو ہم نے بچنے کا ارادہ نہیں کیا مگر بے ارادہ کے بھی گناہوں سے محفوظ رہنا اس کے نعمت ہونے میں شک نہیں اور اس نعمت کا ہم کو شکریہ ادا کرنا چاہیے یہ میں نے اس لئے کہہ دیا تاکہ اس نعمت کی بے قدری نہ کی جائے۔ پس خوب سمجھ لو کہ نعمت ہونا اور چیز ہے طاعت ہونا اور بات ہے۔ میں ترک اصلی سے طاعات و عبادت ہونے کی نفی کر رہا ہوں، نعمت ہونے کی نفی نہیں کر رہا۔ اور ترک اصلی تو نعمت کیوں نہ ہوتا جس میں گناہوں کی طرف التفات ہی نہیں نہ فعلاً نہ ترکاً۔ میں تو ترقی کر کے یہ کہتا ہوں کہ یہ بھی بڑی نعمت ہے کہ ارادہ معصیت کے بعد گناہ کی قدرت سلب کر لی جائے کہ بندہ گناہ کا ارادہ کرتا ہے مگر کر نہیں سکتا۔ گو مجھے اس مسئلہ کی تحقیق نہیں کہ ارادہ کے بعد اگر گناہ پر قدرت اور قدرت کے بعد میں اس کا ارتکاب بھی ہو جائے تو اس کے گناہ میں اور ارادہ میں جازمہ مجرد عن الفعل کے گناہ میں فرق ہے یا مساوات ہے۔ ظاہراً تو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ دونوں میں فرق ہے مساوات نہیں ہے لیکن اگر مساوات بھی ہو جب بھی سلب قدرت فعل نعمت ہے کیونکہ ارادہ جازمہ کے بعد ناکامی ہونے سے انسان کو ندامت سخت ہوتی ہے کہ میں نے خواہ مخواہ ہی گناہ کا قصد کیا۔ اس حالت میں وہ جلدی ہی اپنے ارادہ سے توبہ کر لیتا ہے بخلاف اس شخص کے جس کو ارادہ کے بعد کامیابی ہو جائے کہ وہ ارادے پر نادم نہیں ہوتا۔ بلکہ اول اول تو اس کو خوشی ہوتی ہے کہ میں اپنے ارادہ میں کامیاب ہو گیا۔ پھر کچھ عرصہ تک لذت گناہ کی مستی میں منہمک رہتا ہے۔ اس کو توبہ کی توفیق بہت دیر میں ہوتی ہے۔ اور بعض کو عمر بھر بھی نہیں ہوتی۔ اس لئے میرا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ سلب قدرت گناہ بھی نعمت ہے پھر عدم التفات کیوں نہ نعمت ہوگا۔

پس ترک اصلی میں جو ہم ہزاروں گناہوں سے بچے ہوئے ہیں۔ نعمت تو ضرور ہے مگر قواعد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبادت نہیں اور یہ گفتگو بھی قانون کی تحقیق ہے باقی یہ حق تعالیٰ کا فضل و انعام ہے کہ وہ کسی کو ترک اصلی پر بھی ثواب دیدیں کیونکہ فضل و انعام کسی قانون کا پابند نہیں۔

جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ حشر میں ایک شخص کو سینات کے عوض میں گن گن کر حسنت دی جائیں گی۔ تو یہ اور بات ہے مگر یہ قانون نہیں۔ قانون قاعدہ وہی ہے کہ معصیت پر عذاب ہو۔ اور ترک اصلی پر ثواب نہ ہو۔ مگر قانون تو ہمارے واسطے ہے حق تعالیٰ تو قانون کے پابند نہیں ہیں۔ وہ بطور فضل کے جو چاہیں کریں مگر یہ ضرور ہے کہ خلاف قانون کے عمل کم ہوگا زیادہ عملدرآمد قانون ہی کے موافق ہوگا لہذا یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ فضل محتمل کے بھروسہ پر عمداً قانون کی خلاف ورزی کی جائے۔ ہاں اگر کسی سے قانون کی خلاف ورزی ہو چکی ہو۔ تو وہ محض قانون پر نظر کر کے مایوس بھی نہ ہو۔ بلکہ فضل پر نظر کر کے خدا کی ذات سے امید رکھے کہ ان شاء اللہ سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اور گزشتہ سے توبہ و استغفار کرنے کی ہمت کرے اور آئندہ کے لئے پابندی قانون کا پورا اہتمام کرے۔

بہر حال قانون یہ ہے کہ جس ترک میں ارادہ کا کچھ دخل نہ ہو وہ اطاعت نہیں۔ بلکہ طاعت وہی ترک ہے جس میں ارادہ کا بھی کچھ دخل ہو۔

نیت صوم

چنانچہ روزہ کی حقیقت جو ترک ہے وہ بھی ترک محض نہیں بلکہ ترک بالارادہ ہے چنانچہ اگر کوئی روزہ کی نیت نہ کرے تو دن بھر فاقہ کرنے اور پیاسا مرنے سے وہ صائم نہ ہوگا۔ اسی لئے صحت صوم کے لئے نیت شرط ہے۔

اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب روزہ میں نیت بھی ضروری ہے اور بدوں نیت کے روزہ نہیں ہوتا تو پھر صوم عدمی نہ ہوا۔ بلکہ دیگر عبادات کی طرح وہ بھی وجودی ہو گیا۔ کیونکہ نیت امر وجودی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تم ذرا معقولیوں سے تودریافت کرو کہ وہ مرکب من الوجودی والعدمی کی نسبت کیا کہتے ہیں۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ عدمی اور وجودی سے مرکب عدمی ہوگا کیونکہ مجموعہ احسن کے تابع ہوتا ہے۔

اگر تم یہ کہو کہ ہم تو خود عاقل ہیں گو معقولی نہیں ہیں اس لئے ہم معقولیوں کی بات نہیں سننا چاہتے جب تک ہماری عقل میں نہ آئے تو دوسرا جواب یہ ہے کہ نیت روزہ کی حقیقت میں داخل نہیں۔ بلکہ وہ

اس کی شرط اور اس سے مقدم ہے۔ چنانچہ جن ائمہ کے نزدیک طلوع فجر کے بعد نیت جائز نہیں۔ اور رات ہی کو نیت کرنا لازم ہے ان کے نزدیک تو ظاہر ہے کہ نیت جزو صوم نہیں ورنہ تقدم لازم نہ ہوتا۔ باقی جن کے نزدیک مطلقاً رات سے نیت کرنا شرط نہیں ان کے نزدیک بھی نیت صوم سے مقدم ہی ہے مگر ان حضرات نے اکثر اجزائے صوم پر مقدم ہونے کو دلیل سے بمنزلہ تقدم علی الكل کے قرار دیا ہے۔ چنانچہ نصف النہار کے وقت یا اس کے بعد نیت کرنا ان کے نزدیک بھی لغو و غیر معتبر ہے۔

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ دن بھر روزہ کی نیت کار ہنا تو ضروری ہے اور بقاء نیت بحکم نیت ہے تو نیت صوم سے مقدم نہ ہوئی۔ بلکہ مقترن ہوئی۔ تو میں کہتا ہوں کہ اس کا فیصلہ مسائل شرعیہ خود کر رہے ہیں کہ بقاء نیت واقتران ارادہ صوم کے لئے شرط بلکہ محض تقدم نیت شرط ہے حقیقتاً یا حکماً۔ پھر روزہ شروع ہو جانے کے بعد اگر بدوں فطر حسی یہ پختہ قصد بھی کر لے کہ میں روزہ نہیں رکھتا تب بھی روزہ باقی رہتا ہے۔

اس سے صاف ثابت ہوا کہ اقتران نیت شرط نہیں صرف تقدم کافی ہے البتہ اگر روزہ شروع ہونے سے پہلے نیت توڑ چکا ہو تو اس کا یہ اثر ہوگا کہ روزہ شروع نہ ہوگا۔ اور یہ حکم اس بات کی دلیل ہے کہ نیت شرط صوم نہیں بلکہ محض شرط ہے پس یہی کہنا غلط ہے کہ صوم عدی اور وجودی سے مرکب ہے۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ اس کی حقیقت تو عدی ہے البتہ اس حقیقت عدمیہ کا اعتبار ایک وجودی شرط پر موقوف ہے۔

اعمال وجودیہ

جب یہ معلوم ہو گیا کہ روزہ عدی ہے اور اس کی حقیقت ترک ہے تو اب دیکھنا چاہیے کہ اعمال وجودیہ شاق ہوتے ہیں یا عدمیہ اس میں عقل سے فتویٰ تو معلوم ہوگا کہ اعمال وجودیہ ہی شاق ہیں۔ اعمال عدمیہ میں کیا دشواری ہے۔ اس لئے عقلاء کا اس پر اتفاق ہے کہ فعل سے ترک اہون ہے۔

اس پر شاید کوئی یہ شبہ کرے کہ یہ تو مشاہدہ کے خلاف ہے۔ روزہ میں تو لوگ رو دیتے ہیں اور بڑی مصیبت معلوم ہوتی ہے اور نماز میں کیا دشواری ہے خاص کر ہماری ولایتی نماز میں جس کی مثال مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ گھڑی سے دیا کرتے تھے کہ ہماری نماز ایسی ہے جیسے گھڑی اور تکبیر تحریمہ ایسی ہے جیسے گھڑی میں کوک (چابی) بھرنا تو جیسے وہ کوک بھرنے کے بعد خود بخود چلتی رہتی ہے اور کوک ختم ہو جانے پر بند ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تکبیر تحریمہ کے بعد قرأت و رکوع و سجود ہم سے خود بخود صادر ہوتے رہتے ہیں کیونکہ مشق ہو چکی ہے اور سلام کے اوپر نماز خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔

اس مشق پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک انگریز حاکم کی پیشی میں دوسرے رشتہ دار تھے۔ جن میں ایک نمازی تھا۔ ایک بے نمازی۔ حاکم دونوں کو نماز کے وقت ایک گھنٹہ کی چھٹی دیا کرتا تھا۔ نمازی تو نماز پوری کر کے آتا اور بے نمازی ادھر ادھر ٹہل کر حقہ پان کھا کر آ جاتا۔ اس حالت میں ظاہر ہے کہ بے نمازی جلدی واپس ہوگا تو ایک دن حاکم نے اس سے کہا کہ تم بہت جلدی واپس آ جاتے ہو اور دوسرا دیر میں آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نماز نہیں پڑھتے تو اس نے کہا نہیں حضور نماز تو میں بھی پڑھتا ہوں۔ مگر میں جلدی پڑھتا ہوں اور وہ دیر میں۔ کیونکہ میرے آباؤ اجداد تو کئی صدیوں سے نمازی ہیں۔ تو مجھے نماز کی خوب مشق ہے۔ اور یہ دوسرا رشتہ دار نیا نمازی ہے اس کو نماز اچھی طرح یاد نہیں۔ سوچ سوچ کر پڑھتا ہے اس واسطے دیر لگاتا ہے۔

خیر! اس نے تو یہ جواب فوراً گھڑا تھا مگر ہماری حالت یہی ہے کہ ہم کو نماز کی مشق ہوگئی ہے۔ اس لئے سوچنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس اللہ اکبر کہا۔ اور سارے ارکان خود بخود ادا ہونے لگے۔ تو ایسی نماز میں کیا مشقت ہے۔ اور روزہ میں تو ایسی مشقت ہے کہ آج کل تو بوجہ رمضان کے سردی میں آنے کے زیادہ تعب محسوس نہیں ہوتا۔ مگر چند روز پہلے جب گرمی میں رمضان آتا تھا تو یہ حالت تھی کہ میں نے خود جنگل میں ایک شخص کو صبح کی نماز کے بعد طلوع شمس سے پہلے دیکھا کہ کھیت میں بیٹھا ہوا تر بوز کھا رہا ہے۔ میں نے اس کو ملامت کی کہ بندہ خدا صبح سے ہی روزہ توڑ دیا ہے۔ کہنے لگا کہ گرمی میں رکھا نہیں جاتا۔ میں نے کہا جب گرمی ہوتی اور تجھ سے روزہ نہ رکھا جاتا اسی وقت توڑ دیا ہوتا کہ اس وقت ظاہر میں تو ایک عذر ہوتا۔ اب ٹھنڈے وقت توڑنے میں تیرے پاس کیا عذر ہے۔ مگر وہ غالباً منتظم تھا کہ جو کام بعد کو کرنا پڑے گا اسے پہلے ہی کر لیا جائے ایک قسم انتظام کی یہ بھی ہے۔

چنانچہ ایک شخص سفر کو چلا۔ چلتے ہوئے اپنی ماں سے پوچھنے لگا کہ اماں کچھ منگنا ہے میں سفر میں جا رہا ہوں۔ اس نے کہا کہ وہاں سے ایک ہنڈیا منی کی لیتے آنا شاید جھنجھانہ جاتا ہوگا کیوں کہ وہاں کی ہنڈیاں اچھی ہوتی ہیں۔ آپ نے ماں کی فرمائش کو یاد رکھا اور ایک ہنڈیا خریدی اور گھر کو چلا۔ جب گاؤں قریب رہ گیا سوچا کہ ماں اس ہنڈیا کو لیکر کیا کریگی۔ ظاہر ہے کہ اس میں دال وغیرہ پکائے گی۔ پھر کچھ دنوں کے بعد یہ کالی ہو جائے گی پھر پھوٹ جائے گی تو جو کام اتنی مدت میں ہوگا میں اس کو ابھی نہ کروں۔ یہ سوچ کر ڈھیلوں کو چولہا بنایا۔ ہنڈیا میں پانی بھر کر چولہے پر رکھا۔ پتے جمع

کر کے اس کے نیچے جلائے۔ جب وہ کالی ہو گئی کسی پتھر پر دے ماری اور پھوڑ دی۔
جب گھر پہنچے ماں نے ہنڈیا مانگی تو کہا جی ہاں میں ہنڈیا لایا ہوں۔ مگر یہ تو بتلاؤ کہ تم اسے
کیا کرتیں۔ کہا میں اس میں دال سالن پکاتی۔ کہا پھر کیا ہوتا۔ کہا پھر وہ چند روز کے بعد خراب
ہو جاتی۔ کہا پھر کیا ہوتا۔ کہا پھر پھوٹ جاتی۔ صاحب زادہ بولے بس بس جو کام تم اتنے عرصہ
میں کرتیں۔ میں نے ایک ہی دن میں کر دیا۔ اور سارا قصہ نقل کر دیا۔ تو وہ صبح صبح تر بوز کھانے والا
بھی ایسا ہی منتظم تھا کہ دوپہر کے بعد جو کام کرنا پڑے گا اس کو صبح ہی کیوں نہ کر دیا جائے۔

روزہ اور نماز میں آسانی

غرض ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ آسان نہیں بلکہ دشوار ہے اور تم اس کو آسان
کہہ رہے ہو تو جواب یہ ہے کہ یہ دشواری بوجہ ایک عارض یعنی امتداد کے ہے کہ گرمیوں کا دن بہت
بڑا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے روزہ میں امتداد ہو جاتا ہے اگر کہیں نماز اتنی ممتد ہو جائے جس کو آپ
آسان کہتے ہیں تو پھر نانی یاد آ جائے۔ چودہ گھنٹے تک تو کوئی کیا نماز پڑھے گا۔ اگر کہیں تراویح میں
ایک گھنٹہ سے زیادہ دیر ہو جاتی ہے۔ تو لوگ گھبرا جاتے ہیں کانپور میں ایک مسجد سے نکلتے ہوئے
بعض لوگ کہہ رہے تھے کہ تراویح کیا ہے قرطینہ ہے۔ یہ تو تراویح کا حال ہے۔

شبینہ میں تو کچھ پوچھئے ہی نہیں کیا حال ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ بھی روزہ کے برابر ممتد نہیں
ہوتا۔ پانچ چھ گھنٹے میں شبینہ پڑھنے والے قرآن ختم کر لیتے ہیں۔ مگر وہ پانچ چھ گھنٹے مقتدیوں
کو پانچ مہینے کے برابر ہو جاتے ہیں۔ پہلے یہاں بھی شبینہ کا رواج تھا۔ بڑی گڑ بڑ ہوتی تھی۔ اب
تو رواج نہیں رہا۔ کیونکہ چہنہ ہی سے لوگوں کو فرصت نہیں۔ شبینہ کون سنے۔ اس گڑ بڑ کو دیکھ کر میں
نے شبینہ کی مخالفت کی۔ کیونکہ لوگوں کو یہاں شوق تو تھا نہیں محض نام و نمود مقصود تھا کہ ہم نے ایک
رات میں قرآن سنا۔ حالت یہ تھی کہ مقتدی پڑے ہوئے ہیں اور امام کھڑا ہوا پڑھ رہا ہے۔ پھر وہ
بھی ایسا تیز پڑھتا تھا کہ قرآن بھی بہت کم سمجھ میں آتا تھا۔ اور سمجھانے کی اس کو ضرورت ہی کیا تھی
جب سننے اور سمجھنے ہی والے نہ ہوں۔ کیونکہ مقتدی تو اکثر لیٹے ہوتے تھے۔ باقی جن مقامات
پر لوگوں کو قرآن سننے کا شوق ہے اور یہ نہیں چاہتے کہ امام گڑ بڑ کر کے قرآن ختم کر دے وہاں میں
شبینہ کو نہیں روکتا۔ چنانچہ پانی پت میں اس کا اب تک رواج ہے۔ وہاں کے لوگوں کو میں منع نہیں
کرتا کیونکہ ان کو شوق ہے بشرطیکہ تراویح میں ہو۔

یہاں تو یہ حالت تھی کہ ایک حافظ صاحب شبینہ میں پلنگ پر لیٹے ہوئے امام کو لقمہ دے رہے تھے۔ جس سے ساری رات کی محنت ہی ضائع گئی۔ کیونکہ یہ لقمہ مثل لقمہ طعام کے مفسد صلوٰۃ ہے۔ اور ایک شبینہ میں قرآن ختم ہونے سے پہلے صبح ہو گئی اور صبح صادق کے بعد کا ذبین نے شبینہ پورا کیا۔ تو معلوم ہوا کہ نماز میں سہولت اسی وقت تک ہے جب تک امتداد نہ ہو اور امتداد کے ساتھ تو وہ روزہ سے بھی اشد ہے کیونکہ روزہ میں وہ پابندیاں نہیں جو نماز میں ہیں۔ روزہ اپنی ذات میں سہل ہی ہے۔ ہاں زیادت امتداد سے دشوار ہو جاتا ہے۔

روح صوم

رہا یہ کہ جب روزہ میں مشقت نہیں تو پھر اس میں ثواب ہی کیا ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کیا ضرور ہے کہ ثواب مشقت ہی سے ہوا کرے اور بدوں اس کے ثواب نہ ہو۔ دوسرے تجربہ یہ ہے کہ روزہ میں گوجاڑوں ہی کا روزہ ہو اور گودن بھی چھوٹا ہو پھر بھی کچھ نہ کچھ مشقت ضرور ہوتی ہے۔ گوہم سحر میں کتنا ہی پیٹ بھر لیں۔ اور یہ میں اسلئے کہتا ہوں کہ مجھے ان لوگوں کو جواب دینا مقصود ہے جنہوں نے سحری میں پیٹ بھر کے کھانے سے منع کیا ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ اس سے روح صوم باطل ہو جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ مبطل روح صوم ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ضرور اس سے منع فرماتے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قول زور و عمل سے روزہ میں منع فرمایا ہے کہ وہ بھی مبطل روح صوم ہی ہیں مفسد ظاہر صوم نہیں۔ جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف انہیں مفسدات کو بیان نہیں فرمایا جس سے صورت صوم باطل ہوتی تھی بلکہ ان امور سے بھی تعرض فرمایا ہے جن سے روح باطل ہوتی تھی تو اگر شیع سے حقیقت صوم باطل ہوتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس پر بھی ضرور متنبہ فرماتے۔ مگر حدیث میں کہیں اس سے ممانعت نہیں ہے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نافع و ضار دینی سے ہم کو مطلع فرما دیا ہے اور قسم کھا کر فرمایا ہے کہ کوئی چیز نافع نہ تھی۔ جس سے میں نے تم کو مطلع نہ کیا ہو اور کوئی چیز مضر نہ تھی جس سے منع نہ کیا ہو۔ پس ان حضرات کے قول کا ایک جواب تو یہ ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم کو بھی مسلم نہیں کہ سحری میں پیٹ بھر کے کھانے سے روزہ میں مشقت نہیں ہوتی۔ بلکہ ضرور ہوتی ہے۔ خواہ سحری میں کتنا ہی کھا لو تب بھی وقت معقود پر کھانے کی طلب ضرور ہوتی ہے اور اس وقت کھانا نہ ملنے سے کسی قدر کلفت ہوتی ہے اگر کسی کو اس

کا احساس نہ ہو تو وہ بیمار ہے اپنا علاج کرے گرمی کے روزہ میں تو کھانے سے زیادہ پانی کی طلب ہوتی ہے۔ پیاس بھڑکتی ہے اور سردی کے روزہ میں بھوک زیادہ لگتی ہے اور اس کا مقتضایہ ضرورتاً کہ سردی کے روزہ میں ضعف زیادہ ہو مگر دن چھوٹا ہونے کی وجہ سے ضعف زیادہ محسوس نہیں ہوتا۔

روزہ دار اور مشغولیت

بہر حال روزہ میں مشقت بھی ہے مگر وہ امتداد عارض یا مخالفت عادت کی وجہ سے ہے۔ فی نفسہ اس کی حقیقت میں کوئی ایسی بات داخل نہیں جو موجب مشقت ہو۔ کیونکہ روزہ میں کوئی عمل تلاوت قرآن یا ذکر وغیرہ ضروری نہیں اگر کوئی دن بھر سوتا رہے روزہ ہو جائے گا۔ ہاں اس طرح سونا حرام ہے جس سے نماز فوت ہو اور نماز کے وقت بیدار ہونے کی امید نہ ہو اور اگر ایسا کسی نے کیا بھی تب بھی نماز فوت کرنے کا تو گناہ ہوگا مگر روزہ پھر بھی صحیح ہے یا کوئی شطرنج کھیلتا رہے جب بھی روزہ فاسد نہ ہوگا گو شطرنج کا گناہ ہوگا۔ تو فی نفسہ روزہ خود آسان ہی ہوا۔ جس کا راز یہ ہے کہ اس میں کوئی عمل نہیں کرنا پڑتا۔

امتداد وغیرہ کی وجہ سے جو بعضوں کو روزہ لگتا ہے تو اس کے بارے میں بھی تجربہ یہ ہے کہ تذکرہ کرنے سے روزہ زیادہ لگتا ہے کہ آج تو بہت گرمی ہے۔ آج پیاس زیادہ ہے آج کا روزہ بہت سخت ہے۔ اور اگر اس بات کو ذہن سے بھلا دیا جائے کہ آج ہمارا روزہ ہے اور اس کا تذکرہ بھی نہ کیا جائے اور کسی ایسے کام میں لگ جائے جس میں مشغولی زیادہ ہو تو پھر باوجود امتداد کے بھی روزہ زیادہ نہیں لگتا۔ تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے یہی حالت ہر غم افزاء واقعہ میں ہے کہ اس کے تذکرہ سے غم کو ترقی ہوتی ہے اور قطع تذکرہ سے غم ضعیف ہو جاتا ہے۔

اس تقریر سے ایک بڑا اشکال حل ہو گیا۔ وہ یہ کہ حق تعالیٰ شانہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے قصہ میں فرمایا ہے۔ فاذا خفت علیہ فالقیہ فی الیم ولا تخافی ولا تحزنی اناراد وہ الیک وجاعلوہ من المرسلین۔ ”کہ جب تم کو موسیٰ علیہ السلام پر کوئی اندیشہ ہو تو ان کو دریا میں ڈال دینا اور کچھ خوف و غم نہ کرنا ہم ان کو تمہارے پاس واپس کر دیں گے اور ان کو رسول بنائیں گے۔“

یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ خوف و حزن تو امر غیر اختیاری ہے اور امور غیر اختیاریہ کے ساتھ تکلیف متعلق نہیں ہوتی۔ کیونکہ نص میں ہے لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اسکی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) تو پھر یہاں لا تخافی ولا تحزنی (نہ ڈرنا

اور نہ اندیشہ کرنا) بے بیخبر نہ کیوں فرمایا گیا جس میں خوف و حزن سے ممانعت ہے حالانکہ امر و نہی امور اختیار یہ سے متعلق ہوتی ہے نہ کہ غیر اختیار یہ سے۔

اس کا جواب وہ ہے جو میری تقریر سے ابھی معلوم ہوا۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ خوف و حزن عادتاً تو غیر اختیاری ہے مگر بقاء اختیاری ہے کہ تذکرہ و تذکر سے بڑھتا اور عدم تذکر سے گھٹتا ہے۔ پس یہاں لاتخافی و لاتحزنی کا مطلب یہ ہے کہ خوف و حزن کو لے کر نہ بیٹھنا۔ اور اس کا بار بار تذکرہ اور خیال نہ کرنا کہ اس سے غم بڑھے گا۔ عورتیں اس بات کو خوب جانتی ہیں کیونکہ ان میں تذکرہ بہت ہوتا ہے اسی لئے ان کا غم برسوں ہوتا ہے اور مردوں میں تذکرہ کم ہوتا ہے ان کا غم بہت جلد کم ہو جاتا ہے اور چار دن میں گویا مفقود ہو جاتا ہے۔

والدین کی محبت

اسی لئے بعض عورتیں مردوں کو سنگدل سمجھتی ہیں مگر یہ بالکل غلط ہے مرد سنگدل نہیں بلکہ قوی دل ہے۔ سنگ دل ہونا اور ہے اور قوی دل ہونا اور ہے۔ سنگ دل کہتے ہیں بے رحم ظالم کو اور قوی دل کہتے ہیں بہادر کو۔ اور تجربہ ہے کہ شجاع ہمیشہ رحمدل ہوتا ہے سنگ دلی اکثر بزدلوں میں ہوتی ہے۔ چنانچہ ترک شجاع ہیں مگر نہایت رحم دل ہیں جن کی رحم دلی مشہور ہے۔ اور ہندوستان کی بعض قومیں نہایت بزدل ہیں۔ مگر اس کے ساتھ سنگ دل کنفک بھی ہیں۔ یعنی خود غرض! پس عورتیں مردوں سے زیادہ رحمدل نہیں ہیں بلکہ ضعیف القلب ہیں اور مرد سنگدل نہیں بلکہ قوی القلب ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی صحیح نہیں جو مشہور ہے کہ اولاد سے ماں کو محبت زیادہ ہوتی ہے باپ کو کم۔ چنانچہ ماں کی ممتا مشہور ہے اور تقریباً مرد بھی سب اس کو تسلیم کئے ہوئے ہیں۔ اور ایک مجمع نسواں میں تو اس پر اتفاق ہو گیا تھا۔ اور قریب تھا کہ یہ مسئلہ اجماعی ہو جائے مگر ایک سات آٹھ سال کی لڑکی نے جس کے متعلق وہم بھی نہ تھا کہ یہ بھی اس کمیٹی کی ممبر بننے کے لائق ہے بولی کہ یہ دعویٰ غلط ہے کہ اولاد سے محبت ماں کو زیادہ ہوتی ہے اور باپ کو کم۔ میں اس کو تسلیم نہیں کرتی۔ بلکہ میرے نزدیک اولاد کی محبت تو دونوں کو برابر ہوتی ہے مگر چونکہ اولاد ماں کے پاس زیادہ رہتی ہے تو زیادہ رہنے کے حصہ کی محبت ماں میں بڑھ جاتی ہے۔ اگر کوئی بچہ ماں کے پاس زیادہ نہ رہے باپ کے پاس زیادہ رہے تو اس کی محبت باپ کو ماں سے زیادہ ہوگی۔ چونکہ اس نوعمر لڑکی نے بات پتہ کی کہی اور دلیل کے ساتھ کہی اس لئے کوئی اس کو رد نہ کر سکا۔ اور وہ اتفاق باطل ہو گیا۔

پس نہ عورتیں محبت میں مردوں سے زیادہ ہیں نہ رحم دلی میں (اور حدیث میں جو اللہ تعالیٰ کو ماں سے زیادہ رحیم فرمایا ہے اس کا صدق رحمت للعوارض سے بھی ہو سکتا ہے۔ ۱۲ منہ) اور ان کو جو زیادہ مدت تک غم رہتا ہے اس کا رازیہ ہے کہ یہ تذکرہ واقعہ کا عرصہ تک رکھتی ہیں اسی سے حق تعالیٰ نے ام موسیٰ علیہا السلام کو منع فرمایا ہے۔ آگے ایک شغل بتلادیا کہ بجائے واقعہ غم کو یاد کرنے کے تم دوسری بات کا تصور کرتی رہنا وہ کیا انا را دوہ الیک وجاعلوہ من المرسلین۔ کہ خدا تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ہم اس کو واپس بھیجیں گے اور ان کو رسول بنائیں گے۔ تو اس امر کا تصور کرتی رہو کہ دیکھئے حق تعالیٰ کس طریق سے اور کس طرز سے ان کو واپس کرتے ہیں اور اسی خیال میں رہنا کہ بس اب آئے اور آج آئے یا کل آئے۔ اس خیال کو رفع غم میں بڑا دخل ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

اگرچہ دور افتادم بدیں امید خرسندم ☆ کہ شاید دست من بار دگر جانان من گیرد
(اگرچہ میں محبوب سے دور پڑا ہوں اس امید میں خوش ہوں کہ شاید میرا محبوب میرا دوبارہ ہاتھ پکڑ لے)

یہ تو بیچارہ شاید ہی پر خوش ہے اور جس کو انا را دوہ الیک کا تصور تعلیم کیا گیا ہو جس میں ”ان“ اور جملہ اسمیہ سے تاکید ہے اور حق تعالیٰ کا وعدہ ہونا سب سے بڑھ کر تاکید ہے وہاں تو خوشی کا کیا حال ہوگا۔

عدم التفات اور خوف و حزن

یہاں سے معلوم ہوا کہ خوف و حزن کے رفع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک تو اس کا تذکرہ نہ کرے اس کا سبق روزہ مرہ نہ پڑھا کرے۔ دوسرے یہ کہ اپنے ذہن کو اس کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کرے اور کسی اور بات کی طرف لگائے۔ اسی سے صوفیاء نے کام لیا ہے۔ و سواؤں کے بارے میں کہ سالکین کو جو خطرات و وسوساؤں پیش آیا کرتے ہیں اس کے علاج میں وہ عدم التفات ہی کی تعلیم دیا کرتے ہیں کہ ان کی طرف توجہ و التفات نہ کرو چاہے کفر ہی کے وسوسے کیوں نہ ہوں اور یہی علاج حدیث میں بھی آیا ہے مگر اہل ظاہر اس کو سمجھ نہیں سکتے۔ عارفین ہی نے سمجھا ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ میں حدیث متفق علیہ ہے۔ یاتی الشیطن احدکم فیقول من خلق کذا من خلق کذا حتی یقول من خلق ربک فاذا بلغه فلیستعد باللہ ولینتہ۔ (تم میں سے کسی ایک کے پاس شیطان آئے گا پس کہے گا کہ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا اور فلاں چیز کو کس نے

پیدا کیا اور فلاں چیز کو کس نے بنایا یہاں تک کہ کہے گا تمہارے رب کو کس نے پیدا کیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنی چاہئے اور چاہئے کہ وہ اس وسوسہ سے دور ہو جائے (

یہاں ولینۃ صیغہ امر ہے جس میں انتہا کا امر ہے اگر اس سے مراد انتہا عن الوسوسہ ہے کہ اس وسوسہ سے رک جائے تو لازم آئے گا۔ کہ وسوسہ امر اختیاری ہو حالانکہ وسوسہ امر غیر اختیاری ہے اور اگر یہ مراد نہیں تو پھر کیا مراد ہے۔

عارفین کہتے ہیں کہ ولینۃ سے مراد انتہا عن الالتفات ہے کہ اس کی طرف التفات نہ کرے اور التفات امر غیر اختیاری ہے اس سے معلوم ہوا کہ عدم التفات کو دفع وساوس میں خاص دخل ہے۔ یہ تو حدیث سے استدلال تھا۔ آگے تجربہ شاہد ہے کہ عدم التفات سے بڑھ کر اس کا کوئی علاج نہیں اور جتنی تدابیر کی جاتی ہیں سب سے وسوسہ کو اضافہ ہی ہوتا ہے کیونکہ ان تدابیر میں اس طرف التفات ہوتا ہے کہ ہم وسوسہ کو دفع کرنا چاہتے ہیں اور اتنا التفات بھی غضب ہے۔ بس التفات کے وقت یہ حال ہوتا ہے کہ

ترپوگے جتنا جال کے اندر ☆ جال گھسے گا کھال کے اندر

وسوسہ کی مثال تار برقی جیسی ہے کہ اس کو نہ تو پکڑنے کے واسطے ہاتھ لگاؤ نہ ہٹانے کے واسطے ہاتھ لگاؤ۔ بلکہ اس سے دور ہی رہو۔ جو لوگ وسوسہ کی طرف التفات کرتے ہیں ان کو غلطی یہ پیش آتی ہے کہ وہ وسوسہ کو مضرب سمجھتے ہیں اور ان کا یہ خیال ہے کہ ہم سے وساوس پر مواخذہ ہوگا۔ اس لئے ان پر غم سوار ہو جاتا ہے اور وہ اس سے عدم التفات پر قادر نہیں رہتے۔ حالانکہ نص صریح موجود ہے لایکلف اللہ نفسا الا وسعها (کسی شخص کو اللہ تعالیٰ اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) اور ظاہر ہے کہ وسوسہ کا نہ آنا قدرت سے خارج ہے۔

دوسری حدیث میں تصریح ہے کہ صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وساوس کی شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ذاک صریح الایمان۔ (یہ صریح ایمان ہے) اس سے زیادہ اور کیا اطمینان چاہتے ہو۔

بعض لوگوں کو ایک آیت سے دھوکا ہوا ہے۔ ولقد خلقنا الانسان و نعلم ما توسوس به نفسه و نحن اقرب الیہ من حبل الوريد۔ (اور ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم ان باتوں کو جانتے ہیں جو انسان کے دل میں کھٹکتی رہتی ہیں اور ہم اسکی رگ گردن سے زیادہ قریب ہیں)

کہ اس سے بظاہر وسوسہ پر مواخذہ ہونا مفہوم ہوتا ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم ان باتوں کو جانتے ہیں جو انسان کے دل میں کھٹکتی رہتی ہیں اور محاورہ قرآنیہ میں یہ لفظ نعلم مواخذہ اور وعید پر دلالت کرتا ہے۔ کثرت سے ایسی آیتیں وارد ہیں اور عام محاورہ بھی اس کے موافق ہے جیسے کہا کرتے ہیں کہ مجھے تمہاری حالت خوب معلوم ہے۔ یعنی ٹھہرے رہو تم کو سمجھوں گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ذرا اس آیت کے اوپر نظر کرو اور سیاق و سباق کو ملا کر دیکھو اور یہ قاعدہ ہمیشہ کے لئے یاد رکھو کہ کسی آیت کی تفسیر محض اس آیت کے الفاظ کو دیکھ کر نہ کرو۔ بلکہ سیاق و سباق کو ملا کر تفسیر کیا کرو بغیر اس کے تفسیر معتبر نہیں۔ اسی سے بہت جگہ غلطی واقع ہوتی ہے۔

چنانچہ بہت لوگوں کو آیت ولن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلاً۔ پر اسی لئے یہ اشکال ہوا ہے کہ ہم تو مسلمانوں پر کفار کا غلبہ مشاہدہ سے دیکھ رہے ہیں۔ اس کا بھی جواب یہی ہے کہ تم نے سیاق کو نہیں دیکھا۔ اس سے پہلے یہ مضمون ہے فالله يحكم بينكم يوم القيمة کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمہارے درمیان فیصلہ کریں گے۔ اس کے بعد ارشاد ہے ولن يجعل الله للكافرين الخ مطلب یہ ہوا کہ فیصلہ آخرت میں کفار کو مسلمانوں پر غلبہ نہ ہوگا۔ اس میں مطلق سبیل کی نفی کہاں ہے جو اشکال کیا جائے۔

ایسے ہی یہاں بھی سیاق و سباق کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس مقام پر حق تعالیٰ کا مقصود معاد کو ثابت کرنا ہے جس کے لئے شرط ہے کمال قدرت اور کمال علم۔

قرب حق

تو اوپر کمال قدرت کا ذکر تھا کہ ہم نے آسمان کو اس طرح پیدا کیا زمین کو اس طرح بنایا اور اس میں درخت و نباتات پیدا کئے۔

اب کمال علم کو ثابت کرتے ہیں کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم کو ان وسوسوں پر بھی اطلاع ہے جو قلب انسان پر گزرتے رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ وسوسوں نہایت خفی چیز ہیں۔ جب ہم کو ان کا بھی علم ہے تو ہمارا علم نہایت کامل ہے تو اس سے وعید و مواخذہ پر دلالت کہاں ہوئی؟ بلکہ محض کمال علم پر دلالت ہوئی۔ اس لئے آگے بھی سزا کا ذکر نہیں۔ بلکہ قرب کا ذکر ہے ونحن اقرب اليه من حبل الوريد۔ کہ ہم انسان کے رگ گردن سے زیادہ اس کے قریب ہیں۔ یہ دلیل ہے علم کامل کی۔

رہا یہ سوال کہ اقرب من حبل الوريد کیسے ہیں یہ ایک مستقل سوال ہے سو اس کا حقیقی

جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ کو کوئی حل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ بعض نے تو یہ کہہ دیا ہے کہ یہاں قرب علمی مراد ہے مگر من جبل الورد (رگ گردن سے) کا لفظ بتلا رہا ہے کہ یہاں قرب علمی سے زیادہ کوئی دوسرا قرب بتلانا مقصود ہے کیونکہ جبل الورد ذی علم نہیں ہے۔ جس سے اقرب ہونا اقربۃ فی العلم پر دال ہے بلکہ یہاں قرب ذات پر دلالت مفہوم ہوتی ہے مگر اس کی کیفیت کو ہم بیان نہیں کر سکتے کیونکہ حق تعالیٰ کی کیفیت سے منزہ ہیں ان کا قرب بھی کیفیت سے منزہ ہے مگر تقریب فہم کے لئے اتنا بتائے دیتا ہوں کہ ہم کو جو اپنی ذات سے قرب ہے یہ قرب وجوار کی فرع ہے۔ اگر وجود نہ ہوتا تو نہ ہم ہوتے نہ ہم کو اپنی ذات سے قرب ہوتا اور ظاہر ہے کہ وجود میں حق تعالیٰ واسطہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ ہمارے اور اس تعلق کے درمیان میں واسطہ ہیں جو ہم کو اپنی جان کے ساتھ ہے تو ہم کو اول حق تعالیٰ سے تعلق ہے پھر اپنی جان کے ساتھ تعلق ہے۔ اس تقریر کے استحضار سے قرب حق کا مشاہدہ گو بہت کچھ ہو جائے گا۔ مگر کیفیت اب بھی واضح نہ ہوگی۔ البتہ عقلاً یہ معلوم ہو جائے گا کہ حق تعالیٰ کو ہمارے ساتھ ہماری جان سے بھی زیادہ قرب و تعلق ہے اور یہی مقصود ہے۔

انا للہ کی تعلیم

بہر حال وسوسے سے بے التفاتی برتنا تجربہ سے صوفیاء کی بھی تعلیم ہے۔ اب ایک سوال اور پیدا ہوگا۔ وہ یہ کہ اگر کسی نے وسوسے کو دفع کرنے کے لئے ان کی طرف التفات کیا اور اس التفاوت سے وسوسے کو ترقی ہو گئی تو اس شخص پر مواخذہ عائد ہوگا یا نہیں؟

اس کے متعلق عقل کا فتویٰ تو یہ ہے کہ اس پر مواخذہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس کے اختیار سے وسوسہ بڑھا ہے اور یہاں سے معلوم ہوگا کہ عقل آپ کی خیر خواہ نہیں بلکہ بد خواہ ہے اور خیر خواہ شریعت ہی ہے جس کو آپ دشوار سمجھتے ہیں۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔

آزمودم عقل دوراندیش را ☆ بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(میں عقل دوراندیش کو آزمایا چکا ہوں بعد میں اپنے آپ کو دیوانہ یعنی احکام شریعت کا متبع بنالیا)

(دیوانگی سے مراد اتباع احکام شرع بدو تفیش علل ہے) چنانچہ شریعت کا فتویٰ اس موقع

میں یہ ہے کہ اس شخص سے مواخذہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کی نیت بری نہ تھی گو اس نے التفات قصداً کیا اور التفات سے وسوسہ بڑھ نہ جائے گو طریق دفع میں اس نے غلطی کی مگر نیت دفع ہی کی تھی رضا یا وسوسہ کے ساتھ اس نے التفات نہیں کیا۔

پس معلوم ہوا کہ زائد تو بعض دفعہ قصداً جلب غم کرتا ہے اور عارف قصداً جلب غم نہیں کرتا۔ ہاں بلا قصد کے اگر غم پہنچ جائے تو وہ اس کو لذائذ سے بڑھ کر قبول کرتا ہے مگر قصداً طالب غم اور جالب غم نہیں ہوتا۔ کیونکہ عارفین نصوص و اشارات نصوص سے یہ سمجھے ہیں کہ غم کو بڑھانا یا طلب کرنا شرعاً مطلوب نہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں **یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر۔** (اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی کا ارادہ کرتے ہیں اور تمہارے ساتھ دشواری کا ارادہ نہیں کرتے) اور حدیث میں ہے **من شاق شاق اللہ علیہ** (جو شخص دشوار کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دشوار بنادیتے ہیں)

دوسرے عارفین نے الذین اذا اصابتهم مصیبة قالوا اناللہ وانا الیہ راجعون۔ (وہ لوگ ایسے ہیں جب ان پر کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو ایسے میں کہ ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں) کے مضمون پر غور کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ اس میں حق تعالیٰ نے تقلیل غم و تسہیل حزن کا طریقہ تعلیم فرمایا ہے۔

معلوم ہوا کہ ان کو یہ مطلوب نہیں کہ غم کو بڑھایا جائے بلکہ اس کا کم کرنا مطلوب ہے۔ چنانچہ اول تو انا للہ کی تعلیم ہے کہ یوں سمجھو کہ تم خدا کے ہو اور تمہاری ہر چیز خدا کی ہے۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ تمہاری ذات میں یا متعلقین و متعلقات میں کچھ تصرف کریں تو تم کو ناگواری کا کیا حق ہے۔ اور جن عارفین نے وحدۃ الوجود کو ظاہر کیا ہے جن میں اول شیخ ابن عربی ہیں وہ تو یوں کہتے ہیں کہ ہمارا وجود ہی کوئی چیز نہیں یہاں تک کہ ہم کسی شے کے مستحق ہوں۔ عارفین کی تو اسی سے تسلی ہوگئی اور انہوں نے سمجھ لیا کہ ہمارا کوئی استحقاق نہیں بلکہ اصل مالک اور اصل موجود حق تعالیٰ ہیں۔ دنیا و آخرت دونوں انہیں کے ہیں۔ ان کو اختیار ہے کہ جب چاہیں کسی کو دنیا میں رکھیں۔ اور جب چاہیں آخرت کی طرف بلا لیں۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کے پاس ایک الماری ہو جس کے اندر متعدد تختے لگے ہوں۔ اور اس نے ایک خاص ترتیب سے برتنوں کو ان میں لگا رکھا ہو۔ اب اگر کسی وقت وہ اس ترتیب کو بدل دے اور نیچے کے برتن اوپر اور اوپر کے نیچے رکھ دے تو کسی کو اعتراض یا ناگواری کا کیا حق ہے؟ اسی طرح حق تعالیٰ کے یہاں عالم کے دو تختے ہیں۔ ایک دنیا ایک آخرت اگر وہ کسی وقت ان موجودات کی ترتیب کو پلٹ دیں کہ اوپر کی ارواح کو نیچے بھیج دیں اور نیچے کی ارواح کو اوپر بلا لیں تو کسی کو اعتراض کا کیا حق ہے۔ وہ الماری کے بھی اور اس کے برتنوں کے بھی مالک

ہیں۔ تم گڑ بڑ کرنے والے کون ہو؟

عارفین کو تو اس سے پوری تسلی ہوگئی۔ مگر اہل ظاہر کو صرف عقلی تسلی ہوئی اور طبعی غم مفارقت کا باقی رہا تو اس کی تسکین و تسہیل کے لئے آگے تعلیم فرماتے ہیں کہ تم یوں سمجھو انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اللہ کی طرف لوٹنے والے ہیں) کہ ایک دن ہم بھی وہیں جانے والے ہیں۔ جہاں ہمارا عزیز گیا۔ اس تصور سے مفارقت کا غم بھی ہلکا ہو جائے گا۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے نظام حیدر آباد نے ایک بھائی کو دکن بلا کر وزیر کر دیا۔ دوسرا بھائی مفارقت کے غم میں رونے لگا۔ نظام نے اس کو لکھ بھیجا کہ ارے تو کیوں روتا ہے تجھے بھی عنقریب یہیں بلا لیا جائے گا۔ اس مضمون سے دوسرے بھائی کی یقیناً تسلی ہو جائے گی۔ تو یہاں انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کا مطلب یہی ہے کہ تم مفارقت کا غم نہ کرو۔ بہت جلدی تم بھی وہیں جاؤ گے جہاں تمہارا عزیز گیا ہے۔ عارفین کو یہ مضمون ہر دم پیش نظر رہتا ہے اس لئے ان کو مفارقت حبیب کا زیادہ غم نہیں ہوتا۔

ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک بڑھاروتا ہوا آیا کہ حضرت میری بیوی مر رہی ہے حضرت نے فرمایا کہ دیکھو کیسی عجیب بات ہے ایک قیدی قید سے چھوٹ رہا ہے اور دوسرا رو رہا ہے کہ ہائے یہ قید سے کیوں نکل رہا ہے۔ پھر فرمایا تم بھی ایک دن اسی طرح قید سے چھوٹ جاؤ گے۔ میں نے دل میں کہا کہ اور بیوی کو چھڑانے آؤ تم بھی منگوائے گئے۔

موت مثل شادی

واقعی عارفین دنیا کو قید خانہ سمجھتے ہیں اور ان کو یہاں سے نکلتے ہوئے وہی خوشی ہوتی ہے جو قیدی کو جیل خانہ سے نکلتے ہوئے ہوتی ہے، عارف کہتے ہیں۔

خرم آں روز گزیر منزل ویراں بروم راحت جاں طلسم وز پے جاناں بروم
(جس دن دنیا سے کوچ کروں وہ دن بہت اچھا ہے راحت جاں طلب کروں اور محبوب حقیقی کے پاس جاؤں)

اور یہ نثری شاعری نہیں ہے معیار سے دیکھ لو اگر اس کلام سے دل پر اثر ہوتا ہے تو یہ سچا کلام ہے ورنہ شاعری ہے۔ اب اس کو ہر شخص خود دیکھ لے کہ اہل حقیقت کے کلام میں فرق ہے یا نہیں۔ یقیناً فرق ہے عارف کے کلام کا قلوب پر خاص اثر ہوتا ہے یہی اس کی علامت ہے کہ ان کے کلام میں شاعری نہیں۔ بلکہ سچا کلام ہے آگے فرماتے ہیں۔

نذر کردم کہ گر آید بسرایں روزے ☆ تادرمیکدہ شادواں وغزل خوان بروم
(میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہو جائے تو خوش و خرم اور غزلیں پڑھتا ہوا جاؤں)
آخر یہ خوشی کس چیز کی ہے۔ اسی کی کہ وہ دنیا سے جانے کو جیل خانہ سے نکلنا سمجھتے ہیں ایک
بزرگ نے مرض وفات میں وصیت کی تھی کہ ہمارے وصال کے بعد ہمارے جنازہ کے ساتھ ایک
شخص یہ شعر پڑھتا ہوا چلے۔

مفلسا نیم آمدہ در کوئے تو ☆ شینا لہ اجمال روئے تو
دست بکشا جانب زمبیل ما ☆ آفریں بروست بر بازوئے تو
(آپکے دربار میں مفلس ہو کر آئے ہیں اپنے جمال کے صدقے میں کچھ عنایت
کیجئے..... ہماری زمبیل کی طرف ہاتھ بڑھائیے۔ آپ کے دست و بازو پر آفرین ہے)
ان کو کوئی تو خوشی تھی جو مرتے ہوئے یہ بے فکری تھی۔ اسی واسطے اولیاء اللہ کے وصال و موت
کو عرس کہا جاتا ہے جس کے معنی شادی کے ہیں کیونکہ ان کے لئے موت مثل شادی کے ہے۔ اہل عرس
کو اس معنی کی خبر بھی نہیں وہ بدوں سمجھے ہی عرس کرتے ہیں۔ اس لیے حد و شرعیہ سے تجاوز کرتے ہیں
جو خود ان شادی والوں کی خوشی کے بھی خلاف ہے۔ بہر حال موت کا دن خوشی کا دن ہے غم کا دن نہیں۔
اولیاء اللہ کے لئے تو خوشی کا دن ہے ہی میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ مجرم مسلمان کے لئے بھی
خوشی کا دن ہے کیونکہ دنیا مصیبت کدہ ہے تو جو شخص مرتا ہے اس کی مصیبت کے دن کٹ رہے ہیں۔
اب آخرت میں جا کر اس کو راحت کاملہ حاصل ہوگی۔ اور اگر گنہگار مسلمان کو کچھ دن جہنم میں رہنا پڑے
تو وہ بھی راحت ہے کیونکہ مسلمان کے لئے جہنم میں جانا ترکیہ ہے عذاب نہیں ہے۔ جس کی دلیل یہ
ہے کہ حق تعالیٰ کفار کی بابت فرماتے ہیں۔ ان الذین یشترون بعہد اللہ وایمانہم ثمناً قليلاً
اولئک لا خلاق لہم فی الآخرۃ ولا یکلمہم اللہ ولا ینظر الیہم یوم القیمۃ ولا یزکیہم
ولہم عذاب الیم۔ (یقیناً جو لوگ حقیر معاوضہ لے لیتے ہیں بمقابلہ اس عہدے جو انہوں نے اللہ
تعالیٰ سے کہا ہے اور مقابلہ اپنی قسموں کے ان لوگوں کو کچھ آخرت میں نہ ملے گا نہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف
دیکھیں گے قیامت کے دن اور نہ ان کو پاک کریں گے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا)

یہاں کفار کی نسبت ولا ینظر الیہم (اور نہ ان کا تذکیہ کریں گے) فرمایا ہے اور وعید میں مفہوم مخالف
بالاتفاق معتبر ہے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے جہنم کا دخول ترکیہ کے طور پر ہوگا۔ جیسے یہاں حمام

کا دخول تنظیف کے لئے ہوتا ہے۔ گو اس میں کچھ تکلیف بھی ہوتی ہے مگر پھر بھی خوشی زائل نہیں ہوتی۔
دیکھئے مسہل اور آپریشن میں کیسی تکلیف ہوتی ہے بعض لوگ رونے لگتے ہیں مگر خوش بھی
ہوتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس آپریشن کا انجام صحت و راحت ہے۔

اسی طرح گنہگار مسلمان کو بھی موت پر خوش ہونا چاہیے اور یہ سمجھ لے کہ اگر جہنم میں جانا بھی
ہو تو تڑکیہ اور آپریشن کے لئے جانا ہوگا جس کا انجام راحت و عافیت ہے۔ ہاں کافر کے لئے کچھ
خوشی نہیں کیونکہ اس کے واسطے جہنم تڑکیہ نہیں۔ بلکہ دائمی قید خانہ ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں فاتقوا
النار التي وقودها الناس والحجارة اعدت للكافرين۔ (پس بچو تم اس آگ سے جو کفار
کے لئے تیار کی گئی ہے) اس میں بھی مسلمان کو بشارت ہے کہ جہنم تمہارا گھر نہیں ہے نہ تمہارے
واسطے بنایا گیا۔ بلکہ وہ تو کافروں کا گھر ہے انہی کے واسطے بنایا گیا ہے۔ مگر عصاة مسلمین من
تشبه بقوم فهو منهم (جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہی میں شمار کیا جائے گا) کے جرم
میں پکڑے گئے کہ یہ دنیا میں بعض اعمال کفار جیسے کرتے تھے تو چند دن ان کے گھر میں رہنا پڑے گا۔

خوشی، غم اور عارف

اب یہاں ایک سوال وارد ہوگا کہ جب موت فی نفسہ خوشی کی چیز ہے کیونکہ جیل خانہ سے
رہائی ہے۔ تو پھر چاہیے کہ اپنے کسی عزیز کی موت پر رویا بھی نہ جائے۔ بلکہ خوش ہونا چاہیے اس
کا جواب یہ ہے کہ ہاں جن لوگوں نے صرف اسی پہلو کو دیکھا وہ تو ایسے موقع پر خوش ہی ہوئے ہیں
۔ چنانچہ بعض اولیاء سے منقول ہے کہ وہ اپنی اولاد کے مرنے پر ہنستے تھے اور ذرا بھی نہیں روئے
مگر عارف اس کے ساتھ دوسرے پہلو پر بھی نظر کرتا ہے یعنی حق اولاد و حق اقربا پر وہ اپنی اولاد
یا عزیز کی موت پر روتے بھی ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اولاد کا یہ بھی ایک حق ہے کہ اس کے مرنے
پر رویا جائے اور اس کے ساتھ حق تعالیٰ کا حق بھی ادا کرتے ہیں کہ دل میں راضی رہتے ہیں۔

نیز ایک اور بات بھی ہے وہ یہ کہ قاعدہ ہے کہ تمام جذبات کا اور اسی طرح صفات حمیدہ
کا بقاء ان کے استعمال سے ہوتا ہے اور صفات حمیدہ میں سے ایک صفت رحم بھی ہے۔ اگر اس
کا استعمال ہوتا رہا تو یہ باقی رہے گی ورنہ فناء ہو جائے گی اور استعمال کی صورت یہ ہے کہ کسی اپنے

۱۔ سنن أبی داؤد: ۳۰۳۱، مسند أحمد: ۲/۵۰۹، المصنف لابن أبی شیبہ: ۵/۳۱۳،

کنز العمال: ۲۳۶/۸۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۳۴۷

متعلق پر کلفت وارد ہو۔ اور یہ بات اپنے اختیار سے خارج ہے بلکہ قصداً کلفت وارد کرنا جائز بھی نہیں تو حق تعالیٰ کبھی کبھی عارف کے کسی عزیز کو مصیبت یا موت دیتے ہیں جس سے دل پر چوٹ لگتی ہے تاکہ صفت رحم مستعمل ہوتی رہے۔ اس وقت عارف گونا گونا گویاں میں روتا ہے اور اس کے دل پر بھی اثر ہوتا ہے مگر عقلاً راضی اور خوش ہوتا ہے کیونکہ اس واقعہ کی حمیت اسے منکشف ہو چکی ہے کہ اس سے میری تربیت منظور ہے کہ صفت رحم فنا نہ ہو بلکہ باقی رہے۔

اسی لئے کہا گیا ہے کہ عارف جامع اضداد ہوتا ہے۔ وہ خوشی اور غم دونوں کو جمع کر دیتا ہے۔ اور ناواقف تو ایسے موقع میں پریشان ہو کر یہ کہہ ڈالتا ہے ۔

در میان قعر دریا تختہ بندم کردہ ☆ باز میگوئی کہ دامن ترمن ہشیار باش
(گہرے دریا میں تختہ سے جکڑ ڈالا ہے پھر کہتے ہو کہ ہوشیار رہ کہ دامن تر نہ ہونے پائے)
اور یہ شعر ترجمہ ہے ایک عربی شعر کا

القاء فی الیم مکتوفا وقال لہ ☆ ایاک ایاک ان تبطل بالماء
(اس کو گہرے دریا میں جکڑ کر ڈال دیا اور اس سے کہا دیکھ پانی میں نہ بھیگ)

علامہ شعرانی نے لکھا ہے کہ اس شعر کا پڑھنا حرام ہے کیونکہ اس میں اعتراض ہے حق تعالیٰ پر کہ وہ تکلیف مالا یطاق دیتے ہیں حالانکہ نص میں اس کی نفی ہو چکی ہے لایکلف اللہ نفسا الاوسعها (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) اور جن دو چیزوں کے جمع کو یہ محال سمجھتا ہے اور پریشان ہو کر ۔

در میان قعر دریا تختہ بندم کردہ (گہرے دریا میں تختہ سے جکڑ ڈالا ہے)

کہتا ہے یہ اس کی کوتاہ نظری ہے۔ اگر ذرا آنکھیں کھول کر دیکھتا تو معلوم ہوا جاتا کہ شفا خانہ کا ایک معمولی دنیا دار مریض بھی ان دونوں کو جمع کر دیتا ہے اور اس معترض کے قول کو غلط کر رہا ہے کیونکہ وہ آپریشن کے وقت چیختا چلاتا بھی ہے اور نشتر سے کانپتا بھی ہے مگر اس کے ساتھ ہی خوش بھی ہے کہ بعد میں ڈاکٹر کو فیس اور انعام بھی دیتا ہے۔

اب بتلاؤ اگر یہ آپریشن سے خوش نہ تھا تو ڈاکٹر کو انعام کس چیز کا دیتا ہے اور اگر تکلیف نہ تھی تو روتا چلاتا کیوں تھا۔ بس معلوم ہوا کہ وہ عقلاً خوش تھا اور طبعاً غمگین تھا۔ تو خوشی اور غم دونوں جمع ہو گئے۔ یہ مضمون اس پر چلا تھا کہ روزہ میں گرانی تذکرہ و استحضار سے بڑھ جاتی ہے پھر اس پر موسیٰ علیہ

السلام کی والدہ کا قصہ درمیان کیا گیا تھا کہ ان کو حق تعالیٰ نے لانتخافی و لانتحزنی (نہ خوف کرنا اور نہ غمگین ہونا) میں تذکرہ و استحضار حزن ہی سے منع فرمایا ہے۔ اس کے بعد میں نے یہ مسئلہ متفرع کیا تھا کہ عارفین نے وساوس کے علاج میں بھی اسی قاعدہ سے کام لیا ہے کہ ان کی طرف التفات نہ کیا جائے۔ پھر یہ مسئلہ بیان کیا تھا کہ عارف قصداً جلب غم نہیں کرتا۔ اس پر گفتگو طویل ہو گئی۔

تذکرہ کا اثر

اب میں پھر مقصود کی طرف عود کرتا ہوں کہ روزہ فی نفسہ بھی اور امتداد سے بھی گراں نہیں ہے۔ بلکہ عارضی تذکرہ سے اس میں گرانی پیدا ہو جاتی ہے۔ پس تم روزہ میں شدت کا تذکرہ نہ کیا کرو۔ اور کسی ایسے کام میں لگ جایا کرو جس میں زیادہ مشغولی ہو کہ روزہ کی طرف دھیان ہی نہ جائے۔ اور اس قسم کی باتیں نہ کرو کہ آج گرمی بہت ہے۔ پیاس زیادہ ہے کیونکہ تذکرہ مصیبت سے مصیبت بڑھ جاتی ہے۔ تذکرہ وہ چیز ہے کہ بعض لوگوں نے ہمارے وطن ہی میں تذکرہ ہی سے ایک ثقہ شخص کو جو کہ بزرگوں سے گوناگوں تعلقات رکھتے تھے ایک مردار پر عاشق کر دیا تھا کیونکہ محبت جیسے دیدار سے ہوتی ہے تذکرہ سے بھی ہو جاتی ہے۔ مولانا جامی فرماتے ہیں۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد ☆ بسا کیں دولت از گفتار خیزد

(عشق دیدار سے نہیں پیدا ہوتا بسا اوقات یہ محبت تذکرہ سے بھی پیدا ہو جاتی ہے)

پھر اس شخص نے حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہما سے مشورہ کیا کہ میں اس عورت سے نکاح کر لوں یا نہیں؟ حضرت مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا کہ ہرگز نکاح نہ کرو تم شریف خاندانی ہو اور وہ بازاری عورت ہے۔ اس سے نسل پر برا اثر پڑے گا اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے یہ مشورہ دیا کہ نکاح کر لو۔ مولانا اس شخص کی حالت سے متاثر ہو گئے۔ اور یہ سمجھے کہ اس کی یہ بے قراری جب ہی زائل ہوگی جب کہ اس سے نکاح کر لے گا۔ اس واسطے مولانا نے نسل کی خرابی پر نظر نہ کی۔

فضائل و ہیہ

کامل الاخلاق دونوں تھے اور دونوں اس کی حالت سے متاثر ہوئے۔ مگر ایک غالب علی الاخلاق تھے۔ ایک مغلوب عن الاخلاق تھے اور یہ امر غیر اختیاری ہے اور گو کمال یہ ہے کہ سالک غالب علی الاخلاق ہو مگر یہ کمال غیر اختیاری ہے اس لئے اس میں ایک کو دوسرے پر رشک نہ

کرنا چاہیے۔ اور نہ یہ تمنا کرنا چاہیے کہ کاش میں بھی فلاں کی طرح غالب الاخلاق ہوتا۔ بعض بعض سالکین تربیت السالک میں دوسروں کے احوال دیکھ کر رشک کیا کرتے ہیں کہ کاش ہم کو بھی ایسے احوال پیش آئیں جیسے ان کو پیش آتے ہیں۔ مگر یہ نقص ہے عارف کو رشک نہ کرنا چاہیے کیونکہ احوال غیر اختیاری ہیں اور امور غیر اختیاریہ کا فیصلہ خود نص میں مذکور ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَا تَتَمَنَوُا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ کہ تم ایسے کسی امر کی تمنائمت کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر (بلا دخل ان کے کسی عمل کے محض وہاں) فوقیت بخشی ہے آگے اس کی علت بیان فرماتے ہیں کہ فضائل وہیہ غیر اختیاریہ کی تمنائمنوع کیوں ہے۔ للرجال نصيب مما اكتسبوا وللنساء نصيب مما اكتسبن اس لئے کہ مردوں کے واسطے ان کے اعمال کا حصہ (آخرت میں) ثابت ہے اور عورتوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے۔ (یعنی مدار نجات قانوناً یہی اعمال ہیں) جن میں کسب و اختیار کو دخل ہے۔ امور غیر اختیاریہ کو اس میں دخل نہیں۔ اسی لئے مما اكتسبوا (ان اعمال سے جو کئے ہیں) فرمایا مما فضلو ابہ (اسی سے جس سے وہ فوقیت دیئے گئے) نہیں فرمایا۔

اور اعمال اختیاریہ میں کسی کی کوئی تخصیص نہیں تو اگر دوسروں سے فوقیت حاصل کرنے کا شوق ہے تو فضائل کسبیہ میں کوشش کر کے دوسروں سے زیادہ ثواب حاصل کر لو۔ باوجود اس پر قادر ہونے کے فضائل خاصہ وہیہ کی تمنائمحض ہوس اور فضول ہے۔ پھر فضائل وہیہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس میں عادیۃ اللہ میں تغیر نہیں ہوتا جیسے مرد ہونا، شریف ہونا یا نبی ہونا۔ ان کے لئے تو دعا بھی جائز نہیں کہ کوئی عورت مرد ہونے کی یا جلاہاسید ہونے کی یا امتی بنی ہونے کی کرنے لگے ایسی دعا بھی ناجائز ہے۔ اور ایک قسم وہ ہے جس میں عادیۃ اللہ میں تغیر ہوتا ہے۔ مگر بعد استقامت علی الشرع کے تو ایسے امور وہیہ کی تمنائمحض تو محض ہوس ہے۔ ہاں! اس طرح دعا کرنا جائز ہے۔ کہ وہ ان اعمال کو اختیار کرے جن پر حصول وہب کا ترتب عادیۃ ہوتا ہے پھر ان امور وہیہ کیلئے دعا کرے۔ اسی کا ذکر ہے واسئلوا اللہ من فضله (اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی درخواست کرو) میں کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا ایسے کمالات کے لئے جائز ہے جن میں فی الجملہ بطریق مذکور عمل کو دخل ہے۔

آگے اور ارشاد ہے ان اللہ کان بكل شیء علیما۔ کہ اللہ تعالیٰ بلاشبہ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔ اس میں جواب ہے ان لوگوں کو جو کہا کرتے ہیں کہ ہم نے تو بہت دعا کی مگر قبول نہیں ہوئی جواب کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔ ممکن ہے کہ تمہارے لئے ان

احوال و کمالات وہیہ کا حصول مصلحت نہ ہو یا دیر میں حاصل ہونا مصلحت ہو۔

احوال و کیفیات

دوسری بات سالکین کو اور بھی یاد رکھنا چاہیے وہ یہ کہ جن پر احوال و کیفیات کا درود زیادہ ہوتا ہے۔ ان کو خطرات بھی زیادہ پیش آتے ہیں۔ پس آپ نے ان کی ایک چیز کی تمنا تو کر لی دوسری کی بھی تو تمنا کرو اور خطرات کی تمنا نہ تم کر سکتے ہو اور نہ کرنا چاہیے کیونکہ جن پر بلا درخواست کے خطرات وارد ہوتے ہیں ان کی امداد بھی بہت کی جاتی ہے اور تم درخواست کر کے خطرہ مانگو گے تو نہ معلوم تمہارا کیا انجام ہو۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ عارفین بڑے مزے میں ہیں۔ ہاں ہاں! بے شک ان کو مزہ بھی ایسا حاصل ہے جو کسی کو نصیب نہیں اور اس وقت وہ جوش میں آ کر یوں بھی کہتے ہیں ۔

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی میں ☆ کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم
(گدائے میکدہ ہوں لیکن مستی کی حالت میں دیکھو کہ آسمان پر ناز اور ستارے پر حکم کرتا ہوں)
مگر دوسرے وقت وہ صاحب الم بھی ایسے ہیں کہ کوئی الم ان کے الم کے برابر نہیں۔ واللہ! بعض اوقات ان پر ایسی حالت گزرتی ہے جس کو کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ اس وقت وہ ان لوگوں کو جو انہیں مزے میں سمجھتے ہیں اور ان کے احوال و کمالات کی تمنا کیا کرتے ہیں یوں خطاب کرتے ہیں ۔
اے ترا خارے پنا شکستہ کے دانی کہ چیست ☆ حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورد
(تمہارے پاؤں میں کاٹنا بھی نہیں لگا تم کو ان لوگوں کی حالت کی کیا خبر جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلوار چل رہی ہے)

کہ میاں تم کو تو ابھی تک کاٹنا بھی نہیں لگا اس لئے ہمارے احوال کی تمنا کرتے ہو۔ تم کو ہماری حالت کی کیا خبر ہے کہ کیسی کیسی تلواریں ہمارے سر پر چل رہی ہیں۔ مگر یہ الم قہر کا الم نہیں بلکہ محبت کا الم ہے جو لذیذ ہے کیونکہ ان کو عین حالت الم میں محبوب کی توجہ عنایت کا بھی انکشاف ہوتا ہے جس پر نظر کر کے ہو یوں کہتے ہیں ۔

بجرم عشق تو ام می کشند غوغائیست ☆ تو نیز بر سر بام آعجب تماشا نیست
(تیرے عشق کے جرم میں قتل کرتے ہیں اور غوغائی ہیں تو بھی بر سر بام آعجب تماشا ہے)
اس الم کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کو پچھڑا ہوا محبوب مدت کے بعد آجائے اور بے خبری میں

پیچھے سے آکر دفعۂ عاشق کو دبانے لگے اور ایسا زور سے دبائے کہ پسلیاں ٹوٹنے لگیں۔ اول اول تو عاشق کو تکلیف ہوگی اور وہ کہے گا کہ یہ کون قاتل آگیا۔ مگر جب معلوم ہوگا کہ محبوب دبارہا ہے تو وہ اس وقت خوش ہو کر کہے گا۔

درواز یارست و درماں نیزہم ☆ دل فدائے اوشد و جاں نیزہم
(درد محبوب کی طرف سے ہے اور علاج بھی اس پر دل فدا ہے اور جان بھی)
اور کہے گا۔

ناخوش تو خوش بود برجان من ☆ دل فدائے یار دل رنجان من
(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ اپنی طبیعت کے خلاف اور ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جانب پر خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے دوست پر جو میری جان پر رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں)

اس وقت اگر محبوب یہ کہے کہ تم کو تکلیف ہوتی ہو تو لاؤ تمہیں چھوڑ کر رقیب کو دیا لوں تو وہ کہے گا۔
نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ☆ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی
(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو جو تیری تلوار سے ہلاک ہو، دوستوں کا سر سلامت رہے کہ آپ ان پر خنجر آزمائی کریں)

تو عارفین کو الم بھی سب سے زیادہ ہے مگر ان کو تلخی الم میں بھی لذت آتی ہے اور اس کی زندہ نظیر دہلی کا حلیم ہے جس کی مرچوں کی تیزی سے تکلیف ہوتی ہے آنکھوں اور ناک منہ سے پانی بھی بہتا ہے اور سی سی بھی کرتے جاتے ہیں مگر لذت بھی ایسی ہے کہ چھوڑتے نہیں۔

اسی طرح تمباکو کھانے والے یوں چاہتے ہیں کہ خوب تیز اور کڑوا ہو۔ مگر باوجود تلخی کے ان کے نزدیک پھر لذت ہے۔ حتیٰ کہ ایک دکاندار نے تو غضب کیا کہ اس سے ایک خریدار نے تمباکو مانگا۔ اس نے دکھایا خریدار نے کہا کہ یہ تو کڑوا نہیں اس سے بھی کڑوا دکھلا۔ اس نے دوسرا دکھلایا۔ خریدار نے اس سے بھی کڑوا مانگا تو وہ کہتا ہے بس جی اس سے کڑوا اللہ کا نام (توبہ توبہ)۔

تو اس کے نزدیک کڑوا ہونا ایسا محبوب تھا کہ نعوذ باللہ خدا کے نام کو اس سے زیادہ کڑوا کہنے لگا وہ دکاندار اس بات سے کافر نہیں ہوا۔ کیونکہ اس کے نزدیک کڑوا ہونا صفت کمال تھی۔ مطلب یہ تھا کہ اس سے کمال تر اللہ کا نام ہے۔ مگر الفاظ بہت واہیات ہیں۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ تذکرہ سے مصیبت بڑھ جاتی ہے۔ پھر اس پر ایک قصہ یاد آ گیا تھا کہ ایک صالح شخص کو محض تذکرہ سے لوگوں نے ایک مردار کا عاشق بنا دیا۔ پھر مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مشورہ کا ذکر آ گیا تھا کہ ایک بزرگ نے تو نکاح کا مشورہ دیا ایک نے منع کیا۔ اس پر میں نے کہا تھا کہ ایک غالب علی الاخلاق تھے۔ ایک مغلوب علی الاخلاق تھے۔ اور یہ امر غیر اختیاری ہے۔ اس پر امور وہیہ کے احکام کی تفصیل چل پڑی تھی۔

روزہ اور گرانی

اب میں پھر اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں کہ روزہ میں فی نفسہ گرانی نہیں ہے۔ عوارض سے اس میں گرانی آ جاتی ہے ورنہ اگر دشواری ہے تو اکل میں ہے۔ ترک اکل میں کیا دشواری ہے۔ وہ تو عدی ہے اس عدمیت کی طرف کونص میں اشارہ فرمایا ہے۔ کلووا واشربوا ہنیئاً بما اسلفتم فی الایام الخالیہ کہ قیامت میں روزہ داروں کو کہا جائے گا کہ کھاؤ پیو ایسے اعمال کے عوض میں جو تم نے ایسے ایام میں کئے تھے۔ جن میں تم کو کچھ کام کرنا نہیں پڑا۔ بلکہ یوں ہی خالی بعض اشیاء کے تارک رہتے تھے جس سے معلوم ہوا کہ ترک اکل میں کچھ کام نہیں کرنا پڑتا۔ بلکہ کھانے میں کام کرنا پڑتا ہے۔

مگر ایک پیر جی جو بہت کھاتے تھے ان کے نزدیک البتہ کھانا اتنا آسان تھا کہ وہ کہتے تھے کہ کھانا کیا مشکل ہے بس منہ میں رکھا۔ اور نگل لیا، رکھا اور نگل لیا۔ لیکن یہ لوگ تو شکمی کا شکار ہیں یا شکمی زمیندار۔ ان سے اس قوت میں بحث نہیں۔ یہاں حقیقت میں کلام ہو رہا ہے۔ اور حقیقت میں ترک اکل دشوار نہیں۔ بلکہ اکل دشوار ہے۔ بعض دفعہ کھانے سے موت آگئی ہے۔

خود ہمارے قصبہ میں ایک قصہ ہو گیا کہ ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ میرے گھر میں باہر سے اندر ایک جنازہ آ رہا ہے وہ بڑا پریشان ہوا کہ اس کا کیا مطلب ہے اگر کوئی گھر میں مرنے والا ہے تو جنازہ گھر سے باہر جانا چاہیے۔ یہ الٹا معاملہ کیسا کہ باہر سے گھر میں جنازہ آیا۔ پھر اگلے ہی دن یہ قصہ ہوا کہ ان کے بھائی ایک ولیمہ کی دعوت میں گئے اور وہاں کھانا کھاتے ہوئے ان کے گلے میں لقمہ انکا جس سے سانس بند ہو گیا اور آنکھیں باہر نکل آئیں۔ لوگ پانی لانے کو دوڑے۔ پانی کے آتے آتے ان کا کام تمام ہو گیا۔ پھر وہاں سے جنازہ گھر میں لایا گیا۔ تاکہ غسل و کفن کیا جائے اس وقت یہ معلوم ہوا کہ باہر سے جنازہ آنے کا یہ مطلب تھا۔

تو کھانے میں تو ایسے قصے بہت ہوئے ہیں کہ کھانا موت کا سبب ہو گیا اور نہ کھانا موت کا سبب

بہت کم ہوتا ہے۔ ہاں اگر عدم اکل ممتد ہو جائے تو عارض امتداد کی وجہ سے موت کا واقع ہو جانا ممکن ہے۔ فی نفسہ عدم اکل سبب موت نہیں بخلاف اکل کے کہ وہ بعض دفعہ خود سبب موت ہو جاتا ہے خواہ پھندا لگ جائے یا بدہضمی ہو جائے۔ پھر سب باتوں سے قطع نظر کر کے عقل کا فیصلہ دیکھا جائے تو عقل یہی فیصلہ کرتی ہے کہ فعل سے ترک فعل اہون ہے۔ اس لئے اکل دشوار ہے اور ترک اکل سہل ہے۔

عقل کے اس فیصلہ میں شریعت نے بھی موافقت کی ہے کہ ایک سہل عمل کو عبادت مشروع کر دیا۔ مگر اس کے بعد تعجیل افطار و تاخیر سحور کے بارے میں شریعت نے عقل کے فتویٰ سے موافقت نہیں کی۔ کیونکہ اس میں عقل سے فتویٰ لیا جاتا تو اس کا فتویٰ تو یہ ہوتا کہ فطر میں تاخیر اور سحور میں تعجیل افضل ہے تاکہ ترک اکل کا زمانہ زیادہ ہو جس سے مجاہدہ کا تحقق کامل ہوگا۔ اور عقل تعجیل فطر و تاخیر سحور کو بے صبری اور حرص پر محمول کرتی کہ جب دن بھر روزہ سے رہے تو ایسی بھی کیا بے صبری ہے کہ غروب شمس کے ساتھ ہی کھانے پر پڑ گئے۔ ذرا وقار و سکون سے اطمینان کے ساتھ افطار کرنا چاہیے مگر شریعت خود ہی بدوں کسی کے پوچھے فتویٰ دیتی ہے کہ تعجیل فطر و تاخیر سحور میں ثواب زیادہ ہے۔

ہائے اس پر کوئی وجد نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے جذبات کی کس قدر رعایت فرمائی ہے۔ کیا یہ خدا کے ذمہ ہے کہ وہ آپ کے جذبات کی رعایت کریں آخر خدا کے ذمہ یہ بات کیوں ہے؟ آپ نے کیا کمال کیا ہے جس کی وجہ سے آپ پر یہ عنایات کی جائیں۔ اگر تم اپنے کمالات بیان بھی کرو گے تو وہ سب کے سب خدا ہی کے عطا کردہ نکلیں گے۔ کہیں تو ہارو گے کیونکہ سلسلہ غیر متناہی محال ہے۔ پس ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کو خود ہی آپ سے محبت ہے آپ کا کوئی کمال اس کو مقتضی نہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

مانبودیم و تقاضا مانہ بود ☆ لطف تو ناگفتہ مای شنود

(نہ ہم تھے نہ ہمارا تقاضا تھا آپ کا لطف و کرم ہمارے بے کہے ہوئے کو سنتا تھا)

ماہ رمضان اور زیادتی رزق

صاحبو! اگر کوئی عاقل فلسفی روزہ کو مشروع کرتا تو یقیناً وہ یہی حکم کرتا کہ جس حکمت کے لئے روزہ مشروع ہو رہا ہے۔ اس کا مقتضا یہی ہے کہ افطار میں تاخیر اور سحور میں تعجیل کی جائے تاکہ مجاہدہ کامل ہو۔ مگر شریعت اس کو منظور نہیں کرتی۔ وہ تعجیل افطار و تاخیر سحور ہی کو کمال صوم بتلاتی ہے۔ نیز فلسفی یہ بھی کہتا کہ سحری میں کم کھانا چاہیے ورنہ مجاہدہ ناقص ہوگا۔ وہ روزہ ہی کیا ہوا جس کے لئے

رات کو خوب پیٹ بھریا گیا۔ مگر شریعت کہتی ہے کہ کم کھانا افضل نہیں ہے اور جن صوفیاء نے کم کھانے کو افضل کہا ہے یہ ان کی رائے ہے۔ اور ہر رائے قبول نہیں ہوا کرتی۔ اور میں بے تامل کہتا ہوں کہ ان حضرات کی اس رائے کا منشا محض اتباع عقل ہے اتباع نقل نہیں۔ ورنہ کوئی حدیث دکھلائی جائے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیٹ بھر کے کھانے کو مضر صوم بتلایا ہو۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ حدیث کے اشارہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان میں مومن کو زیادہ کھانا چاہیے۔ اور میں اشارہ کا لفظ بھی احتیاطاً کہہ رہا ہوں ورنہ حدیث تو قریب بصراحت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

شہر یزاد فیہ رزق المؤمن۔ کہ اس مہینہ میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے اب بتلاؤ یہ زیادت کھانے کے واسطے ہے یا دھرنے کے واسطے ہے۔ جب حق تعالیٰ اس مہینہ میں رزق بڑھاتے ہیں تو چاہیے کہ اس مہینہ میں اور مہینوں سے زیادہ کھایا جائے اور فرماتے ہیں:

هو شهر المواساة کہ یہ مہینہ ہمدردی کا ہے

مشاہدہ ہے کہ رمضان میں خود بخود دل تقاضا کرتا ہے کہ احباب اور دوستوں کو بھی کچھ بھیجا جائے جس کے گھر میں کوئی نئی چیز پکتی ہے وہ افطار کے وقت اپنے دوستوں کو بھی کھلانا چاہتا ہے۔ کسی کے ہاں سے پھلکیاں آتی ہیں۔ کوئی جلیبی بھیجتا ہے کوئی کباب بھیجتا ہے کوئی پھل اور میوہ جات بھیجتا ہے۔

اب بتلاؤ کیا ان نعمتوں کو نہ کھائیں؟ جب خدا تعالیٰ نے یہ چیزیں کھانے کے واسطے بھیجی ہیں ہم کسی سے مانگنے نہیں گئے تھے۔ تو یہ صاف اس کی علامت ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہی ہمارے واسطے من حیث لا یحتسب بھیجی ہیں تو ان کو نہ کھائیں اور اٹھا کر دھر دیں۔ حضرت اگر کوئی بادشاہ آپ کو امر و ردے اور آپ یہ کہیں کہ میں تو زاہد ہوں میوے نہیں کھایا کرتا تو گردن پنے گی۔ ایسے ہی یہاں زہد بھگارنا اور حق تعالیٰ کی بھیجی ہوئی نعمتوں کو نہ کھانا خلاف ادب ہوگا۔

اسی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل کی حقیقت واضح ہو گئی جو حدیث میں ہے۔ کان یا کل اکلا در یغا۔ کہ آپ جلدی جلدی کھایا کرتے تھے۔ اس کو بعض بد تہذیب لوگوں نے خلاف تہذیب کہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس بد ذات نے تو صرف اس فعل ہی کو دیکھا ہے یعنی جلدی کھانے کو۔ اور اس ذات مقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کھانا دینے والے پر پہنچی ہوئی تھی۔ اگر یہ شخص اس ذات مقدس کے مشاہدہ کے لاکھویں حصہ کے برابر بھی معظم ذات کو دیکھ لیتا تو یہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی تیز کھاتا۔

بتلاؤ اگر ایک بادشاہ تم کو امر و دودے تو کیا اس کو وقار اور متانت سے اس طرح کھاؤ گے جس سے استغناء ظاہر ہو یا فوراً ہی شوق و رغبت ظاہر کر کے جلدی جلدی کھاؤ گے اسی کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے اس جملہ میں کہ اکل کما یا کل العبد یعنی میں تو اس طرح کھاتا ہوں جس طرح غلام کھایا کرتا ہے

صاحبو! جو لوگ وقار و متانت و تکبر سے کھانا کھاتے ہیں ان کی آنکھیں اندھی ہیں ان پر کھانے کے وقت ذات حق کی تجلی نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ استغناء کے ساتھ کھاتے ہیں اور جس پر ذات حق کی تجلی ہوگی وہ یقیناً سراپا احتیاج اور سراپا غلام بن کر کھانا کھائے گا۔ اس کے ہاتھ سے اگر لقمہ گر پڑے گا تو فوراً صاف کر کے کھالے گا اور ہرگز اس کو پڑا ہوا نہیں چھوڑے گا۔

دیکھو! اگر بادشاہ نے تم کو ایک پھل دیا ہو اور تم اس کے سامنے قاشیں کر کے کھا رہے ہو اور ایک قاش زمین پر گر جائے تو کیا تم اس کو زمین پر ہی چھوڑ دو گے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ عطیہ شاہی کی عظمت کر کے فوراً زمین سے اٹھا کر کھا لو گے۔ یہی طریقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا تھا۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ کھانا کھا رہے تھے اس وقت ایک عجمی رئیس بھی آپ کے پاس بیٹھا تھا۔ آپ کے ہاتھ سے ایک لقمہ گر گیا تو آپ نے اس کو صاف کر کے کھالیا۔ خادم نے کہا کہ یہ عجمی لوگ اس فعل کو معیوب سمجھتے ہیں ان کے سامنے یہ فعل مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ تو حضرت حذیفہ نے جواب دیا اترک سنة حبیبی لہولاء الحمقاء کہ کیا ان بے وقوفوں کی وجہ سے میں اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ چھوڑ دوں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔

ایک دفعہ خود مجھے یہ قصہ پیش آیا کہ ریل میں ایک مسلمان رئیس میرے ساتھ کھانا کھا رہے تھے ان کے ہاتھ سے ایک بوٹی نیچے کے تختہ پر گر پڑی۔ تو ان حضرت نے اس کو بوٹ سے بچ کے نیچے کر دیا۔ یہ دیکھ کر میرا روٹکا کھڑا ہو گیا۔ اور میں نے خواجہ صاحب سے کہا کہ ذرا اسی بوٹی کو اٹھا کر پانی سے دھو لیجئے اور دھو کر مجھے دیجئے میں اس کو کھاؤں گا۔ خواجہ صاحب نے اس کو دھویا اور دھو کر کہنے لگے کہ اگر کوئی دوسرا شخص اس کو کھالے تو اجازت ہے۔ میں نے کہا ہاں اجازت ہے۔ تو خواجہ صاحب نے خود کھالی۔ وہ رئیس بعد میں کہتے تھے کہ اس عملی تنبیہ کا میرے اوپر

ایسا اثر ہوا کہ میں کٹ کٹ گیا اور اس دن سے میں نے کبھی گرے ہوئے لقمہ کو زمین پر نہیں چھوڑا بلکہ صاف کر کے کھا لیتا ہوں۔

تو حضرت یہ زہد آپ کو ہی مبارک ہو کہ حق تعالیٰ تو رمضان میں قسم قسم کی نعمتیں بھیجیں اور طرح طرح کے کھانے بھجوائیں اور آپ کہیں میں تو زائد ہوں۔ میں تو زیادہ نہیں کھا سکتا۔ ہمارا مذاق تو یہ ہے۔ چوں طمع خواہد ز من سلطان دیں ☆ خاک بر فرق قناعت بعد ازیں جب حق تعالیٰ رمضان میں رزق بڑھاتے ہیں اور نئے نئے کھانے بھجواتے ہیں تو ہم کو بھی اپنی خوراک بڑھانا چاہیے اور میں انشراح کیساتھ کہتا ہوں کہ پیٹ بھر کر کھانا سحری میں ہرگز مضرب صوم نہیں اور جن صوفیاء نے اس کو مبطل روح صوم کیا ہے وہ اس قول میں فلسفیت کے رنگ سے مغلوب ہو گئے ہیں۔

بہر حال یہ دوسری آسانی ہے روزہ میں کہ شریعت نے دن بھر کھانا پینا بند کر کے یہ نہیں چاہا کہ ترک اکل ممتد ہو۔ بلکہ تعجیل افطار کو مستحب کہا کہ غروب ہوتے ہی افطار کر دو۔ اب دیر نہ لگاؤ اور سحری میں تاخیر کو مستحب کہا کہ جتنا وقت کھانے کا دیا گیا ہے اس کو پوری طرح وصول کرو اور سحری دیر کر کے کھاؤ تاکہ ترک اکل ممتد نہ ہو پھر اس کی بھی اجازت دی ہے کہ سحری میں خوب کھاؤ کم کھانے کی ضرورت نہیں اور کمال یہ ہے کہ روزہ اس پر بھی مجاہدہ ہے کہ جو مقصود مجاہدہ سے ہے وہ اب بھی حاصل ہوتا ہے مگر ظاہر ہے کہ اتنی آسانیوں کے بعد یہ مجاہدہ سہل ہو گا نہ کہ دشوار۔

اب ان احکام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ ہم کو راحت ہی دینا چاہتے ہیں دشواری میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ جب وہ روزہ میں اتنی آسانیاں کر رہے ہیں جس سے مقصود ہی مجاہدہ ہے تو اور احکام میں تو جن میں شان مجاہدہ بھی غالب نہیں ہے کس قدر آسانیاں ہوں گی۔

آخر یہ حق تعالیٰ کی محبت نہیں تو اور کیا ہے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پھر تو اور عبادات روزہ سے آسان ہو گئیں۔ اصل یہ ہے کہ حیثیات آسانی کی مختلف ہیں اور میرا مقصود اس تقریر سے صرف اس وسوسہ کا دفع کرنا ہے کہ ان کو سب سے مشکل سمجھتے ہیں اور یہی وسوسہ دفع صوم ہو جاتا ہے اور عبادات کا من کل الوجہ سہل ثابت کرنا مقصود نہیں۔

مصائب کی حکمتیں

اس پر شاید تم یہ کہو کہ احکام تشریعیہ میں تو بے شک ایسی ہی آسانیاں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کو ہم سے بہت محبت ہے مگر تکنوینیات میں تو یہ حالت ہے کہ کبھی بیماری ہے کبھی پھوڑا

پھنسی نکل رہا ہے کبھی طاعون ہے کبھی ہیضہ ہے کبھی اولاد کا صدمہ دیتے ہیں کبھی بیوی اور ماں بہن کے مرنے کا۔ کسی کے بدن میں کیڑے پڑ گئے ہیں کسی کو دمہ یا سل اور دق کی تکلیف دی جا رہی ہے۔ محبت تو جب ہوتی کہ تکالیف تکوینیہ بھی نہ آیا کرتیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی محبت ہی ہے مگر اس میں ماں کی محبت کا رنگ نہیں ہے۔ بلکہ باپ کی محبت کا رنگ ہے باپ کی محبت یہی ہے کہ جب لڑکا شرارت کرے تو چار ادھر لگائے اور چار ادھر۔ حضرات ان مصائب سے حق تعالیٰ ہم کو مہذب بنانا چاہتے ہیں۔ تاکہ گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔ ہم لوگ اپنے اعمال بد سے اپنے آپ کو تباہ کرنے میں کسر نہیں کرتے۔ حق تعالیٰ ان سزاؤں سے ہم کو راستہ پر لگا دیتے ہیں اور دماغ درست کر دیتے ہیں۔

پھر حدیث میں آتا ہے کہ دنیا کے مصائب سے بہت سے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ نیز ایک روایت میں ہے کہ بعض دفعہ حق تعالیٰ اپنے بندہ کو کوئی خاص درجہ اور مرتبہ عطا فرمانا چاہتے ہیں جس کو وہ اپنے عمل سے حاصل نہیں کر سکتا۔ تو اللہ تعالیٰ اس کو کسی مصیبت یا مرض میں مبتلا کر دیتے ہیں جس سے وہ اس درجہ عالیہ کو پالیتا ہے۔

اب بتلائیے یہ مصائب و متاعب تکوینیہ محبت حق سے ناشی ہیں یا نہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ قیامت میں اہل مصائب کو ثواب کثیر ملتا ہوادیکھ کر اہل نعم کہیں گے۔ یا لیت جلودنا قرضت بالمقاریض فنعطی مثل ماوتوا (او کما قال)۔ کہ اے کاش! ہماری کھالیں دنیا میں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں تاکہ آج ہم کو بھی یہ درجات ملتے تو۔

صاحبو! اللہ تعالیٰ تو آپ کو سلطنت اور بادشاہت دینا چاہتے ہیں اور آپ روتے ہیں کہ ہائے مارد یا ہائے ذبح کر دیا۔ آپ کی وہی مثال ہے جیسے ایک چھار کا لڑکا بگولے میں لپٹ کر اڑ گیا۔ اور ایک راجہ کے محل کی چھت پر جا پڑا تھا۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ یہ آدمی آسمان سے کیونکر آگرا۔ راجہ نے پنڈتوں کو بلایا۔ انہوں نے آکر کہہ دیا کہ یہ نبی انسان ہے۔ خدا تعالیٰ نے اس کو بھیجا ہے اس کی تعظیم کرنا چاہیے۔ یہ سن کر راجہ نے کہا کہ پھر میری لڑکی جوان ہو گئی ہے اور اس کے لئے بہت جگہ سے پیغام آرہے ہیں۔ میں نے کسی جگہ کو منظور نہیں کیا۔ میری رائے یہ ہے کہ اسی آسمانی لڑکے کو شاہی حمام میں لے جا کر اچھی طرح غسل دیا جائے اور نہایت قیمتی لباس پہنا کر لایا جائے۔ اس کو جو حمام میں لے جانے لگے تو اس نے رونا چلانا شروع کیا کہ مجھے کہاں لے جاتے ہو اور جب

حمام میں اس پر گرم گرم پانی ڈالا گیا تو اور زیادہ چلایا پھر لباس قیمتی لایا گیا تو بہت ہی چیخا اور کسی طرح خاموش نہ ہوا۔ اطباء کی رائے ہوئی کہ شہزادی کو اس کے سامنے لایا جائے شاید اس کو دیکھ کر مانوس ہو شہزادی سامنے آئی تو اس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں اور پہلے سے زیادہ چلانے لگا۔

پھر وزراء کی رائے یہ ہوئی کہ یہ آسمان سے ابھی تازہ آیا ہے۔ زمین کے آدمیوں سے اس کو وحشت ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اس کو آزاد چھوڑ دیا جائے۔ کچھ دنوں کے بعد جب یہ ہم سے مانوس ہو جائے گا۔ پھر شادی کا انتظام کیا جائے گا۔ آخر کار اسے چھوڑ دیا گیا تو وہ سیدھا اپنے وطن میں اپنی ماں کے پاس پہنچا اور رو کر سارا قصہ بیان کرنا شروع کیا کہ میں اس طرح اڑ گیا۔ پھر مجھے بہت سے آدمی پکڑ کر لے گئے اور سب نے مجھے طرح طرح سے مارنا چاہا میرے اوپر تاتالیجنی (گرم گرم) پانی ڈالا میں جب بھی نہ مرا میا۔ پھر میرے سامنے دھکتے دھکتے انگارے لائے (یہ جواہرات کی گت بنائی۔ میں جب بھی نہ مرا میا۔ پھر میرے سامنے ایک ڈائن کو لائے تاکہ مجھے کھالے۔ (یہ شہزادی کی گت بنائی)۔ میں جب بھی نہ مرا میا۔

تو جیسے اس احمق نے ساری قدر و منزلت اور عروج و راحت کو مصیبت اور سامان موت سمجھا۔ ایسا ہی ہم لوگ حق تعالیٰ کے امتحانات و ابتلاءات کو مصیبت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ حقیقت میں غایت عروج و راحت کا سبب ہیں۔ اور یہ حکمتیں تو آخرت میں جا کر منکشف ہوں گی۔

حضرات! دنیا میں بھی عارفین کو ان مصائب کی حکمتیں بکثرت منکشف ہوتی ہیں۔ جن سے وہ مصائب ہی نہیں رہتے۔ بلکہ نعم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک صحابی کا پاؤں کسی صدمہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ ان کو اس کا کچھ غم تھا کچھ دنوں کے بعد حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان لڑائی چھڑی اور دونوں طرف کے لوگوں نے ان صحابیؓ کو اپنا شریک کرنا چاہا تو انہوں نے دونوں سے عذر کر دیا کہ میں تو چلنے پھرنے سے بھی معذور ہوں اس وقت وہ اپنی اس بیماری پر خوش ہوتے تھے اور کہتے تھے

الحمد لله الذي طهر يدي من هذه الدماء باذهاب رجلى.

”کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرے ہاتھ اس محترم خون سے پاک رکھے۔“

اور میں میچ کہتا ہوں کہ اگر انسان مصائب و بلیات کی حکمتیں سوچا کرے تو اس کو اکثر مصائب کی حکمتیں دنیا ہی میں منکشف ہو جائیں گے۔ پھر وہ مصائب ہی نہ رہیں گے بلکہ نعمتیں بن جائیں گی۔

سہل احکام

بہر حال تگوبنی صعوبتوں کی حکمتیں تو نظری بھی ہیں۔ مگر تشریحی سہولتوں کی حکمتیں تو اس قدر بدیہی بلکہ حسی ہیں کہ ان میں بجز محبت حق کے دوسرا خیال ہی نہیں کیا۔ بدوں محبت کے احکام بھی سہل ہو سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں!

پھر افسوس ہے کہ ایک طبیب پر اعتماد کر کے تو آپ کو سہل اور آپریشن بھی گوارا ہے اور خدا پر اعتماد کر کے یہ سہل سہل احکام بجالانا بھی گوارا نہیں۔ بلکہ ان میں سوال کیا جاتا ہے کہ اس حکم میں کیا مصلحت ہے اور فلاں حکم کی کیا حکمت ہے اور روزہ کی کیا فلاسفی ہے نہ معلوم یہ فلاسفی کون سالفت ہے۔ اگر تم کو اعتماد نہیں نہ ہو حق تعالیٰ کو تو تم سے محبت ہے اس لئے وہ تمہاری اصلاح و تکمیل کے واسطے برابر احکام بیان فرماتے رہیں گے اور بہت سے احکام کی حکمت بھی نہیں بتلائیں گے۔ کیونکہ شفیق باپ اپنے بچے کو حکمتیں نہیں بتلایا کرتا۔ بلکہ جس کام میں اس کی مصلحت دیکھتا ہے اس کا امر کیا کرتا ہے چاہے بیٹا حکمت سمجھے یا نہ سمجھے اور اگر وہ سعادت مند ہے اور باپ کے احکام کی تعمیل کرنے لگا تو عمل کے بعد اس کو خود ہی ان احکام کے مصالح و حکم معلوم ہو جائیں گے۔

اسی طرح احکام شرعیہ کی مصالح و حکم دریافت کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ پہلے حکمتیں معلوم کرو پھر عمل کرو۔ بلکہ تم عمل شروع کر دو۔ عمل ہی سے تم کو حکمتوں کا علم بھی ہو جائے گا۔

پس حق تعالیٰ کی ایک تو بڑی عنایت یہ ہے کہ ہمارے واسطے سہل احکام تجویز کئے ہیں۔ پھر عنایت پر عنایت یہ ہے کہ ان سہل احکام میں بھی اگر ہم پر کچھ گرانی تھی تو اس گرانی کے بھی رفع کرنے کا اہتمام فرما دیا ہے اور تسہیل در تسہیل کر دی ہے چنانچہ نماز کے متعلق ارشاد ہے وانھا لکبیرۃ کہ بے شک نماز گراں ہے اس میں محض بندوں کے جذبات کی رعایت ہے کہ جس آسان بات کو وہ گراں سمجھتے تھے حق تعالیٰ نے بھی ان کی رعایت سے اس کو گراں تسلیم کر لیا ہے۔ ورنہ ان کو یہ بھی حق تھا کہ ہمارے جذبات کی رعایت نہ فرماتے۔ بلکہ حقیقت کو واضح کر کے ہمارے اس خیال کی غلطی ظاہر کر دیتے کہ تم جو نماز کو گراں کہتے ہو غلط ہے۔

مگر قربان جائیے ان کی رحمت کے کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ یوں فرمایا کہ بھائی ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ نماز گراں ہے۔ مگر سب کو گراں نہیں۔ بلکہ بعض لوگوں پر آسان بھی ہے آگے ان لوگوں کی صفات مذکور ہیں جن میں ہم کو تعلیم دی گئی ہے کہ اگر تم بھی ان صفات کو حاصل

کر لو گے تو تم پر بھی نماز گراں نہ رہے گی۔ چنانچہ فرماتے ہیں **الا علی الخاشعین الذین یظنون انہم ملقوا ربہم وانہم الیہ راجعون**۔ اس میں اس گرائی کی تسہیل ہے جس کا حاصل یہ ہے خشوع حاصل ہو جانے کے بعد نماز گراں نہ رہے گی۔ اور تحصیل خشوع کا طریقہ یہ بتلایا کہ تم لقاء رب کا استحضار رکھو اور موت کا دھیان رکھو اس سے خشوع حاصل ہو جائیگا۔

اسی طرح روزہ کے متعلق میں عرض کر چکا ہوں کہ وہ فی نفسہ سہل ہے۔ مگر حق تعالیٰ پھر بھی عنوان حکم ہی میں اس کی تسہیل کا اہتمام فرماتے ہیں۔

کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم

”کہ تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔“

اس عنوان میں تسہیل صوم کا پورا اہتمام ہے کہ روزہ کا حکم سن کر یوں مرے جاتے ہو۔ یہ کوئی تمہارے ہی واسطے مشروع نہیں ہوا۔ بلکہ تم سے پہلوں پر فرض تھا۔ آگے انبیاء کی تسہیل ملاحظہ ہو کہ نمازیں اول اول پچاس فرض ہوئی تھیں۔ مگر یہ معلوم نہیں کہ پچاس وقت کی فرض ہوئی تھیں یا پچاس رکعتیں تھیں یا پچاس شفعات تھے اس کی تفصیل روایات میں نہیں ہے اس لئے سب احتمالات جاری ہیں کہ پچاس وقت کی نمازیں فرض ہوئی ہوں یا پچاس رکعات یا پچاس شفعات خیر! جو کچھ بھی ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پچاس نمازوں کا حکم لے کر واپس ہوئے تو موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوچھا کہ حق تعالیٰ نے آپؐ پر اور آپؐ کی امت پر کیا فرض کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ پچاس نمازیں فرض فرمائیں۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے محمدؐ! آپؐ کی امت ضعیف ہے میں نے بنی اسرائیل کا تجربہ کیا ہے جو کہ آپؐ کی امت سے قوی تھے وہ اس سے بھی آسان احکام کو نہ نباہ سکے۔ آپؐ بحق تعالیٰ سے تخفیف کی درخواست کیجئے۔

حضرت موسیٰ کے افسوس کی حقیقت

یہاں سے ایک بات پر متنبہ کرتا ہوں وہ یہ کہ قصہ معراج میں یہ بھی آیا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم حالت عروج میں موسیٰ علیہ السلام پر گزرے اور سلام وغیرہ کر کے آگے بڑھے تو موسیٰ علیہ السلام رونے لگے کسی نے پوچھا کہ آپؐ کیوں روتے ہیں تو فرمایا کہ میں اسلئے روتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے بعد مبعوث ہوئے ہیں اور یہ میرے سامنے جوان لڑکے ہیں مگر ان کی امت جنت میں میری امت سے زیادہ داخل ہوگی۔

اس پر بعض جہلاء کو شبہ ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر حسد ہوا یہ بالکل غلط ہے۔ بلکہ موسیٰ علیہ السلام کو اپنی امت کی کوتاہی پر حسرت و افسوس ہوا کہ انہوں نے میری ویسی اطاعت نہ کی جیسی امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کر گئی (قلت اوبکی تحسرا علی مافات منه من رؤیتہ تعالیٰ مع تمنیہ ایاہا وتشرف بہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی الاسراء واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲) اور ان جہلاء کے خیال کی تردید خود واقعہ معراج ہی میں موسیٰ علیہ السلام کے اس دوسرے واقعہ سے ہوتی ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اپنی امت کے لئے تخفیف کی درخواست کیجئے۔ اگر معاذ اللہ! ان کو حسد ہوا ہوتا تو وہ تخفیف کی درخواست کیلئے کیوں کہتے۔ بلکہ وہ پچاس کے حکم سے خوش ہوتے کہ اچھا ہے ان کی امت پر پچاس نمازیں فرض ہوں تاکہ وہ نباہ نہ سکیں اور جنت میں زیادہ نہ پہنچیں۔ مگر نہیں انہوں نے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حال پر نہایت شفقت فرمائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار تخفیف کی درخواست کرائی۔ یہاں تک کہ اخیر میں پانچ نمازیں رہ گئیں تو موسیٰ علیہ السلام نے اس میں بھی تخفیف کی درخواست کی۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بس میں بار بار مراجعت کرنے سے شرمایا ہوں اس وقت حق تعالیٰ کی طرف سے ندا آئی

امضیت فریضتی وخففت عن عبادی هن خمس وھی خمسون

کہ میں نے اپنا فریضہ بھی پورا کر دیا اور بندوں سے تخفیف بھی کر دی یہ پانچ نمازیں ہیں اور حقیقت میں یہ پچاس ہی ہیں۔ کیونکہ ایک بمنزلہ دس نمازوں کے ہے۔

اسی وقت سے یہ قاعدہ مقرر ہوا ہے کہ ایک حسنة (اس میں تنبیہ تھی ایک عالم کی غلطی پر جنہوں نے اسی باب میں اپنے وعظ میں کہا تھا کہ رمضان میں ایک فرض شریف ستر فرضوں کے برابر ہے اور ایک نیکی دس گنی ہوتی ہے اور پانچ اوقات کی نماز پچاس نمازوں کے برابر معراج میں ہو چکی ہے تو پچاس کو پچاس میں پھر ستر میں ضرب دیا تو ایک لاکھ پچاس ہزار حاصل ہوئے پھر اس کو جماعت کے ثواب میں ضرب کیا تھا اور کئی لاکھ تک پہنچایا) پر دس کا ثواب ملے گا پہلے یہ قاعدہ نہ تھا جن صاحبوں نے الحسنۃ بعشر امثالہا کی تضعیف کو تضعیف لیلۃ المعراج سے علیحدہ سمجھا ہے یعنی یہ سمجھا کہ لیلۃ المعراج میں جو پانچ نمازوں پر پچاس کا وعدہ ہوا ہے۔ ایک تضعیف تو یہ ہے

کہ پھر ان پچاس میں عشر امثال کی تضعیف الگ ہوگی۔ انہوں نے صحیح نہیں سمجھا۔
تو دیکھئے انبیاء علیہم السلام کی بھی تسہیل و تخفیف کا کتنا اہتمام ہے اور یہ بھی حق تعالیٰ ہی کی محبت کا اثر
ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام میں جو شفقت و رحمت ہے وہ حق تعالیٰ ہی کی شفقت و رحمت کا ظل ہے۔

روزوں میں تخفیف

اب یہاں سے ایک بات اور سمجھئے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موسیٰ علیہ السلام
کے کہنے سے نمازوں میں تو تخفیف کی درخواست کی اور اس وقت آپ کو معلوم ہو گیا کہ میری امت
پہلے لوگوں سے کمزور ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس سے تخفیف کی درخواست کر کے
پانچ کرائیں لیکن روزہ کا عدد تیس سے تین نہیں کرایا۔

اس سے صاف میرے دعوے کی تائید ہوتی ہے یعنی اس سے بھی معلوم ہو گیا کہ روزہ سال
بھر میں ایک مہینہ کا کچھ دشوار نہیں ورنہ ایک تجربہ ہو جانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہاں بھی
تخفیف کی ضرورت درخواست کرتے اور تیس دن کے تین کرا لیتے اور اگر عدد بھی کم نہ کراتے تو کم از کم
کیفیت ہی میں تخفیف کرا لیتے۔ اس طرح سے کہ رمضان کے روزہ کو مشکل کشا علیؑ کے روزہ جیسا
بعض جہلار کہتے ہیں جو صبح سے دوپہر کو ہوتا ہے۔ خیر غنیمت ہے کہ ان جاہلوں نے حضرت علیؑ کے
روزہ کو خدا کے روزہ کے برابر نہیں کیا اس کے علاوہ ایک فرق اور بھی ہے وہ یہ کہ حضرت علیؑ کا روزہ
کسی بندہ ہی کے کہنے سے کھلتا ہے خود نہیں کھول سکتے چنانچہ دوپہر کو ایسے روزہ دار تیری میری
خوشامد کیا کرتے ہیں کہ اللہ کے واسطے تم زبان سے کہہ دو کہ روزہ کھول دے اور مذاقی لوگ کچھ
دیر تک ان کو تنگ کیا کرتے ہیں کہ ہم تو نہیں کہتے۔

واقعی ان بدعات کا بدعت و جہل ہونا خود ان کی حالت سے ظاہر ہے بھلا یہ بھی کوئی بات
ہے کہ دوسرے کے کہنے سے روزہ کھولا جائے اور کہنا اس طرح کا جس میں خوشامدی کی جائیں
اور زبردستی دوسرے سے کہلوایا جائے۔

غرض! روزہ کے کم منفعل یعنی عدد میں یا اس کی کم متصل یعنی مقدار میں حضور صلی اللہ علیہ
وسلم کا تخفیف نہ کرانا باوجودیکہ نماز میں آپ نے بہت تخفیف کرائی ہے اس بات کی مستقل دلیل
ہے کہ صبح سے شام تک روزہ رکھنا اور سال بھر میں ایک مہینہ کے روزے رکھنا کچھ بھی دشوار نہیں۔
بلکہ آسان ہے پس اس قسم کی تخفیف تو روزہ میں نہیں ہوئی۔ البتہ اور تغیرات اور تبدیلیاں ہوئی

ہیں۔ مثلاً ابتدائے اسلام میں سو جانے کے بعد سحری کھانا حرام تھا۔ چاہے کوئی عشاء کے بعد متصل ہی سو جائے بعد میں اس کو منسوخ کیا گیا اور صبح صادق تک کھانے پینے کی اجازت دی گئی۔

ایک سہولت روزہ میں یہ رکھی گئی کہ نماز میں تو جمع صوری سفر کی حالت میں جائز ہے اور سال میں ایک دن جمع حقیقی بھی جائز ہے عرفات و مزدلفہ میں مگر روزہ کے اندر جمع نہیں یعنی دو روزوں کے درمیان افطار بھی نہ ہو۔ یہ وصال کہلاتا ہے سو یہ امت پر حرام ہے۔

تو یہ آسانیاں ہیں روزہ میں۔ اس کے بعد غور کیجئے کہ عرف یہ ہے اور آج کل عرفیات کو عقلیات کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ اس موقع پر ہم بھی بطور حجت الزامیہ کے اس قاعدہ کو برتتے ہیں کہ اگر کوئی محبوب یا حاکم اپنے محبت اور محکوم کو کوئی بہت ہی آسان کام بتلائے تو اس کی تعمیل نہ کرنا سخت عتاب کا سبب ہوتا ہے کیونکہ مشکل اور دشوار کام میں سستی ہونا تو ایک درجہ میں عذر بھی ہے لیکن سہل اور آسان کام میں سستی کرنے کا کیا عذر ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا

اس قاعدہ پر غور کر کے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کے روزے نہ رکھنا سخت عتاب و جرم کا سبب ہے اسی لئے حدیث شریف میں ہے: رَغِمَ أَنْفُ رَجُلٍ ذَكَرَتْ عَنْهُ فَلَمْ يَصِلْ عَلَى رَغِمِ أَنْفِ رَجُلٍ أَدْرَكَ رَمَضَانَ فَلَمْ يَغْفِرْ لَهُ رَغِمَ أَنْفِ رَجُلٍ أَدْرَكَ وَالِدَهُ أَوْ أَحَدَ هُمَا الْكَبَرَ عَنْهُ فَلَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ (او کما قال) (ترجمہ و تشریح آگے خود وعظ میں ہے)

اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین شخصوں پر بددعا کی ہے کہ ان کی ناگ رگڑ جائے یہ ذلیل ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ہی شخص پر بددعا کر سکتے ہیں جس کا جرم بہت سنگین ہو اور ان تینوں شخصوں کا جرم اسلئے سنگین ہے کہ انہوں نے نہایت سہل اور آسان کام میں کوتاہی کی ہے۔ اس پر شاید کوئی کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا سے تو ہم کو بے فکری ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ سے دعا کر رکھی ہے کہ جس کو میں بددعا دوں اس کے حق میں میری بددعا کو قربت و صلوة و زکوٰۃ و رحمت بنا دیا جائے تو آپ کی بددعا ہی دعا ہو کر لگتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ گو آپ کی بددعا دعا ہو کر لگے مگر اس سے بے فکری نہایت بھداپن ہے کیونکہ یقیناً بددعا غصہ میں ہوا کرتی ہے تو جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا دی ہے وہ حضور صلی

اللہ علیہ وسلم کے غضب و غصہ کا محل ضرور ہے تو کیا آپ کو یہ گوارا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے ناراض ہوں۔ یقیناً کوئی عاشق اپنے محبوب کی ناراضی اور غصہ کا تحمل نہیں کر سکتا گوارا کا انجام سزا بھی نہ ہو۔ بلکہ عشق کا مقتضی تو یہ ہے کہ سزا گوارا ہوتی ہے مگر محبوب کا غصہ اور ناراض ہونا گوارا نہیں ہوتا۔

دوسرے آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ جس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ سے یہ دعا کی ہے کہ میری بددعا کو بددعا بنا دیا جائے وہ کون سی بددعا کے متعلق ہے وہ خاص ہے۔ اس بددعا کے ساتھ جو بطور بشریت کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکل جائے ہر بددعا کے لئے یہ درخواست عام نہیں اور اس کا قرینہ خود اس حدیث کے الفاظ میں موجود ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اللھم انما انا بشر اغضب کما یغضبون فایما عبداً ذیتہ او شمتہ او لعنة فاجعلھا له زکوة ورحمة وقرۃ تقر بہ بها الیک۔ (اے اللہ میں بشر ہی ہوں غصہ ہوتا ہوں جیسے بندہ غصہ کرتے ہیں پس جس بندہ کو میں تکلیف پہنچاؤں یا اس کو برا کہوں یا اس پر لعنت کروں تو اس کو زکوٰۃ اور رحمت اور قربت اس کیلئے کر دیجئے تاکہ اسکے ذریعہ سے وہ آپ کا قرب حاصل کرے)

اس میں اول ہی لفظ انما انا بشر موجود ہے جو اس کا قرینہ ہے کہ اس کے بعد جو مضمون ہے وہ کسی ایسے امر کے متعلق ہے جس کا منشا بشریت ہے ورنہ یہ لفظ فضول ہوگا۔ پس جو بددعا تشریع سے ناشی ہو اس کے لئے یہ حکم نہیں ہے کہ وہ بھی زکوٰۃ و رحمت و قربت ہو اور حدیث ر غم انف رجل الخ میں جو بددعا ہے وہ بشریت کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ بطور تشریع سے ہے کیونکہ بشریت کے طور پر جو بددعا ہوتی ہے وہ کسی معین شخص یا معین جماعت پر ہوا کرتی ہے جب کہ اس کی طرف سے کوئی امر ناگوار ظاہر ہوا ہو۔ اور اس حدیث میں عام الفاظ کے ساتھ بددعا ہے۔

نیز اس کا سبب ورود سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بددعا کی ہے اس وقت کسی کی طرف سے کوئی امر ناگوار پیش نہ آیا تھا۔ بلکہ قصہ اس کا یہ ہے کہ ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ پڑھنے کے لئے منبر پر جا رہے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک درجہ پر قدم رکھا فرمایا آمین۔ پھر دوسرے درجہ پر پیر رکھ کر فرمایا آمین۔ پھر تیسرے درجہ پر تشریف فرما ہو کر فرمایا آمین۔ صحابہ کو حیرت ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ آمین آمین تین مرتبہ

کس بات پر فرما رہے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے تھے۔ جب میں نے منبر کے ایک درجہ پر پیر رکھا تو انہوں نے کہا: رَغَمِ اَنْفِ رَجُلٍ ذَكَرْتُ عَنْدَهُ فَلَمْ يَصِلْ عَلَيَّ اِيعْنِي اِسْ شَخْصٌ كِي نَاكِرْ رُكُزْ جَائِے اور وہ ذلیل و خوار ہو جائے جس کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آئے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نہ بھیجے۔ میں نے کہا آمین۔ دوسرے درجہ پر میں نے پیر رکھا تو جبرئیل علیہ السلام نے کہا

رَغَمِ اَنْفِ رَجُلٍ اَدْرَكَ رَمَضَانَ وَلَمْ يَغْفِرْ لَهُ (سنن الترمذی: ۳۵۳۵)
یعنی وہ شخص بھی ذلیل و خوار ہو جائے جس نے رمضان کو پایا اور سارا رمضان گزر گیا اور اسے اپنی مغفرت نہ کرائی۔

میں نے کہا آمین۔ تیسرے درجہ پر میں پہنچا تو جبرئیل علیہ السلام نے کہا: رَغَمِ اَنْفِ رَجُلٍ اَدْرَكَ وَالِدَةً اَوْ اَحَدَ هُمَا الْكَبَرِ عَنْدَهُ فَلَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ. (مسند احمد: ۳۴۶: ۲)
وہ شخص بھی ذلیل ہو جائے جس کے والدین یا ان میں سے ایک بوڑھا ہو گیا ہو۔ اور وہ اس کی خدمت کر کے جنت میں داخل نہ ہوا۔ میں نے کہا آمین۔

تو یہ بددعا تو وہ ہے جو حضرت جبرئیل علیہ السلام لے کر آئے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر آمین فرمائی۔ اس میں یہ احتمال بالکل نہیں ہو سکتا کہ بشریت کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا کی ہوگی۔ پس یہ معمولی بددعا نہیں۔ اس سے بہت ڈرنا چاہیے۔

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ بشریت کے طور پر غصہ میں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے بددعا نکلے گی وہ تو بدوں قصد و ارادہ کے صادر ہوگی اور ایسی بددعا و بددعا تو خود ہی قبول نہیں ہوتی۔ جس کے ساتھ قصد و ارادہ متعلق نہ ہو۔ تو پھر اس کے متعلق اس قدر اہتمام کی کیا ضرورت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر اس کے لئے یہ درخواست کی کہ اس کو زکوٰۃ و رحمت قربت بنا دیا جائے۔

اہل اللہ کے کلمات

اس کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو بڑی شان ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض ادنیٰ غلام ایسے ہوئے ہیں کہ ان کی زبان سے جو نکل گیا وہی ہو گیا خواہ ارادہ سے نکلا ہو یا بے

ارادہ کے۔ میرے ایک دوست کہتے تھے کہ پہاڑ میں میں نے ایک جسم دیکھا کہ اس کا بعض حصہ پتھر ہے اور بعض لکڑی ہے اور بعض کچھ اور ہے اور مشہور یہ ہے کہ ایک بزرگ پہاڑ میں چلے جا رہے تھے۔ کسی چیز کی ان کو ٹھوکر لگی۔ آپ نے فرمایا کہ کیا یہ لکڑی ہے؟ تو اس کا کچھ حصہ فوراً لکڑی ہو گیا۔ پھر فرمایا پتھر ہے؟ تو کچھ حصہ فوراً پتھر ہو گیا پھر فرمایا لوبا ہے؟ تو کچھ حصہ فوراً لوبا ہو گیا۔

غرض! جو ان کی زبان سے ہوتا گیا وہی ہوتا گیا۔ حالانکہ ان کا مقصود محض استفسار تھا۔ بددعا یا دعا مقصود نہ تھی۔ اولیاء اللہ کے عجیب عجیب حالات ہیں اور ہر ایک کا رنگ الگ ہے۔ بلکہ خود ایک شخص ہی کے حالات مختلف ہوتے ہیں کبھی کچھ ہے کبھی کچھ، مولانا فرماتے ہیں۔

گر بعلم آئیم مایوان دوست ☆ ورنجیل آئیم مازاندان دوست

گر بخواب آئیم مستان و نیم ☆ و رہ بیداری بدستان و نیم

(اگر علم تک ہماری رسائی ہو جائے تو یہ بھی ان ہی کا ایوان ہے کہ درجہ علم ان ہی کے تصرف سے عطا ہوا ہے اور اگر جہل میں مبتلا رہیں تو یہ ان ہی کا زندان ہے یعنی حق تعالیٰ کا تصرف ہے کہ جہل کے زندان سے نہیں نکلے۔ اگر سو رہیں تو ان ہی کے بے ہوش کئے ہوئے ہیں اور اگر جاگ اٹھیں تو بھی ان ہی کی گفتگو میں ہیں یعنی یہ قوت بانیہ ان ہی کی عطا کی ہوئی ہے) اور۔

درتر دودہر کہ او آشفته است ☆ حق یگوش امعما گفته است

(یعنی جو شخص کسی تردد میں پریشان ہو رہا ہے گویا حق تعالیٰ نے اس کے کان میں کوئی معما کہہ دیا ہے) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے یہ دعا کی ہے اللھم ادر الحق معہ حیث دار یہ عجیب دعا ہے یوں نہیں فرماتے کہ اللھم ادر علیا مع الحق حیث دار یعنی اے اللہ! علی کو حق کے ساتھ کر دے بلکہ یوں فرماتے ہیں کہ حق کو علی کے ساتھ کر دے کہ جدھر یہ رخ کریں حق بھی ادھر ہی رخ کرے اس کی صورت یہ ہے کہ اگر کبھی علیؑ سے خطا بھی ہو جائے تو اسباب ایسے پیدا کر دیئے جائیں جن سے وہ خطا ثواب ہو جائے۔ مثلاً حضرت علیؑ کسی پر عتاب کریں اور وہ اس وقت محل عتاب نہ ہو تو ان کے عتاب کے بعد اسباب ایسے پیدا ہو جائیں جن سے یہ شخص محل عتاب ہو جائے اور حضرت علیؑ کا عتاب انجام کا صحیح ہو جائے۔ مگر یہ فضیلت جزئیہ سے کلیہ نہیں۔

رہا یہ کہ فضیلت کلیہ کے حاصل ہے تو یہ نصوص سے معلوم کرو۔ اور مرزا مظہر جان جاناں کو حضور

علی اللہ علیہ وسلم سے بھلا کیا نسبت ہو سکتی ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ مگر ان میں محبوبیت کی یہ شان تھی کہ جس سے آپ کو ایذا پہنچتی یا کچھ ناگواری پیش آتی تو اس پر کچھ نہ کچھ ضرور دہال آتا۔ اسی لئے آخر میں آپ نے لوگوں سے ملنا بالکل ترک کر دیا تھا بعض خدام نے عرض کیا کہ حضرت لوگ بہت شوق سے زیارت کو آتے ہیں اور محروم ہو کر رنجیدہ واپس جاتے ہیں تو فرمایا میں کیا کروں لوگ بدتمیزی بہت کرتے ہیں۔

مرزا مظہر جانجنا رحمہ اللہ کی لطیف المزاجی

حضرت کے نزدیک تو تقریباً سارے ہی بے تمیز تھے کیونکہ آپ نہایت لطیف المزاج تھے جیسا کہ آپ کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ شاہ دہلی آپ کی زیارت کو حاضر ہوئے اتفاق سے بادشاہ کو پیاس لگی۔ اس وقت کوئی خادم موجود نہ تھا۔ بادشاہ نے خود اٹھ کر صراحی سے پانی پیا اور پانی پی کر حضرت سے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو کوئی خدمت گار جناب کیلئے بھیج دوں۔ مرزا صاحبؒ نے فرمایا کہ بس معاف کیجئے وہ خدمت گار بھی آپ ہی جیسا ہوگا۔ آپ کو خود تو تمیز ہے ہی نہیں۔ پانی پی کر کٹورا ٹیڑھا رکھ دیا جس سے میرے سر میں درد ہو گیا۔

اور سنئے کہ حضرت کے ایک مرید نے ایک دفعہ عرض کیا کہ میں عرصہ سے حاضر خدمت ہوتا ہوں۔ آج تک حضرت نے مجھ سے کوئی فرمائش نہیں کی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کچھ فرمائش کریں اور میں اس کو پورا کروں۔ فرمایا میاں فرمائش کی کیا ضرورت ہے۔ تم محبت سے مل لیتے ہو جی خوش ہو جاتا ہے۔ بس یہی کافی ہے۔ اس نے اصرار کیا کہ نہیں حضرت میرا جی چاہتا ہے کہ آپ فرمائش کریں فرمایا بہت اچھا مگر برا تو نہیں مانو گے؟ اس نے کہا میری کیا مجال جو حضرت کی فرمائش سے برامانوں۔ خصوصاً جب کہ میں خود درخواست کر رہا ہوں۔ فرمایا تم سال میں دو دفعہ آیا کرتے ہو اگر ایک دفعہ آیا کرو تو اچھا ہے۔ کیونکہ تم کھاتے بہت ہو۔ تمہارا کھانا دیکھ کر میرے پیٹ میں ایسی گڑبڑ ہوتی ہے کہ بدوں مسہل لئے چین نہیں آتا۔ اور سال میں ایک بار مسہل لینا تو آسان ہے دوبار مشکل ہے۔

وہ بے چارہ مرید دم بخود رہ گیا ہوگا کہ میں نے اچھا اصرار کیا فرمائش پر۔ مگر عاشق کو تو اس سے بھی خوشی ہوتی ہے کہ محبوب کی تکلیف کا حال تو معلوم ہو گیا۔ آئندہ اگر وہ سال میں ایک بار بھی آیا ہوگا تو کھانے میں بہت احتیاط کی ہوگی۔ تو کچھ ٹھکانہ ہے اس نزاکت کا کہ زیادہ کھائے کوئی اور پیٹ میں گڑبڑ ہو مرزا صاحب کے۔

اور سنیے! ایک دفعہ آپ صبح کو جو مجلس میں بیٹھے تو آنکھیں سرخ تھیں خدام نے وجہ پوچھی۔ فرمایا کہ سردی کی وجہ سے رات نیند نہیں آئی۔ مجلس میں ایک بڑھیا بھی موجود تھی اس نے پکار کر کہا کہ بھائیو! حضرت کے لئے دولائی کا انتظام میں کروں گی۔ اور لوگ فکر نہ کریں۔ چنانچہ اس نے اس روز دولائی تیار کی اور عشاء کے بعد تیار کر کے لائی۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ میرے اوپر ڈال دو۔ وہ ڈال کر چلی گئی۔ صبح کو جو اٹھے تو آنکھیں پھر سرخ تھیں۔ خدام نے پوچھا کہ آج بھی سردی لگی فرمایا کہ نہیں سردی تو نہیں لگی مگر لحاف میں گندے میڑھے تھے اس وجہ سے طبیعت کو الجھن رہی اور نیند نہ آئی۔

بھلا رات کو اندھیرے میں گندوں کے میڑھے ہونے کا احساس یہ بجز مرزا صاحب جیسے لطیف المزاج کے کسی کو ہو سکتا ہے نیز ایک دفعہ اور آپ کورات بھر نیند نہ آئی۔ خدام نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ چار پائی میں کان تھی (یعنی نقص مثلاً میڑھا پن، اونچ نیچ)۔ مگر مرزا صاحب کو وہ اتنی معلوم ہوئی کہ رات بھر نیند نہ آئی۔

مقام مرزا مظہر جان جاناں

تو ظاہر ہے کہ ایسے لطیف المزاج کے نزدیک دنیا میں تمیز دار کتنے آدمی ہوں گے یقیناً بہت کم۔ تو آپ نے فرمایا کہ لوگ بے تمیزی بہت کرتے ہیں جس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے اور میری تکلیف کی وجہ سے اس شخص کو کچھ تکلیف پہنچ جاتی ہے جس کی بے تمیزی سے مجھے تکلیف پہنچی ہو اور اس بارے میں میری دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔ تو اب میں نے مخلوق کی مصلحت اسی میں دیکھی کہ ان سے ملنا چھوڑ دوں۔ تو میں تو انہی کی خیر خواہی کرتا ہوں۔ مگر لوگوں کو اس خیر خواہی کی خبر نہیں۔

اللہ اکبر! کیا شان محبوبیت تھی کہ حالانکہ مرزا صاحب زبان سے کچھ کسی کیلئے بدو عانہ کرتے تھے صرف قلب کو تکلیف ہوتی تھی۔ اس پر بھی ایک گونہ گرفت ہوتی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت رحمت

اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو خود ہی سمجھ لو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج دینے والے کا کیا انجام ہوگا۔ حدیث میں حضرت عائشہ کا قول موجود ہے انی اری ربک یسارع فی ہواک کہ میں دیکھتی ہوں کہ حق تعالیٰ آپ کی خواہش پورا کرنے میں بہت جلدی فرماتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو یہ شان تھی۔

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں ☆ می دہد یزداں مراد متقیں

(تو جو چاہتا ہے اللہ تعالیٰ وہی کرتے ہیں حق تعالیٰ متقیوں کی مراد پوری کرتے ہیں) جب متقین کی یہ شان ہے تو رئیس المتقین صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا شان ہوگی خود ہی سمجھ لو۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کسی کے حق میں بددعا کا نکلنا معمولی بات نہ تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت اندیشہ تھا کہ ایسا نہ ہو جو میری زبان سے نکلے وہی نہ ہو جائے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی بددعاؤں کے متعلق جواز راہ بشریت غصہ میں بے ارادہ نکل جائیں حق تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ ان کو لوگوں کے حق میں دعا بنادیا جائے پھر غایت رحمت یہ ہے کہ یوں فرماتے ہیں کہ اس کو مدعو علیہ کے لئے زکوٰۃ بنادیتے کہ وہ پہلے سے زیادہ آپ کا مقرب ہو جائے۔ لیکن جو بددعا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریحی طور پر قصداً کی ہو اس کا یہ حکم نہیں۔ چنانچہ اس حدیث میں جو بددعا ہے وہ تشریحی ہے جیسا کہ اوپر گزر چکا۔

ذلت اور عذاب جہنم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں رَغِمَ أَنْفُ رَجُلٍ الْخِ يَعْنِي ذَلِيلٌ هُوَ جَاءَ وَهُوَ شَخْصٌ اس میں نہایت سخت بددعا ہے کیونکہ ذلت وہ چیز ہے جو عذاب جہنم سے بھی اشد ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ محشر میں جب مخلوق کھڑی کھڑی پریشان ہو جائے گی تو مومن اور کافر سب مل کر انبیاء علیہم السلام کے پاس جائیں گے۔ کہ حق تعالیٰ سے شفاعت کر دو کہ ہمارا حساب و کتاب ہو کر جلد فیصلہ ہو جائے۔ حالانکہ کفار کو اپنا معذب ہونا اور خالد فی النار اس وقت منکشف ہو جائے گا۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: اَسْمِعْ بِهِمْ وَأَبْصُرْ يَوْمَ يَأْتُونَنَا لَكِنَ الظَّالِمُونَ الْيَوْمَ فِي ضَلَلٍ مُّبِينٍ۔ (کیسے کچھ شنوا اور بینا ہو جائیں گے لیکن آج یہ الم دنیا میں کس غلطی میں ہیں) پھر کفار فیصلہ کے متمنی کیوں ہوں گے ان کے لئے تو بظاہر میدان حشر ہی غنیمت تھا۔ مگر پھر بھی محشر میں رہنا ان کو جہنم میں رہنے سے بھی زیادہ شاق ہوگا جس کی وجہ یہ ہے کہ محشر میں رسوائی بہت سخت ہوگی۔ تو کفار اس وقت عذاب نار کو عار پر ترجیح دیں گے جب ثابت ہو گیا کہ ذلت نہایت سخت چیز ہے تو معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رَغِمَ أَنْفٌ فرمانا بڑی سخت بددعا ہے اور اس کا مقتضایہ ہے کہ جس عمل پر یہ بددعا کی گئی ہے وہ بھی نہایت سنگین ہے۔

سنگین گناہ

مگر ظاہر میں ترک صلوٰۃ علی الرسول و ترک رعایت رمضان و ترک خدمت والدین۔ زنا اور سرقت

اور سود کی طرح تو سنگین گناہ نہیں معلوم ہوتے۔ مگر ان پر ایسی بددعا وارد نہیں۔ غور کرنے سے وجہ صرف یہی سمجھ میں آتی ہے کہ یہ امور اس لئے سنگین ہیں کہ ان میں نہایت سہل و آسان احکام کا ترک ہے تو جو شخص اتنے آسان کاموں میں سستی کرتا ہے اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ غصہ آتا ہے۔

کیونکہ میں کہہ چکا ہوں کہ عرف یہی ہے کہ سہل و آسان کام کے ترک پر غصہ زیادہ آیا کرتا ہے۔ روزہ کی سہولت تو اوپر مذکور ہو چکی اور درود کی سہولت بھی واضح ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سن کر صلی اللہ علیہ وسلم کہہ لینا کیا مشکل ہے۔

پھر فقہاء نے اس میں اتنی سہولت اور کردی کہ ایک مجلس میں ایک ہی بار درود پڑھنا فرض ہے۔ اس کے بعد پچاس دفعہ بھی اگر آپ کا نام مبارک زبان پر آئے یا کان میں پڑے تو بار بار درود فرض نہیں۔ ہاں محبت کا مقتضایہ ہے کہ ہر بار صلی اللہ علیہ وسلم کہو۔

والدین کی خدمت اسلئے آسان ہے کہ ان کی خدمت کرنے میں احتیاط سے زیادہ تو کوئی کام ہی نہیں۔ نہ تمام مال مانگا جاتا ہے۔ بلکہ حکم یہ ہے ابداً بنفسک کہ اول اپنے اوپر مال کو خرچ کر دو۔ ابدائین تعول۔ پھر جن کا نفقہ تمہارے ذمہ واجب ہے ان پر خرچ کرو یعنی بیوی بچوں پر۔ پھر والدین و دیگر محارم کا نفقہ ہے کہ اپنے اہل و عیال سے جو فاضل ہو اس کو والدین وغیرہم پر خرچ کرو۔ پھر بوڑھوں کی فرمائش ہی کیا ہوتی ہے۔ ایک غریب دم ہے۔ تھوڑی سی امداد میں ان کا جی خوش ہو جاتا ہے۔ بوڑھا آدمی نہ کچھ زیادہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ ایک دوروٹی میں اس کا پیٹ بھر جاتا ہے۔ تو اس کی خدمت کچھ بھی مشکل نہیں۔ کھانے پینے پہننے کا زمانہ تو جوانی میں ہے۔ بڑھاپے میں کچھ لطف بھی نہیں رہتا۔ نہ پہننے کو جی چاہے نہ کھانے کو۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ حضرت حاجی صاحب کا یہ مصرع کہ ”جوانی گئی زندگانی گئی“ سن کر جوانی میں ہم کو خیال ہوتا تھا کہ جوانی کے جانے سے زندگی کیونکر جاتی رہے گی۔ آخر بڑھاپے میں بھی تو زندگی رہتی ہی ہے۔ مگر بڑھاپا آنے کے بعد مشاہدہ ہو گیا کہ حاجی صاحب نے سچ فرمایا تھا۔ واقعی۔ ”جوانی گئی زندگانی گئی“

اب کسی کام کو جی نہیں چاہتا۔ بس یوں جی چاہتا ہے کہ ہر وقت پلنگ پر لیٹے رہو۔ تو بتلائے ایسے شخص کی خدمت کیا دشوار ہے جس کا دل دنیا سے سرد ہو چکا ہے۔ یہ تو ان احکام کی وجہ سہولت الگ الگ تھی۔

سہولت اور طبیعت

اب ایک وجہ سہولت ایسی بتلاتا ہوں جو ان تینوں میں مشترک ہے۔ بلکہ تمام احکام شریعہ میں

مشترک ہے وہ یہ کہ ان احکامِ ثلاثہ کی بلکہ تمام احکامِ شرعیہ کی حالت یہ ہے کہ وہ تقاضائے طبیعت کے موافق بھی ہیں۔ صرف حدود میں طبیعتِ منازعت کرتی ہے۔ مگر یہ منازعت بھی بے جا ہے۔ کیونکہ ہر کام کیلئے حدود کا ہونا ضروری ہے بدوں حد کے کوئی شے مستحسن نہیں خصوصاً جب کہ یہ دیکھا جائے کہ حدودِ شرعیہ سے آگے ہلاکت ہے۔ پھر تو ان حدود میں منازعت کرنا بھی بہت ہی بے جا ہے۔

بہر حال اگر طبیعت کچھ منازعت کرتی ہے تو حدود میں کرتی ہے۔ ورنہ احکامِ شرعیہ فی نفسہا محلِ منازعت نہیں ہیں۔ بلکہ وہ تو عین تقاضائے طبعی کے موافق ہیں اور اگر کہیں طبیعت کے کسی حکم سے موافقت نہ ہو تو اس عدم موافقت کا سبب حقیقت کا معلوم نہ ہونا ہے بعد علم حقیقت کے ضرور طبیعت کو اس حکم کا خود تقاضا ہوگا۔

یہاں سے معلوم ہوگا کہ احکامِ شرعیہ کی مخالفت سے دنیا کی بھی بے حلاوتی ہے کیونکہ یہ مخالفت کرنے والا خود اپنی طبیعت کے خلاف کام کر رہا ہے اور اس سے بڑھ کر کیا بے حلاوتی ہوگی کہ طبعی تقاضا کو مردہ کیا جائے۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ مطیعین کی زندگی شاہانہ زندگی ہے کہ ان کا ہر کام طبیعت کے موافق ہے۔

اب سنئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سن کر درود پڑھنا تقاضائے طبیعت کے بالکل موافق ہے۔ اگر کسی کو حضور کا محسن ہونا ہی معلوم نہ ہو۔ وہ اگر درود کو طبیعت کے موافق نہ سمجھے تو نہ سمجھے۔

درود شریف کی اہمیت

مگر اس علم کے بعد کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم محسن ہیں اور سب سے بڑے محسن ہیں خود بخود یہ تقاضا ہوگا کہ حضور کے احسان کا بدلہ کریں۔ جس کا اقل درجہ یہ ہے کہ کم از کم آپ کو دعا ہی دیں مگر خود دعا کیسے دیں۔ ہم کو آپ کے درجہ کا کما حقہ علم ہی نہیں۔ اس حالت میں خود تصنیف کر کے دعا کرنے میں سخت بے دلی کا اندیشہ تھا کیونکہ اس وقت ہماری دعا و ثنا ایسی ہوگی کہ۔

شاہ را گوید کسے جولا بہ نیست ☆ ایں نہ مدح است او مگر آگاہ نیست

(بادشاہ کو کوئی شخص کہے کہ وہ جولا ہا نہیں یہ اسکی تعریف نہیں ہے بلکہ وہ بادشاہ کے مرتبہ

سے واقف نہیں ہے)

اور اسی لئے اپنی رائے سے تفاضل جائز نہیں جس میں درجہ تفاضل خود تصنیف کرے ہاں جو فضائل منصوص ہے ان سے تفاضل جائز ہے کیونکہ وہ تمہاری طرف منسوب نہ ہوگا بلکہ شارع کی

طرف منسوب ہوگا۔ اس میں بے ادبی کا اندیشہ نہیں اور محققین نے تو تقاضا میں اولیاء سے بھی ممانعت کی ہے کیونکہ تقاضا کے لئے ضرورت اس کی ہے کہ یہ فیصلہ کرانے والا دونوں کے مقامات سے واقف ہو اور ایک ولی کا پورا حال دوسرے ولی کو بھی معلوم نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ ہم جیسوں کو۔

اسی لئے ہمارے ماموں صاحب فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو مثل مشہور ہے ”ولی را ولی می شناسد“ صحیح نہیں۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ ”ولی را بنی می شناسد و بنی را خدا می شناسد“

اب بتلائیے کہ اندر سے تو دل تقاضا کر رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احسان کا بدلہ کریں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا دیں مگر اندیشہ بے ادبی کی وجہ سے دعا بھی نہیں دے سکتے۔ ایسے وقت میں جو آیت صلوا علیہ وسلموا تسلیما نازل ہوئی ہوگی۔ تو مشتاقین کا دل کیسا ٹھنڈا ہوگا کہ الحمد للہ ہم کو اپنے محسن کے احسان کا بدلہ ادا کرنے کا طریقہ معلوم ہو گیا تو یہ حکم کس قدر سہل ہے کہ بالکل جذبات طبیعت کے موافق ہے۔

پھر عقل کا مقتضا تو یہ تھا کہ درود پڑھنے پر ثواب نہ ملتا کیونکہ اس کو تو خود تمہاری طبیعت ہی چاہ رہی تھی تو درود پڑھ کر تم نے اپنے دل کو ٹھنڈا کیا۔ اپنی طبیعت کا تقاضا پورا کیا۔ پھر ثواب کس چیز کا مانگتے ہو۔ مگر یہ شریعت کی رحمت در رحمت ہے کہ باوجودیکہ اس کے سب احکام تقاضائے طبیعت کو پورا کرنے والے ہیں۔ مگر ان پر ثواب کا بھی وعدہ ہے تاکہ ثواب کو سن کر اور زیادہ سہولت ہو جائے۔ چنانچہ درود پر ثواب بھی ملتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ جو شخص ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے حق تعالیٰ اس پر دس بار صلوٰۃ و سلام بھیجتے ہیں (یعنی رحمت خاص فرماتے ہیں) اور دس نیکیاں اس کو ملتی ہیں اور ایک حدیث میں ہے کہ دس گناہ معاف ہوتے ہیں۔

یہ صلہ دانت گھسائی ہے انسان اللہ میاں سے دانت گھسائی بھی وصول کرتا ہے ورنہ واقع میں درود میں اس کو ثواب کا کیا حق تھا۔ کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر احسان تھوڑا ہی کیا ہے جو ثواب کا استحقاق ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے درود کی کیا احتیاج ہے جب کہ اللہ تعالیٰ اور ملائکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں۔ چنانچہ خود نص میں ارشاد ہے ان الله وملائكته يصلون على النبی۔ اس میں خود اشارہ کر دیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو تمہارے درود کی ضرورت ہے نہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ ہی کا درود کافی ہے اور مخلوق میں سے مقدس جماعت ملائکہ

کا درود کافی ہے۔ باقی تم کو جو صلوٰۃ و سلام کا امر کیا گیا ہے اس میں تمہارے لئے یہی بات کافی تھی

کہ تم کو اس کام میں شریک کر لیا گیا جو خدا تعالیٰ اور ملائکہ کرتے ہیں اور ثواب مزید برآں۔

مرزا مظہر جان جانا رحمۃ اللہ علیہ نے اسی مضمون کفایت صلوٰۃ حق کو ایک قطعہ میں خوب ظاہر فرمایا ہے۔

خدا در انتظار حمد مانیت ☆ محمد چشم بر راہ شانیت

محمد حامد حمد خدا بس ☆ خدامدح آفرین مصطفیٰ بس

یعنی نہ حق تعالیٰ کو ہماری حمد کی ضرورت ہے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری ثنا کا انتظار

ہے حضور کو خدا تعالیٰ کی مدح کافی ہے اور اللہ تعالیٰ کو مخلوق میں سے حضور کی حمد کافی ہے۔

بس اب ہم جو حق تعالیٰ کی ثناء حضور کی نعت کرتے ہیں۔ اس سے مقصود اپنا ہی فائدہ ہے

اسی کو آگے فرماتے ہیں کہ جیسا اپنا فائدہ مد نظر ہے تو بس مناجات کرلو۔

منا جاتے اگر خواہی بیاں کرد ☆ بہ بیتے اکتفا خواہی تو اں کرد

(اگر کوئی مناجات بیان کرنا چاہتے ہو تو ان دو بیتوں پر اکتفا کرو)

آگے کیا اچھی مناجات ہے۔

محمد از تومی خواہم خدا را ☆ الہی از توحب مصطفیٰ را

کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے ہم خدا کی محبت مانگتے ہیں اور اے اللہ! آپ سے رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت مانگتے ہیں۔ بس خدا نے دیار رسول اور رسول نے دیا خدا یعنی خدا کا پتہ دیا۔

تو خدا سے رسول کی محبت مانگو اور رسول اللہ سے اللہ تعالیٰ کی معرفت مانگو۔ یہ مناجات کافی ہے۔

دانت گھسائی

میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے میں ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی احسان نہیں

کرتے۔ بلکہ اپنے جذبہ شکر کو پورا کرتے ہیں۔ اب اس پر ثواب ملنا یہ محض دانت گھسائی نہیں تو اور کیا ہے؟

اس دانت گھسائی پر مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ ذہا کہ میں ایک پیرزادہ صاحب اپنے باپ کے

مریدوں میں گئے۔ ایک رئیس نے ان کی دعوت کی اور دعوت کے بعد پچاس روپے نذرانہ میں

دیئے۔ پیرزادہ نے روپے پھینک دیئے کہ کیا ہم اس لائق ہیں ہمارا نذرانہ دو سو روپیہ سے کم نہیں

ہونا چاہیے۔ میں نے حکایت سن کر کہا کہ دعوت کے بعد نذرانہ پراتنا تکرار کیسا؟ ایک ظریف نے

کہا کہ یہ دانت گھسائی ہے کیونکہ لقمہ چبانے میں دانت تو گھستا ہی ہے۔ بنگالہ میں جو عالم

یادرویش کسی کی دعوت قبول کر لیتا ہے کھانے کے بعد دانت گھسائی کا نذرانہ بھی ضرور لیتا ہے۔ اسی لئے اس پر تکرار بھی ہوتا ہے۔

خیر یہ تو ان پیروں کا ظلم ہے مگر حق تعالیٰ سے تو انسان دانت گھسائی ہمیشہ لیتا ہے اور چونکہ وہ بڑے کریم ہیں اور ان کے خزانہ میں کمی نہیں اور وہ خوش ہو کر دیتے ہیں اس لئے اللہ میاں سے دانت گھسائی لینے کا مضائقہ نہیں۔ مگر اس کو اپنا حق نہ سمجھو محض ان کا فضل و کرم سمجھو۔

رعایت جذبات

مجھے رعایت جذبات پر کہ اللہ تعالیٰ نے احکام میں ہمارے جذبات کی کیسی رعایت فرمائی ہے۔ ایک بات اور یاد آئی جو مجھ سے لڑکیوں نے ترجمہ قرآن کے درس میں پوچھی تھی۔ میں ان کو سورہ برات کا ترجمہ پڑھا رہا تھا جب یہ آیت آئی۔

يُصَاهُونُ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلِ قَاتِلِهِمُ اللَّهُ اَنِي يُؤْفِكُونَ.

”خدا ان مدعیانِ فرزندِ مسیح و عزیر کو تباہ کرے یہ کہاں الٹے جا رہے ہیں۔“

تو ایک لڑکی نے سوال کیا کہ یہ تو کونسا ہے اللہ میاں جب سب کچھ کر سکتے ہیں پھر وہ کیوں کہتے ہیں؟ یہ سوال اس سے پہلے کسی نے مجھ سے نہ کیا تھا۔ نہ کسی کتاب میں اس کا جواب دیکھا تھا۔ مگر الحمد للہ کہ سوال کے ساتھ ہی معامیرے دل پر جواب القا ہو گیا۔

میں نے کہا کہ اللہ میاں تو کونسا نہیں دیتے مگر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ہمارے جذبات کی بہت رعایت فرمائی ہے۔ تو اوپر جو یہود و نصاریٰ کا حال مذکور ہے اس کو قرآن میں پڑھ کر یا سن کر انسان کو غصہ آتا ہے جس سے کونسا منہ سے نکلتے کو ہوتا ہے۔ مگر قرآن پڑھتے ہوئے غیر قرآن داخل کرنا ادب کے خلاف تھا اس لئے انسان اپنے اس جذبہ کو پورا نہ کر سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف سے خود ہی کونسنے کا مضمون بڑھادیا۔ تاکہ پڑھنے والے کو اپنا جذبہ دبانا نہ پڑے اور وہ دل کھول کر اس تقاضا کو پورا کر لے اور یہ کہہ دے قَاتِلِهِمُ اللَّهُ اَنِي يُؤْفِكُونَ۔ (اللہ انکو ہلاک کرے کدھر بہکے جاتے ہیں)

واقعی اس جواب کے بعد جو قرآن پر نظر کی جاتی ہے تو جا بجا رعایت جذبات کی نظیریں قرآن میں کثرت سے ملتی ہیں۔ چنانچہ قرآن میں جہاں کہیں لفظ عسی اور لعل حق تعالیٰ نے استعمال فرمایا ہے اس میں بھی ہمارے جذبات ہی کی رعایت ہے کہ جہاں ہم لوگ اپنے محاورہ میں عسی و لعل کہتے ہیں وہاں حق تعالیٰ نے بھی یہی فرمایا گو حق تعالیٰ کا علم کامل کے لحاظ سے وہاں ان اور لام تاکید کا موقع تھا اور یہ

رعایت ایسی ہے جیسے بچہ کے ساتھ ابا جان بھی پانی کو موم اور روٹی کو روٹی کہنے لگتے ہیں۔

اس سے زیادہ عجیب ایک دوسرا قصہ ہے وہ یہ کہ میں نے ایک مسماۃ (یہ حضرت مولانا کی اہلیہ کبریٰ ہیں۔ زاد اللہ فی درجہا تھا و رفع فی الجنة منزلتها و رزقها فی الدنیا عیشۃ طیبۃ بقیۃ سویۃ آمین ۱۲۔ ظ) سے آیت والارض جمیعاً قبضتہ یوم القیامۃ والسموت مطویت بیمینہ، کا ترجمہ پڑھاتے ہوئے سوال کیا کہ حق تعالیٰ نے جو یہاں فرمایا ہے کہ زمینیں سب اللہ تعالیٰ کی مٹھی میں ہوں گی اور آسمان داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اس کی حقیقت تو مراد نہیں ہے کیونکہ حق تعالیٰ مٹھی سے اور اعضاء سے پاک ہیں۔ بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ یہ سب چیزیں خدا تعالیٰ کی قدرت کے تحت میں ہوں گی۔ مگر قبضہ کی تعبیر میں جو اختلاف ہے کہ جب زمین کے ساتھ قبضہ اور سموات کے ساتھ بیمینہ کا عنوان اختیار کیا گیا اس کی کیا وجہ ہے ایک ہی عنوان کافی تھا۔

یہ سوال بہت دقیق تھا۔ مگر اس کا جواب اس مستورہ نے عجیب حیرت انگیز دیا کہا کہ یہاں حق تعالیٰ نے ہماری عادت کے موافق کلام فرمایا ہے اور عادت یہی ہے کہ ہم چھوٹی چیز کو مٹھی میں لیتے ہیں اور بڑی کو ہاتھ میں بدوں مٹھی بند کئے لے لیتے ہیں۔ پس چونکہ زمین آسمان سے چھوٹی ہے اس لئے وہاں قبضہ فرمایا ہے اور آسمان بڑا ہے اس کے لئے بیمینہ فرمایا۔ مجھے یہ جواب بہت پسند آیا۔ چنانچہ میں نے اپنی تفسیر میں بھی اس کو لکھ دیا ہے تو یہ بھی وہی بات ہے کہ حق تعالیٰ نے قرآن میں ہمارے جذبات کی رعایت فرمائی ہے۔

مفسرین نے بھی افراد ارض اور جمع سموت میں یہی نکتہ بیان کیا ہے کہ اس میں ہمارے جذبات کی رعایت ہے کہ تعدد سموت تو اذہان عامہ میں پہلے سے تھا تعدد ارض لوگوں کے ذہن میں نہ تھا تو حق تعالیٰ نے بھی ان کے ذہن کو مانوس کرنے کے لئے سارے قرآن میں ارض کو بصیغہ مفرد اور سموات کو جمع استعمال کیا ہے۔ البتہ تعدد ارض کی حقیقت واضح کرنے کے لئے ایک مقام پر اس طرح مقصوداً ظاہر فرما دیا۔ اللہ الذی خلق سبع سموات ومن الارض مثلہن۔ یہ تو درود کے متعلق کلام تھا کہ وہ طبعی تقاضا کے موافق ہے۔

روزہ میں رعایت جذبات طبعیہ اس طرح ہے کہ جیسے کھانے کا ہم کو تقاضا ہوتا ہے ایسے ہی بعض دفعہ نہ کھانے کا بھی تقاضا ہوتا ہے۔ انسان سال بھر کھاتے کھاتے تھک جاتا ہے تو طبیعت

خود تقاضا کرتی ہے کہ کچھ دنوں کے لئے کھانا چھوڑ دیا جائے۔

خدمت والدین میں رعایت جذبات اس طرح ہے کہ جس شخص کو ماں باپ کا ماں باپ ہونا معلوم ہوگا۔ اس کا دل خود تقاضا کرے گا کہ ان کی خدمت کرے۔ ان کے احسان کا بدلہ کرے۔ اور ان کی تکلیف سے اس کا دل خود ہی کڑھے گا اور اندر سے طبیعت میں تقاضا پیدا ہوگا کہ ان کو آرام دیا جائے خصوصاً بڑھاپے میں جب کہ وہ کمزور ہو جاتے ہیں ان کے عجز و ماندگی پر زیادہ ترس آئے گا۔ اس وقت گو محبت ویسی نہ رہے جیسے جوانی کے عالم میں تھی کیونکہ جوانی میں والدین کے کمالات سامنے تھے ان کی گفتگو عاقلانہ تھی وہ اولاد پر خرچ بھی کرتے تھے ان کے نفع و نقصان کا لحاظ کرتے تھے اور ان باتوں سے اولاد کے دل میں ان کی محبت بڑھتی تھی۔ بڑھاپے میں بعض دفعہ والدین کے ہوش و حواس درست نہیں رہتے۔ الٹی پلٹی باتیں کرنے لگتے ہیں اور کمانا یا اولاد پر رویہ لگانا بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اس وقت بعض لڑکوں کو والدین سے محبت نہیں رہتی مگر ان کے حال پر رحم اور ترس تو ضرور آتا ہے اس رحم کا بھی تقاضا یہ ہے کہ اس وقت ان کی خدمت کی جائے۔

محبت اور رحمت کا نباہ

یہاں سے معلوم ہوا کہ محبت کا نباہ دواماً نہیں ہوتا ہاں رحمت کا نباہ دواماً ہو سکتا ہے۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے زوجین کے متعلق فرمایا ہے و جعل بینکم مودة ورحمة۔ مودة سے رحمت کو اسی لئے بڑھایا کہ زوجین میں محبت کا نباہ دائمی نہیں ہے بلکہ اس کی تو یہ حالت ہے کہ اگر ماند شے ماند شے دیگر نئے ماند (اگر رہے تو ایک رات رہے دوسری رات نہ رہے) اور کسی کو بہت ہی محبت رہے گی تو جوانی تک رہے گی۔ بڑھاپے میں محبت و عشق باقی نہ رہے گا۔ ہاں شفقت و رحمت باقی رہے گی۔ اسی لئے شاہ فضل الرحمن صاحب نے ایک ذکر کی اس شکایت پر کہ اب ذکر میں پہلے جیسا مزہ نہیں آتا۔ فرمایا تھا کہ تم کو خبر نہیں پرانی جو روایاں ہو جاتی ہیں یعنی اب اس کے ساتھ ویسی محبت ہو جاتی ہے جیسی ماں سے ہوا کرتی ہے بوجہ خدمت وغیرہ کے جس کا حاصل وہی رحمت ہے۔

اس تقریر سے ثابت ہو گیا کہ یہ تین امور جن کا اس حدیث میں ذکر ہے نہایت سہل ہیں اور طبعی امور ہیں اور ان میں کوتاہی کرنے پر عتاب بھی اسی لئے زیادہ ہے کہ ان میں کچھ زیادہ کام نہیں کرنا پڑتا۔ بلکہ وہی کام کرتا ہوتا ہے جس کو طبیعت خود چاہتی ہے پھر بھی سستی کی جاتی ہے۔

ان اعمال کے متعلق ایک عجیب نکتہ ہے کہ ان تینوں میں ایک تو حق العبد خالص ہے یعنی خدمت والدین۔ اور ایک حق اللہ خالص ہے یعنی صوم رمضان اور ایک حق العبد و حق اللہ سے مرکب ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا درود کا حق العبد ہونا فقہاء نے سمجھا ہے اور اس پر دو مسئلے متفرع کئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ فرماتے ہیں کہ اس میں کوتاہی کرنے کا گناہ صرف توبہ سے معاف نہ ہوگا کیونکہ یہ حق العبد بھی ہے۔ بلکہ اس کی تلافی توبہ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش کرنے سے ہوگی۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ کوتاہی ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ سے توبہ بھی کرے اور آئندہ درود کی خوب کثرت کرے یہاں تک کہ دل گواہی دے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہو گئے ہوں گے۔

درود کی فضیلت

دوسری تفریع یہ کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ درود ایسی طاعت ہے جو کبھی رد نہیں ہوتی کیونکہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے درخواست ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کے محبوب ہیں اور محبوب کے لئے جو درخواست کی جاتی ہے وہ رد نہیں ہوتی۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم بادشاہ سے شہزادہ کے متعلق ایسی بات کی سفارش کریں جو بادشاہ اس کے لئے خود ہی کرنے والا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسی سفارش کیوں رد ہونے لگی۔

درود میں بھی حق تعالیٰ سے ایسی ہی سفارش کرتے ہو کیونکہ درود کا حاصل یہی تو ہے کہ یا اللہ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام نازل فرمائے اور یہ کام تو حق تعالیٰ بدوں ہمارے کہے خود ہی کر رہے ہیں۔ چنانچہ نص میں ہے ان الله و ملئکتہ يصلون علی النبی (بے شک اللہ تعالیٰ اور اسکے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں) پھر ہمارے کہنے کو وہ کیونکر رد کریں گے۔ اس لئے درود کا قبول ہونا یقینی ہے وہ رد نہیں ہوتا۔ اور یہ بہت بڑی فضیلت ہے درود کی۔

غرض اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوق کی جملہ اقسام میں سے ایک ایک فرد بیان فرمادیا ہے کہ ایک نوع میں فلاں اہل ہے اور دوسری تیسری نوع میں فلاں فلاں عمل اہل ہے اس لئے ان میں کوتاہی کرنا سخت جرم ہے۔

مغفرت کا سامان

میں روزہ ہی کے بیان پر کلام کو ختم کرتا ہوں کہ روزہ نہایت آسان ہے اور اب تو بہت ہی آسان ہے کیونکہ صرف تین دن باقی رہ گئے ہیں۔ اگر یہ بیان شروع رمضان میں ہوتا تو اس وقت

تیس روزے باقی ہوتے اب تو تین ہی باقی ہیں اور بعض جگہ کے اعتبار سے تو اس سے بھی کم ہیں۔ کیونکہ بعض مقامات پر شنبہ کی پہلی ہوئی ہے۔ اس حساب سے آج ۲۸ تاریخ ہے ان کے حساب پر تو پیر کو عید ضرور ہونا چاہیے۔ مگر ہمارے یہاں ثبوت کافی سے یہ خبر نہیں پہنچی اس لئے اس کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے یہاں پیر کو عید کا ہونا ضروری نہیں صرف محتمل (پھر یہاں بھی عید پیر کو ہوئی۔ ۱۲۔ ظ) ہے۔ بہر حال ہمارے حساب میں غایت سے غایت تین دن رمضان کے باقی ہیں۔ ان تین دنوں میں جو کچھ کرنا ہو کر لو اور اپنی مغفرت کرا لو۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ گناہوں سے توبہ کر لو چاہے عید کے بعد ہی ٹوٹ جائے مگر خدا کے لئے اس وقت تو عمر بھر کے لئے توبہ کر لینا۔ ایسا نہ ہو کہ توبہ میں حد لگا دو کہ رمضان تک کیلئے توبہ کرتے ہیں کہ اس سے توبہ باطل ہو جائے گی۔ توبہ کی صحت کے لئے یہ تو ضرور نہیں کہ وہ عمر بھر ٹوٹے ہی نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ توبہ کے وقت عمر بھر کے لئے گناہوں کے چھوڑنے کا عزم کر لیا جائے۔ تو اس وقت عزم کر لینا کیا دشوار ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس حدیث کی وعید سے بچنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ رمضان میں گناہوں سے پختہ توبہ کر لی جائے اور توبہ کچھ مشکل نہیں بہت آسان ہے یہ میں نے اس لئے کہہ دیا کہ شاید کوئی حدیث کے ترجمہ سے یہ سمجھا ہو کہ رمضان میں مغفرت حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ رات بھر جاگنا پڑے گا۔ یا تین دن میں قرآن ختم کرنا پڑے گا۔ سو خوب سمجھ لو کہ یہ لازم نہیں یہ تو مستحب ہیں۔ لازم صرف یہ ہے کہ گزشتہ گناہوں سے توبہ کر لو اور رمضان بھر معاصی سے رکو۔ بس اس طرح تم اس حدیث کی وعید سے بچ جاؤ گے۔

ہاں فضائل حاصل کرنا چاہو تو اس کے لئے شب بیداری کی بھی ضرورت ہے لیلۃ القدر کا ایک محل باقی ہے یعنی ۲۹ کی رات اس میں جس قدر ہو سکے شب بیداری کر لو۔ لیلۃ القدر کے متعلق حدیث میں ہے: من حرمها فقد حرم الخیر کلہ۔ ”جو شب قدر سے محروم رہا وہ بڑی خیر سے محروم رہا“

مگر یہ عصیان نہیں صرف حرمان ہے۔ اس لئے اس حدیث سے میرے پہلے کلام پر نقص وارد نہیں ہوتا۔ جہاں میں نے کہا تھا۔ کہ غم انفرج لیلۃ القدر رمضان ولم یغفر لہ کی وعید سے بچنے کے لئے شب بیداری کی ضرورت نہیں بلکہ حدیث من حرمها فقد حرم الخیر کلہ سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ حرمان سے بچنے کے لئے شب بیداری کی ضرورت ہے اور وہ بھی تمام رات کے جاگنے پر موقوف نہیں بلکہ اکثر لیل کی بیداری سے بھی حرمان رفع ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عشاء

اور صبح کی نماز جماعت سے پڑھ لینا بھی شب بیداری کے برابر ہے تو اس سے بھی حرمان رفع ہو جائے گا۔ لیجئے اب تو دونوں حدیثوں کی وعید سے بچنا آسان ہو گیا۔ بس اب میں ختم کرتا ہوں۔

خلاصہ بیان

خلاصہ پھر عرض کرتا ہوں کہ رمضان کا جتنا حصہ باقی ہے اس کو غنیمت سمجھنا چاہیے اور اس میں اپنی مغفرت کا سامان کر لینا چاہیے۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق عمل عطا فرمائیں۔ آمین۔

وصلی اللہ علی سیدنا و مولانا محمد و علی الہ واصحابہ
اجمعین و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمین.

ضمیمہ

بعد میں نماز کے وجودی اور شاق ہونے اور روزہ کے عدمی اور سہل ہونے کی ایک تائید فروع فقہیہ سے بھی ذہن میں آئی۔ وہ یہ کہ اگر نماز میں کوئی فعل مفسد صلوٰۃ نسیان سے صادر ہو جائے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے اور اگر روزہ میں کوئی فعل نسیان ہو جائے تو روزہ فاسد نہیں ہوتا۔ اور اس کی وجہ یہی لکھی ہے کہ نماز کی ہیئت مذکر ہے اس لئے نسیان عذر نہیں اور روزہ کی ہیئت مذکر نہیں اس لئے نسیان عذر ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مذکر ہونا ہیئت نماز کا بوجہ اس کے وجودی ہونے کے ہے اور مذکر نہ ہونا صوم کا بوجہ اس کے عدمی ہونے کے ہے اور وجودیت کے لئے شاق ہونا اور عدمی کے لئے سہل ہونا لوازم طبیعہ سے ہے۔ نیز اگر صوم اپنی حقیقت میں شاق ہوتا تو اس کا شاق ہونا ہی مذکر ہونے کیلئے کافی تھا اور لازم منقشی ہے۔ پس ملزوم یعنی مشقت باعتبار الحقیقہ بھی منقشی ہے۔

التہذیب

مجاہدہ قیام رمضان کے متعلق یہ وعظ ۲۹ شعبان ۱۳۳۲ھ
 بروز جمعہ جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر ساڑھے تین گھنٹہ میں
 بیان فرمایا۔ حاضری قریباً ۲۰۰ تھی۔ محمد عبداللہ گنگوہی صاحب
 نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِیْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْهِ
وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یُّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا
مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ یُّضِلِلْهُ فَلَا هَادِیَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ
لَا شَرِیْكَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنْ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ صَلَّی
اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهِ وَاَصْحَابِهِ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ اَمَّا بَعْدُ فَاعُوْذُ
بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

قد افلح من زكها وقد خاب من دسها (الشمس: ۱۰۹)

ترجمہ: یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس کو پاک کر لیا اور وہ ناکام مراد ہوا جس نے اس کو
(یعنی نفس کو) دبا دیا۔

تزکیہ کے معنی

یہ دو آیتیں ہیں سورہ الشمس کی۔ ان آیتوں میں جناب باری تعالیٰ نے فضیلت بیان فرمائی
ہے تزکیہ نفس کی اور مذمت فرمائی ہے اس کے اہمال کی اور تزکیہ نہ کرنے کی۔ تزکیہ چونکہ لفظ مشہور
ہے اس لئے میں نے بھی لفظ تزکیہ ہی استعمال کیا۔ تزکیہ لغت میں کہتے ہیں میل کچیل سے کسی شے
کو صاف کر لینے کو اور یہ ظاہر ہے کہ جیسی شے ہوگی اسی طرح کا اس کا تزکیہ ہوگا۔ مثلاً کپڑا یا برتن
یا بدن اگر آلودہ نجاست و میل کچیل ہے تو اس کا تزکیہ یہی ہے کہ پانی سے اس کی تطہیر و تنظیف کر لی
جائے اور مکان میں اگر کوڑا کرکٹ جمع ہے تو اس کا تزکیہ یہ ہے کہ اس میں جھاڑو دی جائے۔ غرض
! جس قسم کی شے ہے ویسا ہی اس کا تزکیہ ہوگا اور ظاہری گندگی سے پاک کرنا تزکیہ ظاہری ہوگا۔

تزکیہ باطنی

باطنی نجاست سے صفائی کرنا تزکیہ باطنی ہوگا۔ ہرچند کہ آیت میں معنی عام بھی لے سکتے ہیں لیکن چونکہ تزکیہ ظاہر کو سب جانتے ہیں۔ اسلئے میں تزکیہ باطنی ہی کو ذکر کروں گا خواہ اس کو یہ سمجھا جائے کہ مدلول آیت کا یہی ہے یا یوں سمجھا جائے کہ جزو مدلول ہے۔

وجہ اس میری تخصیص کی یہ ہے کہ تزکیہ ظاہری کی طرف سے اس قدر بے التفاتی نہیں ہے جس قدر کہ لوگوں کو تزکیہ باطنی سے ہے۔ اس لئے کہ جن چیزوں سے تزکیہ ظاہری کا تعلق ہے ان میں سے بعض سے پچنا طبعی امر ہے اور بعض سے شرعی مثلاً قارورات سے اپنے بدن یا کپڑے کو پچانا امر طبعی ہے۔ یہاں طبع کا اقتضا ہے کہ ان چیزوں سے بچو اور بعض نجاست وہ ہیں کہ ان کو شریعت نے نجاست قرار دیا ہے۔ جیسے منی نکلنے سے تمام بدن کا تزکیہ کرایا ہے اور حیض و نفاس سے بھی تمام بدن دھلوا یا ہے۔ بہر حال تزکیہ ظاہری خواہ طبیعت کی وجہ سے یا شریعت کے اتباع سے ہو اس کا اہتمام اور اس کی ضرورت کو سب مسلمان تسلیم کرتے ہیں اور جانتے ہیں اور ان سے بچنے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔

بخلاف تزکیہ باطنی کے کہ بعض تو اس کی ضرورت ہی کو تسلیم نہیں کرتے اور جو کرتے ہیں وہ اس کی طرف سے بے التفاتی کرتے ہیں۔ ایسے افراد تو بہت پائے جائیں گے جو شراب سے بچیں گے پیشاب سے محترز ہوں گے۔ اگر کہیں چھینٹ لگنے کا احتمال بھی ہوگا تو تمام کپڑا ہی دھو ڈالیں گے لیکن ایسے بہت کم ہیں کہ ان کا تقویٰ اکل و شرب میں بھی پایا جاتا ہو۔ چنانچہ رشوت کا مال کھا جائیں گے۔ سود کی کچھ پرواہ نہیں کریں گے۔ قرض لے کر نہ دینے کو ریاست کا جزو سمجھیں گے۔

ہاں ظاہری وضع درست کر لیں گے۔ داڑھی لمبی ہے پا جامہ ٹخنوں سے اوپر کرتا نچا ہے تاکہ اتقیاء میں شمار ہو کر اعتبار بڑھ جائے۔ اور نیز اس میں نفس کو بھی کلفت نہیں ہوتی اور جن امور میں نفس کو مشقت ہوتی ہے جیسے کسی کی زمین دابی ہوئی ہے اس کو چھوڑ دینا۔ رہن کی آمدنی نہ کھانا یا جن امور میں جاہ کی کچھ کمی ہوتی ہے جیسے کسی غریب آدمی کو ستایا تھا۔ اس سے خطا معاف کرانا ایسے امور کا کچھ بھی اہتمام نہیں۔ تزکیہ کی یہ قسم ایقاع میں بہت قلیل ہے بہت کم افراد کو اس کا اہتمام ہے اور ان میں سے اگر کسی کو اہتمام بھی ہے تو ان ہی چیزوں کا ہے جن کا معصیت ہونا۔ بہت مشہور اور ظاہر سے بھی کچھ متعلق ہے۔ باقی جو تزکیہ غیر مشہور اور محض متعلق باطن کے ہے اس کا کسی درجہ

میں بھی اہتمام نہیں ہے الا ماشاء اللہ!
حاصل یہ ہے کہ نجاسات باطنہ سے بچنا یہ تزکیہ باطنی ہے اور اسی کو آیت کا مدلول قرار دیتا ہوں۔

تزکیہ نفس

چنانچہ جناب باری عز اسمہ ارشاد فرماتے ہیں قد افلح من زکھا، یعنی بے شک کامیاب ہوا وہ شخص جس نے نفس کو پاک کر لیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو مٹی میں ملا دیا۔ اول بیان کیا گیا تھا کہ جس قسم کی شے ہوگی اسی طرح کا اس کا تزکیہ ہوگا۔ پس نفس کا پاک کرنا پانی سے نہ ہوگا اور نیز ظاہری نجاست سے بچنا بھی مراد نہیں اس لئے کہ ضمیر نفس کی طرف راجع ہے اور نفس پانی سے پاک نہیں ہوتا۔ ہاں اس معنی کو پانی موثر ہو سکتا ہے کہ تطہیر ظاہری یعنی بدن دھونے کا اثر نفس پر ہوتا ہے۔

چنانچہ امام غزالی نے اس کی تصریح کی ہے اور گودلیل اس پر قائم نہیں کی مگر وہ اس کا مشاہدہ کراتے ہیں کہ دیکھو جب آدمی غسل کرتا ہے یا وضو کرتا ہے۔ تو باطن میں ایک ایسا انشراح اور شگفتگی پاتا ہے جو پہلے نہیں تھی۔ ایک دن ایسا لو کہ پانچوں نمازیں اس میں وضو کر کے پڑھی ہوں اور دوسرا دن ایسا لو کہ ایک وضو سے سب نمازیں پڑھی ہوں۔ پہلے دن میں زیادہ نور اور انشراح اور شگفتگی پایگا اور دوسرے میں ایک قسم کی پڑمردگی اور نور کی کمی دیکھے گا۔

اور لیجئے! استنجا کرنے کے بعد اور وضو سے پہلے باطن میں ایک خاص حالت ہوتی ہے کہ وہ نہ نور ہے نہ ظلمت۔ ایک خلو کی سی کیفیت ہوتی ہے اور وضو کے بعد غور کیجئے کہ ایک نور ہوگا اور طبعیت تازہ ہوگی اور کسل اور کدورت بالکل دور ہو جاتی ہے۔

ایک اور بات اسی وقت سمجھ میں آئی۔ وہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا ہے کہ وضو سے گناہ دھلتے ہیں تو عجب نہیں ہے کہ یہ انشراح اور نور جو وضو کے بعد ہر مومن کو محسوس ہوتا ہے یہ اسی کا اثر ہے۔ اس لئے کہ گناہ سے ظلمت، کدورت اور سیاہی کا قلب پر ہو جانا تو حدیث سے معلوم ہوتا ہی ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب آدمی گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک دھبہ سیاہ لگ جاتا ہے حتیٰ کہ گناہ کرتے کرتے سیاہی قلب کو محیط ہو جاتی ہے۔ پس جب کہ گناہ سے ظلمت ہوتی ہے تو وضو سے گناہ معاف ہو کر اس ظلمت میں کمی ہوتی ہے اس لئے اس کا احساس ہوتا ہے اور اسی کی خبر دی گئی ہے کہ وضو سے گناہ دھلتے ہیں۔

اعمال شرعیہ کی خاصیت

سبحان اللہ! اعمال شرعیہ کی عجیب خاصیت ہے کہ ان میں اخلاص اگرچہ کم ہو لیکن وہ اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتے۔ اسی واسطے تو حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: مثل الذین ینفقون اموالہم ابتغاء مرضات اللہ و تثبیتا من انفسہم کمثل جنة بريرة اصابها وابل فانت اکلها ضعفين۔ فان لم یصبها وابل فطل۔ ”یعنی جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کی رضا مندی طلب کرنے کے واسطے خرچ کرتے ہیں ان کا حال ایسا ہے جیسے ایک ٹیلے پر ایک باغ ہو۔ اس پر زور کی بارش ہو۔ پس اس باغ نے دو چند پھل دیا اور اگر بارش سخت نہ پہنچے تو شبنم ہی کافی ہے۔“ اللہ تعالیٰ نے اس مثال میں مسلمانوں کے قلب کو ایک صالح زمین قرار دیا ہے اور اعمال صالح مثل تخم کے ہیں اور اس قلب کو ایسی قابل زمین قرار دیا ہے کہ اگر اخلاص جو بجائے بارش ہے کافی مقدار میں نہ ہو تو تھوڑا سا اخلاص جو بجائے شبنم کے ہے وہی کافی ہو جائے گا۔ اور ادنیٰ درجہ کہ دس گنا حسنات ہے اس کو میسر ہو جائے گا۔ پس اگر پورا اخلاص نہ ہو مگر ریا بھی نہ ہو جیسی ہماری حالت ہے کہ نہ ریا ہوتی ہے نہ اخلاص۔ مساوات سی ہوتی ہے تو ان شاء اللہ امید ہے کہ حق تعالیٰ اپنی رحمت سے قبول فرمائیں گے۔

اس مقام پر تنبیہ کیلئے ایک بات ضروری یاد آگئی ہے۔ وہ یہ کہ بعض مرتبہ آدمی تواضع میں آکر کہتا ہے کہ ہماری کیا نماز، کیا روزہ اور اپنے ان اعمال کو حقیر سمجھتا ہے۔ کہتا تو ہے یہ تواضع کے لئے۔ لیکن بعض اوقات یہ بات جو نعمت کی طرف مفہمی ہو جاتی ہے۔

یاد رکھو جس قدر تم یہ کرتے ہو یہ بھی نعمت ہے۔ اس پر شکر کرنا چاہیے اور آگے کو ہمت کرنا چاہیے۔ ہم تو اس کے بھی مستحق نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ ایسے ہی وضو اور ایسی ہی نماز کی توفیق دے۔ یہ بھی ان کا فضل ہے ان شاء اللہ حق تعالیٰ کے یہاں اعمال قدر کے ساتھ دیکھے جائیں گے اور مراتب علیا نہ سہی عذاب جہنم سے تو ان شاء اللہ امید ہے کہ نجات ہو جائے گی۔ مراتب علیا تو بڑے لوگوں کو مبارک ہوں۔ ہم تو بخدا اس پر راضی ہیں کہ ہم کو سزا سے خلاصی ہو جائے۔ پس ان اعمال کو حقیر نہ سمجھنا چاہیے۔

کید نفس

بہت سے لوگ اس انتظار میں ہیں کہ نماز جب پڑھیں گے جب کہ حضور قلب ہوگا۔ ہم

کیا نماز پڑھیں۔ دل تو ہمارے دنیا کے بکھیرے بھر رہے ہیں۔ جب قلب پاک و صاف ہوگا اس وقت نماز پڑھیں گے۔

یاد رکھو! یہ نفس کا بڑا کید ہے۔ ظاہر میں تو تواضع ہے مگر واقع میں یہ تکبر ہے اس لئے کہ جو حالت اور جو وقت اس نے اپنے لئے نماز کا تجویز کیا ہے اس وقت کی نماز کو یہ سمجھا ہے کہ یہ نماز اس دربار کے لائق ہے۔ حالانکہ ہم عمل کرتے کرتے ہزاروں بار بھی مرمر کر زندہ ہو جائیں جب بھی ہم ناقص ہیں اور ہمارے اعمال اس وقت بھی ناقص ہی ہیں کسی طرح اس قابل نہیں ہیں کہ اس بارگاہ میں پیش ہوں۔ ہم اور ہمارے اعمال ہر وقت ناقص ہی ہیں۔ ہمارا اپنے اعمال کو ناقص سمجھنا ہی کمال ہے۔ پس اس حالت میں جب کہ یہ اعمال ناقص ہیں اور یہ شخص بھی ان کو ناقص سمجھتا ہے نقص ان میں کم ہے اور جو حالت اس کو مطلوب ہے اور اس کے حصول کے وقت یہ ان اعمال کو کامل سمجھے گا تو اس وقت کے اعمال نقص میں بڑھے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ ناقص تو دونوں ہی حالت میں ہیں لیکن اس کے کامل سمجھنے نے نقص کو اور بڑھا دیا ہے۔ مریض اپنی نماز کو ناقص سمجھتا ہے اور تندرستی کی حالت میں نماز کو کامل سمجھتا ہے۔ حالانکہ معاملہ برعکس ہے۔ اس لئے مقصود تو مٹنا ہے اور غایت تذلل ہے جہاں یہ معنی پائے جائیں گے وہی کمال ہے۔

توفیق نعمت

ہماری نماز اور ہمارا روزہ ایسا ہے جیسے مولانا ارشاد فرماتے ہیں۔

ایں قبول ذکر تو از رحمت است ☆ چوں نماز مستحاضہ رخصت است
(یہ آپکا ہمارا ذکر قبول فرمانا رحمت ہی سے ہے جیسے مستحاضہ کی نماز رخصت کی بناء پر قبول فرماتے ہو)
حق تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ ہم کو اس کی توفیق عطا فرمائی۔

بلا بودے اگر ایں ہم نہ بودے (اگر یہ بھی نہ ہوتی تو سخت مصیبت ہوتی)

اگر یہ نماز بھی نہ ہوتی تو کیا کر لیتے اور کیسی سخت مصیبت کا سامنا ہوتا۔ چنانچہ بعض دفعہ کسی عارض کی وجہ سے اس ناقص نماز میں تاخیر ہو جاتی ہے یا بالکل فوت ہو جاتی ہے تو کیسا غم سوار ہوتا ہے۔
بدل سالک ہزاراں غم بود ☆ چوں زباغے دل خلا لے کم بود
(سالک کے دل پر ہزاروں غم طاری ہوتے ہیں اگر ذرہ بھر بھی اس کی باطنی حالت میں کمی ہوتی ہے)
اس وقت اس ناقص عمل ہی کی قدر ہوتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اگر بالکل بھی توفیق نہ ہوتی

تو کیسی مصیبت تھی۔ بہر حال یہ نماز روزہ بھی حق تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے اگر تھوڑا سا بھی خلوص ہوگا تو نجات کے لئے کافی ہے جیسے نفقات کے مثل میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ شبنم ہی کافی ہے۔

اب یہاں پر یہ شبہ ہوگا کہ جب اپنی نماز کو کافی اور سہل سمجھا تو یہ تو کبر ہے بات یہ ہے کہ ایک صورت سے کبر نہ ہوگا۔ وہ یہ کہ اپنے کو تو بے قدر سمجھے اور یہ جانے کہ میں اس نعمت کے قابل نہ تھا اور نماز کو بے قدر نہ جانے۔ گو اس کو کاہلین کے درجہ کی نہ جانے لیکن یہ سمجھے کہ میں ایسی نماز کے بھی قابل نہ تھا۔ اس کی توفیق ہو جانا یہ بھی میری مقدار سے کہیں زیادہ ہے اس طور سے شکر اور تواضع دونوں جمع ہو جائیں گے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کو نہایت بھوک لگ رہی ہو اور کہیں سے کچھ نہ ملتا ہو اور اتفاق سے کسی نے روکھی روٹی دیدی تو وہ اس کا بہت ممنون ہوگا۔ اس کی قدر کریگا لیکن اس کو دوسروں کی نعمتوں پلاؤ زردے سے کم بھی نہ گنا اور ساتھ ہی یہ بھی سمجھے گا کہ میرے لئے تو یہی پلاؤ و قورمہ ہے اگر یہ بھی نہ ہوتی تو ہلاک ہی ہو جاتا۔

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے کہ وضو سے گناہ دھلتے ہیں۔ یہ معلوم ہوا کہ طاعات کے درمیان یہ خاصہ ہے کہ اس سے تزکیہ نفس ہوتا ہے۔

دعویٰ کی ممانعت

تو اس اعتبار سے طہارت ظاہرہ سے بھی نفس کا تزکیہ ہوتا ہے کیونکہ اولاً جسم کا تزکیہ ہو اور بلا واسطہ اس کے نفس کا اور اسی طرح دیگر اعمال سے بھی تزکیہ نفس کا ہوتا ہے گو بلا واسطہ سہی۔ اور تزکیہ بلا واسطہ مراد لیا جائے تو آیت میں صرف تزکیہ باطنی مراد ہوگا۔

بہر حال آیت کا مدلول عام لیا جائے یا خاص مگر میرا مقصود یہاں پر وہ اعمال ہیں جن سے تزکیہ بلا واسطہ ہوتا ہے۔

بیچ میں ایک شبہ کو بھی دفع کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے اگرچہ شبہ عامیانا ہے لیکن آج کل مصیبت یہ ہے کہ ہر شخص مجتہد ہے اگر ترجمہ اردو قرآن و حدیث کے دیکھنے کا شوق ہے یہ شوق تو برا نہیں لیکن ہر کام کی تدبیر ہوتی ہے اور قاعدہ دنیا میں یہ ہے کہ ہر کام کا ایک استاد ہوتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ کسی استاد سے یہ ترجمہ پڑھیں اپنی رائے کو دخل نہ دیں۔ شبہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے یہاں تو تزکیہ کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور ایک مقام پر ارشاد ہے فلا تنزکوا انفسکم (اپنے نفسوں کو پاک مت سمجھو) تو بظاہر یہاں تزکیہ سے نہیں ہے تو اس سے اردو ترجمہ دیکھنے والے

کو جب کہ اس کو علم نہ ہو سخت حیرانی ہوتی ہے کہ یہ کیا بات ہے۔
 بات یہ ہے کہ تزکیہ کے دو معنی آتے ہیں۔ پاک کردن و پاک گفتن جہاں فضیلت بیان
 فرمائی ہے وہاں تو معنی اول مراد ہیں اور جہاں نہیں ہے وہاں معنی ثانی۔ اس لئے کہ باب تفعلیل
 کا خاصہ یہ بھی ہے کہ ماخذ کو اپنی طرف منسوب کرنا۔ پس جہاں نہیں ہے وہاں یہی معنی مراد ہے
 حاصل یہ ہے کہ نفس کو پاک تو کرو لیکن اس کرنے کے بعد اس کو پاک مت کہو اور ناپاک سمجھو۔
 خلاصہ یہ ہے کہ کردار کی تاکید ہے اور گفتار سے تحذیر ہے۔

کارکن کاربگذر از گفتار ☆ کاندریں راہ کارباید کار
 (کام کرو کام صرف باتیں کرنا چھوڑ دو، اس راستہ میں کام کرنا ہی منزل پر پہنچاتا ہے)
 حضرت شیخ شیرازی فرماتے ہیں۔

قدم باید اندر طریقت نہ دم ☆ کہ اصلے ندارد دی بے قدم
 (طریقت میں قدم رکھنا مفید ہے صرف باتیں کرنا کارآمد نہیں ہے)
 نرے دعوے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کام کرنا چاہیے۔ ایک بزرگ وحدۃ الوجود کے بارہ

میں فرماتے ہیں۔

مغرور سخن مشو کہ توحید خدائی ☆ واحد دیدن بود نہ واحد گفتن
 (لفظوں میں اللہ کی وحدانیت کا اظہار کر کے مغرور نہ ہو جاؤ اس لئے کہ ہر چیز میں اللہ کی
 وحدانیت کا مشاہدہ کرنا ہی حقیقت وحدانیت ہے نہ کہ صرف زبان سے واحد کہنا)
 یعنی وحدۃ الوجود واحد دیدن ہے واحد گفتن نہیں ہے یعنی توحید بمعنی وحدۃ الوجود وہ ایک
 حالت ہے وہ کوئی مضمون علمی نہیں ہے جس پر وہ حالت گزرتی ہے وہ اس کا مشاہدہ کرتا ہے پس
 غرض فلا تزکو انفسکم (اپنے نفسوں کو پاک مت سمجھو) میں دعویٰ کرنے کی ممانعت کی گئی
 ہے چنانچہ قرینہ اس کا یہ ہے کہ اس کے بعد فرماتے ہیں هو اعلم بمن اتقى (وہ خوب جانتا ہے
 کہ کون متقی ہے)۔ اگر پاک کروں کے معنی ہوتے تو اعلم نہ فرماتے پس دعویٰ کی ممانعت ہے۔
 واقعی اگر آدمی غور کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ جس درجہ کی بھی پاکی حاصل کرے حق تعالیٰ کی درگاہ
 کے لائق کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ یہاں تک کہ جو طاعات زبان سے ادا ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ
 زبان ایسی چیز ہے کہ اس سے ہم جو چاہیں اور جس قدر چاہیں عمل ہو سکتا ہے لیکن حق تعالیٰ کے وہ

حقوق بھی ادا نہیں ہوتے اور ہماری تو کیا ہستی ہے سیدالحامدین خود ارشاد فرماتے ہیں۔ لاحصی ثناء علیک انت کما اثبت علی نفسک (میں آپ کی تعریف کا احاطہ نہیں کر سکتا بس آپ کی وہی تعریف ہے جو آپ نے خود کی ہے)

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم ☆ زہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و پیاں رسید عمر ☆ مانجناں دراول وصف تو مانده ایم
(اے اللہ آپ خیال و قیاس و گمان اور وہم سے برتر ہیں اور جو کچھ لوگوں نے بیان کیا اور
جو کچھ ہم نے سنا اور پڑھا ہے اس سے آپ برتر ہیں دفتر تمام ہو گیا اور عمر انتہا کو پہنچ گئی ہم
ایسے پہلے ہی وصف رہے ہیں۔)

اور ایک بزرگ کہتے ہیں۔

نہ گرد و قطع ہرگز جادہ عشق از دید نہا ☆ کہ می بالد بہ خود ایں راہ چوں تاک از برید نہا
(تیز دوڑنے سے عشق کا میدان ختم نہیں ہو گیا اس لئے تو اس کو جتنا قطع کرے گا۔ یہ اتنا بڑھے گا)

مسافت معرفت

میں نے اس مقام میں کلام کو اس لئے طول زیادہ دیا ہے کہ آجکل لوگ کچھ ذکر و شغل کر کے اپنے
کو عارف اور شاغل سمجھتے ہیں حالانکہ یہ راہ پورا کبھی بھی قطع نہیں ہوتا۔ جتنا زیادہ قطع کرو اتنا ہی زیادہ بڑھتا
ہے اور بظاہر یہ خلاف عقل معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ کسی راہ کو جتنا قطع کرتے ہیں وہ تو گھٹا کرتا ہے
بات یہ ہے کہ جس قدر معرفت بڑھتی ہے نظر صحیح ہوتی جاتی ہے اور حق تعالیٰ کے حقوق اور عظمت
کا مشاہدہ زیادہ ہوتا ہے اور اس کے لئے۔ زم ہے کہ اپنا عجز اور کوتاہی بھی ساتھ ساتھ بڑھے۔ پس
سالک کی جس قدر معرفت بڑھے گی اس کو یہ معلوم ہوگا کہ میں ہیچ در ہیچ ہوں۔ اور میں نے راستہ کا ایک
قدم بھی طے نہیں کیا اور خدا تعالیٰ کا ایک حق بھی ادا نہیں کیا۔ اگر خدا تعالیٰ اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے لگیں
تو کہیں ٹھکنا نہیں۔ اس لئے کہ حقوق تو ہم ادا کر ہی نہیں سکتے اسی واسطے اس کا مواخذہ نہ ہوگا کہ ہمارے
حقوق پورے کیوں نہیں ادا کئے بلکہ یہ کہا جائے گا کہ ادائے حقوق میں کیوں نہیں لگے۔

مدار نجات

ایک بات جملہ معترضہ کے طور پر اور دیکھو کہ اس مقام پر عقل تو ادائے تمام حقوق کا فتویٰ دیتی

ہے اور حقوق کا ادائے نام ممکن نہیں تو یہ آپ کی عقل جس پر آپ کو ناز ہے آپ کو مجرم بنانا چاہتی ہے اگر شریعت نہ ہوتی جو کہ ادائے حقوق میں لگ جانے پر کفایت کرتی ہے اور عقل ہی پر مدار ہوتا تو سب ہلاک ہو جاتے لیکن حق تعالیٰ نے رحمت فرمائی اور مدار کار عقل پر نہیں رکھا۔

چنانچہ فرماتے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ کسی شخص کو اسی کے عمل سے نجات نہ ہوگی۔ بلکہ رحمت سے ہوگی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ولا انت یعنی یا رسول اللہ! کیا آپ کو بھی عمل سے نجات نہ ہوگی! قال ولا انا الا ان يتغمد فی اللہ برحمۃ ”فرمایا مجھ کو بھی نجات نہ ہوگی۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو اپنی رحمت سے ڈھانپ لے۔“ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی شان کے موافق ممکن الوجود شخص سے عمل نہیں ہو سکتا۔ خواہ نبی ہو یا ولی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی انسان ہیں الہ نہیں ہیں۔ ہاں انسان کامل بلکہ اکمل الکاملین ہیں۔ اسی لئے عمل کسی کا نجات دینے والا نہیں (اور بعض آیات سے جو معلوم ہوتا ہے کہ جنت اور نعیم جنت اعمال کا بدلہ ہے تو اس کو بدلہ اور جزا بنانا یہی رحمت ہے۔ ۱۲ جامع)۔

تو دیکھو! ہم نے عقل کو وکیل بنایا تھا۔ مگر حاکم حقیقی نے اس کی وکالت کو نہیں قبول کیا اور اس بیرسٹر کی بکو اس کو رد کر دیا اور یہ فرمایا کہ اگر ہم تمہارے بیرسٹر کی تقریر پر فیصلہ کریں گے تو تم سب مقدمہ میں ناکام میاب ہو کر جیل خانہ میں رہو گے لہذا ہم اس کی تقریر نہیں سنتے اور اپنے مراحم خسروانہ سے تم کو خلاصہ بخشتے ہیں یعنی ہم اس کو نہیں دیکھتے کہ تم نے ہمارے حقوق ادا بھی کئے۔ ہاں ہم اس کا ضرور انتظار کریں گے کہ حقوق کے اندر مشغول بھی تھے یا نہیں۔ اس لئے ارشاد ہے ہوا علم بمن اتقی یعنی یہاں تم اپنے کو پاک نہ کہو۔ پاک اور متقی کا علم تو اللہ تعالیٰ کو ہے کہ کون ہے۔ واللہ ثم واللہ! کہ اگر انسان کو اپنی قدر اور حیثیت کا اندازہ اور صحیح علم ہو جائے تو یہ کہتے ہوئے بھی شرم آئے کہ انا موجود چہ جائیکہ یہ کہے انا کذا وانا کذا حق تعالیٰ کی قدرت اور عظمت چونکہ پیش نظر نہیں ہے اس لئے یہ سب کے سب دعوے ہیں۔

تحقیقات جدیدہ اور طاعون

تحقیقات جدیدہ سے ثابت ہوا ہے کہ ایک قطرہ پانی میں خوردبین کے ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ اس قدر کیڑے ہیں جس قدر کہ تمام دنیا کے آدمی۔ اور چلتے ہیں، پھرتے ہیں کھاتے ہیں

اور ان میں آنکھ، ناک، منہ، پیر، دماغ۔ سب کچھ ہے اللہ اکبر!

اس مضمون کا تہہ جو کہ اس کے ایزاد سے مقصود ہے آگے آئے گا۔ مگر درمیان میں ایک مفید مضمون اس کے متعلق یاد آ گیا۔ اس کو پہلے عرض کئے دیتا ہوں کہ دیکھو ایک قطرہ میں اتنے کیڑے ہیں اور پھر وہ قطرے آپ پیتے ہیں خدا تعالیٰ ہی محافظت کرتے ہیں۔ خبر بھی نہیں کہ ہم کیا کھاتے ہیں کیا پیتے ہیں۔ یہ خوردبین تھوڑے دنوں سے ہو گئی ہے۔ اس سے یہ علم ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹروں نے یہ ہانک دیا کہ یہ طاعون ان کیڑوں کی وجہ سے ہے جب پانی خراب ہوتا ہے تو ان میں سمیت آ جاتی ہے لوگوں کو بھی ان کے کہنے کا یقین آ گیا اور چونکہ خدا تعالیٰ کے ساتھ جیسا گمان آدمی کا ہوتا ہے ویسا ہو بھی جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ جب ان کیڑوں میں طاعون کا خیال بندھا تو اللہ تعالیٰ نے بھی طاعون اس میں پیدا کر دیا۔ ورنہ ان تحقیقات سے پہلے نہ طاعون تھا نہ کچھ تھا۔

مجھ کو اس پر ایک حدیث یاد آئی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بیمار کی عیادت کیلئے تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ اس کو بخار ہے فرمایا لا باس طہور انشا اللہ تعالیٰ۔ یعنی کچھ حرج نہیں۔ یہ بخار تمہارے حق میں مطہر ہے۔

اللہ اکبر! عیادت کا حق بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ادا کرنے والا کون ہوگا۔ عیادت کی غرض اصلی تسلیہ ہے اور تسلی اس سے بڑھ کر کیا ہوگی۔ کہ جس شے کو وہ ضرر سمجھتا ہو اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نفع کے افراد میں داخل کر دیں۔ یہ تو ایسے تسلی ہے کہ طبیعت میں اس قدر تسلی اس سے ہونی چاہیے کہ مرض بھی نہ رہے لیکن اس تسلیہ کی اس بیمار نے قدر نہ کی وہ ایک ضعیف الایمان بڑھا تھا کہتا ہے کلابل حمی تقع علی شیخ کبیر تزیوہ القبور۔ (ہرگز نہیں بلکہ یہ تو ایسا بخار ہے جو ایک بوڑھے کو قبر میں پہنچا دے گا) فرمایا اچھایوں ہی سہی۔ چنانچہ وہ بڑھا اسی میں ختم ہو گیا۔

غرض! تم کو اگر طاعون پسند ہے تو طاعون بھی موجود ہے اور اگر شفا چاہتے ہو تو شفا بھی موجود ہے۔ صاحبو! حق تعالیٰ سے عافیت اور امن مانگنا چاہیے اور یہی گمان بھی رکھنا چاہیے ہاں اگر اس کے بعد بھی حکمت الہیہ ابتلا ہو جائے تو صبر کرنا چاہیے بعض لوگ بہت بے صبر ہوتے ہیں اور مصیبت میں ایسے کلمات بول اٹھتے ہیں کہ ایمان تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ ہاں جو اللہ والے ہیں وہ ایسے مواقع میں بھی مستقل رہتے ہیں۔

چنانچہ ایک بزرگ نے دیکھا ہے کہ لوگ بھاگے جا رہے ہیں کسی سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہیں کہا کہ طاعون سے بھاگ رہے ہیں۔ تو آپ فرماتے ہیں یا طاعون خذنی الیک یعنی اے طاعون تو مجھ کو لے لے۔ ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ زبان حال سے یوں کہتے ہیں۔
 نشوونصب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ☆ سردوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی
 دشمن کا ایسا کبھی نصیب نہ ہو کہ میری تلوار سے ہلاک ہو جائے دوستوں کا سر میری خنجر آزمائی کیلئے سلامت ہے۔
وہم کا اثر

الحاصل طاعون کا سبب موثر کیڑے وغیرہ کچھ نہیں۔ یہ محض وہم ہے اگر ایسا ہوتا تو جو لوگ طاعونیوں سے ملے جلے رہتے ہیں ان کو طاعون ضرور ہونا چاہیے تھا۔ حالانکہ بہتوں کو باوجود ان کی تمنا کے بھی نہیں ہوتا۔ کانپور میں میرے بعض دوستوں نے طاعون کے ایام میں التزام کر لیا تھا کہ ہم مبتلایان طاعون کی خدمت کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے اول سے آخر تک تجہیز و تکفین و تدفین سب کچھ کیا لیکن وہ بیمار تک بھی نہ ہوئے۔ اچھے خاصے اب بھی موجود ہیں یہ نرا وہم ہے۔ وہم سوار ہو جاتا ہے اور وہم ایسی شے ہے کہ جب اس کا غلبہ ہوتا ہے تو واقعی اثر بھی ہو جاتا ہے۔

ہمارے استاد مولانا فرماتے تھے کہ دہلی میں ایک ڈوم تھا۔ رمضان المبارک کے دنوں میں مسجد میں قرآن سنا کرتا تھا۔ مومن خاں شاعر سے اس نے کہا کہ خاں صاحب جب قرآن میں وہ سورۃ آئے جو مردوں پر پڑھی جاتی ہے۔ مجھ کو ایک روز پہلے اطلاع کر دیجئے گا۔ میں اس روز نہ آؤں گا۔ مومن خاں نے کہا کہ بڑے میاں وہ سورۃ تو آچکی فوراً اس کو بخار چڑھ آیا اور مردوں کی طرح گھر جا کر لیٹ رہا اور ایسا وہم سوار ہوا کہ تیسرے دن مر گیا۔

قاری عبداللہ صاحب مکی نقل فرماتے تھے کہ یہاں ایک سال غالباً جاوہر کے رئیس حج کرنے کیلئے آئے تھے۔ اتفاق سے ان کی بی بی کو ہیضہ پڑا۔ نئی نئی شادی کی تھی بی بی کو چاہتے بہت تھے۔ نواب صاحب کو بے انتہا گھبراہٹ ہوئی۔ حتیٰ کہ اسی غم میں ان کی روح تحلیل ہو گئی۔ اور بیوی صاحبہ اچھی خاصی ہو گئیں۔ ظہر کے وقت نواب صاحب کا جنازہ حرم میں آیا۔ ہم کو افسوس ہوا کہ مریضہ مر گئیں۔ نواب صاحب کو کیسا رنج ہوگا۔ تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ نواب صاحب کا جنازہ ہے۔

اسی واسطے شریعت نے بیماری کے لگنے میں بہت اچھا فیصلہ کیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ چاہتے ہیں بیماری لگتی ہے جب نہیں چاہتے نہیں لگتی اور اسی طرح تمام اسباب کے متعلق شریعت کا یہی فیصلہ ہے کہ

جب خدا تعالیٰ چاہتے ہیں اسباب کے بعد مسبب کو پیدا کر دیتے ہیں اور نہیں چاہتے تو نہیں کرتے۔
 اب اس قاعدہ پر کچھ اشکال ہی نہیں اور بغیر اس عقیدہ کے مضر بھی نہیں ہے ورنہ اس قدر اشکالات
 وارد ہوں گے کہ جواب دیتے دیتے تنگ ہو جاؤ گے اور پھر بھی وہ ختم نہ ہوں گے مولانا فرماتے ہیں۔
 خاک و باد و آب و آتش بندہ اند ☆ با من و تو مردہ با حق زندہ اند
 نیار و زمیں تا گلوئی بیار ☆ نیار و ہوا تا نہ گلوئی بیار
 (مٹی ہوا پانی آگ سب اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں تیرے اور میرے نزدیک مردہ ہیں
 مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک زندہ ہیں)
 پانی غرق نہیں کر سکتا۔ ہوا اڑ نہیں سکتی۔ طاعون کچھ نہیں کر سکتا جب تک کہ ان کا حکم نہ ہو۔

وحدة الوجود

الحاصل! میں یہ بیان کر رہا تھا کہ یہ تحقیق ہوا ہے کہ ایک قطرہ پانی میں کروڑوں جراثیم ہیں۔
 اب آپ دیکھتے ہیں کہ اس ایک قطرہ پانی کو انسان سے کیا نسبت ہے۔ پھر اس ایک قطرہ پانی میں
 جو جراثیم ہیں ان میں سے ایک کیڑے کو دیکھئے کہ کیا نسبت ہے وہ کیڑا گریوں کہے کہ میں انسان
 کی خدمت کروں گا تو خدمت کرنا تو علیحدہ ہے اس کا یہ مقولہ سن کر ہی بے انتہا ہنسی آئیگی اور
 بالفرض! اگر وہ کچھ خدمت کرے مثلاً پاؤں دبائے تو کچھ بھی خبر نہ ہوگی۔ پس وہ کیڑا محال ہے کہ
 انسان کا کوئی حق ادا کر سکے۔ یا کسی درجہ میں اس کو نفع پہنچا سکے اور اگر اس پر وہ انسان کے مقابلہ
 میں کوئی رائے لگائے یا تحقیقات اور علوم و صنائع کا بھی دعویٰ کرے تو وہ محو کر دینے کے قابل ہے۔
 پس جو نسبت ہم کو اس کیڑے سے ہے واللہ العظیم۔ ہم کو بلکہ تمام کو حق تعالیٰ جل جلالہ سے
 اس قدر بھی نسبت نہیں۔ پس آپ کا یہ دعویٰ کرنا کہ میں بڑا صاف ہوں پاک ہوں۔ ایسا ہی ہے
 بلکہ اس سے بڑھ کر ہے جیسے وہ کیڑا انسان کے مقابلہ میں یوں کہے کہ میں ایسا چمکدار ہوں اور ایسا
 خوب صورت ہوں۔ اگر وہ انسان کو دیکھ لے تو واللہ! اس سے بھی شرمائے کہ یوں کہے کہ میں کوئی
 چیز ہوں اور جن پر کچھ فضل ہو گیا ہے ان کی یہی کیفیت ہوئی۔

ایک بزرگ بیٹھے تھے۔ ان کو ایک شخص پنکھا جھل رہا تھا۔ اور وہ منع کرتے تھے اور کہتے تھے
 کہ میرے ساتھ کیوں تمسخر کرتے ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد اجازت دیدی لوگوں نے پوچھا کہ
 حضرت یہ کیا بات تھی۔ فرمایا کہ اس وقت مجھ پر اضحلال و جووی انکشاف ہوا۔ مجھ کو نہایت شرم

معلوم ہوئی اور میں اپنی نظر میں لاشے محض ہو گیا۔

بعض بزرگ جو اپنی خدمت سے منع کرتے ہیں تم تو یہ سمجھتے ہو کہ یہ تنگ مزاج ہیں تم کو کیا خبر ہے۔ ان پر کیا گزرتی ہے۔

اے تراخارے پناشکستہ کے دانی کہ چست ☆ حال شیرانے کہ شمشیر بلا برسر خورند
(اے وہ شخص کہ جس کا ایک کانٹے سے پاؤں تک زخمی نہیں ہوا تو اس شخص کے حال کو کیا سمجھ سکتا ہے کہ جو بلاؤں کی تلواریں اپنے سروں پر رکھاتے ہیں)

تم تو ان کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہو حالانکہ ان کی دوسری حالت ہے۔

دریابد حال پختہ ہیچ خام ☆ پس سخن کوتاہ باید و السلام

(خام پختہ کے حال کو نہیں سمجھ سکتا، بات مختصر چاہیے طویل کلام سے کیا فائدہ والسلام)

پس کالمین کو ہر گز اپنے اوپر قیاس نہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ جن بزرگوں پر اضمحلال وجود اور فنا کی حالت ہوتی ہے۔ ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے کو کافر تک سے بدتر سمجھتے ہیں۔ دعا کرتے ہوئے اور نماز پڑھتے ہوئے ان کو شرم آتی ہے مگر حکم سے کرتے ہیں۔ اسی حالت کی نسبت شیخ شیرازی فرماتے ہیں۔

ہمہ ہرچہ ہستند ازاں کمتر اند ☆ کہ بازستیش نام ہستی برند

(ان کا جو کچھ وجود نظر آتا ہے وہ اس سے حقیر تر ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے ساتھ اپنے

وجود کا نام لئے پھرتے ہیں)

یہی حالت ہے جس کا نام وحدۃ الوجود ہے۔ حق تعالیٰ کی ہستی ایسی ان کو پیش نظر ہوتی ہے کہ اپنی ہستی کو مٹا ہوا پاتے ہیں۔ اور اس طرح مٹ جاتے ہیں جیسے آفتاب کے سامنے چراغ کہ اس کو باعتبار ذات کے ہست کہہ سکتے ہیں اور آفتاب کے نور کے سامنے اس کو نیست بھی کہا جاسکتا ہے۔ حضرت عارف شیرازی بہت واضح مثال میں اس کو بیان فرماتے ہیں۔

مگردیدہ باشی کہ درباغ وراغ ☆ بتابد بشب کرکے چوں چراغ

یکے گفتش اے کرک شب فروز ☆ چہ بودت کہ بیروں نیائی بروز

بہ میں کاتشیں کرک خاک زاد ☆ جواب از سر روشنائی چہ داد

کہ من روز و شب جز بصر انیم ☆ ولے پیش خورشید پیدانیم

(باغ میں پھرتے ہوئے دیکھا کہ جگنو چراغ کی مانند چمک رہا تھا۔ ایک شخص نے کہا کہ اے رات میں چمکنے والے جگنو تو دن میں سامنے کیوں نہیں آتا۔ دیکھ اس مٹی میں رہنے والے جگنو نے اپنی چمک دمک کے بارے میں کیا جواب دیا کہ میں تو شب و روز صحرا ہی میں رہتا ہوں لیکن سورج کے سامنے میری روشنی نظر ہی نہیں آتی) شیخ اکبر اسی مقام کی نسبت فرماتے ہیں۔

والله ما شمت الكائنات رائحة الوجود

”یعنی خدا کی قسم ہے کہ کائنات عالم نے وجود کی بو تک نہیں سونگھی ہے۔“

پس جب کہ ہماری ہستی ایسی بے بود ہے تو عقلی طور سے سمجھ میں آ گیا کہ ہم کو پاکیزگی کا دعویٰ کرنا کہاں تک زبید دیتا ہے۔ پس اس تقریر پر لاتنز کو انفسکم اور قد افلح من ذکھا۔ میں کوئی تعارض نہ رہا اور شبہ دفع ہو گیا۔

ام المعاصی

میں یہ بیان کر رہا تھا کہ مجھ کو مقصود بالبیان نفس کا تزکیہ ہے معاصی سے۔ خواہ وہ معاصی ظاہری ہوں یا باطنی۔ اور ہر چند کہ معاصی بہت سے ہیں لیکن نشان سب کا صرف دو چیزیں ہیں۔ اول شہوت یا لذت۔ دوسرے کبر یا غضب۔ یہ دو مادہ خبیثہ ہیں کہ جن سے تمام معاصی پیدا ہوتے ہیں۔ پس نفس کو اسباب شہوت و کبر سے بچانا حاصل تزکیہ کا ہے۔ شریعت نے ان ہی دو مادوں کا طرح طرح سے معالجہ کیا ہے معالجہ کی دو قسمیں ہیں۔ معالجہ تفصیلی اور معالجہ اجمالی لیکن معالجہ تفصیلی کا مرجع ہمیشہ کوئی امر اجمالی ہوتا ہے۔ جیسے طبیب نے چند اجزاء سے ایک نسخہ لکھ کر دیا۔ پس بظاہر تو وہ اجزاء متعدد ہیں لیکن حاصل ان کا مثلاً صفر کا قمع کرنا ایک ہے۔

شریعت نے دونوں قسم کے معالجات کئے ہیں۔ دیکھو بنی اسرائیل کو حب مال اور حب جاہ حق کے اتباع سے سدراہ ہوئی۔ حق تعالیٰ نے دونوں کا معالجہ تفصیلی فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے واقیموا الصلوٰۃ۔ یہ توحب جاہ کا معالجہ ہے۔ واتوا الزکوٰۃ۔ یہ حب مال کا علاج ہے۔ وارکعوا مع الراکعین۔ جو تہ ہے اقیموا الصلوٰۃ کا۔ یہ کبر کے زائل ہونے کی تدبیر ہے۔ حق تعالیٰ نے جاہجا جو مجاہدات بیان فرمائے ہیں سب کا حاصل ان ہی دو خصلتوں سے تزکیہ ہے۔ میں اسی کی شرح کرنا چاہتا ہوں اور اسی سے اعمال رمضان کی حکمتیں اور روح معلوم ہو جائیں

گی۔ اور یہ معلوم ہوگا کہ ہمارا رمضان درحقیقت بری طرح سے گزرتا ہے۔

کلابی تقویٰ

بہت تو اللہ کے بندے ایسے ہیں کہ ان کے گھر رمضان آتا ہی نہیں نہ دن کو نہ رات کو۔ یعنی نہ نماز پڑھتے ہیں اور نہ روزہ رکھتے ہیں اور بعض کے یہاں دن کو تو آتا ہے لیکن رات کو نہیں آتا۔ یعنی نماز و تراویح نہیں پڑھتے اور دن کو بھی جو آتا ہے تو بعض کے آثار کے اعتبار سے آتا ہے یعنی کھانا پینا تو چھوڑ دیتے ہیں لیکن جس شے کا چھوڑنا بڑا ضروری تھا۔ یعنی معاصی ان کو نہیں چھوڑتے۔

صاحبو! غضب کی بات ہے کہ جو شے یعنی کھانا پینا کہ فی نفسہ مباح ہے دن کو بھی اور رات کو بھی اور رمضان میں رات کو اور معذور کے لئے دن کو بھی جائز ہے جب کہ شارع نے اس کو ماہ مبارک میں چھڑا دیا تو معاصی جو کہ کسی وقت اور کسی حالت میں کسی عذر سے جائز ہی نہیں وہ کیسے ترک کے قابل نہ ہوں گے اور ان کے ترک کا اہتمام کیوں نہ زیادہ کیا جائے گا۔ افسوس تو یہ ہے کہ کھانا پینا تو چھوڑ دیا لیکن گناہ نہ چھوڑے۔

ہمارے اس تقویٰ کی ایسی مثال ہے جیسے کسی شخص نے بدکاری کی اور حمل رہ گیا۔ کسی نے کہا کہ کم بخت تو نے عزل نہ کر لیا۔ کہنے لگا کہ میں نے علماء سنا تھا کہ مکروہ ہے۔ تو زنا جو کہ حرام قطعی ہے اس کے ارتکاب میں تو باک نہیں کیا اور عزل میں آپ کو تقویٰ پر عمل ہوا۔

ایسا ہی ہمارا تقویٰ ہے ایسے تقویٰ کو تقویٰ کلابی کہتے ہیں اور وجہ تسمیہ یہ ہے کہ کتا جب پیشاب کرتا ہے تو ٹانگ اٹھا کر کسی دیوار پر کر دیتا ہے کہ ایسا نہ ہو مجھ کو چھینٹ لگ جائے لیکن اگر کہیں پلیدی پاتا ہے تو وہ کھا لیتا ہے تو ٹانگ تو نجاست سے بچاتا ہے اور منہ کو نہیں بچاتا۔

ایک گنوار عورت کی حکایت مشہور ہے کہ اس سے کسی نے پوچھا کہ تیرا میاں کہاں گیا تو شرم کی وجہ سے منہ سے تو بولی نہیں لہنگا اٹھا کر اور پیشاب کر کے اس کو پھاند گئی مطلب یہ تھا کہ دریا پار گیا ہے۔ ہم اس عورت کی حماقت پر ہنستے ہیں کہ اچھی شرم آئی۔ بولنے کی تو شرم کی اور ننگے ہوتے ہوئے شرم نہ آئی۔ لیکن ہم سب اس بلا میں مبتلا ہیں۔ گوروزہ میں معمولی کھانا کھایا یا پیا نہیں لیکن مردہ مسلمان کا گوشت کھایا یعنی غیبت کی منہ تو بند کر لیا لیکن غیبت اور بہتان سننے کیلئے کان کھول دیئے۔ کھانے سے ہاتھ روکا لیکن ظلم کرنے اور تاش اور گنجفہ اور شطرنج کھیلنے اور جھوٹی دستاویز پر دستخط کرنے کے لئے خوب چلایا۔ زبان کو لقموں سے نہیں چلایا لیکن مسلمانوں کو برا کہنے اور سب

و شتم اور جھوٹی گواہی دینے سے اس کو نہیں روکا۔

اے صاحبو! یہ کیسا تقویٰ ہے یہ کیسا روزہ ہے یہ کیسی دینداری ہے اگر یہی دین و ایمان ہے تو

بسمایا امرکم بہ ایمانکم ان کنتم مؤمنین۔

تفریق و تنفیر

درحقیقت ہم نے روزہ کے معنی اور غرض ہی نہیں سمجھی۔ روزہ کی اصلی غرض تھی کسرت و تبہ کے واسطے سے معاصی سے بچنا۔ جب معاصی سے ہم عین روزہ کی حالت میں بھی نہ بچے تو بعد میں وہ غرض اور غایت اس پر کیسے مرتب ہو سکتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس شخص کو اس کا روزہ جھوٹ بولنے سے نہ روکے اللہ تعالیٰ کو کوئی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پانی چھوڑے۔ یہ مطلب نہیں کہ جو جھوٹ سے بچتا ہے اس کے روزہ کی اللہ میاں کو حاجت ہے اس لئے کہ ان کی شان تو ان اللہ لغنی عن العلمین۔ بلکہ مقصود ناراضی اور ناخوشی ظاہر کرنا ہے پس جن کے یہاں رمضان المبارک دن کو اس شان سے آتا ہے۔ سو یہ کیا آنا ہے۔ ہاں روپیہ میں سے آنہ ہے اور رات کو تو پوچھو ہی مت۔ رات کو تو شاذ و نادر ہی کسی کے یہاں آتے ہیں اس لئے کہ جو عبادت رمضان المبارک کی راتوں میں مقرر کی گئی ہے اس کے حقوق ادا کرنے والے بہت کم لوگ ہیں۔ عموماً بوجھ سناٹا لتے ہیں۔

چنانچہ تراویح کی وہ گت بنتی ہے کہ الہی توبہ۔ سب سے اول یہ کوشش ہوتی ہے کہ اذان سب سے پہلے کہی جائے۔ چنانچہ بعض مساجد میں تو عشاء کی اذان رمضان میں مغرب کے وقت ہوتی ہے عشاء کا وقت آتا بھی نہیں۔ اگر یہی بات ہے تو مغرب ہی کے وقت فارغ ہو لیا کریں۔ کہیں تو یہ ستم ہے کہ اذان ہی بے وقت ہوتی ہے اور کہیں اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ فرض بھی عشاء سے پہلے ہی ہو جاتے ہیں۔ اور کہیں صرف اذان بے وقت ہوتی ہے اور بعض ان کے مقابل یہ زیادتی کرتے ہیں کہ وہ تاخیر کے دلدادہ ہیں۔

روزہ افطار کیا اور سورہ اور مقتدی بچارے سوکھ رہے ہیں یہ زیادہ تر رؤسا کی مسجدوں میں ہوتا ہے کہ وہ رکس ہیں ان کے ڈر سے کوئی بولتا نہیں جب تشریف لاتے ہیں اسی وقت نماز ہوتی ہے۔ یاد رکھو اس سے تفریق و تنفیر ہوتی ہے۔

امام کا فرض

حدیث شریف میں قصہ آیا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ایک مسجد میں امام تھے

اول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں نفل کی نیت سے شریک ہوتے پھر وہاں جا کر نماز پڑھایا کرتے تھے ایک مرتبہ عشاء کی نماز پڑھانے کے لئے گئے تو سورہ بقرہ شروع کر دی۔ ایک محلہ دار غریب دن بھر کی محنت مشقت سے تھکے ہوئے تھے وہ جماعت سے علیحدہ ہو کر اپنی نماز پڑھ کر چلے گئے۔ اس وقت میں جماعت کے ساتھ شریک نہ ہونا نفاق کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے ان کو برا بھلا کہا۔ صبح کو یہ مقدمہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں پیش ہوا۔ ان اصحابی نے حضرت معاذ کی شکایت کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم مزدوری پیشہ لوگ ہیں دن بھر تو مزدوری محنت کرتے ہیں اور رات کو یہ سورہ بقرہ شروع کر دیتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ پر عتاب فرمایا اور فرمایا۔ افتان انت یا معاذ یعنی ارے معاذ! کیا تم لوگوں کو فتنہ میں ڈالنے والے ہو۔

والشمس، واللیل، والتین پڑھا کرو۔ فان فیہم الضعیف والسقیم وذوالحاجة۔ یعنی مقتدیوں میں ضعیف، بیمار، کاروبار والے آدمی ہیں اس زمانہ میں ہم نے امام بہت دیکھے ہیں لیکن حضرت گنگوہیؒ کے برابر ہلکی اور پھر تمام ارکان کو کمال کے ساتھ نماز پڑھانے والا نہیں دیکھا۔

حضرت قرآن شریف ایسا پڑھتے تھے کہ سننے والے کو تاب نہ ہوتی تھی اور جی چاہتا تھا کہ سنے جائیں۔ مگر عادت حضرت کی یہ تھی کہ فجر کی نماز میں سورہ بروج و طارق یا اذا الشمس کورت و اذا السماء انفطرت پڑھتے تھے پس اس قدر تاخیر نماز میں کرنا یا قرات اتنی لمبی پڑھنا جس سے نمازی بھاگ جائیں جائز نہیں ہے۔

تراویح اور حفاظ

بلکہ فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کسی جگہ رمضان میں نمازی ایک قرآن ہی سننے سے اکتاتے ہوں تو وہاں تراویح الم تر کیف سے پڑھ لیں۔ بعض حفاظ ایسا ستم ڈھاتے ہیں کہ پانچ پانچ پارے پڑھ جاتے ہیں۔ ان حفاظ کو مسائل جاننے کی سخت ضرورت ہے بعض حافظ بہت جاہل ہوتے ہیں عجب نہیں بلکہ غالب ہے کہ سجدہ سہو کے مسائل کی بھی ان کو خبر نہ ہو۔

بعض نابالغوں کو تراویح میں امام بنا دیتے ہیں۔ نابالغ کے پیچھے تراویح پڑھنے میں اختلاف ہے۔ متار اور مفتی یہ یہی ہے کہ ناجائز ہے اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو نابالغ تمیز دار نہ ہو اور مسائل

سے واقفیت نہ رکھتا ہو اس کو بھی امام بنانا مناسب نہیں۔ امام یا تو عالم ہو یا علماء کا صحبت یافتہ ہونا چاہیے۔ اور اگر یہ دونوں امر نہ ہوں تو وہ ضرور نماز کو خراب کریگا۔

مجھے خود ایسا موقع پیش آیا ہے گرمیوں کے رمضان تھے۔ میں اور ایک میرا سامع تھا۔ ہم دونوں ایک مسجد میں قرآن سننے کیلئے گئے۔ ان حافظ صاحب نے ایک رکعت میں آدھا پارہ گھسیٹا۔ ان کو یاد تو رہا نہیں کہ ایک رکعت ہوئی یا دو وہ ایک ہی رکعت پر بیٹھ گئے۔ مقتدی بچارے تھکے ہوئے تھے انہوں نے غنیمت سمجھایا یاد نہ رہا ہو۔ کسی نے نہ بتلایا۔ میں نے اپنے سامع سے کہا کہ تم شریک ہو کر بتلا دو لیکن انہوں نے جلدی سے سلام پھیر دیا۔ میں نے پکار کر کہا کہ حضرت ایک رکعت ہوئی ہے اعادہ کرو اور یہ قرآن جو تم نے پڑھا ہے اس کا بھی اعادہ کرلو۔ اس وقت امام اور مقتدیوں میں خوب جھج جھج ہوئی۔

ان حفاظ کی ایک یہ بھی عادت ہے کہ اول کی رکعتوں میں بہت کھینچتے ہیں اور آخر کی رکعتوں میں دو دو تین تین آیتیں پڑھتے ہیں۔ یاد رکھو کہ سب رکعتیں اور سجدہ اور رکوع مناسب ہونے چاہئیں۔

حدیث شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے بارہ میں آیا ہے کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریباً من السواء یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز معتدل ہوتی تھی اگر قیام طویل ہوتا تھا تو سجدہ رکوع بھی اس کے مناسب ہوتا تھا۔

اب لوگ اس کے برعکس کرتے ہیں کہ قیام طویل کرتے ہیں اور سجدہ و رکوع قعدہ نہایت ہی مختصر۔ اس زمانہ میں تو بس تمام نماز مختصر پڑھنا چاہیے۔ اسی واسطے میں شبینہ کو بھی پسند نہیں کرتا۔ پہلے لوگ قوی ہوتے تھے اور نیزان کو شوق بہت تھا۔

اب تو یہ حالت ہے کہ ایک جگہ شبینہ ہو رہا تھا۔ ایک حافظ چار پائی پر لیٹے ہوئے بتلا رہے تھے۔ سب کی نماز تباہ ہو رہی تھی۔ کسی کی ہمت ہو خود پڑھو۔ لوگوں کو کیوں دق کرتے ہو۔ آج کل لوگ اس کا بالکل خیال نہیں کرتے۔

کانپور میں ایک بزرگ تشریف لائے۔ کہنے لگے کہ نماز جمعہ کی ہم پڑھائیں گے۔ اور وہ خطبہ پڑھیں گے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اول قدم مدینہ میں پڑھا تھا چنانچہ انہوں نے ایک بڑا لمبا خطبہ پڑھا۔ خطبہ کے بعد نماز شروع ہوئی تو انہوں نے سورہ کہف شروع کی۔ گرمیوں

کا موسم اور پھر مسجد ایسی کہ اس میں ہوا کا گزر نہیں۔ ایک شخص کو تو قے ہو گئی۔ اور ایک شخص نیت توڑ کر بھاگ گئے اور کہا کہ اسی واسطے تو ہم مسجد میں نماز پڑھنے نہیں آتے۔

ہمارے تھانہ بھون میں ایک شخص تھے وہ نماز نہ پڑھا کرتے تھے ایک مرتبہ میرے ساتھ ان کو سفر کا اتفاق ہوا۔ راستہ میں عصر کی نماز کا وقت آیا۔ میں نے ان کو تو کچھ کہا نہیں۔ میں لوٹا لے کر وضو کرنے کیلئے گیا۔ دیکھتا ہوں کہ میرے پیچھے آرہے ہیں۔ اور وضو کر کے میرے ساتھ انہوں نے نماز پڑھی پھر کئی روز میرے ساتھ رہے اور برابر نماز پڑھتے رہے کہنے لگے مجھے اگر ایسا امام ملے تو میں نماز نہ چھوڑوں میری نمازوں کی ترک کا بوجھ تو ان اماموں کی گردن پر ہے جو لمبی رکعتیں پڑھ کر گرانی پیدا کر دیتے ہیں۔

حفاظ اور ائمہ کا فرض

اے حفاظ اور اے امامو! اپنے مقتدیوں کو دیکھ لو کہ کیسے ہیں۔ اگر واقعی ان کو قرآن سننے کا شوق ہو تو سبحان اللہ! قرآن زیادہ پڑھو۔ قرآن تو جس قدر بھی زیادہ ہو باعث نورانیت ہے اور اگر دیکھو کہ شوق نہیں ہے جیسا آجکل ہے تو بس سو پارہ اچھی مقدار ہے اور بہتر یہ ہے کہ پندرہ پارہ تک تو سو سو پارہ پڑھو اور پھر ایک ایک پارہ کر دو۔ ۷۲ کو ختم ہو جائیگا اور سب رکعتیں برابر برابر پڑھو۔ دیکھو تم کو ہر شے کے اندر تناسب اور حسن اچھا معلوم ہوتا ہے نماز تو احق ہے اس بات کے ساتھ کہ اس کو حسین کرو۔ داؤد علیہ السلام لوہے کی زرہیں بناتے تھے ان کو حق تعالیٰ نے حکم فرمایا ان اعمال اسباغات وقد رفی السرد۔ یعنی اے داؤد! پوری پوری زرہیں بناؤ اور اس کے بنانے میں انداز رکھو یعنی کڑیاں بڑی چھوٹی نہ ہوں۔ جب کہ لوہے کی زرہوں کے اندر تناسب کا حکم ہے تو اے صاحبو! نماز تو بہت بڑی شے ہے اس میں تناسب کیوں نہ مامور ہوگا۔ اگر تم میں یہ رعایت تناسب طبعی نہ ہو تو ذکر اللہ کی کثرت کیا کرو۔ اس سے طبیعت میں نفاست اور اعتدال پسندی پیدا ہو جائے گی اور ہر امر میں تناسب کی رعایت رکھنے لگو گے۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناں اگر کوئی بدنما مکان دیکھتے تھے تو سر میں درد ہو جاتا تھا۔ مرزا صاحب کی لطافت مزاج کی بہت حکایتیں ہیں ایک حکایت مجھ کو اس وقت یاد آئی۔ ایک شخص مرزا صاحب کے یہاں آیا کرتے تھے وہ کھانا بہت کھاتے تھے۔ ایک بار انہوں نے خود عرض کیا کہ مجھ کو کوئی حکم دیجئے۔ بہت اصرار کے بعد مرزا صاحب نے ان کو فرمایا کہ آپ ایک سال میں

صرف ایک مرتبہ آیا کریں اس لئے کہ جب آپ کھاتے ہیں مجھ کو تمہارے زیادہ کھانے کا تصور ہو کر ثقل ہو جاتا ہے۔ تو مجھ کو مسہل لینے کی ضرورت ہو جاتی ہے تو سال میں ایک مسہل کا تحمل ہو سکتا ہے دو سے تکلیف ہوتی ہے۔

اسی طرح ہم نے اپنے حضرات کو دیکھا ہے کہ نہایت نفاست اور تناسب ہر شے کے اندر پسند کرتے ہیں اور راز اس میں یہ ہے کہ حدیث شریف میں آیا ہے ان الله جميل ويحب الجمال (بے شک اللہ تعالیٰ جمیل ہیں جمال کو پسند کرتے ہیں) اور یہ حضرات موصوف ہوتے ہیں صفات حق سے۔ اس لئے ان کو بھی جمال یعنی تناسب (نہ کہ صورت پرستی) ہر شے میں پسندیدہ ہوتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے نظفوا افیتکم ولا تشبهوا بالیہود ”یعنی اپنے گھروں کے صحن کو صاف رکھا کرو اور یہود کے مشابہ مت بنو۔“

یہود اکثر میلے کچیلے رہا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ایک شخص کو دیکھا کہ پریشان بال اور میلا کچلا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حالت پر انکار فرما کر کنگھی اور تیل سے بالوں کے درست کرنے کا حکم فرمایا۔ کوئی تواضع نہیں ہے کہ آدمی میلا کچلا رہا کرے اور نہ ایسی زینت پسندیدہ ہے کہ ہر وقت نواب اور بیگم بنا رہے۔

ایک شخص کو ہم نے دیکھا ہے کہ بہت ہی بنے ٹھنڈے رہتے تھے اگر وہ گھر میں ہوتے تھے اور کوئی ان کو بلاتا تھا تو اول آئینہ کنگھا منگاتے تھے۔ بالوں میں کنگھا کرتے تھے کئی کئی مرتبہ آئینہ دیکھتے تھے۔ غرض کم از کم ۱۵ منٹ میں وہ دولت خانہ سے برآمد ہوتے تھے۔

بعض نوجوانوں کو میں نے دیکھا ہوں کہ گرمیوں میں بھی جرابیں پہنتے ہیں۔ یہ اہل یورپ کی تقلید ہے۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ وہ لوگ سرد ملکوں کے رہنے والے ہیں اس لئے اس کے مناسب ان کی وضع ہے۔ تم بھی اول اپنے گھروں میں سردی پیدا کرو اس کو کشمیر بناؤ۔ اس کے بعد جرابیں پہنو تو مضائقہ نہیں۔ گرمیوں میں جرابیں پہننے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے دماغوں میں خلل ضرور آگیا ہے۔ غرض نہ تو ایسی زینت کی ضرورت ہے اور نہ اس قدر میلے کچیلے بنو تو سطر اور تناسب ہر شے میں بہتر ہے۔

خرابیوں کی جڑ

لیجئے جماعت کے اندر تناسب کا حکم ہے کہ صف سیدھی ہو۔ درمیان میں جگہ نہ چھوڑو۔ میں تو یہ

کہتا ہوں کہ شریعت کا کوئی حکم ایسا نہیں کہ جس میں تناسب ملحوظ نہ ہو۔ جب تناسب ہر امر میں مامور بہ ہے تو نماز کے اندر کیوں نہ ہوگا۔ پس تراویح اور غیر تراویح ہر نماز میں تناسب کی رعایت رکھو۔ غرض رات کو رمضان اکثروں کے یہاں نہیں آتا اور اس تمام خرابی کا منشا رمضان کے اسرار اور اس کی روح کا نہ جاننا ہے اس لئے ضروری ہوا کہ تزکیہ کے متعلق مضمون بیان کیا جائے کہ اس کے ضمن میں رمضان کے روزہ کی حکمتیں بھی معلوم ہوں گی۔ پس جاننا چاہیے کہ منشا تمام تر معاصی اور خرابیوں کا دو چیزیں ہیں۔

اول لذت جس کو شہوت بھی کہہ سکتے ہیں دوسرے کبر جس کو غنیمت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ دونوں جڑ ہیں تمام مفسد کی۔ پس ان دونوں سے تزکیہ نفس کا یعنی ان کی تعدیل ضروری ہے شریعت نے ان ہی دو مرضوں سے تزکیہ کیا ہے۔ اور تمام احکام ان ہی کے متعلق ہیں اور سبحان اللہ ایسی خوبی سے معالجہ فرمایا ہے کہ کوئی حکم ان احکام میں ایسا نہیں ہے کہ ہمارے طبعی مذاق اور فطری جذبات سے بعید ہو۔ تمام احکام ایسے ہیں کہ ہماری طبیعت انکو قبول کرتی ہے۔

مجاہدہ اور مواد خبیثہ

حکماء اشراقیین نے بھی اخلاق رذیلہ سے تزکیہ کیا ہے لیکن انہوں نے اس کے لئے ایسے سخت مجاہدے کئے ہیں کہ ہر زمانہ میں انسان ان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ترک لذات کے خاص خاص طریقے مقرر کئے اور ان کی عادت ڈالی اور نفس کو مہذب بنایا۔ اور یہاں تک اس میں کمال پیدا کیا کہ آدمی کی تصویر دیکھ کر بتلا دیا کرتے تھے کہ اس کے اطوار و اخلاق کیا ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ کسی اشراقی کے سامنے کسی حکیم کی تصویر پیش کی گئی اس نے دیکھا اور کہا کہ یہ شخص زانی ہے لوگ قہقہہ لگا کر ہنسے اور کہا بس جناب! آپ کا ادراک معلوم ہو گیا۔ یہ تصویر تو فلاں حکیم کی ہے اور وہ بڑا عقیف و پار سا شخص ہے۔ اشراقی نے کہا کہ اب تو میں نے کہہ دیا ہے خواہ اس کی تصویر ہو یا کسی کی ہو۔ چنانچہ لوگ اس کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ تمہاری نسبت ایسا کہا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ واقعی اس کا تقاضا تو میرے قلب میں بہت ہے لیکن میں نے مجاہدہ ریاضت سے نفس کو قابو میں کر لیا ہے صدور کبھی نہیں ہوا۔ اس تقاضا ہی کا اس کو ادراک ہوا۔ اس لئے کہ قیافہ سے مواد ہی کا ادراک ہو سکتا ہے۔ افعال کا ادراک نہیں ہو سکتا۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجاہدہ سے مواد خبیثہ بالکلیہ زائل نہیں ہو سکتے۔ بلکہ مغلوب

ہو جاتے ہیں۔ سالک کو اس میں بڑا دھوکا ہوتا ہے جب اول ذکر کرتا ہے تو غلبہ ذکر سے مواد مضحل ہو جاتے ہیں تو یہ شخص سمجھتا ہے کہ میرے نفس میں سے وہ مواد جاتے رہے حالانکہ وہ موجود ہیں لیکن چونکہ غلبہ دوسری شے کا ہے اس لئے وہ مد رک نہیں ہوتے اور جب وہ حالت غلبہ کی زائل ہو جاتی ہے اور پھر ان مواد کا ادراک ہوتا ہے تو اپنی حالت پر بہت افسوس کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں مردود ہو گیا ہوں۔ حالانکہ یہ اس کی غلطی تھی وہ کیفیت جو زائل ہو گئی ہے اس کی مثال تو صبح کاذب کی سی ہے اور جو کیفیت اب پیدا ہوئی ہے وہ صبح صادق کے مثل ہے۔ پس جو شخص صبح کاذب کو روشنی سمجھے گا وہ صبح صادق کی طرف ملتفت ہونے سے پہلے ضرور متاسف ہوگا کہ ہائے! وہ روشنی کہاں گئی حالانکہ وہ روشنی نہ تھی روشنی تو اب آئی ہے مولانا فرماتے ہیں۔

اے شدہ تو صبح کاذب رارہین ☆ صبح صادق راز کاذب ہم بہ میں
آپ نے دیکھا ہوگا کہ درختوں پر اول جھوٹا پھول آتا ہے پھر سچا پھول آتا ہے وہ مشر ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کیفیات و حالات کا قصہ ہے کہ اول اول غلبہ ہوتا ہے تو سمجھتا ہے کہ میرے اندر سے امراض جاتے رہے۔ اس کے بعد غلبہ جاتا رہتا ہے اور ایک ہلکی مگر پائیدار کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کی اس کو وقعت نہیں ہوتی اور وہ امراض جن کو یہ زائل سمجھتا ہے مد رک ہوتے ہیں کہ شہوت بھی ہے۔ غضب بھی ہے، بخل بھی ہے، حرص بھی ہے لیکن پہلے میں اور اس وقت میں فرق اس قدر ہوتا ہے کہ پہلے تو ان کے مقتضا پر عمل کرنے سے بچ نہ سکتا تھا اور اب بعد مجاہدہ کے بسہولت بچ سکتا ہے۔

تہذیب نفس

پہلے نفس کو روکتا تھا اور نہ رکتا تھا۔ اور اب رک جاتا ہے بعینہ اس کی مثال شریر گھوڑے کی سی ہے کہ سدھانے سے پہلے تو وہ قابو سے باہر ہو جاتا تھا۔ اور سوار کو پنک (پنچ) دیتا تھا اور بعد شائستہ ہونیکے گوگا ہے شوخی کرتا ہے مگر تاہم قابو سے باہر نہیں ہوتا۔ سوار اس کو جدھر چاہتا ہے موڑ دیتا ہے چون و چرا نہیں کرتا۔ یہی کیفیت نفس کی ہے۔

دوسری شے جس کے تزکیہ کی ضرورت ہے کبر تھی۔ اس کے لئے وہ حکماء اسباب تذلل کو اختیار کیا کرتے تھے اور اس کی اعانت کے واسطے خلوت اور ترک اختلاط کرتے تھے اور اس میں بھی بہت مبالغہ کرتے تھے اور اصل مقصود ان کا صرف یہی تہذیب نفس تھا۔

شریعت نے بھی ان ہی دو خصلتوں کی تعدیل کی ہے اور اس کے لئے طرق ان حکماء کے

ترک سے اسہل اور نفع میں اکمل تجویز کئے ہیں۔ چنانچہ ترک لذات کیلئے تو روزہ مقرر فرمایا جس کی حقیقت ترک اکل و شرب و جماع ہے۔ اس لئے کہ امہات لذات یہی تین چیزیں ہیں۔ جتنی لذات ہیں سب کا حاصل یہی ہے ان کو روک دیا گیا۔ اور سبحان اللہ! کیا رحمت ہے کہ روزہ کو عبادت بنادیا۔ اور اس پر انعام بھی تجویز فرمایا مسہل ہم کو ہمارے امراض کے ازالہ کے لئے دیا جائے اور اس پر انعام بھی تجویز فرمایا۔ پس جب اسباب لذات کو میں دن انسان چھوڑیگا تو نفس کی سرکشی ضرور کم ہوگی۔ اور مادہ عصیاں کا مغلوب ہو جائے گا۔

اور کیا رحمت ہے کہ مجاہدہ کے لئے ہماری عمر کا صرف بارہواں حصہ مقرر فرمایا اور حکماء برسوں ترک لذات سے مجاہدہ کرتے تھے جس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ ضعیف الجسم ہو جاتے تھے اور نسل ان کی منقطع ہو جاتی تھی اور پھر اس میں خوبی یہ رکھی کہ وہ ایک ماہ بھی ایک ہی موسم میں متعین نہیں رکھا کبھی جاڑوں اور کبھی گرمیوں میں آتا ہے تاکہ نرمی اور گرمی سے سب طرح کے مصالح مرعی ہوں۔

غرض! ایسا سہل اور لطیف مجاہدہ اور نفع میں ان کے مجاہدات سے کہیں زیادہ کہ سب کام کرتے رہو اور مجاہدہ بھی ہوتا رہے بجز صاحب وحی کے اور کسی کی عقل یہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔

شریعت کا مقصود

ایک اور رعایت عجیب و غریب یہ رکھی ہے کہ روزہ دن کو مقرر فرمایا۔ تاکہ مجاہدہ کا فائدہ حاصل ہو۔ اس لئے کہ مجاہدہ نام ترک عادت ہے اور کھانے پینے کی عادت اکثروں کو ہے۔ اگر یہ مجاہدہ رات کو ہوتا تو خبر بھی نہ ہوتی نہ کچھ نفس پر شاق ہوتا اور اگر حکماء جنگیہ کی طرح شب و روز کا روزہ ہوتا تو ضعیف ہو کر بالکل بیمار ہو جاتے اور قوی بیکار ہو جاتے اور شریعت کا مقصود قوی شہویہ کا ازالہ نہیں بلکہ ان کی تعدیل ہے۔

نیز رات کو کھانے پینے کی اجازت دینے میں ایک اور دقیق رعایت ہے وہ یہ ہے کہ اس صورت میں مجاہدہ اور مشقت بھی زیادہ ہے کیونکہ بعض لذات کے ایک دم سے چھوڑ دینے میں نفس اسی کا خوگر ہو جاتا ہے۔ بخلاف حالت موجودہ صوم کے کہ اس میں شب کو متلذذ ہونے سے اس کو لذت یاد رہتی ہے اور پھر ترک کرائی جاتی ہے۔ نفس پر یہ زیادہ بھاری ہے۔ یہ وہ مجاہدہ ہے کہ جو حکماء کے باپ کو بھی نہیں سوچھا۔ حکماء نے جو کچھ تجویز کیا تھا وہ بالکل ناتمام تھا شریعت نے اس کی تکمیل فرمائی ہے۔

مجھ کو کچھ ضرورت اس امر کی نہ تھی کہ حکماء کی مجاہدات اور تزکیہ کو میں ذکر کرتا۔ اس لئے کہ شریعت کے مقابلہ میں ان کے خیالات کا تذکرہ ایسا ہی ہے۔ جیسے آفتاب کے سامنے چراغ

کا بلکہ اس سے بھی بدرجہا کم۔ لیکن وجہ ان کے تذکرہ کی یہ ہوئی کہ آجکل عقل پرست مخلوق بہت پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے میں دکھلاتا ہوں کہ روزہ وہ شے ہے کہ جس کی ضرورت کو ائمہ ملیہ نے بھی تسلیم کیا ہے اور جس شخص نے اس کے راز کو سمجھ لیا ہو وہ اس سے دوسری جگہ بھی کام لے گا۔ پس جب کہ آپ حضرات نے روزہ کے حکم و مصالح سمجھ لیے تو اب اس کا بہت اہتمام کرنا چاہیے۔ جو روزہ نہیں رکھتے ان کو رکھنا چاہیے اور جو رکھتے ہیں اور اس کی حقوق کی رعایت نہیں رکھتے ان کو حقوق کی طرف توجہ کرنا چاہیے اور نفس کو اس کے حال پر نہ چھوڑنا چاہیے۔ ایک ماہ کے لئے ہی اس سے صلح کر لو اور سمجھا دو کہ بس ایک ماہ تو اپنی خواہشات سے تائب ہو جا۔ ایک ماہ جب اس سے اس طرح کام لو گے تو ان شاء اللہ کام کرنے کی عادت ہو جائیگی۔

نفس کی مثال

نفس کی مثال بچہ کی سی ہے جس طرف اس کو لگاؤ لگ جاتا ہے۔

والنفس كالعقل ان تهمله سب على حب الرضاع وان تعظمه ينظم

(نفس کی مثال بچہ کی سی ہے اگر دودھ چھوڑاؤ نہیں چھوڑے گا اگر چھڑاؤ گے چھوڑ دے گا)

اس سے کام لے کر دیکھو۔ تم دیکھتے ہو کہ اتنے دنوں سے تم نماز روزہ کرتے ہو لیکن اثر کچھ نہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ لا پرواہی سے کام کرتے ہو۔ یہ نیت نہیں ہے کہ نفس کو ہم عبادت کا خوگر بناویں۔ اب ایک ماہ ہی اس نیت سے کر لو۔ دیکھو تو کیا اثر ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ نے نفقات کے بارہ میں یہی مضمون ارشاد فرمایا ہے ارشاد ہے۔ ومثل الذين ينفقون اموالهم ابتغاء مرضات الله وتثبيتا من انفسهم الخ (اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں کو) اس عمل شاق کا خوگر بنائیں) مال کے خرچ کرنے کی دو جوہات ارشاد فرمائیں۔

اول تو اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کو طلب کرنا۔ دوسرے اپنے نفس کو نیک کام پر جمانا۔

پس اگر ہم اپنے ہر کام میں ان دونوں باتوں کی نیت رکھیں تو ان شاء اللہ ہم کو یہ کہنے کا موقع نہ ہوگا کہ ہم اتنے دنوں سے نماز روزہ کرتے ہیں، دل پر اثر نہیں ہوتا۔ اور اس کا نفع کو دنیا میں بھی ہوگا اور آخرت کیلئے تو یہ اعمال صالح پر استقامت حاصل ہو جائے گی۔ نفس کے اندر رسوخ پیدا ہو جائیگا۔ جس کی نسبت کہا گیا ہے۔ الاستقامت صد فوق الكرامة استقامة اور ثبات بڑی شے ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اسی کی نسبت فرماتی ہیں کان خلقه القرآن یعنی حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کا خلق قرآن تھا یعنی قرآن پر عمل کرنا آپ کا فطری امر تھا۔

اس کے بعد سمجھنا چاہیے کہ بعض بزرگوں نے لکھ دیا ہے کہ نفع روزہ کا اس وقت ہے کہ اور ایام سے کم کھائے ورنہ روزہ کا کوئی نفع نہیں۔ حالانکہ کتاب و سنت میں یہ مضمون کہیں نہیں ملتا۔ اگر روزہ کا نفع اسی پر موقوف ہوتا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ضرور کہیں نہ کہیں فرماتے یا قرآن میں کوئی آیت اس کے متعلق ہوتی۔ بلکہ فرمایا تو یہ فرمایا۔ کُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ۔ (اور کھنا و اور پیو اس وقت تک تم کو سفید خط (نور) صبح صادق کا تمیز ہو جائے۔)

اس لئے کہ کم کھانا کوئی مجاہدہ نہیں بلکہ روزہ سے جو مجاہدہ ہوتا ہے وہ ترک عادت کی وجہ سے ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ پیٹ سے زیادہ نہ کھائے۔

تذلل للخلق

بالخصوص ہمارے زمانہ میں تو کم کھانا مفید کیا مضر ہے۔ اس لئے کہ قوی ہیں کمزور اور نیز تعلق جی بھی حق تعالیٰ کے ساتھ مخلوق کو اس طرح کا نہیں رہا جیسا پہلے تھا۔ اس لئے زیادہ مجاہدہ کرنے میں کئی قسم کی خرابیوں کا اندیشہ ہے اول تو عجب پیدا ہوگا۔ دوسرے یہ شخص اپنے کو مستحق سمجھے گا کہ میں اتنا مجاہدہ کرتا ہوں مجھ کو ضرور کچھ ملنا چاہیے۔

تیسرے ضعف اس قدر ہو جائے گا کہ فرائض میں خلل آنے کا احتمال ہے کم کھانے اور کم پینے کے اندر قرب منحصر نہیں نفس کو تنگ نہ کرو۔ اس سے کام لو۔ اور بعض بزرگوں نے جو نفس کو کافر کہا ہے۔ سو یہ کافر کفر سے نہیں کفران سے ہے۔ خوب کھاؤ پیو اور کام بھی کرو۔

دوسرا ذلیل تھا کبر اس سے جو مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے۔ اس کا حکماء نے یہ علاج کیا ہے کہ اسباب تذلل کو اختیار کرتے تھے ایسے ایسے طریقے ایجاد کئے کہ جس سے لوگ ان کو چھوڑ دیں، ذلیل سمجھیں جو گیوں اور بعض صوفیاء اہل اسلام نے بھی اس طریقہ سے اس مرض کا علاج کیا ہے لیکن شریعت نے ہم کو اس کے خلاف یہ تعلیم فرمایا ہے۔ لَا يَنْبَغِي لِلْمُؤْمِنِ أَنْ يَذُلَّ نَفْسَهُ يَعْنِي مُؤْمِنٌ كُوْنًا سَابِغًا لَا يَنْبَغِي لَهُ أَنْ يَذُلَّ نَفْسَهُ يَعْنِي مُؤْمِنٌ كُوْنًا سَابِغًا لَا يَنْبَغِي لَهُ أَنْ يَذُلَّ نَفْسَهُ

لیکن اس میں ایک بات شبہ کی ہے وہ یہ ہے کہ بڑے کے سامنے تو ہر شخص تذلل اختیار کر لیتا ہے کمال اور تواضع تو یہ ہے کہ اپنے کو چھوٹوں سے بھی ذلیل اور ہیچ سمجھے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ جب خالق کے سامنے اپنا بیچ ہونا پیش نظر ہوگا تو اس کو لازم ہے کہ حق تعالیٰ کی عظمت اس کے قلب میں آئے گی اور جب معرفت و عظمت حق تعالیٰ کی اس کو ہوگی تو چونکہ اپنے نفس کو حاجب اور مانع جانے گا اس لئے سب سے زیادہ بیچ در بیچ اپنے ہی کو جانے گا اور ہر ایک کو اپنے سے بہتر یقین کریگا تو یہ مقصود بدوں اس کے کہ مخلوق کے سامنے ذلت اختیار کرے حاصل ہو جائیگا۔

پس ثابت ہوا کہ اس مقصود کے لئے صرف تذلل للخالق کافی ہے۔ اس تذلل للخالق کے واسطے ہم کو شریعت نے نماز تعلیم فرمائی ہے کہ اس کا خاصا ہے کہ انسان کو اپنا عجز پیش نظر ہو جاتا ہے اس لئے کہ اس میں حکم ہے کہ اشرف الاعضا کو ارذل الاشیاء کے ساتھ ملا حق کرو۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ ظاہر کا اثر باطن پر پڑتا ہے۔ جب یہ شخص اپنے سر کو جو کہ اشرف الاعضاء ہے زمین پر رکھے گا تو ضرور اس کے اندر سے کبر کم ہوگا۔ اور تواضع اور مسکنت پیدا ہوگی نماز کے اندر عجیب خاصیت ہے اور اس کو بڑا دخل ہے حق تعالیٰ کی معرفت اور قرب کے حاصل ہونے میں۔ اور جب حق تعالیٰ کی عظمت پیش نظر ہوگی تو اپنا بیچ ہونا پیش نظر ہو جائے گا اور دوسرے کی طرف التفات بھی نہ ہوگا۔ ایسی مثال ہے جیسے ہاتھی کے سامنے مثلاً دو چیونٹیاں ہوں تو اس کے سامنے ہوتے ہوئے ایک چیونٹی دوسری کو نظر بھی نہ آئے گی۔ یا مثلاً وائسرائے کسی جگہ آجائے تو تحصیلدار بیچارہ دکھائی بھی نہ دے گا۔ اور نہ وہ تحصیلدار کسی دوسرے تحصیلدار کو حقیر یا عظیم سمجھے گا۔

اور پھر ہیئت تذلل ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس کے اندر اپنے ساتھ ہمکاری کی بھی اجازت دی ہے ورنہ اگر یہ حکم ہوتا کہ سر جھکا کر بس کھڑے رہو تو نرا مجاہدہ ہی ہوتا اب مجاہدہ بھی ہے اور لذت بھی اور پھر اول سے آخر تک ایک ہیئت نہیں بنائی بلکہ اس کو مختلف افعال سے مرکب بنایا ہے۔ قیام، رکوع، سجدہ، قومہ، جلسہ، قعدہ تا کہ نشاط رہے۔ اکثر مثلاً سجدہ ہی ہوتا یا رکوع ہی ہوتا تو نفس اکتا جاتا۔ سبحان اللہ! ہمارے مذاق کی کیا رعایت فرمائی ہے بخلاف حکماء کے مجاہدوں کے کہ وہ ایسے سخت سخت مجاہدے کرتے تھے کہ ہر شخص سے وہ نبھ نہیں سکتے۔

ترک لذات کا طریقہ

اب ایک شبہ رہا۔ وہ یہ ہے کہ جب تراویح مجاہدہ ہے تو جیسے رمضان میں مشروع فرمایا اور دنوں میں بھی مقرر فرمادیتے۔ جواب یہ ہے کہ اگر اور دنوں میں نماز نہ ہوتی تو بے شک اس کی شان اسی کو مقتضی تھی کہ فرض ہوتی۔ چنانچہ حدیث میں آیا بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی روز رمضان

میں قیام لیل فرمایا۔ اور تیسرے روز یا چوتھے روز آپ تشریف نہ لائے اور یہ فرمایا کہ مجھے خوف ہوا کہ کہیں یہ فرض نہ ہو جائے اس لئے میں نہیں آیا لیکن اوردنوں میں بھی فرض نمازیں مقرر ہیں جو مجاہدہ کے لئے کافی ہیں۔ اس لئے رمضان ہی میں اس کو رکھا گیا اور سنت موکدہ بنادیا گیا۔ الحاصل ترک لذات کے لئے روزہ اور علاج کبر کے لئے نماز شریعت نے مجاہدہ مقرر فرمائی۔

اب تیسری شے تھے خلوت جو ان کی معین ہے حکماء کے یہاں تو برسوں بلکہ عمر بھر کی خلوت تھی۔ ظاہر ہے کہ اس میں سخت حرج ہے اور تعلقات اور تمدن کی تیغ کٹی ہے۔ شریعت نے سبحان اللہ اس میں عجیب رعایت رکھی ہے صرف دس دن کی خلوت مقرر فرمائی اور اس کا نام اعتکاف رکھا۔ اور اس میں بھی یہ نہیں کیا کہ بالکل کسی سے نہ بولونہ ملو۔ بلکہ اس کا ایسا اچھا طریقہ بتلادیا کہ اس میں خلوت کا جو نفع ہے وہ بھی باقی رہے۔ اور جو لوگ وہاں آئیں ان سے ملنے میں کچھ حرج بھی نہ ہو۔ وہ یہ ہے کہ یہ تعلیم فرمایا کہ اعتکاف مسجد کے سوا اور کہیں جائز نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ مسجد میں اپنے ہم جنس ہی آئیں گے اور بچنا اغیار سے مطلوب ہے۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے خلوت از اغیار نہ از یار پس خلوت ان لوگوں سے ہے جو رہن ہیں دین کے۔ باقی جو دین میں معین ہیں ان کے پاس بیٹھنا تو خلوت سے بہتر ہے ایسی جلوت کو خلوت پر ترجیح ہے۔

مولانا نے عجیب لطیفہ لکھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ اے عزیز! تو جو خلوت کو مطلقاً جلوت پر ترجیح دیتا ہے اور اس کے فضائل بیان کرتا ہے یہ بھی تو تجھ کو جلوت کی ہی بدولت علم ہوا ہے پھر وہ جلوت پر مطلقاً کیسے رائج ہو سکتی ہے۔ پھر وہ دس دن کا اعتکاف ایسے دنوں میں رکھا ہے کہ اس عشرہ میں ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے یعنی ہزار مہینے اگر ریاضت مجاہدہ کرے تو وہ بات نصیب نہیں ہوتی جو اس ایک رات میں ہو جاتی ہے۔

تو دیکھئے! خلوت کے ایام گو کم تھے مگر اس کا تذکرہ اس طرح کر دیا گیا۔ یہ محض تائید غیبی ہے اور نوروحی سے ہی اس کا ادراک ہو سکتا ہے حکماء کو یہاں تک کہاں رسائی ہو سکتی ہے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت ہے کہ ہم کو ایسا راستہ بتلایا کہ جو بہت آسان اور نفع میں سب راہوں سے بڑھ کر ہے۔

پھر صاحبو! غضب ہے کہ ہم اس کی قدر نہ کریں اور اس سے منتفع نہ ہوں یہ طریقہ ہے جس سے تزکیہ نفس و تہذیب نفس ہوتی ہے اور جس پر فلاح کا وعدہ ہے۔

اب اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہم کو توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

التہذیب

مجاہدات شرعیہ کے متعلق یہ وعظ ۲۸ رمضان ۱۳۳۲ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر فرمایا جو ساڑھے تین گھنٹہ میں ختم ہوا۔
محمد عبداللہ گنگوہی صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِیْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْهِ
وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا
مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلِّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ
لَا شَرِیْكَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنْ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ صَلَّى
اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهِ وَاَصْحَابِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ. اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ
بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر ولتکملوا العدة ولتکبروا
اللہ علی ماہدکم ولعلکم تشکرون. (البقرہ: ۱۸۵)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ (احکام میں) آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے
ساتھ (احکام قوانین مقرر ہیں) دشواری منظور نہیں تاکہ تم لوگ ایام قضاء کی شمار کی
تکمیل کر لیا کرو (کہ ثواب میں کمی نہ رہے) اور تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی بزرگی (وثناء)
بیان کرو اس پر کہ تم کو (ایک ایسا) طریقہ بتلادیا جس سے تم برکات صیام رمضان
سے محروم نہ رہو گے اور تاکہ تم لوگ (اس نعمت کا) شکریہ ادا کیا کرو۔

مجاہدہ کی اہمیت

یہ ایک آیت ہے جو متعلق ہے صیام کے۔ اس کے قبل چند جمعوں میں روزہ، تراویح،
اعتکاف اور ان کے اسرار و احکام و حقوق و آداب و خواص مع ان کے شعب و متعلقات کے ذکر کئے
گئے ہیں جن کا حاصل تھا مجاہدہ کہ حق جل و علا شانہ نے نفس کے قویٰ منکسر کرنے کے لئے
چند مجاہدات کی تعلیم کی ہے اور وہ مجاہدات تمام قوموں کے مجاہدات سے ممتاز ہیں اور یہ مجاہدات

ہمارے ہی نفع اور مصالح کیلئے ہیں کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم پر بڑا بار ڈالا گیا ہے۔ مجاہدہ تو وہ شے ہے کہ ہر سلیم المرزاج اس کی طرف راغب ہے بلکہ جو مجاہدہ نہیں کرتے ہیں وہ بھی اس کو پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ تمام فساق و فجار مجاہدہ سے خود تو محترز ہیں مگر اس کے ساتھ ہی اہل مجاہدہ کو محبوب رکھتے ہیں۔ جس شخص کو وہ دیکھتے ہیں کہ زاہد ہے، تارک ہے بالطبع اس کی طرف ان کو بھی میلان ہوتا ہے۔ دنیا دار کیسا ہی دنیا دار ہو جب وہ لڑے گا طالب دنیا سے لڑے گا۔ تارک دنیا سے نہ لڑے گا۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے صرف یہ وجہ ہے کہ اس کو یہ خیال ہے کہ یہ شخص دنیا کا تارک ہے اس خیال نے اس کے سب خیالات کو پست کر دیا ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ دنیا سے خدا کو بغض ہے اس کا اثر ایسا عام ہے کہ جبین دنیا کے قلوب میں بھی اس کا اثر ہے۔ اگر دنیا کی محبت اچھی شے ہوتی تو ایک محبت دوسرے محبت سے ضرور محبت کرتا۔ لیکن یہ بات نہیں۔ بلکہ آپس میں لڑتے ہیں کٹتے ہیں مرتے ہیں۔

بہر حال زہد فی الدنیا بالطبع مرغوب ہے اور تارک تعلقات سے اول تو محبت ہی ہوتی ہے اور اگر محبت نہ بھی ہو تو بغض تو ہرگز نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طلب دنیا ایسی شے ہے کہ اس کے برے ہونے پر سب کا اتفاق ہے اور ترک دنیا ایسی محبوب شے ہے کہ اس کی محبوبیت پر سب کا اتفاق ہے۔ اسی واسطے اس کا تھوڑا بہت رواج ہر قوم میں ہے۔ عیسائی، ہندو جو کہ منکرین اسلام ہیں وہ بھی اس کو ضروری جانتے ہیں۔ چنانچہ تہذیب اخلاق میں ان کی کتابیں موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ تہذیب اخلاق بدوں نفس کشی کے ہو نہیں سکتی۔ کیونکہ نفس کے موافق کرنے سے بھی تو بہت سی بد اخلاقیات صادر ہوتی ہیں۔

مثلاً ایک شخص ہے اس کا جی چاہا کہ فلاں عورت کے پاس جائے تو اگر وہ نفس کو نہیں روکے گا اور خلاف نفس کے نہ کرے گا تو یہ فعل اس سے صادر ہو جائیگا جو کہ تمام ملل میں مذموم و مبغوض و مٹھی عنہ ہے۔ حکماء میں مجاہدہ ہونے کی ایک حکایت یاد آئی ایک شخص حکیم نے دوسرے یونانی حکیم کی تصویر دیکھ کر یہ کہا تھا کہ علم قیافہ کی رو سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ شخص زانی ہے لوگوں نے کہا کہ یہ تو فلاں حکیم کی تصویر ہے۔ اس کو ندامت ہوئی مگر اس نے کہا کہ کسی کی ہو ضرور اس شخص کے اندر یہ عیب ہے۔ لوگوں نے جا کر اس حکیم سے کہا کہ ایک شخص تمہاری نسبت ایسا کہتا ہے سچے لوگ تھے اس نے کہا کہ وہ سچ کہتا ہے میرے اندر مادہ اس فعل خبیث کا ہے لیکن میں مجاہدہ کرتا ہوں

اور نفس کو مغلوب کرتا ہوں۔ اس لئے عمر بھر میں صدور اس فعل کا کبھی نہیں ہوا۔ تو باوجود ایمان نہ لانے کے ان لوگوں نے نفس کی اتنی بڑی مخالفت کی کہ عمر بھر صدور اس کا نہ ہونے دیا۔

غرض! مجاہدہ وہ شے ہے کہ اس کی پسندیدگی تمام اہل مذاہب کے اندر مسلم ہے بلکہ دہری بھی کسی قدر مجاہدہ ضرور کرے گا۔ بغیر اس کے اس کو بھی چارہ نہیں ہے اگرچہ مقصود اس کا دنیا ہو۔ مثلاً اس کو کسی پر غصہ آیا اور جانتا ہے کہ اگر میں اپنے غصہ جاری کروں گا تو خود مجھ کو یہ شخص ضرر پہنچائے گا تو ایسے موقع پر وہ ضبط سے کام لے گا۔ اور نفس کو روکے گا۔ غرض مجاہدہ کی ہر قوم اور ہر اہل مذہب بلکہ ہر شخص کو ضرورت ہے اور دین میں تو ضرورت ہے ہی۔ دنیا میں بھی ضرورت ہے۔

ماہ رمضان اور ایام شماری

باقی شریعت مقدسہ نے جو مجاہدات ہم کو تعلیم کئے ہیں ان کے جو امتیازات ہیں اور جو ان کے خواص و آثار ہیں وہ کسی قوم اور کسی حکیم و فلسفی کے مجاہدہ میں نہیں ہیں۔ اہل مجاہدہ کی نظر جہاں تک نہ پہنچتی تھی وہاں تک کی شریعت مقدسہ نے رعایت کی ہے ان خواص و حکم اسرار کو بہت مختصر طور سے گزشتہ جمعوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اب موقع اسکا ہے کہ ان مجاہدات کے خاتمہ کا بیان کر دیا جائے کہ یہ بھی قابل اہتمام ہے اور آج رمضان المبارک کا جمعہ اخیرہ بھی ہے اس لئے ان بیانون کا خاتمہ بھی اس جمعہ کو ہو تو بہتر ہے۔

باقی درمیان میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے گو میرے موضوع کے خلاف ہے کہ اس جمعہ کے لئے یہ صفت تو صحیح اور واقعی ہے کہ یہ جمعہ اخیرہ ہے۔ باقی جو خصوصیات زائدہ لوگوں نے اپنی طرف سے اس میں بڑھائی ہیں ان کا کہیں پتہ و نشان تک نہیں ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ جو بات قابل اعتناء و اہتمام کے ہے اس کی طرف تو التفات تک نہیں اور زائدہ تصنیف کر لیے۔

منجملہ ان کے ایک یہ خاصہ مشہور ہے کہ آخری جمعہ کو جس قدر نئے کپڑے پہن لو اس کا کوئی حساب و کتاب نہ ہوگا جواب یہ ہے ہاتھ ابرہانکم ان کنتم صدقین۔

ایک خاصہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس دن جو خطبہ پڑھا جائے اس میں وداع کا مضمون اور اس قسم کا مضمون جس سے اظہار تاسف و حزن ہو ہونا چاہیے۔ جناب! دل ہی جانتا ہوگا کہ کیسا کچھ افسوس ہے۔ ابھی دل میں انگلیں اور شوق لگ رہا ہے کہ جلدی سے رمضان ختم ہو تو سویاں اور چھوہارے کھائیں اور دل میں کہتے ہوں گے کہ خدا کا شکر ہے کہ یہ بوجھ اتر ا۔ دل میں تو خوشی پھر منہ بسورتا تکلف ہی ہے

اور امتحان اس کا یہ ہے کہ اگر تم کو غم ہی ہے اور اللہ تعالیٰ کسی ذریعہ سے یہ حکم بھیج دیں کہ میرے بندوں کو رمضان کے جانے سے بہت غم ہے اچھا ایک ماہ کے روزے اور ہم فرض کرتے ہیں تو جناب ابھی سب کے منہ خشک ہو جائیں۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ رمضان بھر تو ایام شکاری رہتی ہے کہ آج اتنے روزے ہوئے اتنے باقی ہیں۔ اور یہ تو عابدوں اور زاہدوں کی کیفیت ہے۔

یاد رکھو! جو بات دل میں ہو اسی کو ظاہر کرنا چاہیے۔ ورنہ ہم بے چارے تو کس قطار میں ہیں صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس پر باز پرس ہو گئی ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم، غزوہ بدر کے بعد تمنا کیا کرتے تھے کہ کاش کوئی دن مثل بدر کے ہو اس میں ہم دشمن سے مقابلہ کریں جب غزوہ احد ہوا تو اس میں ہزیمت ہوئی اور بعض صحابہؓ سے کچھ غلطی اجتہادی بھی ہوئی جس کا بڑا قصہ ہے تو اس پر حق تعالیٰ ان کو متنبہ فرماتے ہیں۔

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمْنُونَ الْوَيْلَ مِنَ الْمَوْتِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ.
”یعنی تم لوگ موت کی لقاء سے پہلے اس کی تمنا کیا کرتے تھے اب تو تم نے اس کو دیکھ لیا۔
اور تم اس کو دیکھ رہے ہو۔“ جب صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس پر تنبیہ ہوئی تو ہمارا کیا منہ ہے۔
آرزو میخو ایک اندازہ خواہ ☆ برتا بدگوہ را یک برگ کاہ

(آرزو اتنی چاہئے جتنا کہ ضرورت ہے جس طرح کہ ایک گھاس کا تنکا بھی پہاڑ کی چوٹی کیلئے کافی ہوتا ہے)

روزہ دار کی خوشیاں

ہم کو چاہیے کہ سنبھل کر بولیں ہم ضعیف ہیں ہم کو چاہیے کہ یوں کہیں کہ الہی شکر ہے ہم سے یہ عبادت جس طرح بنی ادا ہو گئی۔ اب آپ اس کو قبول کیجئے۔ افسوس اور رنج وغیرہ کا خلاف واقعہ اظہار نہ کرو اور کچھ رنج بھی ہو تو اس پر مسرت اس قدر غالب ہے کہ وہ رنج قابل اعتبار نہیں ہے اور وہ مسرت یہ ہے کہ غنیمت ہے کہ روزہ ہمارا بیچ میں ٹوٹا نہیں۔ خیر و عافیت سے سب پورے ہو گئے۔ بجائے رنج کے خوش ہونا چاہیے اور خدا جانے یہ رنج کس نے اختراع کر لیا ہے۔ روزے کے ختم پر تو ہم کو تعلیم کی گئی ہے چنانچہ ارشاد ہے: لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ فَرْحَةٌ عِنْدَ الْإِفْطَارِ وَفَرْحَةٌ عِنْدَ الْإِقْلَاءِ رَبِّهِ” یعنی روزہ کی دو خوشیاں ہوتی ہیں ایک خوشی تو افطار کے وقت اور دوسری اپنے پروردگار کے ملنے کے وقت۔“

اگر ہمارے دعوؤں کی رعایت ہوتی تو بجائے فرحت کے افسوس ظاہر کیا جاتا اس لئے کہ

جو ست ہے اس رنج کی یعنی رمضان المبارک کا رخصت ہونا اس کا کچھ حصہ افطار کے وقت بھی ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ ایک دن اور کم ہو گیا۔ لیکن یہ نہیں فرمایا گیا۔ بلکہ خوشی کی خبر دی گئی۔

راز اس میں یہ ہے کہ روزہ فرض ہے اور تراویح اور تہجد جو شب کی عبادات ہیں وہ سنت ہیں۔ اور یہ مسلم ہے کہ جس قدر قرب ادائے فرض سے ہوتا ہے اس قدر ادائے سنت و نوافل سے نہیں ہوتا۔ تو اس کا مقتضایہ تھا کہ جب روزہ تمام ہو تو ہم کو رنج ہونا چاہیے تھا کہ افسوس ایک رات تک ہم روزہ کے برکات سے محروم رہیں گے کیونکہ رات کو روزہ نہیں ہوتا۔ پس اس خیال کے رفع کرنے کے لئے ہم کو تعلیم فرماتے ہیں فرحت کی۔

باقی جو خوشی ہم کو افطار کے وقت ہوتی ہے دیکھنے کی یہ بات ہے کہ کون سی خوشی کی خبر دی گئی ہے اور کس بات کی خوشی کی خبر ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ دو قسم کی خوشی ہوتی ہے۔ ہم کو اس کی خوشی ہوتی ہے کہ اب کھانے کا وقت آ گیا ہے پھلکیاں کھائیں گے اور جلیبیاں کھائیں گے اور جو اللہ والے ہیں ان کو یہ خوشی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری عبادت کو محفوظ رکھا اور بخیریت روزہ ختم ہو گیا۔

بہر حال خواہ کسی قسم کی خوشی ہو سب محمود و مطلوب ہے۔ باقی رنج کے مطلوب ہونے کی تو کوئی دلیل نہیں ہے۔ بہر حال رنج نہ واقع ہے اور نہ اس کی کوئی اصل ہے پس تا سفا اور رنج کرنا اور خطبہ میں الوداع الوداع یا شہر رمضان پڑھنا بالکل بے اصل ہے۔

ہاں رمضان المبارک کے آنے سے پہلے کا تو ایک خطبہ خاصہ منقول ہے چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ شعبان کے جمعہ اخیرہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ پڑھا جس میں فرمایا یا ایہا الناس قد اظلمکم شہر عظیم الخ (اے لوگو تم پر ایک عظیم المرتبت مہینہ سایہ فگن ہونے والا ہے) پس رمضان کے آنے کی خوشی تو ظاہر فرمائی ہے مگر جانے کا غم ظاہر کرنا اور خطبہ و دعا پڑھنا کہیں منقول نہیں۔

یہ سب تقریر جملہ معترضہ کے طور پر آخری جمعہ کے متعلق تھی۔ مقصود تو میرا یہ ہے کہ یہ آخری جمعہ ہے اور آخری جمعہ کو یہ ضرور ہے کہ رمضان ایک ہفتہ سے کم رہ جاتا ہے چنانچہ آج ۲۸ تاریخ ہے۔ اور ہاں باقتضاء وقت یہ بھی بتادینا ضرور ہے کہ ۲۸ تاریخ کو سورج گرہن تخمیناً پانچ بجے سے شروع ہو جائے گا۔ حدیثوں میں ایسے وقت نماز آئی ہے جس کا لقب صلوٰۃ الکسوف ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی پڑھی ہے جس میں قراءۃ، سجدہ، رکوع طویل تھا۔ مگر وقت بہت کم اور نازک ہے اور نیز احتمال ہے کہ عصر کا بعد ہو جائے اسلئے نوافل اس وقت مکروہ ہیں۔ اس لئے بجائے نوافل کے ذکر میں مشغول ہونا چاہیے۔ لوگوں نے جس طرح جمعہ اخیرہ رمضان کے کچھ خواص تراشے ہیں۔

ہمارے توہمات

ایسے ہی سورج گرہن کے بھی اپنی طرف سے کچھ احکام مقرر کئے ہیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ سورج گرہن کے وقت کھانا نہ کھاؤ۔ اصل تو اس کی یہ تھی کہ وہ وقت جب مشغولی مع اللہ اکبر اور ذکر کا ہے تو ظاہر ہے کہ کھانا خود ہی اس وقت ترک ہو جائے گا لیکن ذکر اللہ اور نوافل کو تو لوگوں نے اڑا دیا۔ اب بجائے اس کے بیکار بیٹھے رہیں گے۔ شطرنج اور گنجدھ کیلیں گے مگر اتنی توفیق نہ ہوگی کہ اللہ کی یاد کریں۔ اسی طرح جب کوئی محلہ میں مرجاتا ہے تو مشہور ہے کہ کھانا کھانا جائز نہیں۔ دنیا بھر کے سب کام جائز مگر کھانا ناجائز نہیں۔ غیبتیں کریں گے، دغا بازی کی گفتگو کریں گے ہاں کھانا نہ کھائیں گے۔

اس کی اصل یہ تھی کہ ایسے وقت جب کہ اپنے پاس والوں کو غم ہو اور خود اپنے کو بھی ہوتا ہے تو کھانا کھانا طبعاً مکروہ ہے شرعاً مکروہ نہیں۔ لیکن جب دنیا بھر کے قصے اور گناہ تک تو کریں تو کھانا جو کہ فی نفسہ مباح ہے اس سے کیوں احتراز کیا جائے۔

ایسے ہی یہ بھی مشہور ہے کہ عصر اور مغرب کے درمیان کھانا نہ کھاؤ۔ اصل تو اس کی یہ تھی کہ وہ وقت فضیلت کا ہے اور اکثر بزرگوں کی عادت رہی ہے کہ عصر کے بعد سے مغرب تک ذکر اللہ میں مشغول رہے ہیں۔ جب ان کو عام لوگوں نے مشغول دیکھا تو اس سے یہ سمجھا کہ اس وقت کھانا کھانا ممنوع ہے اور جب اس کی یہ تراشی ہے کہ مرتے وقت عصر کا وقت نظر آتا ہے اور شیطان مرنے کے وقت پیشاب کا پیالہ لاتا ہے اور اس شخص کو پیاس بہت ہوتی ہے۔ تو اگر اس وقت کھانے پینے کی عادت ہوگی۔ تو یہ شخص پی جائے گا۔

نعوذ باللہ! بالکل غلط اور جھوٹ بات ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو بہت چھوٹی چھوٹی باتیں جن سے ادنیٰ سے ضرر دینی بلکہ اکثر دنیوی کا احتمال بھی ہوا ہے وہ بتلائی ہیں۔ چہ جائیکہ اتنا بڑا نقصان عظیم جس شے سے لازم آتا ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو منع نہ کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک ہم کو منع فرمایا ہے کہ ایک پاؤں میں جوتی پہن کر مت چلو۔ اس لئے کہ اس طرح چلنے سے احتمال گر جانے کا ہے۔ پس جو پیغمبر اتنے بڑے شفیق ہوں کیا وہ ایسے عمل سے منع نہ کریں گے جس کے اختیار کر لینے سے شیطان کے پیشاب پینے کا احتمال ہو۔ بالکل غلط ہے ہاں اتنا آیا ہے کہ قبر میں جب سوال ہوتا ہے تو مثلث لہ الشمس یعنی دھوپ نکلی ہوئی اس کو نظر آتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ مجھے نماز کو دیر ہوتی ہے۔ میں نماز پڑھ لوں۔ باقی مرنے کے وقت پاس دکھائی دینا نہیں آیا ہے۔ اور اگر

بالفرض ایسا ہو بھی تو وجہ اس کی یہ ہو سکتی ہے کہ چونکہ اس کی عمر کا خاتمہ ہو گیا ہے اس لئے اگر اس کو دن بھی ختم ہوتا ہوا نظر آتا ہو کچھ تعجب نہیں۔ لیکن یہ پیشاب پینے کا مضمون قابل اعتبار نہیں ہے۔

اگر کہا جائے کہ ہم نے خوب دیکھا ہے کہ مرتے وقت لوگوں نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے تو جناب خدا خیر کرے ہم نے ایسے مردے بھی دیکھے ہیں کہ جنہوں نے بیان کیا کہ ہم مر گئے تھے اور جب ہماری جان فرشتے لے گئے تو ہم نے دیکھا کہ ایک بڑھا سا آدمی بیٹھا ہوا ہے اور اس کے سامنے ایک رجسٹر کھلا ہوا رکھا ہے اس نے اس میں دیکھ بھال کر کہا کہ اس کو ہم نے نہیں بلایا وہ دوسرا شخص ہے۔ اس لئے واپس کر دیئے گئے چنانچہ وہ زندہ ہو گئے۔

اس حکایت سے لازم آتا ہے کہ عزرائیل علیہ السلام غلطی کرتے ہیں اور اگر عزرائیل علیہ السلام غلطی کرتے ہیں تو ان میں جبرائیل علیہ السلام میں کچھ فرق نہیں وہ بھی ضرور غلطی کرتے ہوں گے اور جب کسی کے مارنے میں غلطی کی تو کسی شے کے پہنچانے میں بھی غلطی کا احتمال ہے اور جی بھی ایک شے ہے۔ اس کے پہنچانے میں جبرائیل علیہ السلام نے ضرور احتمال ہے کہ شاید غلطی کی ہو۔ جناب ایسے احتمالات سے تو قرآن سے بھی نعوذ باللہ ایماں اٹھا جاتا ہے۔ اور غالی شیعوں کا مذہب حق معلوم ہوتا ہے کہ ”جبرائیل غلط کردہ و مقصود علی بود“ (حضرت جبرائیل علیہ السلام نے غلطی کی ورنہ مقصود حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے نعوذ باللہ)

توبہ کرو ایسے قصوں سے یہ سب دماغ کا تصرف ہے۔ دماغ میں جیسے خیالات گھومتے ہیں اسی قسم کے نظروں کے سامنے متحمل ہو جاتے ہیں۔ باقی فرشتوں سے غلطی اور خطا کا احتمال نہیں ہے جس کی موت آتی ہے اور جس کی نسبت حکم ہوتا ہے اسی کی جان قبض کرتے ہیں۔ یہ احتمال نہیں کہ دوسرے کی جان قبض کر لیں چنانچہ صاف ارشاد ہے:

حتى اذا جاء احدكم الموت توفته رسلنا وهم لا يفرطون

”یعنی یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے فرشتے اس کی جان لیتے ہیں اور وہ اس میں تقصیر نہیں کرتے“۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے جس سے عموماً معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی کسی کے حکم کے خلاف نہیں کرتے۔ لا یسبقونہ بالقول وهم بامرہ یعملون غضب کی بات ہے کہ قرآن کا انکار عقل کے خلاف ایسے امور کا اعتقاد کر لیتے ہیں۔ پس اگر یہ قصہ صحیح بھی ہو تو یہ قوت تخیل کا تصرف ہے۔

شیطان اور مومن

اگر فرض کر لیا جائے کہ شیطان اس وقت پیشاب کا پیالہ لئے ہوئے نظر بھی آتا ہو تب بھی اس وقت کھانے پینے کی عادت سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس پیشاب کو پی لے۔ اس لئے کہ مرنے کے وقت مردہ کو عالم آخرت کا انکشاف ہو جاتا ہے اور یہ قصہ اگر ہو بھی تو اس عالم کا نہ ہوگا۔ بلکہ ایک برزخی واقعہ ہوگا اور اس عالم کے خواص و عادات اس عالم میں موثر نہیں ہیں۔ ہاں عبادات بھابھے شک موثر ہیں جیسا حدیث میں ہے دعونی اصلی (مجھے چھوڑو میں نماز پڑھ لوں) اور اگر اس سے بھی قطع نظر کی جائے تب بھی شیطان پیشاب نہیں پلا سکتا۔ اس لئے۔

دشمن چہ کند چو مہربان باشد دوست (شیطان کا داؤ مخلصین پر نہیں چلتا)

حق تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

انه ليس له سلطان على الذين امنوا و على ربهم يتوكلون (النحل: ۹۹)

سلطان نکرہ ہے تحت میں نفی کے آرہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنین متوکلین پر اس کا بالکل قابو نہیں چلتا۔ بلکہ اس وقت مومنین پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور وہ تسلی کرتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے: ان الذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا تتنزل عليهم الملائكة ان لا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنة التي كنتم توعدون نحن اولياءكم في الحياة الدنيا وفي الآخرة ولكم فيها ما تشتهي أنفسكم ولكم فيها ما تدعون نزلا من غفور رحيم۔ ”یعنی بے شک وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے اور اس پر جم گئے ان پر فرشتے اترتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ تم مت ڈرو اور مت غمگین ہو اور جس جنت کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا اس سے خوش ہو ہم تمہارے دوست ہیں دنیوی زندگی میں اور آخرت میں اور تمہارے لئے آخرت میں وہ چیزیں ہیں جن کو تمہارے چچی چاہتے ہیں اور تمہارے لئے وہاں وہ ہے جس کو تم مانگو (یہ سب) مہمانی سے غفور الرحیم کی طرف سے۔

اور نیز وہ وقت چونکہ اس شخص پر بہت سخت ہوتا ہے اس لئے اس وقت ضرور رحمت حق متوجہ ہوتی ہے چنانچہ ارشاد ہے انا عند المنكسرة قلوبهم (میں ٹوٹے ہوئے دلوں کے ساتھ ہوتا ہوں) اور مولانا فرماتے ہیں۔

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود ☆ ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

ہر کجا رنج شفا آنجا رود ☆ ہر کجا دردے دوا آنجا رود
(جہاں کہیں پستی ہوتی ہے وہیں پانی جاتا ہے جہاں مشکل ہوتی ہے وہیں اس کا حل ہوتا ہے۔ جہاں رنج ہوتا ہے وہیں شفا ہوتی ہے، جہاں درد ہوتا ہے وہیں اس کی دوا ہوتی ہے) پس اور فرماتے ہیں۔

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ ☆ جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ
(اپنے دل اور فہم کو گستاخ کر لینا یہ صحیح راستہ نہیں بلکہ شکستہ ہو جانا ہی بادشاہ کے مہربانوں کے حاصل کرنے کی دلیل ہے)

ایک قصہ منقول ہے ایک نبی علیہ السلام کا چند قبور پر گزر رہا تھا۔ دیکھا کہ مردے قبور میں معذب ہیں جہاں تشریف لے جا رہے تھے جب وہاں سے واپس ہوئے تو دیکھا رحمت ہو رہی ہے حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے اللہ! اس وقت تو میں نے ان کو مبتلاء عذاب دیکھا تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مرنے کے بعد ان سے کوئی عمل صادر نہیں ہوا۔ پھر کیا وجہ رحمت کی ہوئی؟ ارشاد ہوا کہ ان کے کفن گل گئے ان کی ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو گئیں اس لئے ہم کو رحم آیا کہ ان پر کیا عذاب کیا جائے جب کہ ان پر رحمت ہوئی تو قلوب شکستہ پر تو ضرور ہی رحمت ہوتی ہے۔

غرض وہ وقت رحمت کا ہے۔ شیطان کا داؤ وہاں نہیں چلتا۔ پھر یہ کہ اگر اس وقت حواس باقی ہیں تو جان بوجھ کر پیشاب کیوں پیوے گا۔ اور حواس جاتے رہے اور اس حالت میں شیطان کا پیشاب بھی پی لیا تو حرج کیا ہوا۔ اس سے ایمان میں کچھ خلل نہیں۔ شیطان کے اندر جزو ناری زیادہ ہے اس کا پیشاب آدمی کے پیشاب سے تو بہر حال نجاست میں کم ہوگا۔ اس وقت تو اگر آدمی کا پیشاب بھی پی لے تو ایمان میں خلل نہیں آتا بلکہ ایک حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کا پیشاب کوئی ذی جرم نجس بھی نہیں۔

چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص صبح تک سوتا رہے تو شیطان اس کے کان میں پیشاب کر دیتا ہے اور یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ کان کو پاک کیا کرو۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی ذی جرم نجس چیز نہیں ہے۔ غرض یہ بالکل بے جوڑ اور بے اصل بات ہے۔

سلب ایمان

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ مرنے کے وقت اگر رحمت ہوتی ہے تو اس کا کیا مطلب جو بکثرت سنا

ہے کہ مرتے وقت بعضوں کا ایمان مسلوب ہو جاتا ہے۔ یاد رکھو! پریشانی اور بدحواسی کی حالت میں کسی کا ایمان سلب نہیں ہوتا۔ ایمان مثل ایک قلعہ مضبوط کے ہے وہ ایسے سیلابوں سے شکستہ نہیں ہوتا یہ ہرگز نہیں کہ مرنے کے وقت بلا اختیار ایمان سلب ہو جائے ہاں پہلے سے جو لوگ مسلوب الایمان ہیں زندگی میں اور دنیا کے کاموں میں ان کو اپنی بے حسی سے اپنا مسلوب الایمان ہونا منکشف نہیں ہوتا۔ اور مرنے کے وقت چونکہ ظہور حقائق کا وقت ہوتا ہے اس لئے اس کو اس کا علم ہوتا ہے اسی لئے مجازاً کہہ دیا جاتا ہے کہ فلاں مسلوب الایمان ہو کر دنیا سے گیا ہے۔

یہ جو مشہور ہے کہ مردہ کے پاس صرف الا اللہ پڑھنا چاہیے لا الہ الا اللہ کے ساتھ نہ ملاوے اس لئے کہ اگر لا الہ پر دم نکل گیا تو بے ایمان مریگا کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ کوئی معبود نہیں ہے تو اس سے حق تعالیٰ کی معبودیت کی نفی بھی ہو گئی اور یہ کفر ہے۔

یہ بھی بالکل بے اصل اور خلاف عقل ہے اس لئے کہ اگر لا الہ پر خاتمہ ہو گیا اور دل میں اس کے تھا کہ الا اللہ بھی کہوں گا تو کفر کہاں لازم آیا۔ اللہ تعالیٰ تو دل کو ہی دیکھتے ہیں اور نیز ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ لا الہ کہنے نہ پایا۔ اس کو اس قدر وقت ہی نہ ملا۔ باقی یہ ظاہر ہے کہ توحید اس کے ذہن میں پہلے سے تھی۔

مابروں رائنکریم وقال را ☆ مادروں رائنکریم وحال را
(ہم کسی شخص کی ظاہری حالت اور اس کی گفتگو کو نہیں دیکھتے بلکہ ہم اس کی اندرونی کیفیت اور حالت کو دیکھتے ہیں)

توبہ کی اہمیت

یہاں توفیق نام تمام عبارت ہی تھی وہاں تو یہ حال ہے کہ اگر کوئی شخص مرتا سر غلط کہہ ڈالے اور دل میں نہ ہو تو کچھ حرج نہیں اور اس کے ایمان میں ذرہ برابر فرق نہیں ہے۔

حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ حق تعالیٰ کو اپنے بندے کے توبہ کرنے پر اس شخص سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ اس کا اونٹ راہ میں گم ہو جائے اور تمام سامان کھانے پینے کا اسی پر ہو، اور وہ پریشان ہو کر اس کو ڈھونڈتا ہے اور جب ناامید ہو گیا تو ایک درخت کے نیچے تھک کر اور اپنی جان سے مایوس ہو کر لیٹ رہا اور اسی حالت میں اس کو نیند سی آ گئی جب آنکھ کھلی تو دیکھا اونٹ کھڑا ہے تو جوش مسرت کے ساتھ کہتا ہے اللھم انت عبدوانا ربک اخطاء من شدۃ الفرح یعنی اے اللہ! تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ شدت خوشی کی وجہ سے بہک گیا۔

دیکھو! اس نے کلمہ کہا لیکن چونکہ نہ اس کے دل میں تھا اور نہ زبان سے قصد کہنے کا رکھنا تھا۔ خدا تعالیٰ کی نعمت پر خوشی کے جوش میں زبان بچل گئی۔ اس لئے کچھ کچھ مواخذہ نہیں اور نہ اس کے ایمان میں کچھ فرق آیا۔ ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے نقل کے وقت انکار فرماتے۔

محبت اور ادب

اور لیجئے۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک بزرگ تھے برخ نام۔ موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ بارش کے لئے ان سے دعا کراؤ۔ وہ بزرگ مقام ناز و احلال میں تھے۔ ان سے جب دعا کیلئے کہا گیا تو انہوں نے جو کلمات کہے ہیں اگر کوئی اور شخص کہہ دے۔ تو سخت بے ادبی ہے۔ جنت میں بھی بعض لوگ ایسے کلمات کہیں گے کہ وہ بظاہر بے ادبی ہے لیکن چونکہ دل میں بے ادبی کا قصد نہیں اس لئے کچھ مضرب نہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ سب سے آخر جو شخص دوزخ سے نکلے گا اس سے کہا جائیگا تجھ کو دنیا اور دنیا سے کئی حصے زیادہ جنت میں جگہ دی گئی وہ عرض کرے گا۔

اتستہزیئ منی وانت رب العلمین۔

یعنی کیا آپ مجھ سے ٹھٹھا کرتے ہیں حالانکہ آپ رب العالمین ہیں۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر ہنسی آگئی۔

اور لیجئے! افک کے قصہ میں جب حضرت عائشہؓ کی برات نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابشری یا عائشہ! فقد براك الله یعنی خوش ہواے عائشہ! اللہ تعالیٰ نے تم کو بری کر دیا۔ اس پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اے عائشہؓ گھڑی ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شکریہ ادا کرو۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شکریہ کیوں کروں میں تو اپنے اللہ کی حمد بیان کروں۔

دیکھئے! بظاہر تو یہ کلمہ بے ادبی کا ہے لیکن حقیقت اور منشا اس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے۔ حضرت عائشہؓ کا قلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا محبت سے لبریز تھا اور جیسے محبوب ناز کیا کرتا ہے کبھی محبت بھی کرتا ہے۔ لیکن ہر شخص کا حوصلہ نہیں ہے کہ ایسی بات کہے یا جی میں لائے۔ اس لئے کہ۔

نازاراروئے نباید ہنچو درو ☆ چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

(ناز برداری کیلئے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے اگر تو ایسا حسین نہیں ہے تو بری عادات چھوڑ دے)

اور حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اے عائشہ! مجھے معلوم ہو جاتا ہے جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو اور جس وقت راضی ہوتی ہو تو اس طرح قسم کھاتی ہو لا ورب محمد، (قسم ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی) اور جب ناراض ہوتی ہو تو کہتی ہو لا ورب ابراہیم۔ (قسم ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے رب کی) حضرت عائشہؓ نے فرمایا یا رسول اللہ! لا اھجر الا اسمک یعنی یا رسول اللہ! میں اس وقت صرف آپ کا نام ہی چھوڑ دیتی ہوں یعنی دل میں تو آپ ہی بے ہوئے ہیں لیکن صرف نام مبارک زبان سے ترک کر دیتی ہوں۔

نام پر ایک حکایت یاد آئی۔ ہمارے حضرت میاں جی نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خلیفہ شیر خان نامی لوہاری کے رہنے والے تھے۔ جب ان کا انتقال ہونے لگا تو ساکت لیٹے ہوئے تھے۔ لوگ کلمہ کی تلقین کرتے تھے لیکن وہ بالکل خاموش تھے لوگوں کو بہت خیال ہوا کہ افسوس ہے کہ خاں صاحب ہمیشہ تو ذکر شاغل رہے اور آخر میں یہ کیفیت ہے کہ کلمہ تک زبان سے نہیں نکلتا اور حضرت میاں جی کو جا کر اطلاع کی۔ حضرت تشریف لائے اور پوچھا کہ خاں صاحب کس حال میں ہو۔ فرمایا کہ حضرت لوگوں کو روک دیجئے۔ مجھے پریشان نہ کریں۔ یہ مجھ کو مسمیٰ سے اسم کی طرف لاتے ہیں مشاہدہ مسمیٰ میں ہوں اور یہ مجھ کو اسم کی طرف کھینچتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔

درنیا بد حال پختہ یچ خام ☆ پس خن کوتاہ باید والسلام
(کوئی کچا پکا حال یعنی اندرونی حقیقت معلوم نہیں کر سکتا بہتر ہے کہ بات مختصر کر کے اجازت لی جائے)

لا ورب ابراہیم کہہ کر حضرت عائشہؓ نے نام بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چھوڑ دیا اور خفا بھی ہو رہی ہیں منہ میں۔ تو یہ بات کیا ہے؟ وہ یہی ہے کہ دل تو محبت سے پڑھا اور اس ناراضی کا منشا بھی وہی محبت تھی۔ پس اگر دل میں ایمان ہے اور زبان سے بدحواسی میں کلمہ کفر کا بھی کہہ دیا تب بھی وہ شخص مومن ہے اس کے ایمان میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا یہ کلمہ کفر ایسا ہی ہے۔

خون شہیداں راز آب اولیٰ تراست ☆ ایں خطا از صد صواب اولیٰ تراست
(شہیدوں کا خون آب حیات سے افضل ہے اور یہ غلطی سینکڑوں اچھائیوں سے بہتر ہے)

اوقات نزاع کے کلمات

بحر الرائق میں لکھا ہے کہ اگر مرتے وقت کسی مسلمان کے منہ سے کلمات کفر نکلیں تو وہ سب معاف ہیں مرنے کا وقت بڑا نازل وقت ہے۔ تھوڑی سی آدمی کو تکلیف ہوتی ہے تو پریشان ہو جاتا ہے اور وہ وقت تو جان نکلنے کا ہے۔ اسی واسطے ایسے وقت میں سمجھ دار آدمی پاس ہونا چاہیے تاکہ مردہ

کی حالت کو سمجھیں۔ بعض حالتیں ایسی پیش آتی ہیں کہ پاس والوں کو بالکل سمجھ میں نہیں آتیں۔ ایک بزرگ تھے جب ان کا انتقال ہونے لگا تو انہوں نے یہ کہا لا الہ الا اللہ موسیٰ کلیم اللہ اور کہہ کر رحلت فرما گئے لوگوں نے شور مچا دیا کہ افسوس یہودی ہو کر مرے ہیں۔ یہودی پر اسی کے مناسب ایک اور حکایت یاد آئی حضرت نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑے بزرگ ہیں۔ کمرے کا لفظ سن کر طالب علموں کو بڑا خلیجان ہوا ہوگا کہ مونث کا صیغہ مذکر کی کیسی صفت بن گیا۔ یہ صفت ان کی نہیں ہے۔ اس کا موصوف محذوف ہے یہ عالم ہیں اور اپنے زمانہ میں مباحثہ کے اندر الطامۃ الکبرے مشہور تھے کثرت استعمال سے موصوف تو اڑ گیا کمری رہ گیا۔ غرض ان کے زمانہ میں ایک بزرگ تھے ان کے کسی مرید نے ان بزرگ کی زیارت کے لئے ان سے اجازت چاہی۔

یہاں ایک بات سمجھ لینے کی ہے وہ یہ ہے کہ تعلیم و تلقین کا تعلق تو ایک ہی سے رکھے باقی عقیدت و محبت و زیارت سب بزرگوں سے رکھے تو کچھ حرج نہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے طبیب و مریض کہ جب تک جم کر ایک کا علاج نہ کریگا تو مرض کا زوال نہ ہوگا اور اگر ہر ایک سے دوا پوچھے تو شفا نہ ہوگی۔

غرض شیخ نجم الدین سے اجازت لیکر ان بزرگ کی زیارت کے لئے گئے۔ چلتے وقت پیر نے کہہ دیا تھا کہ میری طرف سے بھی حضرت کی خدمت میں سلام کہہ دینا۔ جب وہاں پہنچے تو پیر کا سلام عرض کیا۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ تمہارا یہودی پیرا چھا ہے۔ مرید صاحب دل ہی دل میں بہت بگڑے کہ یہ اچھے بزرگ ہیں میرے پیر کو انہوں نے یہودی کہہ دیا لیکن چونکہ پیر سے ان کے مناقب سن چکے تھے اس لئے بولے کچھ نہیں۔ جب واپس پیر کی خدمت میں آئے تو پیر نے پوچھا ہمارا سلام بھی کہہ دیا تھا لیکن وہ تو بہت بے ڈھب آدمی ہیں انہوں نے آپ کو یہودی کہا فرمایا کہ الحمد للہ! آج معلوم ہوا کہ میں کس مقام پر ہوں اور بہت خوش ہوئے اور یہ فرمایا کہ بھائی تجھ کو خبر نہیں ہے کہ اس یہودی سے کیا مراد ہے۔

تو حقیقت اس کی یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر تمام انبیاء کی شانیں جلوہ گر ہیں۔ اسی مضمون کو کسی نے شعر میں ^{تقریباً} ایہ ہے

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری ☆ آنچہ خوباں ہمہ دار ند تو تنہا داری
(آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن حضرت عیسیٰ علیہ

السلام کی پھونک اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ید بیضا ہے جو کمالات سب انبیاء اسلام کو دیئے گئے تھے وہ تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع ہیں)

ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ اسی طرح تمام انبیاء علیہم السلام کی شان حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم شان جمعیت لئے ہوئے ہیں۔ اب اولیائے امت میں سے ہر ایک کی شان جدا ہے۔ کسی کے اندر ابراہیم علیہ السلام کی شان ہے کوئی موسیٰ کی شان پر ہے جو بزرگ جس نبی کی شان لئے ہوئے ہوتے ہیں ان کو ان کے قدم پر کہا جاتا ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ فلاں بزرگ قدم موسیٰ پر ہیں اور فلاں ابراہیم پر ہیں یعنی شان موسیٰ اور ابراہیم ہی پر ہیں۔ لکن لا من حیث انہ شان ابراہیم و موسیٰ بل من حیث انہ شان محمد صلی اللہ علیہ وسلم لانہ صلی اللہ علیہ وسلم جامع للشنون کلہا۔ (نہ اس حیثیت سے کہ یہ حضرت ابراہیم و حضرت موسیٰ علیہما السلام کی شان ہے بلکہ اس حیثیت سے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان ہے اس لئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام میں سب شانیں جمع ہیں)

پس جن بزرگ نے مرنے کے وقت لا الہ الا اللہ موسیٰ کلیم اللہ پڑھا۔ انہوں نے ظاہر کر دیا کہ قدم موسیٰ پر ہوں۔ یہی مطلب یہودی کہنے کا بھی ہے۔ اب بیچارے عوام اس بات کو کیا جانیں۔ اس لئے مرنے کے وقت ایسے لوگ پاس ہونے چاہئیں جن کو دین کی سمجھ ہو۔ بہر حال اصلی مقصود مسمیٰ ہے۔ غلبہ حال میں اگر اسم میں غلطی ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ ایسے امور سے ایمان نہیں جاتا۔

ایمان کی رخصتی

یہاں سے معلوم ہوا کہ یہ جو بعض عوام الناس کہا کرتے ہیں کہ فلاں نے چہار کا حقہ پی لیا اس لئے اس کا ایمان جاتا رہا یہ بالکل غلط ہے۔ کیا چہار کے حقہ کی نلکی میں ایمان گھس گیا ہے۔ چہار کا حقہ تو درکنار اگر سور کا گوشت بھی کوئی مسلمان کھالے تو ایمان نہیں جاتا۔ ہاں سخت گناہ ہوگا۔ اور اگر بھول کر یا کسی نے بلا اطلاع کھلا دیا تو گناہ بھی نہیں۔ ہاں جان کر اگر کھایا، تو گنہگار ہوگا۔ ایمان ایسی شے نہیں جو ایسی باتوں سے جاتا رہے۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا گنگوہی رام پور سے آتے ہوئے اسلام نگر ٹھہرے وہاں ایک خاں صاحب پہلے سے مہمان تھے۔ وہ حضرت کی خدمت میں آکر بیٹھے۔ اب خاں صاحب کو کچھ خیال ہوا کہ حضرت سے کچھ باتیں کرنا چاہئیں اور باتیں بھی ایسی ہونی چاہئیں جو ان کے مذاق کے موافق ہوں۔ تو آپ پوچھتے ہیں کہ حضرت وہ کون سی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن سے ایمان جاتا

ہے حضرت نے ہنس کر فرمایا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہمارا ایمان نہیں جاتا بے وقوفوں کا جاتا ہے (چھوٹی باتوں سے آپ کی مراد کیا ہے) خاں صاحب شرمندہ ہوئے اور تاویل کی غرض سے کہا کہ حضرت یہی کفر و شرک کی باتیں ہو جاتی ہیں حضرت نے فرمایا کہ خاں صاحب کفر و شرک جب تمہارے یہاں چھوٹی باتیں تو وہ بڑی باتیں کون سی ہوں گی خاں صاحب سن کر چپ ہو گئے۔
خلاصہ یہ ہے کہ ایمان ایسی شے نہیں ہے کہ شیطان کا پیشاب پی لینے سے جاتا رہے۔ بلکہ اگر شیطان کو کوئی بھون کر کھا جائے جب بھی ایمان نہیں جاتا۔

کانپور میں ایک واعظ آئے تھے انہوں نے من شر الوساوس الخناس (وسوسہ ڈالنے والے کی برائی سے) کی یہ تفسیر بیان فرمائی تھی کہ وسواس سے مراد تو شیطان ہے اور خناس سے شیطان کا بیٹا اور یہ کہا کہ اس کا قصہ یہ ہوا تھا کہ جب آدم علیہ السلام جنت سے باہر آ گئے تو وسواس حضرت حوا علیہا السلام کے پاس اپنے بچہ خناس کو لایا اور کہا کہ یہ رکھ لو میری امانت ہے۔ حضرت حوا نے رکھ لیا۔ آدم جب آئے تو پوچھا یہ کیا ہے۔ حضرت حوا نے فرمایا کہ ایک غریب مسکین آیا تھا امانت رکھ گیا ہے آدم علیہ السلام نے فرمایا وہ شیطان تھا۔ غرض اس کو نکال دیا۔ وہ دوسری بار شکل بدل کر پھر آیا پھر ایسا ہی کر دیا۔ کئی بار کے بعد آدم علیہ السلام اس بچہ کا قیمہ بنا کر کھا گئے۔ شیطان مسمیٰ وسواس جب آیا اور کہا کہ میرا بچہ لاؤ۔ آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ تو ہم کھا گئے۔ وسواس نے پکارا بیٹا خناس! تو اس نے پیٹ کے اندر سے جواب دیا کیوں ابا وسواس پس یہ معنی ہیں من شر الوساوس الخناس (وسوسہ ڈالنے والے کی برائی سے) کے یعنی وسواس تو وہ ہے جو باہر سے وسوسہ ڈالے اور خناس وہ جو اندر بیٹھا وسوسہ ڈالتا ہے۔

خیر یہ حکایت تو مہمل گپ ہے باقی اگر بالفرض کوئی شخص شیطان کو کھا جائے تب بھی اس کا ایمان نہیں جاتا۔

نشان قدرت

گناہ میں بھی اس امر کا اعتبار ہے جو علم اور شعور اور عقل اور بلوغ کے ساتھ ہو۔ اسی واسطے بچے جو کچھ کریں ان سے مواخذہ نہیں بلوغ کے بعد وہ مکلف ہوتے ہیں۔ اس کو سن کر لڑکے تو بہت خوش ہوں گے کہ ہمارے ذمہ کچھ نہیں۔ ہم تو خوب چھوٹے۔ یہ تو صحیح ہے کہ تمہارے ذمہ نہیں لیکن ہمارے ذمہ تو ہے کہ تم سے مار کر کام لیں تاکہ بلوغ کے بعد تم کو نیک کام کی عادت ہو۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اپنے بچوں کو جب وہ سات سال کے ہوں نماز کا حکم کرو اور جب دس سال کو پہنچیں تو مارو۔

غرض اس کی کوئی اصل نہیں ہے کہ عصر و مغرب کے درمیان کھانا نہ کھاؤ یا کہ کسوف کے وقت کھانا نہ کھاؤ البتہ کسوف کے وقت مستحقین کو خیرات دو۔ اب بجائے مستحقین کے بھنگی مانگتے ہوئے پھرتے ہیں۔ خیر ہمارے اطراف میں مسلمانوں سے تو نہیں مانگتے لیکن بعض جگہ مسلمان بھی ان کو دیدیتے ہیں اور بعض جگہ یہ رسم ہے کہ صدقہ میں خاص چیزیں دیتے ہیں۔ ماش کی دال، پیسے، تیل۔ میں نے جوان میں وجہ مناسبت سوچی تو یہ سمجھ میں آیا کہ یہ تینوں چیزیں کالی ہیں اور بھنگی بھی اکثر کالے ہوتے ہیں اور بلا کی صورت بھی کالی ہی سمجھتے ہیں۔ اس لئے یہ سمجھتے ہیں کہ ان چیزوں میں بلا لپٹی ہوئی ہے ان کے دینے سے بلا جاتی رہے گی۔

یاد رکھو! خیرات اگر دو کسی اپنے بھائی غریب کو دو اور پھر خیرات میں ایسی چیزوں کی تخصیص نہیں ہے۔ یہ شگون اور مشرکین کی رسم ہے۔ مسلمانوں کو جو تعلیم کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ایسے وقت صدقہ دیں اور جماعت کا اگر اہتمام ہو سکے تو صلوٰۃ الکسوف جماعت سے پڑھیں اور اپنے گناہوں سے استغفار کریں۔ اس لیے کہ اس کی وجہ حدیث شریف میں یہ آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتے ہیں کہ ہم کو اتنی قدرت ہے کہ بڑے جسم منور کو بے نور کر دیا تو تم گناہ مت کرو ورنہ تم بھی عذاب میں مبتلا ہو گے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

باز گستاخی کسوف آفتاب (چاند کی گستاخی سورج گرہن کا سبب بنتی ہے)

اور حدیث میں آیا ہے کہ جب تم اس قسم کی قدرت کی نشانیاں دیکھا کرو تم فافز عواالیٰ ذکر اللہ یعنی اللہ کے ذکر کی طرف ملتچی ہو جایا کرو۔ ایسے ہی اگر آندھی آئے یا آگ لگ جائے تو اس وقت بھی ذکر اللہ کیا کرو۔

ذکر اللہ کی دولت

سبحان اللہ کیا تعلیم ہے اس سے دو فائدے ہیں اول تو گناہ معاف ہوں گے۔ یہ تو آخرت کا ثمرہ ہے اور دنیا میں یہ کہ دل کو اطمینان اور چین ہوگا۔ اس لئے کہ ارشاد ہے

الا بذكر الله تطمئن القلوب "یعنی خبردار ہو اللہ ہی کی یاد سے قلوب مطمئن ہوتے ہیں"

سچ ہے خدائے پاک کے نام میں اس قدر حلاوت اور چین ہے کہ کسی میں نہیں۔ بلکہ چین کا تحقق ہی بجز اللہ کے نام کے کسی شے میں نہیں اس لیے کہ الاحرف حرف تنبیہ ہے۔ اور "بذكر الله"

کے تقدیم کے ساتھ جو مفید حصر ہے فرمایا ہے اور اطمینان کے معنی عربی میں سکون کے ہیں۔ چنانچہ اس کا تجربہ ہے کہ جب ذکر اللہ قلب میں رچ جاتا ہے تو اس کو نہ کوئی گھبراہٹ کی شے اور نہ کوئی فرحت کی چیز ہلا سکتی ہے چنانچہ ارشاد ہے لا یحز نھم الفزع الا کبر یعنی بڑی گھبراہٹ یعنی قیامت ان کو غمگین نہ کرے گی۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

عاشقاں را با قیامت روز محشر کار نیست ☆ عاشقاں را جز تماشاۓ جمال یار نیست
(عاشقوں کو قیامت میں اور کوئی کام نہیں ہوگا سوائے جمال یار کے دیکھنے سے)

چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ روز قیامت باوجود اس کے کہ پچاس ہزار برس کا دن ہوگا۔ لیکن مومن پر ایسا گزر جائے گا کہ جیسے فرض نماز کا وقت۔ پس جب ایسی شدید گھبراہٹ سے بھی وہ نہ گھبرائیں گے تو دنیا کے ہولناک واقعات تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ان سے مومن کیوں از جا رفته ہونے لگا ہے حالانکہ قیامت کی گھبراہٹ اور شدت ایسی ہولناک ہے کہ جس کی نسبت حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ یا ایہا الناس اتقوا ربکم ان زلزلة الساعة شیء عظیم یوم ترونہا تذهل کل مرضعة عما ارضعت وتضع کل ذات حمل حملہا وترى الناس سکاری وما هم بسکاری ولكن عذاب اللہ شدید۔ تو جو اس سے مامون ہے یہاں کے احوال سے کیا متاثر ہوگا۔ چنانچہ شیخ شیرازی اسی کو فرماتے ہیں۔

مؤحد چہ برپائے ریزی زرش ☆ چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نہ باشد ز کس ☆ ہمیں ست بنیاد توحید و بس
(مؤحد کے پاؤں پر چاہے دنیا کی دولت ڈال دی جائے یا اس کے سر پر تلوار رکھ دی جائے اس کو کسی سے امید ہوتی ہے اور نہ خوف توحید کی ایسی بنیاد ہے)

غرض کیسی ہی شدت اور پریشانی ہو ذکر اللہ ایسی دولت ہے کہ اس سے سب بھاگ جاتی ہے۔ افلاطون موسیٰ علیہ السلام سے ملا اور پوچھا کہ اگر آسمان کی کمان ہو اور حوادث تیر ہوں اور زمین نشانہ ہو تو آدمی کہاں جائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فوراً جواب دیا کہ تیر انداز کے پاس جا کر کھڑا ہو جائے۔ افلاطون بولا کہ یہ جواب بجز نبی کے کوئی نہیں دے سکتا۔

مگر اس کے باوجود اکثر حکماء حضرات انبیاء علیہم السلام کی نسبت یہ کہتے تھے کہ یہ نبی تو ہیں مگر ہمارے لئے نہیں صرف جہلا کے لئے ہیں۔ حالانکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ نبی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اور موسیٰ علیہ السلام خود کہتے ہیں کہ میری نبوت خاص نہیں جہلاء کے ساتھ۔ پس حکماء

کا عذر مہمل محض ہے۔

غرض! ذکر اللہ وہ شے ہے کہ حق تعالیٰ کا اس سے قرب ہوتا ہے۔ اور تمام مصائب کا علاج ہے جب چاہے تجربہ کر لو کہ ایک ہی قسم کا حادثہ اگر دو شخصوں پر نازل ہو تو ان میں سے جو نمازی و صاحب نسبت ہوگا اس پر وہ خفیف ہوگا اور غیر نمازی یا غیر صاحب نسبت پر وہ بہت ثقیل اور شدید ہوگا۔ اس لئے کہ فرمایا کہ کسوف کے وقت اللہ کی یاد کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

خسوف اور نکاح

ایک بات یہ مشہور ہے کہ کسوف و خسوف کا وقت منحوس ہوتا ہے۔ ایسے وقت نکاح یا کوئی شادی کی تقریب نہ کرنا چاہیے۔ میں نظام آباد علاقہ حیدر آباد میں اپنے بھتیجے کا نکاح کرنے گیا تھا جو دن اور جو وقت نکاح کے لئے قرار پایا تھا اس وقت خسوف ماہ ہو گیا۔ اب وہاں کے لوگوں میں کھلبلی پڑی کہ ایسے وقت میں کیا نکاح ہوگا۔ اور اگر ایسے وقت نکاح کیا تو تمام عمر نحوست کا اثر رہے گا۔ بہت سے جنٹلمین بھی ان مہملات میں مبتلا تھے چنانچہ جمع ہو کر میرے پاس آئے اور یہ کہا کہ عرض کرنا ہے میں نے کہا کہ فرمائیے کہنے لگے کیا چاند گرہن کے وقت بھی نکاح ہوگا۔ میں نے کہا اس وقت تو نکاح کرنا بہت ہی اولیٰ و افضل ہے اور میرے پاس اس کی دلیل بھی موجود ہے۔

وہ یہ ہے کہ آپ صاحبوں کو معلوم ہے کہ ہم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ خسوف کے وقت ذکر اللہ و نوافل میں مشغول ہونا چاہیے۔

اب سمجھئے کہ امام صاحب فرماتے ہیں کہ نکاح میں مشغول ہونا نوافل میں مشغول ہونے سے افضل ہے۔ پس ایسے وقت نکاح کا شغل اور بھی افضل و اولیٰ ہے ان سب نے اس کو تسلیم کر لیا۔

میں نے بیان تو کر دیا لیکن میرے دل میں ان لوگوں کے خیال سے ایک انقباض رہا اور یہ دعا کی کہ اے اللہ! جلدی چاند صاف ہو جائے۔ اگر اس حالت میں نکاح ہوا اور بعد میں کوئی حادثہ تقدیر سے پیش آیا تو ان لوگوں کو کہنے کی گنجائش ہوگی کہ ایسے وقت نکاح کیا تھا اس لئے یہ بات پیش آئی۔ اللہ کی قدرت تھوڑی دیر میں چاند صاف ہو گیا۔ سب خوش ہو گئے اور نکاح ہو گیا۔ بہر حال ان اختراعات اور خیالات کو چھوڑنا چاہیے۔

یہ سب مضمون ۲۸ تاریخ پر یاد آ گیا تھا۔ ایک بات اور ضروری یاد آئی وہ یہ ہے کہ آج ۲۸ ہے اور کل ۲۹ اور پرسوں کا دن مشکوک ہے اگر ۲۹ کو چاند نظر آ گیا تو عید ہو جائے گی۔ یہ اسلئے کہا گیا کہ عوام الناس کا شاید شبہ رہے کہ چاند ۲۹ شعبان کو یہاں تو نظر آیا نہیں۔ اس لئے یہاں کے حساب

سے آج ۲۸ تاریخ نہیں بلکہ ۲۷ ہے اس لئے اطلاع کی جاتی ہے کہ باہر سے خبریں معتبر آگئی ہے اس لئے ایک روزہ ابھی رکھنا چاہیے۔

بعض لوگوں کو یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ ہمیشہ یہی فضا جتا ہوتا ہے۔ اس سے تو بہتر یہ ہے کہ ۳۰ شعبان کو ہمیشہ روزہ رکھ لیا کریں۔ اگر خبریں آگئیں تو رمضان میں محسوب ہو جائے گا۔ ورنہ نفل ہو جائے گا تو یاد رکھو کہ اس دن کے روزہ رکھنے کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے البتہ خواص کو جائز لکھا ہے اور وجہ فرق کی یہ ہے کہ اگر عوام کو بھی اجازت دیدی جائے تو تھوڑے دنوں میں ایسا ہوگا کہ اگر شعبان کی طرح رمضان بھی تیس دن کا ہوا اور روزہ شروع کیا تھا۔ ۳۰ شعبان سے جس سے ۲۹ رمضان کو پورے ۳۰ دن ہو جائیں گے تو عوام الناس رمضان کی ۲۹ تاریخ پوری کر کے ۳۰ تاریخ کو عید کر لیا کریں گے۔ اور یہ کہیں گے کہ ہم نے تیس روزے تو رکھ لیے۔ اس لئے عوام کو منع کیا جاتا ہے اور خواص کو اجازت ہے۔ بہر حال کل ۲۹ تاریخ ہے۔ یہ سب مضامین اخیر تاریخ کے اوپر یاد آ گئے۔ اب میں اصلی مضمون بیان کرتا ہوں۔ جاننا چاہیے کہ جیسے اختتام مجاہدہ کے متعلق ماضی میں بیان کئے گئے تھے۔

اختتام و اکمال مجاہدہ

اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اختتام مجاہدہ کے متعلق مضمون بیان کیا جائے۔ اختتام کے مناسب یہ آیت ہے جو میں نے تلاوت کی ہے۔ میں پہلے یہ بیان کر چکا ہوں کہ دوسرے لوگوں کے مجاہدوں میں چند کوتاہیاں تھیں۔

اول تو ان کو اختتام نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ ان میں یسر یعنی سہولت نہیں تھی اور جس قدر بھی مجاہدات ایسے ہیں کہ ان میں وحی کی اعانت نہیں ہے ان میں تیسیر کی رعایت نہیں۔ بہت دشواری ہے اور کبھی اس مجاہدہ کا خاتمہ نہیں ہے گویا مجاہدہ ہی کو اصل مقصود سمجھتے ہیں۔

تیسری کوتاہی یہ ہے کہ اس قدر مجاہدہ جب کوئی کرتا ہے تو اس کو عجب ہو جاتا ہے کہ میں بڑا کام کرتا ہوں اور کچھ حاصل نہ ہوا تو اس مجاہدہ کو بیکار سمجھتا ہے چنانچہ اہل مجاہدہ کو اس قسم کی آفتیں پیش آتی ہیں۔ اکثر ذاکر و شاعری شکایت کیا کرتے ہیں کہ ہم کو کوئی نفع نہیں ہوا۔ یہ شکایت وہی شخص کریگا جو اپنے کو مستحق سمجھے گا۔ یہ شکایت فی الواقع دعویٰ ہے استحقاق کا۔ اور دلیل عجب کی ہے۔

چوتھی کوتاہی مجاہدہ میں یہ تھی کہ اگر مجاہدہ میں کچھ ثمرات مرتب ہوں گے تو ان کو حق تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر شکر نہ کریگا۔ بلکہ اس کو ثمرہ اپنے عمل کا سمجھے گا۔

پانچویں کوتاہی یہ ہے کہ چونکہ ان کے مجاہدہ کا اختتام نہیں ہے اس لئے ہمیشہ ہمیشہ کو دنیا کی

لذات سے محروم رہیگا۔ چنانچہ بہت مجاہد ایسے ہیں کہ گوشت، گھی میوہ جات نہیں کھاتے اور جب یہ نعمتیں ان کو میسر نہ ہوں گی۔ تو شکر بھی حق تعالیٰ کا ان پر نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ان سب کا جواب اور مجاہدات ارشاد شدہ کی شان اس آیت میں بیان فرماتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ سہولت کا ارادہ فرماتے ہیں اور تم پر سختی کا ارادہ نہیں کرتے۔

یہ ابطال ہے اس کوتاہی کا کہ ان کے مجاہدات میں دشواری ہی دشواری ہے یہاں تو یہ بات نہیں ہے۔ چنانچہ جن مجاہدات کی تعلیم کی گئی ہے۔ وہ سب نہایت لطیف اور ہماری طبیعت اور مذاق کے موافق اور نفع میں سب مجاہدوں سے بڑھ کر ہیں۔ (کما بینا بالادلة فی المواعظ السابقة) آگے ارشاد ہے ولتکملوا العدة۔ اور تاکہ تم شمار کو پورا کرلو۔

اس کوتاہی کا ابطال ہے کہ ان کے مجاہدہ کا کہیں خاتمہ ہی نہیں اور نہ اس میں اکمال ہے یہاں اختتام بھی ہے اور اکمال بھی۔ ایک کوتاہی یہ تھی کہ مجاہدہ کر کے ناز ہوتا تھا۔ اور یہ اس طریق میں سخت مضر ہے اس کو دفع فرماتے ہیں۔ ولتکبروا للہ علی ماہدکم۔ یعنی تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اس پر کہ اس نے تم کو راہ بتائی لعلکم تشکرون۔ تاکہ تم شکر کرو۔

یہ اس کوتاہی کی تکمیل ہے کہ ان کے مجاہدہ کے اختیار کرنے میں نعم اور لذات سے محرومی تھی تو نعمتوں کا شکر بھی ادا نہ ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی آسانی فرمائی کہ خوب سب کچھ کھاؤ پیو اور شکر کرو۔ بعض مفسرین نے ”لتکبروا للہ علی ماہدکم“ سے تکبیرات عیدین مراد لی ہیں یعنی روزوں کے شمار کو پورا کرنے کے بعد اللہ اکبر اللہ اکبر عید کی نماز میں کہو۔ میں نے اس کو اختیار نہیں کیا۔ اس لئے کہ میرا ذوق اس سے آبی ہے اس لئے میں نے اپنی تفسیر میں بھی اس کو اختیار نہیں کیا لیکن اس سے بھی میرے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے یہ تو اجمالاً اس آیت کا حاصل ہے۔

مجاہدہ کی آسانیاں

اب میں تفصیلاً اس کی شرح کرتا ہوں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہاری آسانی چاہتے ہیں۔ منجملہ آسانیوں کے آسانی تو یہ ہے کہ مجاہدہ کو ختم فرمادیا۔ اور خود عین مجاہدہ کے وقت بہت آسانیاں ہیں۔ چنانچہ اعتکاف میں یہ سہولت فرمائی کہ مسجد میں اس کو مشروع فرمایا تاکہ خلوت درانجمن کا مضمون ہو جائے۔ اعتکاف سے آدمی اس کا خوگر ہو جاتا ہے سب سے الگ ایک گوشہ میں بھی بیٹھے ہیں اور سب کے ساتھ شریک بھی ہیں۔

از بروں شو آشنا و از دروں بیگانہ و ش ☆ ایں چنین زیباروش کمتر بود اندر جہاں

(کسی کے ظاہر سے آشکار ہو اور اس کے باطن کی کھود کرید مت کرو اور یہ اتنی مناسب روش ہے کہ دنیا میں کم پائی جاتی ہے)

لاخلو لاملء دل بیار دست بکار اعتکاف کی شان ہے۔ اگر بالکل تنہائی کا حکم ہوتا تو نفس پر بہت گراں ہوتا۔ اسی طرح رمضان کے روزہ کو دیکھئے بظاہر اس میں مشقت ہے لیکن واقعہ میں بہت آسان ہے چنانچہ نفل روزہ کا اگر کبھی اتفاق ہو جاتا ہے تو اس میں بہت مشقت معلوم ہوتی ہے اور رمضان المبارک کی ایسی برکت ہے کہ اس میں کچھ بھی مشقت معلوم نہیں ہوتی۔ رمضان کی برکت اس قدر صاف اور کھلی ہوئی ہے کہ جس کو کچھ بھی احساس ہو وہ بے تکلف اس کا ادراک کرتا ہے۔

شب برات کے دن جن لوگوں نے روزہ رکھا تھا وہ اس روزہ کا اور رمضان المبارک کے روزہ کا مقابلہ کر کے دیکھیں۔ اس روزہ میں بہت مشقت معلوم ہوئی تھی اور رمضان المبارک میں کچھ بھی نہیں اہل مجاہدہ یہ بات کہاں سے لائیں گے۔ ان برکات کا علم بجز وحی کی تعلیم کے کسی ذریعہ سے معلوم نہیں ہو سکتا۔

گر مصور صورت آں دلتاں خواہد کشید ☆ لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید
(اگر مصور اس محبوب کی تصویر کھینچے گا تو میں حیران ہوں کہ اسکے ناز و ادا کی تصویر کیسے کھینچے گا)

تراویح کے اندر جو آسانیاں ہیں وہ بھی مخفی نہیں ہیں آگے ارشاد ہے۔ ولتکملوا العدة (تا کہ گنتی مکمل کرو)۔ اس کی ترکیب میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں بعض تو یہ کہتے ہیں کہ اس کا عطف یرید اللہ (اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں) پر ہے اور تقدیر کلام کی یہ ہے شرع اللہ ہذہ الاحکام لا ارادة التیسیر ولا کمال العدة، الخ۔ (اللہ تعالیٰ نے ان احکام کو آسانی اور گنتی پورا کرنے کے لئے فرمایا ہے) بعض نے کہا ہے کہ اس کا متعلق محذوف ہے اور اصل کلام یہ ہے شرع ہذہ الاحکام لتکملوا العدة، الخ۔ (یہ احکام گنتی پورا کرنے کیلئے شروع ہوئے) اور یہ حذف واؤ کے بعد ہے اور ایک بزرگ کے کلام سے میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ یہ حذف واؤ کے قبل ہے اور لتکملوا (تا کہ گنتی پورا کرو) کا معطوف علیہ مقدر ہے۔

اس میں ایک عجیب نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ تو مسئلہ مشہور و مسلم ہے کہ حق تعالیٰ کے افعال معلل بالا غراض نہیں ہیں لیکن ان میں حکمتیں ضرور ہیں۔ اور کہیں کہیں حق تعالیٰ نے اپنے افعال کی حکمتیں بیان فرمائی ہیں۔ اس سے شبہ یہ ہوتا ہے کہ شاید یہی حکمتیں مقصود بالذات ہوں۔ احکام فی نفسہا مقصود نہ ہوں۔ اسلئے ضرورت ہوئی کہ اس شبہ کو دفع کیا جائے۔ اس لئے بعض جگہ اس حکمت پر حرف عطف لائے اور معطوف علیہ کو حذف فرما دیا اور چونکہ عطف کا مقتضا مغائرت ہے متعطفین کی اور معطوف ہے اعتبار حکمت تو معطوف علیہ ہوگا۔ عدم اعتبار حکمت۔ جس

ہاں حاصل یہ ہوگا کہ یہ احکام اس لئے بھی وضع فرمائے کہ حاصل اس حکمت کا یہاں یہ ہے کہ تم شمار کو کامل کر لو یعنی مجاہدہ کو ختم کر دو اور ختم بھی ایسا کیا کہ اس تاریخ پر اگر کوئی ختم نہ کرے تو مجرم ہوگا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ماں بچہ کو اصرار کرے کہ یہ شے کھا لو۔ اسی شفقت سے۔ بلکہ اس سے بدرجہا زیادہ سے حق تعالیٰ اپنے بندوں کو کھلاتے ہیں۔

اگر کوئی شبہ کرے کہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عید کے دن کھانا فرض ہے حالانکہ کھانا فرض نہیں۔ جواب یہ ہے کھانا دو قسم کا ہے ایک بالقوہ دوسرے بالفعل۔ بالفعل تو ظاہر ہے کہ تحقق کھانے کا ہو اور بالقوہ یہ ہے کہ کھانے کی قوت یعنی نیت روزہ کی ہو اگرچہ نہ کھائے۔ پس مجاہدہ ہر حال میں ختم ہو جائے گا۔ اس لئے کہ مشقت تو نفس کو اسی وجہ سے ہے کہ وہ یہ سمجھے ہوئے ہے کہ کھانے کے لئے رات ہی کو ملے گا اور جب جانتا ہے کہ جب چاہوں کھا سکتا ہوں تو مجاہدہ ختم ہو گیا۔

مصلحت الہی

ایک بات ضروری قابل اطلاع یاد آگئی۔ وہ یہ ہے کہ عوام عید کی صبح کو کہا کرتے ہیں کہ روزہ کھول لو۔ ہم بچپن میں بہت دنوں تک یہی سمجھتے تھے کہ آج بھی روزہ ہوتا ہے اور شب میں ہوتا ہے تو یاد رکھو! آج روزہ نہیں ہے رات کو نہ دن کو۔ اور حقیقت اس کہنے کی کہ روزہ کھول لو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک ماہ تک جو روزہ رکھا ہے تو آج یہ ظاہر کر دو کہ روزہ نہیں ہے گویا رمضان المبارک کے ہر دن کے ختم پر تو خاص اسی دن کا روزہ افطار ہوتا تھا اور آج تمام مہینے کے دنوں کا ایک افطار ہے یعنی اور دنوں میں افطار اصغر تھا آج افطار اکبر ہے اگر کوئی کہے کہ مجاہدہ تو ساری عمر ضروری ہے اس لئے کہ نفس سے تو کسی وقت بھی امن نہیں ہے مولانا فرماتے ہیں۔

نفس اژدہ است او کے مردہ است ☆ از غم بے آلتی افسردہ ست
(نفس اژدہ ہے وہ کبھی نہیں مرتا البتہ اپنی آگ کے سرد ہونے کی وجہ سے افسردہ رہتا ہے)
اور فرماتے ہیں۔

صد ہزاراں دام و دانہ ست اے خدا ☆ ماچو مرغیاں حریص بے نوا
و مہدم پابستہ دام نوایم ☆ گر ہمہ شہباز و سیرغے شویم
(دنیا میں سینکڑوں جال اور دانے بکھرے ہوئے ہیں اور ہماری مثال بھوکے لالچی پرندوں کی طرح ہے اگر ہم شہباز اور سیرغ ہی کیوں نہ ہو جائیں پھر بھی قدم قدم پر اپنے جالوں میں پھنس جاتے ہیں)

تو جواب اس کا یہ ہے کہ علی الاطلاق مجاہدہ کا اختتام نہیں ہوا کہ اسکے بعد کسی قسم کا مجاہدہ نہیں

ہوگا۔ بلکہ ایک خاص قسم کا مجاہدہ ختم ہو گیا۔ اس لئے کہ اگر وہ متواتر علی الدوام رہتا تو نفس کو اولاً بے حد شاق ہوتا۔ اس لئے اس میں حق تعالیٰ نے تعاقب رکھا ہے کہ چند روزہ مجاہدہ کرو اور چند روزہ آرام کرو۔ اور بعد بے حد مشقت کے پھر اس مجاہدہ کا اثر ضعیف ہو کر مجاہدہ نہ رہتا۔ بلکہ وہ طبیعت بن جاتا۔ چنانچہ جو لوگ کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں ان کی آنتیں اور معدہ خشک ہو جاتا ہے اور ان کو اضطراب اور اشتہا نہیں رہتی تو ان کے نہ کھانے میں کوئی کمال نہیں ہے۔ سوہان روح اور علاج نفس تو یہ ہے کہ کبھی کھائیں اور کبھی نہ کھائیں۔

اسی واسطے محققین نے مقیمین مکہ کو رائے دی ہے کہ کبھی کبھی ان کو مکہ سے چلا جانا چاہیے کہ نشاط کی تجدید ہوتی رہے کیونکہ دوام کے اندر شوق بھی بجھ جاتا ہے اور عادت سی ہو جاتی ہے۔ اسی واسطے روزہ نفل میں صوم اللہ افضل نہیں ہے بلکہ افضل یہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھے اور ایک دن افطار کرے تاکہ نہ بہت شاق ہو نہ بالکل عادت ہو جائے اور اس میں حق تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر بھی رہتی ہے۔

نیز ہم لوگ بہت ضعیف ہیں جو عبادت سہولت سے ہوتی رہے وہ تو ہم سے ہوتی رہتی ہے اور اس میں حق تعالیٰ کی محبت بھی باقی رہتی ہے اور زائد مشقت کے متحمل نہیں ہوتے اور نفس کو کلفت زائد ہونے سے محبت میں بھی کمی ہونے لگتی ہے۔

اسی واسطے ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگ عاشق احسانی ہیں ذات کے عاشق نہیں ہیں۔ خلاف طبع پیش آنے سے اللہ میاں سے بھی ایک گونہ تکرر ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث قدسی میں آیا ہے جس کو قاضی ثناء اللہ نے تفسیر مظہری میں نقل کیا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اپنے بندوں کو خوب جانتا ہوں۔ ان میں بعض ایسے ہیں کہ اگر میں ان پر فقر مسلط کر دوں تو وہ کافر ہو جائیں۔ اس لئے ان کو فقر سے بچاتا ہوں اور بعض ایسے ہیں کہ اگر ان کو غنی کر دوں تو کفر کرنے لگیں۔ اس لئے ان کو محتاج رکھتا ہوں۔

پس اسی واسطے بعض ایسے ہیں کہ ہمیشہ بیمار ہی رہتے ہیں اور بعض تندرست رہتے ہیں جو حالت جس شخص کے لئے تجویز فرمادی ہے وہی اس کے لئے بہتر ہے اور اسی میں مصلحت ہے۔ دیکھو! ماں اگر بچہ کو مٹھائی نہ دے تو وہ اس کی مصلحت کو جانتی ہے۔

آنکس کہ تو انگرت نئے گرداند ☆ او مصلحت تو از تو بہتر داند

(جو شخص تجھے امیر نہیں مانتا وہ میری مصلحت تجھ سے بہتر جانتا ہے)

اسی واسطے حق تعالیٰ نے مجاہدہ میں تعدیل فرمائی ہے۔ اگر دائمی مجاہدہ ہوتا تو بندے اکتا جاتے۔

ایک زمانہ آرام کا مقرر فرمادیا۔ اس کے بعد پھر مجاہدہ مقرر فرمایا کہ نفس کو نشاط رہے۔ اور نعمت کی قدر ہو۔

اسی واسطے ہمارے حضرت نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میاں اشرف علی جب پانی پیو ٹھنڈا پیو تاکہ بال

بال سے شکر یہ ادا ہو۔ اور اگر گرم پانی پیو گے۔ تو زبان سے تو الحمد للہ کہو گے مگر دل سے الحمد للہ نہ نکلے گا۔

مشاہدہ جمال حق

اسی واسطے شکر کی نیت سے اگر کوئی اچھا کھانے کھائے اور اچھا کپڑا پہنے تو اس کے لئے افضل ہے گونا واقف طعن کریں خسرو اسی مضمون کو کہتے ہیں۔

خلق میگوید کہ خسرو بت پرستی میکند ☆ آری میکیم با خلق و عالم کار نیست (دنیا کہتی ہے کہ خسرو بت پرستی کرتا ہے ہاں ہاں کرتا ہوں مجھے دنیا و مخلوق سے کوئی کام نہیں ہے)

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ مجھے ساری عمر کا رزق ایک دم سے دیدیتے۔ حکم ہوا کہ ہمارے وعدہ پر اطمینان نہیں؟ عرض کیا اطمینان تو ہے مگر شیطان مجھے بہکاتا ہے کہ تو کہاں سے کھائے گا تو میں کہہ دوں گا کہ اس میں سے کھاؤں گا۔

پس باوجود محبوب ہونے کے بعض میں ایک قسم کا ضعف ہوتا ہے اور قوت یقین میں ایسے لوگوں کے فرق نہیں ہوتا۔ یہ ضعف طبعی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ اگر اچھا کھائیں اچھا پہنیں تو کچھ حرج نہیں ہے۔ اس لئے کہ غرض ان کی یہ ہوتی ہے کہ جو ذرہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا قلب میں ہے وہ ضائع نہ ہو جائے ان کے لئے یہ نعمتیں ذریعہ ہو جاتی ہیں مشاہدہ جمال حق کی اور جن کے لئے سبب غفلت کا ہوں ان کے لئے پرہیز لازم ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص کی طبیعت جدا ہے علاج جدا ہے۔ سب کو ایک لکڑی ہانکنا یا ہر ایک کو اپنے اوپر قیاس نہ کرنا چاہیے۔ آگے ارشاد ہے ولتکبروا اللہ علی ما ہدانا کم یہ ابطال ہے اس کمی کا جو اہل مجاہدہ کو بعض اوقات مجاہدہ سے پیش آ جاتی ہیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شدۃ مجاہدہ سے بعض اہل مجاہدہ کو عجب پیدا ہو جاتا ہے اور مجاہدہ یہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کرتا ہوں یہ بڑی شے ہے اور یہ بہت بڑا مرض ہے اپنے کو یہ شخص مستحق ثمرات سمجھتا ہے اور جب وہ ثمرات نہیں حاصل ہوتے تو دل میں حق تعالیٰ کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے اور جانتا ہے کہ جو کچھ میرے ذمہ ہے وہ میں ادا کرتا ہوں اور جو اللہ تعالیٰ کا ذمہ ہے وہ (نعوذ باللہ) ادا نہیں فرماتے حالانکہ کام مقصود ہے۔ ثمرات مقصود نہیں ہیں۔ یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

ہمارے اعمال

ہمارے حضرت ایسے موقع پر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

یابم اور ایا نیا بم جستجوئے میکیم ☆ حاصل آید یا نہ آید آرزوئے میکیم

(میں اسے پاؤں یا نہ پاؤں مگر اسکی جستجو کرتا رہتا ہوں مقصود حاصل ہو یا نہ ہو آرزو کرتا رہتا ہوں)
 مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک ڈاکر تھے ہمیشہ رات کو اٹھ کر نماز پڑھتے ذکر کرتے
 ایک مدت گزر گئی۔ ایک شیطان نے بہکایا۔ جی میں آیا کہ اتنے دن ہو گئے اللہ کا نام لیتے ہوئے نہ
 ادھر سے سلام ہے نہ پیام ہے یہ محنت ہماری اکارت ہی گئی۔ یہ سوچ کر سو رہا۔ خواب میں حکم ہوا
 گفت آں اللہ تو بلیک ماست ☆ دیں نیاز و سوز و درد دست پیک ماست
 (اسنے کہا ہمارا اللہ کہنا ہی ہماری بلیک ہے اور یہ عاجزی اور سوز و درد ہمارے لئے مقاصد ہیں)
 ہمارے حضرت نے اس کی شرح اس طرح فرمائی کہ دیکھو کہ اگر کوئی شخص تمہارے سامنے
 تمہارا نام لے جس کا نام لینا تم کو برا معلوم ہو تو تم اس کو روک دیتے ہو پس جب تم نے حق تعالیٰ
 کا نام لیا اور انہوں نے پھر توفیق دی اور روکا نہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ ہمارا وہ نام لینا پسندیدہ
 اور مقبول ہے۔ یہ معنی ہیں آں اللہ تو بلیک ماست اور یہ حسرت اور افسوس ہے اور تضرع و زاری بھی
 اسی کی دلیل ہے۔ پس گویا یہ پیک حق ہے۔

حقیقت میں اللہ اللہ کرنا بڑی نعمت ہے اور ثمرات کا انتظار کرنا یہ دل کا چور ہے کہ اپنے عمل کو اس
 نے قابل استحقاق اجر سمجھا۔ خدا کی قسم ہے ہمارے اعمال تو اس درجہ کے ہیں کہ اگر ان پر عتاب ہی نہ
 ہو تو بسا غنیمت ہے کس کے ثمرات اور کہاں کا اجر۔ اگر اعمال کے بعد ثمرات ہوں تو وہ رحمت ہے باقی
 عمل کرنا تو بندہ کا کام ہی ہے خواہ قبول ہو یا نہ ہو۔ اگر قبول ہو جائے تو عین رحمت ہے۔

ایک بزرگ سے منقول ہے کہ ہم حج کو جاتے تھے۔ راستہ میں ایک نوجوان کو دیکھا کہ
 نہایت آزادی سے جا رہا ہے ان بزرگ نے پوچھا کہ صاحب زادہ تمہارے پاس زاد نہیں ہے تم
 کو تکلیف ہوگی اس نے کہا۔

وفد علی الکریم بغیر زاد ☆ من الحسنات والقلب السليم

فان الزاد ابق کل شی ☆ اذا کان الوفود علی الکریم

(کریم کے دروازہ پر جماعت کو نیکی اور سلامت قلبی کے ساتھ بغیر زاد راہ کے جانا چاہیے)

اس لئے کہ کسی کریم کے دروازے جماعتوں کا زاد راہ لے کر جانا سب سے بری چیز ہے)

جب سب لوگوں نے احرام باندھا تو اس نے احرام بڑے سوچ سے باندھا۔ اس سے پوچھا
 کہ میاں! تم احرام جلدی کیوں نہیں باندھتے۔ کہا کہ اس لئے نہیں باندھتا کہ ایسا نہ ہو کہ میں کہوں
 بلیک اور ادھر سے آواز آئے لالیبک ولا سعد یک وحجک مردود علیک۔ (نہ
 تیری حاضری منظور ہے نہ تیرے لئے نیک بختی ہے اور تیرا حج تجھ ہی پر لوٹا یا جاتا ہے) جب منیٰ میں
 لوگ قربانی کرنے لگے اس جوان نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور عرض کیا کہ میرے پاس قربانی

کا جانور تو نہیں تو صرف یہ جان حاضر ہے اگر قبول ہو۔ یہ کہتے ہی گرا اور جاں بحق تسلیم ہوا۔
اس پر ایک اور حکایت یاد آگئی۔ ایک صاحب حال حج کو گئے۔ جب بیت اللہ شریف پہنچے تو
مطوف نے ان سے کہا کہ یہ ہے بیت اللہ شریف! اس نے یہ شعر پڑھا۔

چوری بکوائے دلبر بسا رجان مضطر ☆ کہ مبادا باردیگر نری بدیں تمنا
(اگر تیری پہنچ کو چہ جاناں میں ہو جائے تو اپنی بے قرار جان کو نثار کر دینا کیونکہ ایسا نہ ہو
کہ اس تمنا کے ساتھ تو دوبارہ وہاں نہ پہنچ سکے) اور یہ کہہ کر گرا اور جان دیدی۔
پس دیکھئے! اس نوجوان عارف نے احرام باندھتے ہوئے خوف کھایا۔ اس سے معلوم ہوا
کہ ہمارے اعمال کچھ بھی نہیں پھر استحقاق ثمرات کیسا۔ بس خدمت کئے جاؤ۔ اپنا کام یہی ہے کہ
کام کرتے کرتے جان دیدیں۔ اور کسی شے کی طلب نہ ہو حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔
توبندگی چو گدایاں بشرط مزکن ☆ کہ خواجہ خودروش بندہ پروری داند
(توفقیروں کی طرح مزدوری کی شرط کے ساتھ بندگی مت کر کیونکہ مالک خود جانتا ہے
کہ اپنے بندوں کی پرورش کیسے ہوتی ہے)

خلاصہ یہ ہے کہ اپنے عمل پر نظر نہ ہونا چاہیے۔ اسی خود بینی کو ولتکبر واللہ (اور تاکہ اللہ کی
بڑائی بیان کرو) الخ سے رد فرماتے ہیں۔ اس لئے کہ جب حق تعالیٰ کی بڑائی پیش نظر ہوگی
تو اپنے اعمال اور خود اپنی ذات لاشی نظر آئیگی اور بجائے عجب کے شکر کریگا۔

مذاق طبعی کی رعایت

چنانچہ آگے ارشاد ہے ولعلکم تشکرون (اور اُمید کہ تم شکر گزار بن جاؤ گے) اور جیسے دل
سے بڑائی کی تعلیم ہے اسی طرح زبان سے بھی سکھائی گئی ہے کہ عید کے راستہ میں اللہ اکبر اللہ اکبر زبان
سے کہتے جائیں اور نیز پانچوں وقت کی نماز میں بھی اسی واسطے حکم فرمایا اللہ اکبر زبان سے کہیں اور اسی کی
نظیر ہے نماز کی نیت کہ اصل نیت تو دل سے ہے لیکن زبان سے کہنا بھی فقہاء نے مشروع فرمایا ہے۔
الحاصل یہ بڑی رحمت ہے کہ مجاہدہ کو ختم فرمادیا اور وجوبی کا حکم فرمایا کہ عید کے دن ضرور
کھاؤ پیو۔ دیکھئے اس میں ہمارے مذاق طبعی کی کس قدر رعایت ہے جیسے جمعہ کے بارے میں
ارشاد فرمایا ہے فاذا قضیت الصلوۃ فانتشروا فی الارض۔ یعنی جب نماز ادا کر لی جائے
تو زمین میں متفرق ہو جاؤ۔ ہم لوگ خود ایسے تھے کہ نماز کے بعد خود ہی بھاگتے لیکن حکم بھی فرمادیا۔
اس میں بھی مذاق طبعی کی کس قدر رعایت ہے اور یہی وجہ تشبیہ ہے۔ گو یہ حکم وجوبی نہیں اور نیز ایسے
لدادہ بھی تھے جو مسجد ہی میں رہ جاتے ہیں۔ بقول امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ۔

خسرو غریب ست گدا افتادہ در کوئے شما ☆ باشد کہ از بہر خدا سوائے غریباں بنگری

(خسر و غریب ایسا فقیر ہے جو تیری گلی میں پڑا ہوا ہے بس اب تجھے کو چاہئے کہ خدا کے واسطے غریبوں کی طرف نظر کرے)

ان کے لئے بھی انتشار فی الارض کو مصلحت سمجھا اور اس میں بڑی مصلحت یہ ہے کہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ ایک کام سے طبیعت اکتا جاتی ہے اور نیز طبائع اکثر ضعیف ہیں۔ جب زیادہ پابندی ہوتی ہے اور اس سے حرج معاش ہوتا ہے اور حاجت ستاتی ہے تو ساری محبت رکھی رہ جاتی ہے اس لئے ارشاد فرمایا کہ فان تشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ یعنی زمین میں متفرق ہو جاؤ اور اللہ کا فضل یعنی رزق طلب کرو۔

علاوہ اس کے اس میں ایک تمدنی و سیاسی مصلحت بھی ہے جس کو میں نے ایک مرتبہ کراچی میں وعظ کے اندر بیان کیا تھا۔ اس طرح سے کہ تمدن کے مسائل جیسے قرآن مجید سے ثابت ہوتے ہیں ایسے دوسری جگہ سے نہیں ہوتے۔ چنانچہ اس آیت سے بھی ایک مسئلہ مستنبط ہوا کہ بلا ضرورت اجتماع نہ ہونا چاہیے۔ اگر بضرورت ہو تو رفع ضرورت کے بعد فوراً منتشر ہو جانا چاہیے۔

یہی وہ مضمون ہے جو تمام اہل سیاست مانے ہوئے ہیں کہ ناجائز مجمع کو منتشر کر دیا جائے۔ قرآن مجید میں اس مجمع کے ناجائز بننے سے پہلے ہی محض اس احتمال پر کہ اب ان کو کوئی کام تو رہا نہیں۔ یہ ناجائز مجمع نہ بن جائے سب کو منتشر کر دیا گیا۔ اس وعظ میں ایک بڑا عالی رتبہ انگریز بھی تھا۔ اس نے بعد وعظ کے مسرت ظاہر کی۔

الحاصل مجاہدہ کو ختم کر کے کھانے پینے اور عید گاہ میں جانے اور خوشی منانے کی اجازت دی اور اس میں بھی یہ نہیں کہ کوئی لہو و لعب ہو بلکہ اس دن میں ایک خاص عبادت مقرر فرمائی اور اس کا طرز علیحدہ رکھا کہ شہر سے باہر صحراء میں جائیں اور اچھے اچھے کپڑے پہنیں اور وہاں نماز پڑھیں اور اس نماز کا طریقہ بھی جدا گانہ رکھا کہ اور نمازوں سے اس میں چھ مرتبہ اللہ اکبر اللہ اکبر زیادہ ہے۔ یہ اس لئے کہ جوش مسرت میں موحدا اور خدا پرست کی زبان سے اللہ اکبر ہی نکلا کرتا ہے۔

غرض ہماری فرحت بھی ایسی ہے کہ اس میں بھی عبادت ہے اور مشقت میں بھی راحت ہے بخلاف اور قوموں کے کہ ان کے یہاں خوشی کے دن لہو و لعب اور بعض قوموں میں فسق و فجور تک ہے اور اس دن میں ایک طریق ادائے شکر اور اظہار خوشی کا یہ مقرر فرمایا کہ اغنیاء پر صدقہ قطر مقرر فرمایا۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ نے جو نعمت ہم پر فائز فرمائی کہ ہم سے روزے ادا ہو گئے اس کا شکر یہ ہے کہ اپنے بھوکے ہونے کو یاد کر کے اپنے بھوکے مسلمان بھائی کی امداد کرے اور کم از کم دو وقت کی کفایت کے لئے اس کو کھانا دیدے اور نیز اس میں اپنی خوشی کی تکمیل بھی ہے۔ اس لئے کہ مجمع میں اگر ایک شخص بھی کبیدہ ہوتا ہے تو اس کا اثر سب پر ہوتا ہے تو اغنیاء پر صدقہ قطر مقرر فرما دیا۔ تاکہ سب مسلمان بھائی آج سیر اور خوش نظر آئیں اور خوشی کی تکمیل ہو جائے ورنہ

اپنے بھائی کو افسردہ دیکھ کر دل پھٹ جاتا ہے غرض اس میں ادائے شکر بھی ہے اور فرحت کی تکمیل بھی ہے اور اس کے ساتھ معنی صدقہ کے بھی۔ اس لئے غیر صائمین اور صیامین کی طرف سے بھی ادا کیا جاتا ہے بہر حال رمضان کا تمام مہینہ تو مجاہدہ کا وقت ہے اور عید اس کا اختتام ہے۔

اختتام رمضان

اس اختتام یعنی عید اور مقصود یعنی مجاہدہ رمضان میں چند امور مشترک ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ رمضان المبارک میں بعض عبادتیں فرض ہیں بعض نفل میں۔ مثلاً روزہ رکھنا فرض ہے اور تراویح و اعتکاف مسنون ہیں۔ عید کے دن میں بھی بعض عبادتیں واجب ہیں بعض مستحب ہیں۔ عید کی نماز واجب ہے۔ صدقہ فطر واجب ہے اور غسل کرنا، عطر لگانا اور اچھے کپڑے پہننا مستحب ہے۔ غرض دو قسم کی عبادتیں رمضان شریف میں ہیں ضروری اور غیر ضروری اور یہی دو ہی قسم کی عید کے دن میں ہیں۔ میں نے اپنے ایک وعظ میں اسی رمضان کے مواعظ میں سے وعدہ کیا تھا کہ فرض اور نفل میں جو اثر قرب کا اور اس قرب کے مراتب ہیں جو تفاوت ہے اس کا بیان کروں گا۔ سو آج اس کا ایفاء کرتا ہوں اور وہ مضمون اپنی طرف سے کوئی نکتہ نہ ہوگا۔ بلکہ حدیث شریف ہی کا مضمون ہوگا۔ بغور سنئے کہ فرائض کی نسبت حدیث قدسی میں آیا ہے کہ میرا بندہ جس قدر فرض ادا کرنے سے مقرب بنتا ہے اس قدر کسی شے سے نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرض بہت بڑی شے ہے اور نوافل کی نسبت ارشاد ہے: لا یزال عبدی یتقرب الی بالنوا فل حتی احبته فاذا احبته كنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصر به ویدہ الذی یتطش بہا۔ ”یعنی میرا بندہ ہمیشہ نوافل سے قرب تلاش کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اس کو چاہنے لگتا ہوں اور جب میں اس کو چاہتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں کہ وہ مجھ سے سنتا ہوں اور میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں کہ وہ مجھ سے دیکھتا ہے اور میں ہی اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں کہ وہ مجھ سے پکڑتا ہے۔“ اس کا یہ مطلب نہیں اللہ میاں تو بہ تو بہ اس کا کان آنکھ ہاتھ ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان اعضاء سے اس سے کوئی کام حق تعالیٰ کے خلاف مرضی نہیں ہوتا۔ اب غور کیجئے کہ فرائض کی خاصیت یہ بیان فرمائی کہ جس قدر قرب ان سے ہوتا ہے اس قدر کسی عبادت سے نہیں ہوتا۔ اور نوافل کے بارہ میں یہ ارشاد فرمایا شینا شینا حاصل ہوتا رہتا ہے جیسا لا یزال یتقرب اس پر دل ہے تو حاصل اس کا یہ ہے کہ زیادت قرب دو قسم کی ہے ایک کیفیہ اور ایک کمیہ کا اور وہ دونوں مطلوب ہیں تو فرائض سے تو کیف کے اعتبار سے قرب بڑھتا ہے اور نوافل سے کمیہ بڑھتا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص سرکاری عہدہ دار ہے تو نفس قرب تو اس کو اپنا منصبی کام

انجام دینے سے حاصل ہوگا۔ اور اگر یہ کام نہ کرے تو قرب ہی نہ ہوگا تو یہ منجھی کام بہت بڑی شے ہے کہ اس نے اس کو سرکاری آدمی بنادیا ہے اب وہ چاہتا ہے کہ میرا قرب حاکم سے اور بھی زیادہ بڑھ جائے تو وہ حاکم کے خوش کرنے کے لئے ایسا کام اختیار کریگا کہ وہ کام اس کے ذمہ نہیں ہے مثلاً اس کے لئے ڈالی لے جائے اور تحائف بھیجے نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ حاکم کا بہت مقرب ہو جائے گا۔ حتیٰ کہ حاکم کے پاس بیٹھنا بھی اس کو نصیب ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس تشبیہ سے پاک ہیں لیکن بطور تمثیل کے سمجھنا چاہیے کہ عاشق کو نفس قرب کیفی سے تسلی نہیں ہے وہ اپنی استعداد کے اعتبار سے کمال قرب کی کا طالب ہوتا ہے مثلاً محبوب نے اپنے پاس خوش ہو کر بٹھلایا تو وہ کھسکتا ہوا اور آگے مل کر بیٹھنا چاہتا ہے اس لئے حق تعالیٰ نے دو عبادتیں مقرر فرمائی ہیں۔ فرض اور نفل قرب کیفی کا تعلق تو فرض کے ساتھ ہے۔ فرض کے بعد کوئی درجہ کیف کا باقی نہیں رہتا۔ اور کمیہ کا تعلق نفس سے ہے اور کیت قرب کے مراتب بے شمار ہیں۔ جس قدر بھی مراتب طے کریگا ختم نہ ہوں گے اور نہ سیری ہوگی۔ برابر دل چاہتا رہے گا کہ اور بڑھے اور بڑھے۔

فرائض اور قرب

خلاصہ یہ ہے کہ فرض کے ادا کرنے سے جو قرب حاصل ہوتا ہے عاشق کو اس مقدار سے تسلی نہیں ہوتی۔ الریاض نفل نہ ہوتے تو وہ یقیناً تڑپ تڑپ کر مرجاتا اس لئے کہ دل کا تقاضا ہوتا کہ مراتب قرب کو طے کرے اور طریقہ کوئی تھا نہیں۔ اس لئے شدت شوق میں اگر جان دیدیتا تو تعجب نہ تھا اور اب نوافل حق تعالیٰ نے مقرر فرمادئے ہیں کہ ان سے درجات طے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اذکار اشغال اور روزے و نماز نفل سب اسی واسطے ہیں کہ بندہ قرب کے درجات طے کرے اس لئے فرائض محدود ہیں اور نوافل غیر محدود۔

خلاصہ یہ ہے کہ فرائض کے متعلق جو قرب ہے وہ ایک دم سے حاصل ہو جاتا ہے اور اس نوع میں کوئی درجہ باقی نہیں رہتا۔ اور نوافل کے متعلق جو قرب ہے اس کی کوئی حد نہیں۔ پس اس حکمت کی وجہ سے بعض عبادتیں فرض مقرر فرمائی ہیں۔ فرض روزہ بھی ہے۔ بعض نفل جن میں نفلی روزے بھی ہیں جو دوسرے ایام میں بھی مشروع ہوئے۔ تاکہ کوئی نوع قرب کی فوت نہ ہو۔ صوفیا کی اصطلاح میں اول کو قرب فرائض کہتے ہیں اور دوسری نوع کو قرب نوافل کہتے ہیں اور چونکہ نوافل سے جو قرب ہوتا ہے وہ ختم نہیں ہوتا۔ اسی واسطے حدیث میں اس کو لایزال عبدی الخ سے تعبیر فرمایا ہے۔

بحمد اللہ میں نے بقدر رسائی ذہن کے ان احکام کے اسرار و حکمتیں بیان کی ہیں۔

مقصود میرا اس سے یہ ہے کہ آپ صاحبوں کو ان عبادتوں کو مع ان کے حقوق کے ادا کرنے کی رغبت ہو۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ توفیق عطا فرمائیں۔ آمین!

تمت بحمد اللہ